رسالہ جا

جلد ۸ | ماہ ذیقعدہ ۱۳۴۵ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۲۷ء | نمبر ۵

نابینائی

اس عالم کون وفساد میں ناتواں اور بے بس انسان کے لئے جو ابتدائیں اور آزمائشیں ھی گئی ہیں انمیں سے بے بصری بھی ایک سخت مصیبت ہے۔ اللہ محفوظ رکھے۔ اندھا زندہ ہے مگر رگور۔ دنیا میں ہے لیکن دنیا سے دور اور اقربا، واحباب کی دیدار سے مجبور۔ اسی وجہ سے س مصیبت عظمےٰ میں صبر کرنے پر بعض روایات میں جنت کی بشارت دی گئی ہے۔ قرآن حکیم نے بھی اسکو معذورین میں داخل کیا۔ اور فرمایا لیس علی الاعمیٰ حرج۔ چنانچہ فریضہ جہاد اس سے ساقط ہے اور جمعہ وعیدین وغیرہ کی حاضری اس کے لئے لازم نہیں۔

بعض علماء نے اندھوں کو ناقص الدین قرار دیا ہے کیونکہ طہارت جو اصل الاصول اسکی پوری رعایت کرنے سے وہ قاصر ہیں۔ اسی بنا پر بعضوں کے نزدیک انکی امامت بھی دہ ہے۔ ان لوگوں کا استدلال اس آیت سے ہے۔

یستوی الاعمیٰ والبصیر ولا الظلمات ولا النور | نابینا اور بینا برابر نہیں۔ اور نہ ظلمت اور نہ نور

وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُورُ | اور نہ سایہ اور دھوپ

لیکن حقیقت میں اس آیت میں نہ اعمیٰ سے مراد اندھا ہے نہ بصیر سے بینا۔ بلکہ کافر اور مومن ہیں اور یہیں نہیں بلکہ قرآن میں دوسرے مواقع پر بھی انہیں معنوں میں یہ الفاظ مستعمل ہوئے ہیں۔ سورۂ ہود میں ہے۔

مَثَلُ الْفَرِيقَيْنِ كَالْأَعْمَىٰ وَالْأَصَمِّ وَالْبَصِيرِ وَالسَّمِيعِ | دونوں فریقوں (کافروں اور مومنوں) کی مثال ایسی ہے جیسے اندھا اور بہرا اور بینا و شنوا۔

سورۂ حج میں بھی فرمایا۔

فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ | حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں نہیں اندھی ہوتیں بلکہ وہ دل اندھے ہوجاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔

اس لئے یہ باور کرنا مشکل ہے کہ ایک غیر اختیاری معذوری کی وجہ سے کیوں انسان کا رتبہ رب شکور و غفور کے نزدیک فروتر ہوجائیگا۔

جن لوگوں نے یہ دعوے کیا ہے کہ اندھا نبی نہیں ہوسکتا انکا نقطہ نظر اور ہے یعنی وہ اس معذوری کو نبوت کے فرائض میں حارج سمجھتے ہیں۔ انکے نزدیک جہاں اور بہت سی باتیں ہیں مثلاً بدشکل یا بدخاندان ہونا جن سے ساحت نبوت پاک رہنا چاہئے وہاں نابینائی بھی ہے معہذا سارے اہل علم انکے ہم خیال نہیں ہیں۔ علامہ ابوالعباس احمد بن علی نے اپنی کتاب راس مال الندیم[1] میں لکھا ہے کہ حضرت شعیب اور اسحاق علیہم السلام کی بینائی چلی گئی تھی۔ امام ابن جوزی نے تلقیح میں ان دونوں ناموں کے ساتھ حضرت یعقوبؑ کا نام بھی اضافہ کیا ہے جن کی آنکھوں کے سفید ہوجانے کا ذکر قرآن میں بھی موجود ہے۔

گو اسکا جواب مخالفین کی طرف سے یہ ہے کہ پہلے دو نبیوں کے متعلق کوئی قطعی شہادت

---

[1] یہ نادر و نایاب کتاب جس سے دنیا کے بڑے بڑے شاہی کتب خانے خالی تھے حال میں ہمارے دوست مولوی محمد یوسف صاحب ٹونکی کی کوشش سے دہلی میں طبع ہوئی ہے۔

موجود نہیں ہے اور حضرت یعقوب کی نابینائی عارضی تھی لیکن تاہم انکے بیان سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ وہ نابینائی کو ایک نقص سمجھتے ہیں نہ کہ عیب۔ تعجب ان لوگوں پہ ہے جو اس کو نہ صرف عیب بلکہ عذاب قرار دیتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے دعوے کی تائید میں یہ آیت پیش کرتے ہیں۔

وَمَن كَانَ فِي هَٰذِهِ أَعْمَىٰ فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْمَىٰ	اور جو یہاں اندھا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا۔

لہذا جب آخرت میں نابینائی عذاب ہے تو دنیا میں کیوں نہیں۔

مگر حضرت ابن عباس مجاہد اور مقاتل وغیرہ اکثر علما تفسیر نے اس کے معنے بیان کئے ہیں کہ اعمیٰ عن الحجت یعنی قیامت کے دن اس کو کوئی جواب نہ سوجھے گا۔ یہ مفہوم دوسری آیت سے جو سورہ طہٰ میں ہے زیادہ صاف ہو جاتا ہے۔

وَمَنْ أَعْرَضَ عَن ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنكًا وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمَىٰ ۔ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِي أَعْمَىٰ وَقَدْ كُنتُ بَصِيرًا ۔ قَالَ كَذَٰلِكَ أَتَتْكَ آيَاتُنَا فَنَسِيتَهَا وَكَذَٰلِكَ الْيَوْمَ تُنسَىٰ	جو کوئی میرے ذکر (قرآن) سے روگردانی کریگا اس کیلئے معیشت تنگ ہوگی۔ اور ہم قیامت کے دن اس کو اندھا اٹھائیں گے وہ کہے گا اے میرے رب مجھے اندھا کیوں اٹھایا میں تو بینا تھا۔ وہ جواب دیگا کہ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ میری آیتیں تیرے پاس آئیں تو نے انکو بھلا دیا اسی طرح آج تو بھلا دیا جائے گا۔

یعنی اسکے اندھا اٹھانے کا مطلب نسیان حجت ہے کہ وہ جواب دے کر اپنی برات نہیں کر سکیگا اور نجات کی صورت نہیں دیکھ پائیگا جیسا کہ آیت کے آخری حصہ سے تشریح ہوتی ہے۔

اس پر اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ اگر یہاں اعمیٰ کا مجازی مفہوم یعنی نسیان دلائل مراد ہے تو اس سے دنیا میں اس کو کیا ضرر تھا جو آخرت میں یہ اس کے لئے تعزیر بن سکے۔

امام رازی نے اسکا جواب یہ دیا ہے کہ چونکہ اسکی روح نے جہالت میں دنیا سے مفارقت کی اس لئے یہی جہالت اس کی روح کے لئے الم کا باعث ہوگی۔

اس جواب سے افسوس ہے کہ امام صاحب کے روحانی معاد کے قائل ہونے کا پتہ چلتا ہے۔

ہمارے نزدیک اسکا سیدھا جواب یہ ہے جو شخص دنیا میں قرآن سے روگردان ہوا وہ قیامت میں اندھوں کی طرح سرگردان پھریگا اور کوئی سبیل نجات کی نہیں دیکھ پائے گا۔

گو یہ آیت عمل بالقرآن کے متعلق ہے لیکن بعض علما رنے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اگر کوئی شخص حفظ کرنیکے بعد قرآن کو بھلا دے تو وہ قیامت کے دن اندھا اٹھایا جائے گا۔

حاصل یہ ہے کہ نابینائی اگرچہ ایک دردناک مصیبت ہے لیکن وہ عذاب یا تعزیر کسی طرح نہیں کہی جاسکتی۔ ہزاروں بچے مادرزاد اندھے پیدا ہوتے ہیں آخر یہ کس جرم کی تعزیر ہیں؟

بے بصری سے ہرچند انسان میں بڑا نقص آجاتا ہے اور اُسکی زندگی تقریباً بیکار سی ہوجاتی ہے لیکن اس میں کچھ فائدہ بھی ہے۔ وہ یہ کہ توجہ بٹانے والی چیزوں سے اس کو یکسوئی ہوجاتی ہے۔ اس لئے اُسکی بصیرت اور ذہانت بڑھجاتی ہے۔ خاصکر قوت حافظہ۔ چنانچہ خود نابینا بزرگوں کے اقوال اس پر شاہد ہیں۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں۔

اِن یاخذ اللہ من عینیَّ نورَہما ففی لسانی وسمعی منہما نور

قلبی ذکیٌّ وعقلی غیرُ ذی دَخَلٍ وفی فمی صارمٌ کالسیفِ ماثور

یعنی اگر اللہ نے میری آنکھوں کا نور لے لیا تو انکے بدلے میں میری طلاقت اور سماعت میں نور آگیا۔ میرا دل ذکی ہے اور عقل بے شائبہ۔ اور منہ میں ایسی زبان ہے جو تیغ کی طرح تیز ہے۔

وَقالوا قد عمیتَ فقلتُ کلَّا وانی الیومَ ابصرُ من بصیر

سوادُ العین زار سوادَ قلبی لیجتمعا علی فہم الامور

یعنی لوگوں نے کہا کہ تو اندھا ہوگیا میں نے کہا ہرگز نہیں۔ اب تو میں بیناؤں سے بھی بڑھکر بینا ہوں۔ میری آنکھوں کی سیاہی (پتلی) سویدا قلب میں آگئی ہے تاکہ دونوں ملکر باتیں سمجھیں۔

جودت طبع۔ سیلان ذہن اور حفظ و یادداشت کے متعلق نابیناؤں کی داستانیں حیرت انگیز ہیں ایک حدیث بھی بیان کیجاتی ہے کہ۔

ما اخذ اللہ کریمتی مومنٍ الا عوّضہ خیراً منہما	اللہ جس مومن کی آنکھیں لے لیتا ہے انکا بدلہ انسے بہتر اسکو دیتا ہے

یہی وجہ تھی کہ ہمارے سلف اس جماعت کو حفظ قرآن وحدیث میں لگا دیتے تھے تاکہ انکی زندگی نہ صرف انکے بلکہ ملت کے لئے مفید اور کارآمد ہوجائے۔ چنانچہ علماء اسلام یعنی محدثین مفسرین فقہاء اور ادباء بالخصوص شعراء میں انکی ایک جماعت کثیر نامور ہوئی جنکی تصانیف اتبک بھی امت کے لئے سرمایۂ ناز ہیں۔

خود عرب کی گرمی اور اسکے صحاری آنکھوں کے حق میں کچھ اچھے واقع نہیں ہوئے ہیں۔ ہمیشہ سے وہاں ایک بڑی تعداد احولوں، کانوں اور اندھوں کی رہی ہے۔ لیکن اسلامی ممالک میں سب سے زیادہ آنکھوں کے لئے مضر دریائے نیل کا پانی ہے ملک مصر میں تقریباً ۲۵ فیصدی آدمی آنکھوں کے بیمار رہتے ہیں وہ بیمار نہیں جس کی بابت شاعر نے کہا ہے ؎

نقب کیا کیا تمہاری چشم عاشق کش نے پائے ہیں　　نیلی۔ سرگیں۔ بیمار۔ افسونگر۔ بڑی۔ اچھی

بلکہ واقعی مریض۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں کثرت سے اندھے سڑکوں پر گھومتے نظر آتے ہیں۔

ہرچند کہ بغداد کی تباہی کے بعد سے اسلامی علوم اور آداب کا مرکز قاہرہ رہا ہے اور آجتک بھی ہے۔ لیکن وہاں کی حالت خراب ہوتے ہوتے اس درجہ پہنچ گئی ہے کہ ہر ہر محلہ میں ایک ایک قبر پرستش گاہ ہوتی ہے جس کے اردگرد یہ اندھے بیٹھے ہوئے قرآن پڑھتے رہتے ہیں تاکہ زائرین سے کچھ خیرات وصول کریں۔ مُردوں کے ایصال ثواب کی دعوتوں اور گورستانوں میں اکثر یہی جماعت قطار در قطار نظر آتی ہے اور اپنی دینی اور دنیاوی اور جسمانی وروحانی افسوسناک حالت سے ایسا پر الم نظارہ پیش کرتی ہے جس پر انسانیت ماتم کرنے لگتی ہے۔ اور اس کے مقابل میں کافر یورپ جو سلوک اپنے یہاں کے اندھوں کے ساتھ کرتا ہے۔ اس کی تلاش کرنی پڑتی ہے۔

ہندوستان کے مفلس اور نادار مسلمان اس مصیبت زدہ جماعت کی تکالیف کا احساس بھی نہیں رکھتے[1]۔ اور تاریخ یہ بتلاتی ہے کہ انہوں نے اپنی دولت اور شوکت کے زمانہ میں

---

[1] چند سال ہوئے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب نے اپنے والد ماجد کی یادگار میں علیگڈھ میں مدرسہ

بھی اسکی طرف زیادہ توجہ نہ کی اور ایک بیکار جزو سمجھا۔

اس آخری زمانہ میں نواب صدیق حسن خانصاحب نے البتہ جابجا سے اندھوں کو بھوپال میں جمع کر کے سلف کے دستور کے مطابق قرآن وحدیث یاد کرنے کے کام میں لگایا تھا اور وظائف مقرر کر دئے تھے چنانچہ انکے عہد میں وہاں اس جماعت کی بڑی تعداد تھی۔ بالعموم یہ لوگ قرآن حفظ کر لیتے تھے جس کا اثر یہ ہوا کہ وہاں اندھوں کو عام طور پر "حافظ جی" کہنے لگے۔ بعض بعض بلوغ المرام اور مشکوٰۃ از بر کر لیتے تھے اور اس پر انکو انعامات ملتے تھے۔ چند ایسے بھی تھے جو بخاری بلکہ صحاح ستہ یاد رکھتے تھے۔ انہیں سے کچھ لوگ صاحب درس بھی تھے جن کی ذہانت اور حافظہ کے متعلق عجیب وغریب روایتیں وہاں مشہور تھیں۔

اس ذیل میں اسلام کے مشہور نابیناؤں کا ایک اجمالی تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم میں سے جو حضرات مکفوف البصر تھے وہ یہ ہیں۔

(۱) حضرت سعد بن وقاصؓ۔ فاتح قادسیہ و مدائن یہ ساتویں مسلمان اور عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔ نیز اُن چھ ارباب شوریٰ میں سے بھی جنکو حضرت عمرؓ نے آپ میں سے خلیفہ منتخب کرنے کیلئے نامزد فرما گئے تھے۔

یہ صحابۂ کرام میں خصوصیت کیساتھ مستجاب الدعوات تھے۔ زمانہ فتنہ میں سب سے الگ رہے آخری عمر میں بصارت جاتی رہی۔ حمراء الاسد کے متصل انکی ایک زمین تھی وہیں مکان بنا کر سکونت اختیار کی۔ ۵۵ھ میں انتقال فرمایا نعش کو لوگ مدینہ میں اٹھالائے۔

(۲) حضرت عباس بن عبد المطلب۔ عم رسولؐ بڑھاپے میں نابینا ہوگئے تھے۔ حضرت عمرؓ نے استسقاء میں جب انکو آگے بڑھایا تھا اس وقت بھی نابینا تھے۔ ۳۲ھ میں وفات پائی۔ عمر ۸۸ سال تھی۔

(۳) عبد اللہ بن عباس حبر اُمت۔ اپنے باپ اور دادا کی طرح بڑھاپے میں آنکھوں سے

کی تعلیم کے لئے ایک مدرسہ کھولا ہے۔ غالباً ہندوستان کے مسلمانوں میں یہ پہلی مثال ہے۔

معذور ہو گئے تھے۔ امیر معاویہ انکی بہت عزت و توقیر کرتے تھے۔ ایک تو انکے عقل و علم کی وجہ سے۔ دوسرے اس سبب سے کہ انکے باپ ابو سفیان اور انکے باپ حضرت عباس میں باہم بہت محبت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ عبداللہ بن عباس اکثر ان سے ملنے کے لئے دمشق میں جایا کرتے تھے۔ جب یہ نابینا ہو گئے تھے اس زمانہ میں امیر معاویہ نے ایک دن کہا کہ بنی ہاشم کی بصارت پر اکثر آفت آجاتی ہے۔ بولے کہ ہاں۔ اور بنی امیہ کی بصیرت پر۔ طائف میں رہتے تھے۔ وہیں ۶۸ھ میں گذر گئے۔

(۴) عقیل بن ابی طالب حضرت علی کرم اللہ وجہ کے بھائی اور انساب عرب کے بڑے واقف کار تھے۔ حضرت عمر نے فوج کا دفتر جن لوگوں سے مرتب کرایا تھا ان میں یہ بھی تھے جنگ صفین کے بعد اپنے بھائی کا ساتھ چھوڑ کر معاویہ کے پاس چلے گئے۔ اور وہیں رہنے لگے۔ انہوں نے مشہور کرنا شروع کیا کہ دیکھو حضرت علی کے حقیقی بھائی جو انساب عرب کے سب سے بڑے عالم ہیں اگر ہمکو بہتر نہ سمجھتے تو کیوں انکو چھوڑ کر ہمارے پاس آتے عقیل کو جب یہ خبر ملی تو کہا کہ بے شک۔ لیکن صرف دنیاوی لحاظ سے۔

ایک روز امیر معاویہ نے اپنے درباریوں سے کہا کہ سورہ تبت میں ابو لہب کا نام جو آیا ہے اسکو تم لوگ جانتے ہو کہ کون تھا؟ شامیوں نے کہا کہ نہیں عقیل کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ انکا چچا تھا۔

حضرت عقیل نے ان لوگوں سے کہا کہ اسی سورۃ میں ابو لہب کی بیوی جس کو حمالۃ الحطب کا خطاب دیا گیا ہے جانتے ہو کہ کون تھی؟ لوگ بولے نہیں۔ کہا کہ وہ معاویہ کی پھوپھی ام جمیل بنت حرب تھی ۵۰ھ کے حدود میں وفات پائی۔

(۵) عبداللہ بن عمر بن خطاب۔ علماء اور اتقیا صحابہ میں سے ہیں۔ باپ کے ساتھ ہجرت کرکے مدینہ آئے تھے۔ جنگ بدر اور احد میں کمسنی کی وجہ سے شرکت کی اجازت نہ پائی اور راستہ سے واپس کردئے گئے اس کے بعد سے تمام مشاہد میں شریک رہے۔ فتح مصر میں بھی شامل تھے

اور جنگ ایران میں بھی۔
بعض مورخوں نے لکھا ہے کہ سب سے پہلے بیعت رضوان میں انہوں نے ہی سبقت کی تھی
لیکن صحیح یہ ہے کہ وہ ابو سنان اسدی تھے۔
زمانہ فتنہ میں بالکل الگ رہے نہ حضرت علی کا ساتھ دیا نہ معاویہ کا۔ کبر سنی میں آنکھوں نے
جواب دیدیا تھا۔ ۷۳ھ میں محاصرۂ مکہ کے زمانہ میں حجاج بن یوسف ثقفی کے کسی سپاہی
کا نیزہ انکے پاؤں میں لگ گیا۔ اس زخم سے جانبر نہ ہو سکے۔ حجاج بھی عیادت کے لئے
حاضر ہوا۔ اور پوچھا کہ کس نے مارا۔ بولے کہ اس نے جس نے حدود حرم میں لوگوں کو
اسلحہ رکھنے کی اجازت دی۔

(۶) ابو سفیان صخر بن حرب۔ امیر معاویہ کے والد۔ فتح مکہ میں مسلمان ہوئے۔ طائف کے غزوہ
میں آنحضرت صلعم کے ہمرکاب تھے اس میں ایک آنکھ تیر سے زخمی ہوئی۔ دوسری معرکۂ یرموک
میں شہید ہوئی جبکہ یہ اپنے بیٹے یزید کے علم کے نیچے جہاد کر رہے تھے۔ مدینہ میں ۳۲ھ میں
وفات پائی۔

(۷) ابو قحافہ۔ حضرت ابو بکر کے والد۔ فتح مکہ میں مسلمان ہوئے تھے خلیفہ اول کی یہ خصوصیت
یہاں ذکر کے قابل ہے کہ انکی چار پشتیں صحابی ہیں۔ وہ خود۔ انکے باپ۔ اور انکے بیٹے عبد الرحمن
اور پوتے محمد بن عبد الرحمن۔
اسلام لانیکے وقت ابو قحافہ کی بصارت جا چکی تھی اور تمام بال سفید ہو چکے تھے۔ تاہم وہ
حضرت ابو بکر کے انتقال کے وقت تک زندہ تھے۔ انکے ترکہ میں سے ایک سدس ان کو
بھی ملا تھا جس کو انکی اولاد پر پر مسترد کر دیا۔ ۱۴ھ میں انتقال کیا۔ عمر ۹۷ سال کی تھی۔

(۸) حسان بن ثابت انصاری خزرجی۔ شاعر دربار نبوی۔ بڑی عمر پائی۔ ساٹھ سال جاہلیت میں
گذارے اور اسیقدر اسلام میں۔ ۵۴ھ میں وفات ہوئی۔ یہی انکی خاندانی عمر تھی امام
ذہبی نے لکھا ہے کہ انکے باپ، دادا، پردادا ہر ایک نے اسی قدر طویل عمریں پائی تھیں۔

جب بڑھاپے میں بینائی سے معذور ہو گئے تھے کبھی کبھی حضرت عائشہ کی خدمت میں حاضر ہوکر
اپنے اشعار سناتے۔ کسی نے کہا کہ ام المومنین! یہ تو ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے
آپ پر تہمت تراشی تھی اور جنکی نسبت قرآن میں ہے کہ انکے لئے بڑا عذاب ہے۔ ان کو
کیوں یہاں آنیکی اجازت دیتی ہیں!!
حضرت عائشہ نے فرمایا کہ نابینائی سے بڑھکر کون عذاب ہوگا۔
لیکن اصلیت یہ ہے کہ قرآن میں عذاب کی وعید اس کے لئے ہے جو اس تہمت کا بانی تھا
(والَّذِی تولّٰی کِبْرَہٗ مِنْھُم لہٗ عذابٌ عظیم) اور یہ راس المنافقین عبداللہ بن سلول تھا۔
چنانچہ جو جو اس تہمت میں شریک تھے انکو اللہ تعالےٰ نے توبہ کی توفیق بخشی لیکن نہ بخشی تو
ابن سلول کو جو نفاق میں مرا۔ اور ایسا مغضوب و معتوب ہوا کہ اسکی قبر کے پاس
کھڑے ہونیکی بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو اجازت نہ دی۔
(۹) کعب بن مالک انصاری۔ دربار نبوی کے دوسرے شاعر۔ جنگ احد میں انکو گیارہ زخم
آئے تھے۔ اسکے بعد تمام غزوات میں شریک رہے۔ بدر کی شرکت میں اختلاف ہے
قرآن کریم میں جن تین شخصوں کا ذکر ہے کہ غزوۂ تبوک میں آنحضرت کے ہمراہ نہ گئے اور
لیت ولعل میں رہ گئے ان میں سے ایک یہ بھی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے بوجہ صدق کے ان
کی توبہ قبول کر لی۔
۵۰ھ میں مدینہ میں انتقال فرمایا۔ اس سے کچھ زمانہ پہلے آنکھیں جاتی رہی تھیں۔
(۱۰) ابن ام مکتوم۔ انکا نام عمرو بن قیس ہے۔ ام المومنین حضرت خدیجہ کے ماموں زاد بھائی ہوتے
تھے۔ بصارت سے معذوری کی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انکو مدینہ میں موذن
مقرر فرمایا تھا۔ عاقل و مدبر تھے۔ چنانچہ آنحضرت جب کہیں باہر کسی غزوہ وغیرہ کے لئے
جاتے تو اکثر انہیں کو اپنا قائم مقام کر جاتے۔
جہاد کے شوق میں جنگ قادسیہ میں جاکر شرکت کی۔ کیونکہ عرب و عجم کا سب سے بڑا مقابلہ وہی تھا

ایکطرف تمام عجمی شاہزادے امراء اور روساء تھے۔ دوسری طرف سے ملک عرب کے سارے بہترین بخت جگر حضرت سعد نے انکو علمبردار مقرر کردیا۔ ایک بیان یہ بھی ہے کہ وہیں شہید ہو گئے لیکن اکثر مورخ لکھتے ہیں کہ مدینہ میں آکر ۲۳ھ میں انتقال فرمایا۔

عبس وتولی ان جاءہ الاعمیٰ انہیں کے متعلق نازل ہوئی۔ شان نزول یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس صنادید قریش عتبہ، شیبہ۔ ابوجہل۔ امیۃ بن خلف اور ولید بن مغیرہ وغیرہ کا مجمع تھا۔ اور آپ انکو اسلام کی دعوت دے رہے تھے۔ اسی گفتگو میں تھے کہ ابن ام مکتوم وہاں پہنچگئے اور کہا کہ یا محمد علمنی مما علمک اللہ

انکی یہ بات اس وقت بے موقع معلوم ہوئی۔ اس لئے آپنے ترش رو ہو کر منہ پھیر لیا۔ اس پر یہ سورہ اتری جس میں پیغمبر پر عتاب کیا گیا۔

مفسرین کا بیان یہی ہے امام رازی نے اس پر اعتراض کیا ہے کہ ابن ام مکتوم اگرچہ نابینا تھے لیکن باتیں تو سن سکتے تھے۔ آنحضرت کے انداز خطاب سے انکو سمجھنا چاہئے تھا کہ کس توجہ کیسا تھ تبلیغ میں مصروف ہیں۔ ایسی حالت میں دخل دینا مناسب نہ تھا علاوہ بریں وہ اسلام لاچکے تھے اور ضروریات دین سے واقف تھے۔ بخلاف اس کے سرداران قریش کافر تھے اس لئے اصولاً انکو مسلمان بنانا زیادہ اہم تھا خاصکر ایسی حالت میں جبکہ انکے اسلام لانے سے تقریباً سارے قریش کے مسلمان ہوجانیکی توقع تھی۔ لہذا ابن ام مکتوم بیچ میں چھیڑکر بہت بڑے کار خیر اور ادائے فرض نبوت میں خلل اندازی کے مرتکب ہوئے۔ پھر اگر پیغمبر نے انکی اس حرکت پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا تو کیا بیجا کیا۔ اور کیوں مورد عتاب ہوئے۔

اسکا انہوں نے خود ہی جواب بھی دیا ہے جو حسب معمول اسقدر قوی نہیں جس قدر کہ اعتراض۔ کہتے ہیں کہ اگرچہ واقعہ کی ظاہری شکل کا مقتضا تو یہی تھا لیکن چونکہ آنحضرتؐ کے اس طرز سلوک سے فقراء پر اغنیاء کی ترجیح کا شبہ ہوتا تھا جس سے انکی دلشکنی کا احتمال تھا۔

اس لئے عتاب نازل ہوا۔ کیونکہ نبیوں کا دستورالعمل یہ ہے "ولا تطرد الذین یدعون ربہم الخ"
یہ بھی ممکن ہے کہ حضور انور کے قلب میں اس وقت ابن ام مکتوم سے بوجہ بعد قرابت
اور نابینائی کے نفرت اور اُن کفار کی طرف بسبب اُنکی ریاست اور قرابت قریبہ کے
رغبت پیدا ہوگئی ہو اسلئے عتاب ہوا۔ یعنی یہ عتاب تادیب (ترش روئی اور اعراض سے
ابن ام مکتوم کی زجر و توبیخ) پر نہیں بلکہ تادُب کے لئے تھا

(۱۱) ابواسید ساعدی انصاری - بدر و اُحد ہر غزوہ میں حاضر رہے۔ بدرئین میں سے سب سے
آخر میں ۶۰ھ میں انتقال فرمایا عمرہ ۷ سال تھی۔ بڑھاپے میں آنکھوں سے معذور
ہو گئے تھے۔

(۱۲) فویک - نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے - دونوں آنکھیں سفید تھیں اور
مطلق سوجھتا نہ تھا۔ حضور نے پوچھا کہ کیا ہوا۔ کہا سانپ کے انڈوں پر پاؤں پڑ گیا
تھا۔ غالباً اسی کا اثر ہے۔ آپنے اپنے مبارک لبوں کی تری دونوں آنکھوں میں لگا دی
اچھے ہو گئے۔ اسی سال کی عمر تک سوئی میں تاگا ڈال لیتے تھے۔

اسی ذیل میں یہ واقعہ بھی ذکر کے قابل ہے کہ جنگ احد میں حضرت قتادہ بن نعمان کو ایک
ایسا تیر لگا کہ اُنکی آنکھ نکل پڑی - وہ اس کو ہاتھ میں لئے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم
کے پاس آئے۔ آپنے دعا کی اور آنکھ اپنے دست مبارک سے انکے حلقہ چشم میں رکھکر
جما دی۔ وہ ایسی درست ہوگئی کہ زندگی بھر بہ نسبت دوسری آنکھ کے زیادہ خوش نظر
اور خوش منظر رہی۔ بلکہ بعض مورخ لکھتے ہیں کہ اُنکی نسل میں بھی اسکا اثر باقی رہا۔

(۱۳) مخرمہ بن نوفل - سرداران قریش میں سے تھے۔ فتح مکہ کے دن اسلام لائے۔ اور جنگ حنین
میں رسول اللہ کے ہمرکاب شریک ہوئے۔ حضرت عمر نے دفتر فوج کی ترتیب میں انسے
بھی مدد لی کیونکہ انساب اور قبائل عرب سے خوب واقف تھے۔
حضرت عثمان کے زمانہ میں آنکھوں سے معذور ہو گئے تھے ۵۴ھ میں مدینہ میں انتقال کیا

(۱۴) برا بن عازب انصاری جنگ بدر میں جا رہے تھے لیکن کمسنی کی وجہ سے راستہ سے واپس کئے گئے سنہ ۲۴ھ میں ملک رے انہیں کے ہاتھ سے فتح ہوا جب آنکھیں جاتی رہیں تو کوفہ میں سکونت گزیں ہوگئے وہیں سنہ ۷۱ھ میں وفات پائی۔

(۱۵) عبداللہ بن ارقم۔ فتح مکہ میں اسلام لائے۔ آنحضرت کے اور انکے بعد شیخین کے کاتب رہے حضرت عمر اور عثمان کے عہد میں ایک مدت تک بیت المال انکے سپرد رہا آخر میں نابینا ہوگئے تھے سنہ ۶۰ھ کے حدود میں گذر گئے حضرت عثمان نے ایک بار انکو تیس ہزار درہم انعام عطا کئے لیکن لینے سے انکار کر دیا۔

(۱۶) عبداللہ بن علقمی خزاعی۔ بیعت رضوان نیز دیگر غزوات میں بھی شریک رہے۔ آنحضرت کی وفات کے بعد مدینہ چھوڑ دیا۔ جب کوفہ آباد ہوا تو وہاں سکونت اختیار کرلی بڑی عمر پائی بڑھاپے میں آنکھیں جاتی رہیں۔ کوفہ میں سب سے آخری صحابہ یہی رہ گئے تھے سنہ ۸۶ھ میں انتقال فرمایا۔

(۱۷) عتبہ بن مسعود ہذلی۔ دونوں ہجرتوں میں شریک تھے۔ اور کسی غزوہ سے غیر حاضر نہ ہوئے مدینہ میں انتقال کیا۔ حضرت عمر نے جنازہ کی نماز پڑھائی گو عمر زیادہ نہ پائی لیکن آنکھوں نے جواب دیدیا تھا۔

(۱۸) اُمیہ بن الاشکر کنانی زمانہ جاہلیت میں اپنے قبیلہ بنی لیث کے سردار تھے۔ اسلام لاکر مدینہ میں رہ گئے۔ آنکھوں سے معذور تھے۔ انکے ایک ہی بیٹا تھا کلاب۔ جہاد کے شوق میں اس نے ابوموسیٰ اشعری کی فوج میں اپنا نام لکھا لیا اور عراق کو چلا گیا۔ ادہر باپ اور خاصکر بڈھے نابینا باپ کو فرمانبردار اور خدمتگزار بیٹے کے چلے جانے سے بڑی بے قراری ہوئی۔ خلیفۂ وقت حضرت عمر کے پاس آکر روئے اور درخواست کی کہ کلاب کو واپس بلا دیجئے۔ چند اشعار بھی انکو سنائے جو اسقدر دردناک تھے کہ حضرت عمر آبدیدہ ہوگئے۔ آخر میں یہ دھمکی بھی تھی کہ اگر نہ بلایا تو بددعا کروں گا۔

حضرت عمرؓ نے ابو موسیٰ کو فوراً حکم بھیجا کہ کلاب کو واپس کردو۔ جب وہ آئے تو پہلے خلیفہ ہی کے پاس حاضر ہوئے۔ انہوں نے پوچھا کہ تم اپنے باپ کی کیا خدمت کرتے تھے کہ وہ تمہارے لئے اسقدر بیتاب ہیں۔ کہا کہ میں ہی انکے سارے کاموں کا کفیل تھا اور جب وہ پینے کے لئے دودھ مانگتے تھے تو سب سے بہتر اونٹنی کو منتخب کرکے اس کے تھن کو پانی سے دہوتا کہ دودھ ٹھنڈا ہو جائے پھر نکالکر لاتا اور پلاتا تھا۔

حضرت عمرؓ نے امیہ کو بلایا پوچھا کہ کیا حال ہے؟ بولے کہ بس آرزو یہی ہے کہ کلاب کو پاؤں جگر سے لگاؤں اور سونگھوں [۱]

حضرت عمرؓ نے کلاب کو اشارہ کیا۔ وہ اسی طریقہ سے اونٹنی کا دودھ نکالکر لائے جس طریقہ سے باپ کیلئے نکالا کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے اسکو امیہ کے ہاتھ میں دیا۔ انہوں نے منہ سے لگایا تو کہا کہ واللہ اس پیالہ سے مجھے کلاب کے ہاتھوں کی مہک آتی ہے۔

فرط رقت سے حضرت عمرؓ اور حاضرین کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ پھر انہوں نے کلاب کو ملادیا وہ لپٹ گئے۔ اور بیٹے کو لیکر گھر آئے۔ حضرت عمرؓ نے کلاب سے کہا کہ تم اپنے والدین کی خدمت ہی کو جہاد سمجھو۔ چنانچہ ان دونوں کی زندگی تک وہ کسی جنگ میں شامل نہ ہوسکے۔

صحابۂ کرام میں سے صرف انہیں حضرات کے حالات ملے یقیناً اور لوگ بھی ہونگے ا ر ہم نے استیعاب کی کوشش بھی نہیں کی۔

زمانہ مابعد میں تاریخ اسلام میں نابیناؤں کی ایک کثیر تعداد ملتی ہے۔ مگر ان میں سے دشاہوں۔ شاہزادوں۔ امرا اور وزرا کے حالات میں کوئی خاص دلکشی مجھکو نظر نہیں تی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اندھا ہونے یا کردئے جانیکے بعد اس گروہ کو اپنی گذشتہ عزت و شوکت اور دولت و راحت کا اس قدر رنج و غم رہتا تھا کہ ساری انسانی خوبیاں اور طبعی

---

[۱] عرب اپنے بچوں کو سونگھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ کو اپنی ریحانہ فرمایا۔

لطافتیں جاتی رہتی تھیں اور خوش مزاجی انکے پاس بھی نہیں پھٹکتی تھی۔ اس لئے انکے خشک تذکرہ کو چھوڑ دینا پڑا۔

مفسرین و محدثین علما و فقہا مصنفین و مؤلفین اور ادبا و شعرا کا بھی بڑا گروہ ہے لیکن ان میں سے بھی ہم صرف اُن بعض کے حالات لکھتے ہیں جنکی زندگی میں کوئی تاریخی دلچسپی یا ادبی لطافت ہے۔

(۱) عبدالصمد بن علی۔ انکے باپ۔ دادا۔ پردادا۔ اور سکڑ دادا سب آخر میں نابینا ہوگئے تھے پھر یہ کیسے بچتے۔ انکی تاریخ اعجوبہ روزگار ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ انکی ولادت اور انکے بھائی محمد بن علی اولین خلیفہ عباسی سفاح کے باپ کی ولادت میں پورے ۴۴ سال کا فصل ہے یہ ۱۰۴ھ میں پیدا ہوئے تھے اور محمد مذکور ۶۰ھ میں۔ پھر محمد نے ۱۲۶ھ میں وفات پائی اور عبدالصمد نے ۱۸۵ھ میں دونوں کی وفات میں ۵۹ سال کا فرق ہے۔ اسقدر بُعد زمانی ایک ہی باپ کی دو اولاد میں مشکل سے مل سکتا ہے۔

دوسرا امر یہ ہے یزید بن معاویہ ۶۰ھ میں امیر الحج تھا اور عبدالصمد ۱۵۰ھ میں حالانکہ دونوں عبد مناف سے ایک ہی درجہ میں پڑتے ہیں۔ یعنی یزید بن معاویہ بن ابی سفیان بن حرب بن امیہ بن عبد شمس بن عبد مناف۔ اور عبدالصمد بن علی بن عبداللہ بن عباس بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد مناف۔

تیسری بات یہ ہے کہ پانچ عباسی خلفا سفاح۔ منصور۔ مہدی۔ ہادی اور ہارون الرشید کے زمانے دیکھے چنانچہ ایکبار ہارون کے دربار میں عجیب اجتماع تھا۔ خلیفہ کا چچا سلیمان موجود تھا۔ اور سلیمان کا چچا عباس اور عباس کے چچا عبدالصمد تھے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ خلاف معمول انکے دودھ ہی کے دانت آخر عمر تک رہے۔ دوسرے دانت نہیں نکلے۔

مہدی اور ہارون کے زمانوں میں دمشق اور مکہ وغیرہ مختلف امارتوں کے عہدوں

پر رہے۔ بنی عباس میں انکا خاص احترام تھا۔ بصرہ میں انتقال کیا۔

(۲) قتادہ بن دعامہ حفظ میں ضرب المثل تھے۔ جو بات سن لی کبھی نہ بھولے۔ روایت حدیث میں کسی شیخ سے کبھی یہ نہ کہا کہ دوبارہ فرمائیے۔ امام احمد بن حنبل نے انکی بہت مدح لکھی ہے۔ اور تفسیر اور اختلاف علما کا عالم اور فقیہ و حافظ حدیث تسلیم کیا ہے۔ انکے حافظہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ میں نے ایکبار صحیفۂ جابر انکے سامنے پڑھا وہ سارے کا سارا ان کو ازبر ہوگیا۔

یہ ائمہ تابعین مثلاً سعید بن المسیب اور امام شعبی وغیرہ کے شاگرد تھے۔ اور آپ سے کئی ارباب صحاح ستہ نے روایات لی ہیں۔ ۱۱۷ھ میں انتقال فرمایا۔ آنکھیں ایام طفلی ہی میں جا چکی تھیں۔

(۳) محمد بن حازم ابو معاویہ ۱۱۳ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ چار سال کی عمر میں بینائی سے محروم ہو گئے۔ امام اعمش کے پاس بیس سال رہے اور انہیں سے علم حدیث اخذ کیا۔ ہشام بن عروہ سے بھی روایت کرتے ہیں ائمہ حدیث مثلاً امام احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین وغیرہ نے ان سے روایت کی ہے۔ حافظ حدیث اور ثقہ تھے۔ اور بغداد میں بڑی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ ۱۹۴ھ میں وفات پائی۔ ہارون الرشید نے علویہ کی طرف سے اپنی سلطنت کیلیے خطرہ دیکھ کر ایک بار حکم دیا کہ جو شخص حضرت علی کی خلافت کو صحیح ثابت کرنیکی کوشش کرے گا میں اسکو قتل کر دوں گا۔ ابو معاویہ نے کہا کہ بنی تیم کے حضرت ابوبکر۔ بنی عدی کے حضرت عمر۔ بنی امیہ کے حضرت عثمان۔ پھر اگر حضرت علی خلیفہ نہ تسلیم کیے گئے تو خلافت راشدہ میں بنی ہاشم کا کوئی حصہ نہ ہوا۔ یہ سنکر ہارون سوچنے لگا۔ اس کے بعد کہا ٹھیک ٹھیک ہے اب سے جو کوئی حضرت علی کی خلافت کا منکر ہوگا اس کو قتل کی سزا دیجائیگی۔

(۴) ابو الحسن منصور بن اسمٰعیل ضریر۔ امام شافعی کے شاگردان خاص میں سے تھے۔ متعدد کتابیں

تصنیف کی ہیں۔ اہل مصر انکا بہت احترام کرتے تھے۔
ایک بار وہاں سخت قحط پڑا۔ فاقہ سے تنگ آکر انہوں نے اپنی چھت پر کھڑے ہو کر پکارا کہ لوگو! میری امداد کرو۔ تھوڑی دیر میں انکے دروازہ پر سیکڑوں اونٹ غلہ سے لدے ہوے آگئے۔
شعر بھی کہتے تھے۔ نہایت لطیف اور حکیمانہ۔
پہلے فوج میں ملازم تھے جب بصارت سے معذور ہو گئے تو تفقہ اختیار کیا۔ ۳۰۶ھ میں مصر میں گذر گئے۔

(۵) محمد بن ہذیل علاف بصری معتزلی۔ جماعت متکلمین میں ممتاز اور انکے ایک گروہ کا جو اسی کی نسبت سے ہذلی بولے جاتے ہیں امام ہے۔
جہم بن صفوان امام فرقہ جہمیہ جنت اور دوزخ کے فنا ہو جانے کا قائل ہے[۱]۔ علاف اس حد تک تو نہیں پہنچا۔ لیکن انکے ایک ہی حالت پر دوام کا وہ قائل نہیں ہے۔ بلکہ کہتا ہے کہ آخر میں اہل جنت پر ایک سکون امن طاری ہو جائیگا جس میں تمام لذتیں مجتمع ہونگی۔ اسی طرح اہل نار پر بھی ایک خمود ہوگا جس میں ہر قسم کے آلام ہونگے۔ مگر یہ ایسی بات ہے کہ قرآن کہیں اس کی تائید نہیں کرتا بخلاف جہم بن صفوان کے قول کے۔
خلیفہ مامون معتزلی اس کو بہت عزیز رکھتا تھا۔ ایک دن جب وہ دربار میں آیا تو آپ

---

[۱] بحث بہت لطیف ہے اگرچہ اسکی تفصیل کا یہ موقع نہیں تاہم ایک مختصر توضیح نامناسب نہ ہوگی۔ قرآن کریم میں جنت اور دوزخ دونوں کے لئے خلود اور ابدیت کا لفظ مستعمل ہوا ہے۔ اسوجہ سے اہل سنت تامتر انکے خالد و مخلد ہونیکے قائل ہیں لیکن جہم بن صفوان انکے خلود کو اسقدر دوامی نہیں مانتا جسقدر کہ انکے خلق کی سرمدیت ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک وقت انکا فنا ہو جانا لازمی ہے یعنی "کل شیئ ہالک الا وجہہ" میں شئے کے تحت میں وہ جنت و نار کو بھی مندرج سمجھتا ہے۔ سورہ ہود میں جنت و نار کی مدت خلود میں دونوں جگہ "الا ما شاء ربک" کا استثنا ہے جو اس کے قول کا موید ہے

حاجب سے پوچھا کہ دروازہ پر کون کون لوگ ہیں؟ اس نے کہا۔ علاف معتزلی۔ عبداللہ بن اباض خارجی اور ہشام بن کلبی رافضی
سنکر بولا تو پھر جہنم کے سارے سرغنے جمع ہیں۔
مسعودی نے مروج الذہب میں لکھا ہے کہ آخر عمر میں اسکی بصارت اور اس کے ساتھ بصیرت بھی جاتی رہی۔ لوگ کہتے تھے کہ سٹھیا گیا ہے۔ ۲۲۷ھ میں مرگیا۔
یہاں اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ مسلمانوں کے ہر طبقہ میں ایسے لوگ ملتے ہیں جنکی عقلیں کبر سنی میں ماری پڑیں۔ بجز محدثین کی جماعت کے حالانکہ سب سے زیادہ طویل عمریں انہیں لوگوں نے پائیں۔ میرے خیال میں یہ اس تقویٰ اور ورع کا اثر تھا جو حدیث کے علم و عمل سے ان میں پیدا ہو جاتا تھا۔

(۶) عبداللہ بن محمد شافعی۔ سلطان نور الدین زنگی شہید نیز سلطان صلاح الدین ایوبی دونوں کے درباروں میں بڑی عزت رکھتے تھے۔ اور چونکہ یہ دونوں شافعی تھے اس وجہ سے امام مذکور انکے عہد میں صاحب فتویٰ اور قاضی القضاۃ تھے۔ متعدد تصانیف چھوڑی ہیں جو شافعیہ میں مقبول ہیں۔ ۵۸۵ھ میں مرے۔
آخر عمر میں نابینا ہو گئے تھے۔ اسوقت ایک رسالہ اس امر کے اثبات میں لکھا کہ اندھا شخص قاضی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ سلطان صلاح الدین نے انہیں کے فتوے کے مطابق ان کو انکے منصب پر بحال رہنے دیا۔ لیکن دوسرے لوگوں نے اس مسئلہ میں ان سے اختلاف کیا ہے اور عام طور پر اہل علم اسی بات کے قائل ہیں کہ نابینا کو قاضی نہیں ہونا چاہئے۔ کیونکہ وہ فریقین نیز گواہوں کی شناخت میں غلطی کر سکتا ہے۔

(۷) شافع بن علی بن عباس بن اسمٰعیل بن عساکر عسقلانی۔ دیار مصریہ کے میر منشی اور علم و ادب میں صاحب کمال تھے۔ صلاح الدین صفدی نے تاریخ اور علوم عربیہ میں انکی تقریباً ۵۰ تصنیفات نام بنام گنائی ہیں۔ ایک دیوان شعر بھی ہے۔

جنگ حمص میں کان کی جڑ میں ایک تیر لگا تھا۔ اسی سے آنکھیں جاتی رہیں۔ اس کے بعد سے خانہ نشین ہو گئے۔ کتابوں کے بڑے شایق تھے۔ ۱۸ الماریاں ان سے بھری ہوئی رکھتے تھے اور اپنے مصاحبین اور شاگردوں سے پڑھوا کر سنا کرتے تھے جب ان میں سے کوئی کتاب ہاتھ میں لیتے تو بتا دیتے کہ یہ فلاں کتاب ہے جو فلاں زمانہ میں میں نے فلاں شخص سے اس قیمت پر خریدی تھی بسنہ ۳۰۷ھ میں انتقال کیا۔

(۸) علی بن احمد آمدی۔ یہ بھی بڑے ادیب۔ فاضل اور کتب کے عاشق تھے۔ اور فن تعبیر خواب کے امام۔ جواہر التبصیر فی علم التعبیر انکی مشہور تصنیف ہے کتابوں کی تجارت کرتے تھے اور اپنے کتب خانہ کے ایک ایک نسخہ سے واقف تھے۔ جب ضرورت پڑتی تو خود نکالکر لاتے اگر کسی کتاب کی متعدد جلدیں ہوتیں اور ایک خاص جلد درکار ہوتی تو اسی پر انکا ہاتھ پڑتا تھا۔

ہلاکو خاں کا پڑپوتا سلطان غازان خاں جو مسلمان ہو گیا تھا جب بغداد میں مدرسہ مستنصریہ کو دیکھنے کے لئے آنے والا تھا تو اس کی خوب آرائش کی گئی تھی علما اپنے اپنے مسندوں پر بیٹھے تھے۔ اعیان واکابر بغداد بھی سلطان کے استقبال کے لئے بلائے گئے تھے جن میں علی آمدی بھی تھے۔

جب سلطان آیا تو اس کے ساتھ کے مغولی امرا سب ان سے مصافحہ کر کر کے گذرتے گئے لیکن یہ کسی کے لئے تعظیماً کھڑے نہیں ہوئے۔ مگر جس وقت سلطان نے ہاتھ ملایا تو بلا تابائے ہوئے سروقد کھڑے ہو گئے اور ترکی۔ فارسی اور عربی زبانوں میں اس کو دعائیں دیں۔ اسکو انکی فراست اور لیاقت پر تعجب ہوا۔ اور یہ معلوم کر کے اور بھی خوش ہوا کہ یہ رومی زبان بھی بے تکلف بولتے ہیں۔ خلعت اور انعام عطا فرمایا اور تین سو درہم ماہانہ گزارہ کے لئے مقرر کر دیا۔ بغداد کے علما اور رؤسا نیز خوانین مغول سب ان کی عزت کرتے تھے۔ باوجود فراغت کے بھی یہ دن رات اپنے تجارتی

شاغل میں مصروف رہتے تھے ۱۷۰ھ میں فوت ہوئے۔

(۹) یعقوب بن داؤد خلیفہ مہدی کا مشہور وزیر جو وزارت نہیں بلکہ خلافت کرتا تھا۔ دشمنوں نے مہدی کے کان میں پھونکدیا کہ یہ علویہ کی طرف میلان رکھتا ہے۔ اُس نے اس کو ایک حسین وجمیل کنیز عطا کی جسکو نہایت خوش ہو کر یہ اپنے گھرلے آیا۔ دوسرے دن جب دربار میں گیا تو مہدی نے تنہائی میں لیجا کر کہا کہ میرا ایک ضروری کام ہے وہ کردو۔ اس نے کہا کہ میں تو حضور کا غلام ہوں جو حکم ہوگا بجالاؤں گا۔ کہا کہ نہیں میرے سر پر ہاتھ رکھکر قسم کھاؤ۔ اس نے قسم کھائی۔ فرمایا کہ فلاں علوی کی طرف سے مجھے خطرہ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اسکا خاتمہ کردو۔ بولا کہ یہ کونسی بڑی بات ہے۔ اپنے گھر آکر رات کو اس علوی کو بلایا اور کہا کہ میں تمکو قتل کروں گا۔ اس نے جواب دیا کہ میں بے بس ہوں اور آپ صاحب اختیار جو چاہیں کرسکتے ہیں۔ لیکن یہ سوچ لیجئے کہ رسول اللہ کی اولاد کا خون کرکے قیامت میں اللہ تعالیٰ کو کیا جواب دینگے۔

یعقوب پر اس بات کا اثر ہوا۔ اس نے کہا اچھا مناسب یہ ہے کہ تم راتوں رات یہاں سے غائب ہوجاؤ۔ تاکہ خلیفہ کو میں مطمئن کرسکوں۔ وہ علوی نکل گیا۔ ادہر کنیز نے فوراً خلیفہ کو پرچہ بھیجکر اس کیفیت سے آگاہ کیا۔ اُس نے سوار دوڑائے جو علوی کو گرفتار کرلائے اور محل کے ایک حجرہ میں بند کردیا۔

صبح کو حسب معمول جب وزیر یعقوب وہاں پہنچا تو خلیفہ نے اس سے پوچھا کہ تم نے کیا کیا کہا حکم کی تعمیل کردی۔ بولا کہ میرے سر پر ہاتھ رکھکر قسم کھاؤ۔ اس نے یہ بھی کیا۔ مہدی نے اشارہ کیا۔ خدام نے علوی کو سامنے لاکر کھڑا کردیا۔ یعقوب مبہوت رہ گیا۔ مہدی نے کہا کہ اب تمہارا خون میرے لئے حلال ہے۔ لیکن مجھے قتل کی عادت نہیں ہے اس لئے حکم دیتا ہوں کہ تم تہ خانے میں قید کردیے جاؤ۔

پندرہ سال تک یعقوب ایک تہ خانے میں بند رہا۔ اس کے بعد ہارون کے عہد میں اسکے

حکم سے آزاد کیا گیا جب دربار میں سلام کے لئے حاضر ہوا تو ہارون نے کہا کہ میں نے اپنے
ایک بچہ کو کل گود میں اٹھا لیا تھا اس وقت مجھکو یاد آگیا کہ بچپن میں تم مجھکو اسی طرح گود میں کھلایا
کرتے تھے اس لئے میں نے تم کو رہا کیا اب تمہارا گذارہ مقرر کرتا ہوں جہاں چاہو رہو۔
اس نے مکہ مکرمہ میں اقامت اختیار کی۔ وہیں ۱۸۰ھ میں گذر گیا۔

(۱۰) بشار بن برد۔ مادرزاد اندھا۔ عربی کا نامور شاعر۔ ہزاروں قصیدے لکھے۔ جن میں سے
اکثر ہجویں تھے۔ کہا کرتا تھا کہ پہلے میں نے جریر کی ہجو لکھی تھی مگر اس نے کمسن سمجھکر میری
طرف توجہ نہ کی ورنہ فرزدق کی جگہ میں لیتا۔
ایک بار مہدی کی تعریف میں قصیدہ کہا۔ اس نے التفات نہ فرمایا اس پر اسکی ہجو کہی وزیر
یعقوب بن داؤد نے خلیفہ کو سنایا وہ سخت برہم ہوا۔ چنانچہ جب بصرہ میں آیا تو
بشار کو گرفتار کرکے شراب خواری کے الزام میں اسقدر پٹوایا کہ وہ تلف ہوگیا۔ یہ واقعہ
۱۶۸ھ میں ہوا۔
بشار ایک بار گلی سے نکلکر جب سڑک پر پہنچا تو کسی نے کہا کہ ذرا رک جاؤ بڑا اژدہام ہے
لوگ ایک جنازہ بڑی تیزی سے لئے جا رہے ہیں۔ بولا کہ کیا کہیں سے چرا کر بھاگے جاتے
ہیں؟"۔
اس کے غلام نے ایک بار حساب پیش کیا جس میں دس درہم آئینہ کی جلا کی اجرت بھی
درج تھی۔ کہنے لگا کہ عجیب!! اندھا اور آئینہ کی جلا کی اجرت!! واللہ اگر سورج بھی زنگار
ہوجائے اور اسکی صیقل کی اجرت دس درہم مجھسے مانگی جائے تو میں نہیں دونگا۔

(۱۱) ابن علاف ضریر شاعر۔ خلیفہ معتضد کا ندیم تھا۔ اس نے ایک بلی پالی تھی جو ہمسایوں کے کبوتر
کھا جاتی تھی۔ ایک دن کسی نے اسے مار کر پھینکدیا۔ اس کا مرثیہ لکھا اور دلچسپ لکھا۔ بعض
لوگ کہتے ہیں کہ بلی کا نہیں بلکہ وزیر ابن فرات کا نوحہ ہے جو خلیفہ مقتدر کے حکم سے قیدخانہ
میں مارا گیا تھا۔ خوف کی وجہ سے اس نے بلی سے تعریض کی اور نام نہ لے سکا۔

(۱۲) ربیعہ بن ثابت۔ اندہا خوشگو شاعر۔ خلیفہ مہدی کا مداح تھا۔
ایکبار عباس کی مدح میں جو خلیفہ سفاح کا بھائی تھا نہایت بلیغ قصیدہ سنایا اس نے
صرف دو دینار انعام دیا۔ ربیعہ نے ناراض ہوکر ہجو کہی۔
عباس خلفاء عباسیہ کا بزرگ تھا اور دربار میں اس کی بڑی عزت تھی۔ غضبناک ہوکر
ہارون الرشید کے پاس جو اس وقت خلیفہ تھا پہنچا اور ربیعہ کی شکایت کی۔ اس نے
فوراً ربیعہ کو بلوایا اور چاہا کہ قتل کردے۔ ربیعہ نے کہا کہ پہلے قصیدہ تو دیکھ لیا جائے۔
کہا کہ سناؤ۔ جب سنا تو بہت پسند کیا۔ پھر پوچھا کہ اسکا تم کو کیا صلہ ملا۔ اس نے کہا کہ
دو دینار۔ یہ سنکر وہ عباس کی طرف مخاطب ہوا اور کہا کہ اس کا نہیں بلکہ یہ آپ کا
قصور تھا۔ پھر ربیعہ کو تیس ہزار درہم عطا کئے۔ اور کہا کہ خبردار ابھی اپنے اشعار میں
انکا ذکر نہ تصریحاً کرنا نہ تعریضاً۔

(۱۳) علامہ ابوالبقاء عکبری۔ بچپن میں چیچک نکلی تھی اسی میں آنکھیں جاتی رہیں۔ حافظہ نہایت
قوی تھا۔ تحصیل علوم کرکے مختلف فنون میں امام وقت ہوگئے۔ تفسیر۔ حدیث۔ فقہ۔ فرائض
حساب منطق۔ ادب۔ نحو اور لغت میں متعدد کتابیں املا کرائیں جس فن میں کچھ لکھنا ہوتا
تھا۔ پہلے اس فن کی کتابیں پڑھواکر سنتے پھر لکھتے بیشتر انکی بیوی انکو پڑھکر سناتیں۔
دیوان حماسہ اور مقامات حریری کی بھی شرحیں لکھوائی تھیں۔ مگر حماسہ کی شرح میں تبریزی
اور مقامات کی شرح میں سریشی ان سے بڑھ گئے۔ لیکن دیوان متنبی کو جو شرح کی تھی اس
میں کوئی ان سے فوقیت نہ لیجا سکا۔ چنانچہ وہی آجتک متداول اور مقبول ہے۔
۶۱۶ھ میں وفات پائی۔

(۱۴) عبدالرحمٰن سہیلی اندلسی متوفی ۵۸۱ھ سیرۃ ابن ہشام کی مشہور شرح۔ روض الانف کے
مصنف سیرت اور عربیت میں امام وقت تھے۔ تفسیر۔ ادب اور تاریخ میں کئی تصنیفیں
چھوڑی ہیں۔

روض الانف میں سوا سو کتابوں سے زیادہ سے مدد لی ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ بڑی معلومات فراہم کی ہیں۔ ۱۷ سال کی عمر میں نابینا ہو گئے تھے۔
جب انکے کمال کا شہرہ ہوا تو مراکش میں قضا کے عہدہ پر بلوائے گئے۔ وہاں عزت کے ساتھ زندگی گزاری۔

(۱۵) علوک شاعر متوفی ۲۱۳ھ۔ پیدائشی اندھا اور مبروص تھا۔ امیر ابو دلف کی شان میں ایک قصیدہ کہا جو اپنی خوبی کی وجہ سے بغداد میں بہت مقبول ہوا۔ مامون کا عہد تھا اس کا استبداد یہ گوارا نہ کر سکا کہ اس کے ایک خادم کی ایسی بلند رتبہ مدح کیجائے۔ علوک گرفتار کرایا۔ اور اس الزام پر کہ اس نے اپنے قصیدہ میں بعض ان صفتوں کو جو خالق کے ساتھ مخصوص ہیں مثلاً زمانہ پر اختیار اور حکومت ایک مخلوق کی طرف منسوب کیا ہے۔ حکم دیا کہ زبان گدی سے کھینچ لی جائے۔ اسی میں مر گیا۔
بعضوں نے کہا ہے کہ اگر یہی قصیدہ اس نے خود مامون کی ستائش میں لکھا ہوتا تو کوئی سزا نہ پاتا بلکہ صلہ ملتا۔

(۱۶) مؤمل کوفی متوفی ۱۹۰ھ۔ جوانی میں نابینا ہو گیا طبیعت رسا رکھتا تھا۔ شعر گوئی شروع کی۔ ایکبار خلیفہ ابو جعفر منصور کے ولی عہد مہدی کی مدح میں قصیدہ کہکر سنایا۔ اس نے بیس ہزار درہم انعام عطا کیا۔ منصور نے جب سنا تو کہا کہ اس قدر فضول خرچی! فوراً پکڑ کر اس سے وہ رقم واپس لیلی اور کہا کہ اس بھولے لڑکے کو تو نے جا کر دھوکا دیا وہ تیرے دام فریب میں آ گیا۔
لیکن جب وہ قصیدہ سنا تو پسند کیا اور باوجود اپنی جزرسی کے حکم دیا کہ ربیع اسے کو چار ہزار درہم دیدو۔ بقیہ بیت المال میں جمع کر دو
جب مہدی کا دور خلافت آیا تو مؤمل نے یہ سارا واقعہ لکھوا کر بھیجا وہ بہت ہنسا اور اسکو رقم واپس دلا دی۔

(۱۷) ابو العیناء مشہور ادیب اور مورخ - نہایت ظریف الطبع خلیفہ متوکل کا ندیم تھا -
اس کے بے شمار لطائف کتب محاضرات میں منقول ہیں لیکن اکثر فحش ہیں اس وجہ
سے ترک کرنے پڑے - بقیہ میں سے بڑا حصہ اس زمانہ کے امرار اور اعیان کی ذات
سے متعلق ہے جنکو ناظرین کو سمجھانے کے لئے اس عہد کے ہنگامی حالات اور امرار
کے باہمی تعلقات پر اسقدر حاشیہ لکھنا پڑتا کہ یہ مختصر مضمون انکا متحمل نہ ہوسکتا - لہذا صرف
چند نوادر پر اکتفا کرنا پڑا -

ایکبار کسی رئیس نے اس سے وعدہ کیا کہ میں سواری کیلئے ایک خچر تم کو دونگا - کئی روز
گزر گئے لیکن خچر نہ آیا - ایکدن راستہ میں ملاقات ہوگئی - اس رئیس نے سلام کیا اور خیریت
پوچھی - جواب دیا کہ خیریت ہی مگر بغیر خچر کے - وہ ہنسا اور گھر پہنچکر فوراً بھیجدیا -

امیر صاعد اسلام لانیکے بعد وزیر مقرر ہوا - ابو العیناء اس سے ملنے گیا - معلوم ہوا کہ
ابھی نماز میں مصروف ہی تھوڑی دیر انتظار کیا پھر پوچھا - حاجب نے کہا کہ ابھی فارغ
نہیں ہوئے - کہا کہ ہاں کل جدید لذیذ" نیا نیا مسلمان ہوا ہے نماز کی لذت لے رہا ہے -

ابو محمد ادیب سے خشمک تھی - ایک دن اس کے دروازہ پر سے گذرا - سرسری طور
پر اسکا حال بھی پوچھ لیا - لوگوں نے کہا کہ آپکے حسب نشا ہے - بولا کہ تو پھر میں
رونے اور چیخنے کی آواز کیوں نہیں سنتا -

نجاح بن سلمہ وزیر مال کو غبن کے جرم میں خلیفہ نے موسیٰ بن عبدالملک کے حوالہ کیا کہ
اس سے رقم مطلوبہ وصول کرے - موسیٰ نے اسقدر سخت شکنجہ میں کھینچا کہ نجاح ہلاک
ہوگیا - ابو العیناء سے کسی نے نجاح کا حال پوچھا تو کہا "فوکزہ موسیٰ فقضٰی علیہ" -

دوسرے دن موسیٰ نے اس سے تہدید آمیز لہجہ میں کہا کہ میرے بارے میں اگر کچھ
کہوگے تو سیدھا کر دونگا - ابو العیناء نے جواب دیا "اتریدان تقتلنی کما قتلت
نفساً بالامس"

علی بن جہم معتزلی نے ایک دن مجلس بحث و مناظرہ میں اس کو مخنث کہدیا۔ اس نے یہ آیت پڑھی وَضَرَبَ لَنَا مَثَلاً وَنَسِیَ خَلْقَہ

متوکل کے دربار میں ایکدن امیر سعید بن عبد الملک ابو العینا۔ کی طرف دیکھکر کسی بات پر مسکرایا۔ خلیفہ نے کہا کہ ابو العینا، یہ کیا بات ہے کہ لوگ تمکو دیکھکر ہنستے ہیں فوراً کہا "اِنَّ الَّذِیْنَ اَجْرَمُوْا کَانُوْا مِنَ الَّذِیْنَ آمَنُوْا یَضْحَکُوْنَ "۔

ابن مکرم وزیر کے یہاں دعوت تھی۔ تین بار ابو العینا، کو پانی ٹھنڈا ملا۔ چوتھی بار گرم بولا کہ شاید تمہاری صراحی کو چوتھیا کا بخار آیا کرتا ہے۔

ایک بار ایک گلی سے گذرا غلام نے کہا کہ ایک بکری کا بچہ بڑا فربہ ہے۔ کہا دیکھو گلی میں کوئی ہے تو نہیں۔ اس نے کہا کہ نہیں۔ حکم دیا کہ پکڑ لو۔ پھر چادر میں لپیٹ کر بغل میں دبالیا۔ اور گھر لاکر ذبح کرکے کھاگیا۔

دوسرے دن اس محلہ کے رئیس کا ایک رقعہ پہنچا کہ کل سے ہمارا بزغالہ غائب ہے۔ یہاں کے بچے کہتے ہیں کہ آپ پکڑ کرلے گئے۔ لہذا حامل عریضہ کے ہاتھ واپس بھیجدیجئے۔ جواب لکھوایا کہ میرے محلہ کے بڑے بوڑھے آپ کے حق میں کہا کرتے ہیں کہ مابون ہے اور کذاب۔ مگر میں نے ہمیشہ انکی تکذیب کی۔ تعجب ہے کہ ایک حقیر جانور کے متعلق آپ میرے بارے میں اپنی گلی کے بچوں کی تصدیق کرتے ہیں۔ وہ خفیف ہوکر چپکا بیٹھ رہا۔

ایک دن متوکل کے دسترخوان پر کھانا کھانے بیٹھا۔ کسی نے اس کے آگے سے شوربہ کا پیالہ اٹھاکر سرکہ کی پیالی رکھدی۔ جب لقمہ کھایا تو ترشی کی وجہ سے چہرہ ایسا بگاڑا جس کو دیکھکر سب لوگ ہنس پڑے۔ کہنے لگا کہ امیر المومنین میں معذور ہوں۔ معاذ اللہ غضب کی ترشی ہے کہ قلب سے ایمان کی حلاوت تک مٹ گئی۔

باپ کی طرف التفات کم کرتا تھا۔ اس نے کہا کہ دیکھو اللہ تعالیٰ نے اپنے شکر کے ساتھ والدین کا شکر بھی انسان پر فرض کیا ہے اور فرمایا ہے "اَنِ اشْکُرْلِیْ وَلِوَالِدَیْکَ "

کہا کہ بے شک۔ مگر اولاد کے حق میں والدین کی امانت پر اعتماد نہیں کیا اس لئے فرمایا "لاَ تقتلوُا اولاَ دُ کمُ الا یہ" بخلاف اس کے اولاد پر والدین کے بارے میں پورا اطمینان تھا اس وجہ سے انکو اس قسم کا حکم دینے کی ضرورت نہ سمجھی۔

ابن طوق ایک متکبر مگر نہایت کم عقل رئیس تھا۔ کسی نے ابوالضیاء سے اس کی بابت پوچھا۔ کہا کہ اگر بنی اسرائیل میں یہ اسوقت ہوتا جب انکو گائے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تو یقیناً وہ اسی کو ذبح کرتے۔

۲۸۲ھ میں بغداد میں مرا۔

(۱۸) ابوالعلاء معری۔ ذہن و ذکا اور حافظہ میں اعجوبۂ روزگار تھا۔ اور شعر و ادب اور عربیت میں یگانۂ دہر۔ شعرا میں متنبی کا بہت قائل تھا۔ اور اسکو بشار۔ ابو نواس بلکہ ابو تمام پر بھی ترجیح دیتا تھا۔ شریف مرتضیٰ اس کے برخلاف متنبی کو ناپسند کرتے تھے۔ یہ ان کی محفل میں جایا کرتا تھا۔ ایک دن اسکے سامنے انہوں نے متنبی کے کلام کے عیوب چن چنکر بیان کرنے شروع کئے۔ ابوالعلاء نے کہا کہ اگر اس نے بجز اس قصیدہ کے جس کا پہلا مصرعہ یہ ہے۔

لک یا منازل فی القلوب منازل

اور کچھ نہ کہا ہوتا تو یہی اسکی فضیلت کے لئے کافی ہوتا۔ شریف مرتضےٰ نے غضبناک ہو کر اسی وقت اس کو مجلس سے نکلوا دیا۔ پھر لوگوں سے بولے کہ اندھے کا مطلب بھی تم سمجھے۔ متنبی کے اس قصیدہ میں ایک شعر یہ ہے ؎

فاذا اتتک مذمتی من ناقص   فہی الشہادۃ لی بانی کامل

جب کوئی ناقص آدمی میری مذمت کرے تو یہی میرے کامل ہونے کا ثبوت ہے۔

اُس کا اشارہ اسی کی طرف تھا۔

ابوالعلاء نے آغاز جوانی میں طرابلس شام میں تحصیل علم کی۔ پھر لاذقیہ میں آیا۔ وہاں کے

راہب کی صحبت میں جو فلسفیانہ خیالات سے آشنا تھا کچھ دن گزارے جس کے اثر سے عقائد اسلامیہ میں اس کو شکوک پڑ گئے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے کلام سے جا بجا الحاد ٹپکتا ہے چنانچہ بہت سے لوگ ہیں جو اسے زندیق سمجھتے ہیں۔ اور کم ہیں جو اس کے الحاد میں شک کرتے ہیں۔ اور یہ مسئلہ ایک مابہ النزاع مسئلہ ہو گیا ہے۔ میرا خیال تھا کہ اسکے مذہب کے متعلق ایک فیصلہ کن بحث لکھدوں لیکن مجھے اس کی دینی منزلت اس قابل نہ معلوم ہوئی اور حقیقت یہ ہے کہ اس کے الحاد میں بحث کی گنجایش بھی کم ہے [1]

وہ اپنے اشعار میں اسلامی عقائد یا نقلی مسائل پر جو اعتراض کرتا ہے وہ نہایت سفیہانہ ہوتے ہیں۔ مثلاً۔

ید بخمس مئین عسجد و دیت   ما بالها قطعت فی نصف دینار

یعنی وہ ہاتھ جس کی دیت پانچ سو دینار زر سرخ ہے محض نصف دینار کی چوری میں کیوں کاٹ لیا جاتا ہے۔ یاقوت رومی نے لکھا ہے کہ یہ شخص فقاہت سے کسقدر نابلد ہے کہ اتنا نہیں سمجھتا کہ اگر ہاتھ پانسو دینار سے کم پر نہ قطع کیا جائے تو سرقہ کی وارداتیں بڑھ جائیں اور دیت اگر نصف دینار رہو تو لوگ کثرت سے اپنے دشمنوں کا ہاتھ کاٹ لیا کریں۔

حال میں جامعہ مصریہ کے استاد ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے جو وہاں جمیعتہ الحاد و زندقہ کے روح رواں ہیں اسکو بطل الحاد قرار دیکر اس کے کارناموں کو چمکانے اور فروغ دینے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ اسکے ایک رفیق کار حسن گیلانی نے اس کے رسالہ غفران

---

[1] ناصر خسرو علوی مشہور سیاح اس کے زمانہ میں معرۃ النعمان میں گیا تھا۔ اس کے بیان سے بھی جو اس نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ راہبانہ اور فلسفیانہ زندگی گذارتا تھا۔

کو جو شیخ ابن القارح کے جواب میں ہے اور جس میں جنت اور دوزخ کا مذاق اڑایا
گیا ہے نہایت آب و تاب سے شائع کیا ہے اور اس کے ملحدانہ مضامین کی
مدح سرائی کرتے ہوئے نعوذ باللہ اس کو قرآن کے ہمسر بنانا چاہا ہے۔ علماء نے برافروختہ
ہو کر عدالت میں چارہ جوئی کر دی ہے۔ اور مقدمہ چل رہا ہے۔

معری نے سنہ ۴۴۹ھ میں وفات پائی۔ تین سال کی عمر میں چیچک میں آنکھیں ضائع
ہوئی تھیں۔ کہا کرتا تھا کہ مجھکو سوائے سرخ رنگ کے اور کوئی رنگ یاد نہیں ہے
کیونکہ بیماری کے زمانہ میں اسی رنگ کا کپڑا میرے بدن پر ڈالا جاتا تھا۔

ہندوستان کی زراعتی کمزوریاں

(۲)

ہندوستان کا مقروض کاشتکار

ہندوستان کی زراعتی کمزوریوں کے عنوان سے ہم نے جو سلسلۂ مضامین شروع کیا تھا اس کے پہلے نمبر میں ہم ہندوستانی زراعت کے اہم ترین عامل پیدائش یعنی "زمین" کی حالت پر غور کر چکے ہیں۔ آج کے اس مضمون میں ایک دوسرے عامل پیدائش یعنی اصل کے لحاظ سے ہندوستانی کاشتکار کی جو حالت ہے اسکا ذکر ہوگا۔

ہندوستانی کاشتکار کا افلاس اور اسکے اصل کی کمی ضرب المثل ہے۔ اس کے اصل کی کمی کا اندازہ کرنیکے لئے بہت سے اعداد و شمار پیش کرنیکی چنداں ضرورت نہیں۔ اس کی ظاہری حالت ہی پر اگر ہم ایک سرسری نگاہ ڈالیں تو اسکا صحیح اندازہ ہوسکتا ہے۔ آبپاشی کے لئے کنواں کھودنا۔ ضروری آلات کا مثلاً ہل، کھرپا، کدالی، پھاوڑا وغیرہ مہیا کرنا، مویشی اور انکے چارے کا انتظام اور کھاد کی فراہمی یہی وہ مدات ہیں جن میں ہندوستانی کاشتکار عموماً اپنا اصل صرف کرتا ہے۔ جن صوبوں میں نہروں کی قلت ہے وہاں زیادہ تر کنووں سے آبپاشی کا کام لیا جاتا ہے، اور نسبتاً ہندوستانی کاشتکار اس مد پر بہت زیادہ اصل صرف کرتا ہے۔ اس کے آلات کار مثلاً ہل، کدالی، کھرپا، وغیرہ بہت ہی معمولی قسم کے اور کم قیمت ہوتے ہیں۔ خراب ہونیکی صورت میں انکی مرمت بھی بآسانی کیجا سکتی ہے۔ چونکہ ابھی مشینوں سے زراعت میں بہت کم کام لیا جاتا ہے۔ اس لئے کاشتکار کو مویشیوں کا انتظام کرنا پڑتا ہے ساتھ ہی ساتھ انکے چارے کا انتظام بھی ضروری ہے خود کاشتکار کے لئے اچھی غذا کی جتنی ضرورت ہے اتنی ہی اسکی زمین کے لئے اچھے کھاد کی مناسب مقدار کی ضرورت ہوتی ہے

کیونکہ بلا کھاد کے زمین کی پیدا آوری برقرار نہیں رہ سکتی۔ لیکن جب غریب کاشت کار کو خود ہی فاقہ کشی کرنا پڑے تو وہ ان مدات میں گو وہ لاکھ ضروری ہی کہاں سے اور کس طرح خرچ کر سکتا ہے۔ پھر بھی چونکہ اس کی گذر اسی پر ہے وہ کسی نہ کسی طرح ان مدات پر تھوڑا بہت خرچ کر ہی لیتا ہے۔ البتہ اپنے ذاتی اصل کی عدم موجودگی میں اسے ساہوکار کا سہارا ڈھونڈنا پڑتا ہے اور وہ قرض پر اپنا کام چلاتا ہے۔

دنیا کی زرعی تاریخ کا اگر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ کاشتکار کے لئے قرض لینے کی ضرورت ہمیشہ سے رہی ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔ خاصکر ہندوستان جیسے ملک میں جہاں کاشتکار کی زندگی کا دارومدار بارش پر ہو اور جہاں آبادی نہایت تیزی سے بڑھ رہی ہو اور زمین کی پیدا آوری اس نسبت سے کم ہو رہی ہو کاشتکار کے لئے قرض لینا اور بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ ہندوستانی کاشتکار کے متعلق بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ قرض کی ایک مقدار ورثے میں پاتا ہے۔ اپنی حین حیات میں اس میں برابر اضافہ کرتا رہتا ہے اور مرنے پر خود جتنا قرض ورثے میں پایا تھا اس سے کہیں زیادہ اپنے وارثوں کو سونپ جاتا ہے ہندوستانی کاشتکار کے قرضہ کے متعلق قابل اعتماد اعداد و شمار ابھی مہیا نہیں ہوئے ہیں پھر بھی اس کی قرض گیری کا اندازہ لگانیکے لئے ذیل کی تفصیل کافی ہو گی۔

۱۸۷۵ء کے قحط کمیشن نے دکن کے ۱۲ گانوؤں کی تحقیقات سے یہ اندازہ لگایا تھا کہ کاشتکاروں کی کل تعداد کا ⅓ حصہ بہت زیادہ مقروض تھا۔ انکے قرض کی مقدار انکی سالانہ مالگذاری کی مقدار سے ۱۸ گنی تھی۔ اور اس قرض کا ⅔ حصہ انہوں نے جائدادیں رہن رکھ کر حاصل کیا تھا۔

احمدنگر کے ضلع کے ۸ گانوؤں میں ۴۲ فیصدی کاشتکاروں کے قرض کی مقدار ان کی سالانہ مالگذاری سے ۱۵ گنی تھی۔ اور بعض بدبختوں کا تو یہ حال تھا کہ انکا قرض سالانہ مالگذاری سے ۵۴ گنا تھا۔ زمین کا ⅛ حصہ ساہوکاروں کے قبضے میں جا چکا تھا۔ اور باقی حصے میں بھی بہت بڑا حصہ ایسا تھا جس پر سے اگر ساہوکار چاہتے تو کاشتکاروں کو قانوناً

علیحدہ کر سکتے تھے ؎۵۱

سر فریڈرک نکلسن نے صوبہ مدراس کے کسانوں کے مجموعی قرض کا اندازہ ۴۵ کروڑ کیا تھا اور کہا تھا کہ "اگر اس قرض پر ۹ فیصدی قرض شمار کیا جائے۔ جو بلا شبہ زیادہ نہیں ہے کیونکہ اکثر عدالتی کارروائیوں سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ کسان اس سے کہیں زیادہ شرح سود ادا کرتے ہیں۔ تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ صوبہ مدراس کے کسان سالانہ ۶ کروڑ ۵۰ لاکھ روپیہ صرف سود کی ادائیگی میں صرف کرتے ہیں۔ اگر یہی شرح سود ۱۸ فیصدی شمار کیجائے تو یہ رقم ۸ کروڑ تک پہنچتی ہے۔ اس میں اگر جسٹری اور اسی قسم کی دیگر عدالتی کارروائیوں کے اخراجات کا اضافہ کیا جائے تو یہ رقم بآسانی ۱۰ کروڑ یا کم از کم ۹ کروڑ تک پہنچتی ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اگر صوبہ مدراس کے زرعی پیداوار کا سالانہ تخمینہ ۶۰ کروڑ کیا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ ہر سال زرعی پیداوار کا ۱۵ فیصدی سود کی نذر ہوتا ہے ؎۵۲

صوبہ بمبئی میں ۱۹۰۱ء میں جو قحط کمیشن مقرر ہوا تھا اس کی تحقیقات سے ثابت ہوا کہ کاشت کاروں کا ¼ حصہ اپنی ملک کا قبضہ کھو چکا تھا اور ایسے خوش قسمت جو قرض کی لعنت سے پاک ہوں کل تعداد کے ⅕ سے بھی کم تھے اور باقی کم و بیش مقروض تھے ؎۵۳

صوبہ پنجاب کا بھی یہی حال ہے۔ کاشتکاروں کے مجموعی قرض کی مقدار ۹۰ کروڑ روپے ہے جو سالانہ مالگذاری سے ۹، گنی زیادہ ہے۔ صوبہ کے مالکان آراضی میں سے صرف ۱۷ فیصدی مقروض نہیں ہیں۔ صوبہ کے مجموعی قرض سے معلوم ہوتا ہے کہ زیر کاشت رقبے کے

؎۵۱ تقریر سر نی۔ ہوپ۔ گورنر جنرل کی کونسل میں بروز ۷ جولائی ۱۸۹۷ء منقول از S.C. Ray's Agricultural Indebtedness in India.

؎۵۲ ملاحظہ ہو رپورٹ بابت Possibility of Introducing Land & Agricultural Banks into the Madras Pr. صفحہ ۱۸ - ۲۰

؎۵۳ ملاحظہ ہو رپورٹ قحط کمیشن ۱۹۰۱ء دفعہ ۳۳۴

ہر ایک شخص پر اوسطاً ۳۱ روپیہ قرض ہے۔ اور جن لوگوں کی گذر صرف زراعت پر ہوتی ہے ان پر فی کس ۶۰ روپیہ قرض ہے۔ اس قرض کا سالانہ سود ۱۲ کرور روپیہ ہے جو صوبے کی سالانہ مالگذاری سے تگنا ہے۔ (۱)

ان اعداد و شمار کو مد نظر رکھکر مختلف اوقات میں لوگوں نے ہندوستان کے زرعی قرضے کا تخمینہ کیا ہے۔ ۱۸۹۵ء میں سر فریڈرک نکلسن نے صوبہ مدراس کے قرض کا تخمینہ ۴۵ کرور لگایا تھا اور اسی کی بنیاد پر سر ایڈورڈ میکلیگن نے ۱۹۱۱ء میں ہندوستان کے مجموعی قرض کا تخمینہ ۳۰۰ کرور لگایا تھا۔ (۲) سر اینڈریو فریزر کا تخمینہ ۵۰۰ کرور تھا (۳) اور اب ایم ایل ڈارلنگ نے اپنی کتاب The Punjab Peasant in Prosperity and Debt. میں بھی تخمینہ ۶۰۰ کرور کیا ہے۔

مندرجہ بالا تفصیل سے ثابت ہوا کہ ہندوستانی کاشتکار بہت زیادہ مقروض ہے اور اسکے قرض کا بار برابر بڑھتا جا رہا ہے۔ اصل کی ادائگی تو ایک طرف وہ سود ہی کی ادائگی سے خستہ حال ہو رہا ہے۔ آخر اسکی کیا وجہ ہے؟ دوسرے ممالک کے کاشتکار بھی قرض لیتے ہیں اور انہیں بھی بلا سود کے قرض نہیں ملتا لیکن باوجود اس کے انکی حالت دن بدن بہتر ہوتی جا رہی ہے۔ ایک بڑا فرق جو ان دو کاشتکاروں کی پر غور کرنے سے سمجھ میں آتا ہے وہ یہی ہے کہ غیر ممالک کے کاشتکاروں کے قرض کا بڑا حصہ دولت آفرین کاموں میں

---

(۱) ملاحظہ ہو M. L. Darling: The Punjab Peasant in Prosperity and Debt. P. 2

(۲) ملاحظہ ہو " " " P. 18

(۳) ملاحظہ ہو Sir Andrew Fraser: Among Indian Rajas and Rayats Page 203.

بطور اصل کے صرف ہوتا ہے بخلاف اس کے ہندوستانی کاشتکار کے قرض کا کثیر حصہ ایسے کاموں میں صرف ہوتا ہے جسے اصلاح زراعت یا اضافہ پیداآوری زمین سے کوئی تعلق نہیں وہ وقتی ضروریات کی نذر ہوجاتا ہے۔

ہندوستانی کاشتکار کی قرضگیری کی اس قدر تفصیل کے بعد ہم مختصراً ان اسباب کا ذکر کرینگے جن کی وجہ سے وہ قرض لینے پر مجبور رہے۔ یہ اسباب ایسے ہیں جو نہ صرف اسے قرض لینے پر مجبور کرتے ہیں بلکہ اگر ان پر غور کیا جائے تو انہی میں اس کے قرض کے روز افزوں اضافی کے اسباب کا بھی پتہ چل جائیگا۔ کیونکہ انہی کی وجہ سے وہ اکثر تبہ جو قرض لے لیتا ہے اس کی ادائگی سے بھی معذور رہتا ہے اور اپنا کاروبار کسی نہ کسی طرح جاری رکھنے کے لئے اسے سوائے اسکے چارہ کار نہیں رہتا کہ مزید قرض لیتا رہے۔

۱۔ افلاس | سب سے پہلے جس چیز پر ہماری نظر پڑتی ہے وہ ہندوستانی کاشتکار کا ناگفتہ افلاس ہے اس کے افلاس کا اندازہ اسی سے ہوسکتا ہے ۱۸۸۰ء کے قحط کمیشن نے اسکی تفصیل حسب ذیل کی ہے (۱)

مویشی	۱۲۵	روپے
آلات کار	۲۰	" (مثلاً ہل وغیرہ)
مکان	۵۰	"
دیگر اشیاء	۲۰	"
میزان کل	۲۱۵	"

اصل کی اس حیرتناک قلت کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ محنتی اور جفاکش کاشتکار کو بھی مجبوراً قرض لینا پڑتا ہے اور ایک مرتبہ قرض لینے کے یہ معنی ہیں کہ وہ ہمیشہ مقروض رہے کیونکہ اس کی محدود

---

(۱) ملاحظہ ہو S.C. Ray's Agricultural Indebtedness of India. صفحہ ۳

آمدنی سے اعلیٰ شرح سود ادا کرنا اور پھر اصل قرض کے بار سے بھی سبکدوش ہونا تقریباً ناممکن ہوجاتا ہے

۲۔ فصل کی خرابی | ہندوستان کے جن صوبوں میں نہروں کے ذریعے آبپاشی کا معقول انتظام نہیں ہے وہاں زراعت کا دارومدار زیادہ تر بارش پر ہوتا ہے اور بارش کا ہونا نہ ہونا ایک اتفاقی امر ہے جس میں کاشتکار کی مرضی کو ذرا بھی دخل نہیں۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ اوسطاً ہر تین سال میں ایک سال تو خشک سالی کا ہوتا ہے اور بقیہ دو میں سے ایک میں فصل اچھی ہوتی ہے اور ایک میں معمولی۔ بارش کی کمی بیشی نیز وقت سے قبل یا وقت کے بعد ہونیکا اثر فصل پڑتا ہے اور ہمارے کاشتکار کے پاس چونکہ اندوختہ شاذ ونادر ہی ہوا کرتا ہے اس لئے خرابی فصل کے لازمی معنی قرضگیری ہوتے ہیں۔

۳۔ ناعاقبت اندیشی | ہندوستانی کاشتکار کی ناعاقبت اندیشی کی مثال مشکل ہی سے کہیں اور ملے گی۔ شادی بیاہ اور ماتمی رسوم کے مواقع پر وہ جو رقوم خرچ کرتا ہے انہیں اس کی آمدنی یا معیار زندگی سے کوئی نسبت نہیں ہوتی۔ ان مواقع پر اپنی حیثیت سے کہیں زائد خرچ کرنا اس کے لئے ضروری سا ہوگیا ہے ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ اس نے اپنی پانچ سال کی مجموعی آمدنی ایک شادی پر صرف کی ہے۔ یہ دیکھکر حیرت ہوتی ہے کہ جو کاشتکار اپنی ضروریات کو گھٹاتے گھٹاتے اس درجہ پر لے آیا ہے کہ خشک ٹکڑا اور موٹے جھوٹے کپڑے پر بسر کرلیتا ہے آخر شادی بیاہ میں اس قدر اسراف کیوں کرتا ہے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ عرصہ تک ایک ہی طرز کی زندگی بسر کرنے سے اسکی طبیعت اکتا جاتی ہے اور اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ زندگی بھر میں کم از کم ایک مرتبہ خوب دل کھول کر خرچ کرے لیکن یہ خیال زیادہ صحیح نہیں ہے۔ اسکی اصل وجہ معلوم کرنا ہو تو ہمیں ہندوستانی کاشتکار کی اجتماعی زندگی پر غور کرنا چاہئے۔ ہندوستان میں صدیوں سے مشترکہ خاندان کا رواج چلا آرہا تھا اور اسی وجہ سے فرد کو ہمیشہ خاندان کے ایک رکن کی حیثیت سے دیکھا جاتا تھا شادی بیاہ اور اسی قسم کی دیگر مراسم میں خرچ کا جو معیار قائم ہوا وہ ظاہر ہے کہ مشترکہ خاندان کا معیار تھا۔

اب بدقسمتی سے مشترکہ خاندان تو باقی نہیں رہا لیکن اس زمانے میں اجتماعی مواقع پر خرچ کا جو معیار قائم ہو چکا تھا وہ بطور روایت کے ابتک برابر چلا آرہا ہے۔ معاشی حالات نے کاشتکار کو اس درجہ پر مجبور کر دیا ہے کہ جہاں صرف اس کی ذات واحد کا تعلق ہے وہ فاقہ کشی تک گوارا کر سکتا ہے لیکن جہاں پوری جماعت کا تعلق آتا ہے وہ اپنی خاندانی روایات کو برقرار رکھنا از حد ضروری سمجھتا ہے اور چار و ناچار قرض لیتا ہے۔ اور یہ خصوصیت صرف کسانوں ہی تک محدود نہیں بلکہ ہندوستان کے کسی طبقے کی حالت پر بھی غور کرنے سے یہی نتیجہ مرتب ہوگا۔ آمدنی خواہ کتنی ہی کم کیوں نہ ہو جائے خود فاقہ کرلیں گے لیکن رسوم کی پابندی میں فرق ناممکن ہے۔ نسبتاً ہندوستانی کاشتکار اس مد میں جو فضول خرچی کرتا ہے اس پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے اور یہی اس کی تباہی کا سب سے بڑا سبب بتایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ وہ بیکشت اتنا روپیہ کسی اور کام میں صرف نہیں کرتا لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ اخراجات کتنے ہی کثیر کیوں نہ ہوں پھر بھی اتفاقی ہیں۔ اس کی تباہی کا اصل سبب تو وہ دائمی اخراجات ہیں جو خوراک، مویشی، بیج اور ادائگی مالگذاری جیسی مستقل مدات کی صورت میں اسے پیش آتے ہیں جو اپنی خستہ حالی کی وجہ سے وہ بلا قرض لئے پورے نہیں کر سکتا۔

۴۔ اضافۂ آبادی اور زمین کی تقسیم در تقسیم | گذشتہ مضمون میں ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ ہندوستان کی آبادی کے اضافے کا سارا بار زراعت پر پڑ رہا ہے دوسرے پیشوں کی عدم موجودگی میں لوگ مجبوراً زراعت کے دامن میں پناہ لیتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ قوانین وراثت کے ماتحت زمین چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم ہو رہی ہے جس کا اثر پیداآوری پر بہت بڑا پڑ رہا ہے۔ اس سے قبل سوت کاتنے اور کپڑا بننے کی صنعت کا ہندوستان میں عام رواج تھا جس کی وجہ سے قحط سالی کے زمانے میں کاشتکار کو تھوڑی بہت مدد ملجاتی تھی لیکن اب چونکہ وہ ذریعہ بھی مفقود ہو گیا ہے کاشتکار کو سوائے قرض لینے کے اور کوئی چارہ کار باقی نہیں رہتا۔

۵۔ گرانی اجناس | گرانی اجناس کا اثر بظاہر کاشتکار کے حق میں مفید ہونا چاہئے کیونکہ اس صورت

میں اسکی پیداوار کی قیمت میں اضافہ ہوتا ہے اور آمدنی بڑھتی ہے۔ دنیا کے ہر تمدن ملک میں یہی ہوتا ہے۔ لیکن ہندوستانی کسان ہر حیثیت میں دنیا سے نرالا ہے۔ وہ اپنے محدود ذرائع پیدائش کی وجہ سے جو کچھ پیدا کرتا ہے وہ اس کے ذاتی خرچ کے لئے بہ مشکل کافی ہوتا ہے یہاں کاشتکاروں کے بڑے حصے کو اپنی پیداوار بیچنے کی نوبت ہی نہیں آتی اور اگر آتی بھی ہے تو وہ اپنی بے بسی کی وجہ سے اسے بہت سستے داموں پر فروخت کرتا ہے۔ بخلاف اس کے جب اسے خود خریدنے کی ضرورت ہوتی ہے تو بہت زیادہ دام دینے پڑتے ہیں نتیجہ یہ ہے کہ گرانی اجناس سے اس پر دو طرفہ مار پڑتی ہے اور اسکی مجبوریوں میں اضافے کا باعث بنکر وہ ساہوکار کا شکار رہتا ہے۔

۶۔ خاندانی قرض | ہندوستانی کاشتکار کی بدقسمتی کا یہیں پر خاتمہ نہیں ہوتا کہ نامساعد حالات کی بنا پر بوجہ مجبوری اسے قرض لینا پڑتا ہے بلکہ وہ غریب تو قرض کی ایک کثیر مقدار ورثہ ہی میں پاتا ہے اور اگر اپنی قابلیت و حسن انتظام سے آمدنی و خرچ کی مدات کو کسی طرح مساوی بنا بھی سکا تو خاندانی قرض کے سود کی ادائگی اسے دم لینے نہیں دیتی ۱۸۸۰ء کے قحط کمیشن نے اپنی رپورٹ میں صاف الفاظ میں اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ "کاشتکاروں کے مقروض ہونیکی اصل وجہ انکا وہ قرض ہے جو ورثتاً انکے حصے میں آتا ہے"(۱)

۷۔ قرضگیری کی آسانیاں | علاوہ اسباب مندرجہ بالا کے ملک کے سیاسی اور معاشی حالات میں جو تغیرات رونما ہو رہے ہیں۔ اور جنکی وجہ سے کاشتکار کو قرض لینے میں دن بدن آسانیاں پیدا ہو رہی ہیں انکا بھی اسکی قرضگیری میں بہت بڑا حصہ ہے ان میں سے ہم صرف دو پر غور کرینگے جو بہت زیادہ اہم ہیں۔

(الف) زمین کی قیمت میں غیر معمولی اضافہ۔

(ب) قرض دہندہ کو قرض کی وصولیابی میں قانونی آسانیاں اور انکی وجہ سے قرض دینے

---

(۱) ملاحظہ ہو S.C. Ray: Agricultural Indebtedness of India, Page 5.

پر اسکی غیر معمولی آمادگی ۔

(الف) ہندوستان میں انگریزی حکومت کے قیام کے بعد سے زمین کی قیمت میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا ہے ۔ اس اضافے کے مختلف اسباب ہیں اس سے قبل ہر گاؤں اپنی ضروریات آپ پوری کیا کرتا تھا ۔ اور زمین کی خرید و فروخت بہت کم ہوا کرتی تھی ۔ اپنی ضروریات پوری کرنیکے بعد کسان کے پاس غلہ بچ رہتا تو اس کی آتنی زیادہ طلب نہ ہوتی تھی جتنی کہ آج کل ہے ۔ ریلوں کے انتظام سے ذرائع آمد و رفت و بار برداری میں جو آسانیاں پیدا ہوئی ہیں وہی غلہ کی اس اضافہ طلب کا اصل باعث ہیں ۔

غلہ کی طلب و اضافے سے اسکی قیمت میں اضافہ اور اس اضافے کا اثر زمین کی قیمت پر اسکا لازمی نتیجہ تھا ۔ اب بجائے اس کے کہ زمیندار کسان کو تلاش کرتا پھرے کسان کو زمیندار کی تلاش رہتی ہے ۔ علاوہ اس کے ملک میں اندرونی امن و امان کی وجہ سے آبادی میں بھی غیر معمولی اضافہ ہونے لگا ۔ اور جیسا کہ ہم گذشتہ مضمون میں دیکھ چکے ہیں زمین کی تقسیم در تقسیم ہوتے ہوتے نوبت یہانتک پہنچی کہ اکثر کسانوں کے پاس آتنی زمین بھی نہ رہی جس پر انکی اور انکے اہل و عیال کی آسانی سے گذر ہو سکے ۔ لیکن چونکہ زراعت کے علاوہ کوئی اور پیشہ بھی نہیں ہے جس کی طرف کسان رجوع کر سکے مجبوراً وہ بہت زیادہ قیمت دیکر زمین خریدنا چاہتا ہے ۔ زمین کی قیمت میں انگریزی حکومت کے قیام کے بعد جو غیر معمولی اضافہ ہوا ہے اسکا اندازہ اعداد ذیل سے ہوگا ۔

ابتداً صوبۂ پنجاب میں زمین کی قیمت صرف ۶ر فی ایکڑ تھی ۱۸۶۹ء میں یہی قیمت دس روپے فی ایکڑ ہوگئی ۱۸۷۹ء میں ۲۰ ۱۸۸۹ء میں ۳۰ اور ۱۸۹۹ء میں ۷۷ روپے ہوگئی ۱۹۱۰ء میں یہی اوسط ۱۲۲ روپیہ فی ایکڑ تھا اور ۱۹۱۶ء میں اس میں اور اضافہ ہوکر ۱۲۷ روپے ہوگیا ۔

زمین کی قیمت کے اس اضافے کا یہ اثر ہوا کہ ساہوکار کسانوں کو اسی مقدار زمین کی ضمانت پر زیادہ قرض دینے لگے ۔ زمین کی قیمت دیکھکر کسان کی بھی ہمت بڑھی ۔ وہ بلا تکلف بڑی بڑی رقمیں قرض لینے لگا ۔ اور بجائے اصلاح زراعت یا دولت آفریں کاموں میں اسے صرف کرنے کے اپنی وقتی ضروریات میں اڑانے لگا ۔ ہندوستانی کسان کے اخراجات کی ایک بڑی مد اس کی لاتناہی عدالتی کارروائیاں ہیں ۔ آئے دن وراثت کے جھگڑے ہوتے رہتے ہیں اور بہت لوگوں کو تو اب مقدمہ بازی کی لت سی پڑگئی ہے اور بعض لوگوں کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ ہندوستانی عدالتیں ہندوستانی کاشت کاروں کے حق میں وہی درجہ رکھتی ہیں جو Monte Carlo یورپ اور امریکہ کے کروڑپتی جواریوں کے حق میں ۔ جس طرح جواری بازی پر بازی لگاتا چلا جاتا ہے بعینہ ہمارا مقروض کسان قرض کی بڑی بڑی رقوم بلاتکلف مقدمہ بازی پر صرف کرتا رہتا ہے ۔ نتیجہ یہ ہے کہ جہاں اسکی جائداد کی قیمت میں غیر معمولی اضافہ ہو رہا ہے وہیں اس کے قرض کی مقدار بھی حد سے آگے بڑھ رہی ہے ۔

(ب) انگریزی حکومت کے قیام کے بعد سے قرض دہندوں کو اپنے قرض کی وصولیابی میں جو آسانیاں پیدا ہوتی ہیں انکا بھی کسانوں کی قرضگیری میں بہت بڑا حصہ ہے ۔ اس سے قبل ملکیت پر چونکہ پورے خاندان کا مشترکہ قبضہ ہوتا تھا اس لئے عدم ادائگی قرض کی صورت میں قرض دہندہ کو یہ اختیار نہ تھا کہ وہ زمین پر قبضہ کرے لیکن انگریزی حکومت میں قانون نے انفرادی ملکیت کو تسلیم کرکے عدم ادائگی قرض کی صورت میں قانونی چارہ جوئی کے بعد زمین پر قبضہ کرنے کا ساہوکاروں کو جو اختیار عطا کیا ہے اس کی وجہ سے ساہوکار قرض دینے میں بہت کم پس وپیش کرتے ہیں ۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ جب تک ساہوکار گاؤں والوں کو اپنا حامی نہ بنالے کسی نادہند قرضدار سے روپے کی وصولی بہت مشکل تھی ۔ گاؤں والوں کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے اسے عجیب وغریب ترکیبیں لڑانا

پڑتی تھیں جنمیں ایک بہت ہی دلچسپ تھی جو دہرنا کے نام سے مشہور تھی۔ اسکا طریقہ یہ تھا کہ یا تو وہ خود نادہند قرضدار کے دروازے پر جا پہنچتا تھا۔ یا اپنی بجائے کسی برہمن کو متعین کرتا تھا۔ جس کا کام یہ ہوتا تھا کہ مختلف طریقوں سے قرضدار پر اثر ڈالے۔ چنانچہ جبتک قرض ادا نہ ہو وہ کھانا پینا بند کر دیتا تھا بعض اوقات اپنے سر پر بڑا سا پتھر رکھ لیتا تھا اور کبھی کبھی اپنی چوٹی قرضدار کے برآمدے کی کسی کھونٹی میں باندھ کر اس میں لٹک جاتا تھا۔ مقصد یہ ہوا کرتا تھا کہ یا تو قرضدار تنگ آکر خود ہی قرض ادا کر دے یا گاؤں والوں کو اسکی تکالیف دیکھ کر رحم آئے اور وہ قرضدار کو ادائگی قرض پر مجبور کریں۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں قرضدار سے اصل مع سود وصول کرنا ہی ساہوکار کے لئے غنیمت تھا۔ لیکن اب حالت یہ ہے کہ قرضدار نے ادائگی میں ذرا دیر کی اور ساہوکار نے فوراً ہی قانون کی آڑ تلاش کرکے اس پر وارنٹ جاری کرادیا۔ ۱۹۲۶ء میں صرف صوبہ بمبئی میں کسانوں کو محض دھمکانیکی خاطر ۰۰۰ ۱۵ وارنٹ جاری کیے گئے۔
ان تمام قانونی آسانیوں کا جو ساہوکاروں کو حاصل ہوئیں نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے بلا دریغ کسانوں کو قرض دیا اور ان ناعاقبت اندیشوں نے بھی خوب ہی خرچ کیا۔
اس پر کسانوں کی جہالت اور قانون سے ناواقفیت نے اور بھی غضب ڈھایا۔ عموماً ساہوکار زیادہ ایماندار نہیں ہوتے اور جب کسان اپنی مجبوریوں سے تنگ آکر انکے پاس پہنچتا ہے تو وہ جس قسم کا بھی چاہتے ہیں وثیقہ لکھوا لیتے ہیں اور وہ غریب بلا چون وچرا اپنے انگوٹھے کا نشان ثبت کرکے ہمیشہ کے لئے انکے پھندے میں پھنس جاتا ہے۔

۸۔ ناقابل برداشت مالگذاری کاشتکاروں کی موجودہ حالت کا اندازہ کرتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ حکومت ان سے جو مالگذاری وصول کرتی ہے وہ بہت زیادہ ہے اور کاشتکاروں کی قرضگیری میں اضافہ کا باعث۔ عام طور پر انگریز مصنفین یہ ثابت کرنیکی کوشش کرتے ہیں کہ موجودہ

شرح مالگذاری نسبتاً کم ہے۔ بہت ممکن ہے یہ خیال صحیح ہو لیکن ہم گذشتہ مضمون میں دیکھ چکے ہیں کہ آراضی کے بڑے حصہ کی وہ حالت نہیں رہی جو اس سے قبل تھی۔ اضافہ آبادی، گرانیٔ اجناس اور زراعت کے علاوہ اور پیشوں کا فقدان اور اسی قسم کے دیگر اسباب نے اکثر آراضی کو غیر معاشی معیار پر لا رکھا ہے۔ بحالت مجبوری کاشتکار اپنے پیشے کو جاری رکھتا ہے اور اس کی آمدنی اسکی گذر کے لئے ناکافی ہے ایسی حالت میں شرح مالگذاری کتنی ہی کم کیوں نہ ہو وہ کاشت کار کے حق میں تو بہر حال ایک بار ہے واقعہ تو یہ ہے کہ غیر معاشی آراضی پر مالگذاری وصول کرنا کسی طرح بھی قرین انصاف و مصلحت نہیں کہا جا سکتا۔ انگریزی حکومت میں مالگذاری وصول کرنیکے جو طریقے ہیں انہوں نے اور آفت مچا رکھی ہے۔ اس سے قبل حکومت نفع و نقصان دونوں میں کاشت کار کی شریک رہتی تھی کیونکہ مالگذاری کی کوئی رقم مقرر نہ تھی اور ہر سال کی پیداوار کا ایک حصہ وصول کیا جاتا تھا۔ اب چونکہ حکومت نے ایک رقم معین کر دی ہے کاشتکار اس کی ادائگی پر مجبور ہے خواہ فصل کی حالت کیسی ہی خراب کیوں نہو۔ چنانچہ ہندوستانی کاشتکار "قرض کے روپے سے مالگذاری ادا کرتا ہے جس پر اسے ۲۵ سے لیکر ۳۰ فیصدی تک سود ادا کرنا پڑتا ہے۔ اور جو شرح مالگذاری سرمایہ داروں کے معیار سے مقرر کی گئی ہو وہ ایسی قوم کے حق میں جو جنس کی صورت میں قرض کے ادائگی کی عادی رہ چکی ہو اور جس کی معاشی ذمہ داریوں کا معیار ایک فصل کی پیداوار سے طے پاتا ہو بلاشبہ ناقابل برداشت ہو گی"(۱)

اصلاحی کوششیں اور انکے نتائج کاشت کاروں کی اس تباہ حالی نے بالآخر حکومت کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی ۱۸۸۶ء اور ۱۹۰۱ء کے قحط کمیشنوں نے اپنی رپورٹ میں حکومت کو اس طرف متوجہ کیا اور چند اصلاحی تجاویز بھی پیش کیں۔ سب سے قبل قانون دیوانی کی اصلاح

---

(۱) ملاحظہ ہو R. Macdonald: The Awakening of India P. 167-58. صفحہ ۱۵۷-۸

کا خیال پیدا ہوا اور اسمیں کسی قدر تبدیلیاں بھی ہوئیں لیکن وہ حسب ضرورت اور کافی نہ تھیں اسلئے انکا زیادہ اثر نہ ہوا دوسری صورت قحط سالی کے زمانے میں پوری مالگذاری یا اس کے ایک حصہ کی معافی تھی۔ اس صورت سے کسانوں کو کسیقدر آسانی تو ضرور ہوئی لیکن انکا بار اتنا زیادہ تھا کہ باوجود اس آسانی کے اتبک مالگذاری کی ادائگی کے لئے قرض لینے کا سلسلہ برابر جاری ہے چنانچہ ۱۸۹۶ء میں صوبہ پنجاب میں کسانوں کے مجموعی قرض کا ۱۲ فیصدی حصہ اسی مالگذاری کی ادائگی کی خاطر قرض لیا گیا تھا۔ حتیٰ کہ ۱۹۲۱ء میں انجمہائے امداد باہمی نے کسانوں کو جتنا قرض دیا اسکا بھی ۱۲٫۵ فیصدی کسانوں سے مالگذاری کی ادائگی میں صرف کیا۔ (۱)

۱۸۸۳ء میں Land Improvements Loans Act اور ۱۸۸۴ء میں Agriculturists Loans Act پاس کرکے۔ دیوانی قانون کی اصلاح اور مالگذاری کی معافی کے علاوہ کاشتکاروں کو ایسے کاموں میں صرف کرنیکے لئے جن سے زمین کی پیداآوری میں اضافہ ہو حکومت کیطرف سے مناسب شرائط پر امدادی قرض دینے کا انتظام کیا گیا۔ جو ز رتقاوی، کہلاتا ہے۔ لیکن یہ قرض حاصل کرنے میں کاشتکاروں کو کچھ تو اپنی جہالت کیوجہ سے اور کچھ حکام کی زیاتی اور قانونی پابندیوں کی وجہ سے اتنی دقتیں پیش آتی ہیں کہ اس سے بہت کم لوگ فائدہ اٹھانا پسند کرتے ہیں۔

علاوہ ازیں زمین کے آئندہ تبادلے پر قانونی پابندیاں عائد کی گئی ہیں۔ انفرادی ملکیت کے خیال کو تقویت پہنچنے سے ہندوستانی کاشت کاروں کے اجتماعی نظام میں جو خلل پڑ رہا ہے اس کے تباہ کن اثرات کا ازالہ ان قانونی پابندیوں کا اصل مقصد ہے اس کے قوانین کی ایک مثال کے طور پر ۱۹۰۱ء کا The Punjab Land Alienation Act پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس قانون کا مقصد زمین کے مزید تبادلے کو روک کر

Calvert : Wealth and Welfare of the Punjab. P. 131

اسے کسانوں ہی کے قبضے میں رکھنا ہے۔ اس قانون کی رو سے ڈگری حاصل کرکے زمین کا نیلام کروانا۔ اپنی قوم کے علاوہ کسی دوسری قوم والے کے ہاتھ زمین فروخت کرنا اور بشرط عدم ادائگی قرض قرضدار کو زمین بیچنے کا اختیار دیکر زمین رہن رکھنا خلاف قانون قرار دیا گیا ہے۔

باوجود ساہوکاروں کے طبقے کی شدید مخالفت کے اس قانون کا بہت اچھا اثر ہوا اور اراضی کی خرید فروخت میں نمایاں کمی واقع ہوئی جسکا اندازہ اعداد ذیل سے ہوسکیگا۔ اس قانون کے اجراء سے پانچ سال قبل اوسطاً ۱۶۲۰۰۰ ایکر زمین فروخت ہوئی تھی۔ لیکن اجراء قانون کے پانچ سال بعد یہی اوسط گھٹکر ۱۳۵۰۰۰ ایکر رہگیا۔ سنہ ۱۹۰۳ء میں اس میں اور بھی کمی واقع ہوکر اس عرصے میں صرف ۱۲۱۰۰۰ ایکر زمین فروخت ہوئی۔ نہ صرف یہ کہ اب کسان زمینیں کم فروخت کرتے ہیں بلکہ اور طبقے جو زمینیں فروخت کرتے ہیں۔ اسے زیادہ تر کسان ہی خریدتے ہیں۔ گو اس سے قبل جو زمینیں کسانوں کے قبضے سے نکلکر بکی تھیں انپر پھر کسانوں کا قبضہ ہو رہا ہے۔ چنانچہ اعداد ذیل اس پر شاہد ہیں:۔

	سنہ ۱۹۰۲-۱۹۰۶	سنہ ۱۹۰۶-۱۹۱۱	سنہ ۱۹۱۱-۱۹۱۶	سنہ ۱۹۱۶-۱۹۱۷	سنہ ۱۹۱۹-۱۹۲۰
کسانوں نے جو زمین اوروں کی ہاتھ بیچی	۱۵۰۰۰۰	۱۷۰۰۰۰	۱۸۸۰۰۰	۱۸۳۰۰۰	۱۶۶۰۰۰
اور لوگوں نے جو زمین کسانوں کی ہاتھ بیچی	۱۴۹۰۰۰	۱۷۸۰۰۰	۲۱۷۰۰۰	۲۰۳۰۰۰	۱۹۱۰۰۰
کسانوں کا نفع نقصان	-۱۰۰۰	+۸۰۰۰	+۲۹۰۰۰	+۲۰۰۰۰	+۲۵۰۰۰

اسی طرح رہن مقبوضہ کے رقبے میں بھی رفتہ رفتہ کمی ہو رہی ہے جو کسانوں کے قرض ہونیکی علامت ہے۔ سنہ ۱۹۰۱-۰۲ء میں ایسا رقبہ ۳۲۸۰۰۰ ایکر تھا جو سنہ ۱۹۱۶-۱۷ء میں ۳۲۰۰۰۰ ایکر ہوگیا اور سنہ ۱۹۱۹-۲۰ء میں اور کم ہوکر ۳۱۱۰۰۰ ہوگیا۔ اسی زمانے میں مرہونہ رقبے کا تناسب مجموعی زیر کاشت رقبے سے ۱۲٫۸ فیصدی سے کم ہوکر ۱۰٫۸ فیصدی رہ گیا (۲)

پنجاب کے علاوہ بندیلکھنڈ، بمبئی اور اودھ میں بھی اسی قسم کے قوانین کا اجرا کیا گیا اور ان صوبوں میں بھی کسانوں کی حالت کی اصلاح میں وہ مد ثابت ہوئے

ان قوانین کا اثر کسانوں کے حق میں کتنا ہی مفید کیوں نہ ہوا ہو ان سے ایک دشواری بھی پیدا ہوائی اور شرح سود میں اضافہ تھا۔ اب چونکہ ساہوکاروں کے اختیارات کم ہو گئے اور قرض کی ضمانت میں زمین پر قبضہ ناممکن ہو گیا۔ اس لئے انہوں نے شرح سود بڑھائی۔ چنانچہ پنجاب میں اسکا اثر صاف نمایاں ہوا اور شرح سود بڑھکر ۱۲ فیصدی سے لیکر ۵۰ فیصدی تک پہنچی

اب حکومت کے سامنے مناسب شرائط پر قرض دیکر کسانوں کی مشکلات رفع کرنیکا اور ساہوکاروں کے پنجے سے انہیں نجات دلانیکا مسئلہ پیش ہوا اور اسی غرض سے انجمنہائے امداد باہمی کی (Cooperative Credit Societies) بنیاد پڑی۔ سب سے پہلے یہ خیال سر فریڈرک نکلسن کے ذہن میں پیدا ہوا انہوں نے جرمنی میں رائفیسن نے جن اصولوں پر یہ انجمنیں قائم کی تھیں انہی اصولوں پر ہندوستان میں انجمنیں قائم کرنیکی تجویز ۱۸۹۵ء میں پیش کی چنانچہ ۱۹۰۴ء میں Cooperative Credit Societies Act کی رو سے حکومت نے ان انجمنوں کے قیام کا انتظام کیا اور ابتدائی ۸ سال میں زائد از توقع کامیابی حاصل ہوئی۔ ۱۹۱۲ء میں ان انجمنوں کی تعداد ۸۱۷۷ تھی اور انکے اراکین ۴۰۳۳۱۸ تھے۔ انجمنوں کے اصل کی مجموعی مقدار ۳۳۵۰۴۱۶۲ روپے تھی۔ ۱۹۱۲ء میں ایک نئے قانون Cooperative Societies Act 1912 کی رو سے ان انجمنوں کے دائرہ عمل کو وسعت دی گئی

اس کے بعد ان انجمنوں نے جو قابل غور ترقی کی ہے اسکا اندازہ اعداد ذیل سے ہوگا۔

۲۳-۱۹۲۲ء میں ان انجمنوں کی تعداد صرف برطانوی ہند میں ۵۱۶۸۰ تھی۔ اسی میں اگر دیسی ریاستوں کو شریک کر لیا جائے تو یہ تعداد ۵۶۱۳۶ تک پہنچتی ہے ان میں سے ۹۰ فیصدی محض کاشتکاروں ہی کے لئے مخصوص ہیں۔ اب گویا ملک کی ہر ۶۰۰۰ کی آبادی پر ایک انجمن

کا اوسط پڑتا ہے۔ اراکین کی کل تعداد (برطانوی ہند میں) ۱۹۴۰۹۴۳ تھی جن میں ۱۵۰۶۴۵۰
ان انجمنوں کے رکن تھے جو زراعت پیشہ لوگوں کے لئے مخصوص ہیں۔ گویا آبادی میں فی ہزار
سات آدمی ان انجمنوں کے رکن ہیں۔ برطانوی ہند کے انجمنوں کے اصل کی مجموعی مقدار
۳۳۳۲۱۱۰۰۰ تھی۔

ان انجمنوں کے نظام کا اور مختلف صوبوں میں وہ جو مفید کام کر رہے ہیں اسکا بہ تفصیل ذکر
اسی مختصر مضمون میں ممکن نہیں۔ اشارتاً یہ کہدینا کافی ہوگا کہ انکا بڑا حصہ کاشتکاروں ہی
کی اغراض پوری کرنیکے لئے مخصوص ہے انکا نظام رائفن کی انجمنوں کے نظام ہی پر مبنی ہے
اور رفتہ رفتہ ان انجمنوں کی تعداد اور کارگذاری میں نہایت سرعت سے اضافہ ہو رہا ہے۔

تاہم ان انجمنوں کی بظاہر ترقی سے ہمیں زیادہ متاثر نہ ہونا چاہئیے۔ اعداد و شمار کے اضافے
کے یہ معنی نہیں کہ واقعتاً کام بھی اسی رفتار اور مستعدی سے ہو رہا ہے ان میں جو ابتدائی
انجمنیں (Primary Societies) ہیں انہیں امداد باہمی کے اصولوں کا بہت کم احساس
ہے۔ ان انجمنوں کا مقصد کاشتکاروں کو نہ صرف مناسب شرائط پر قرض دینا ہے بلکہ ان میں
انتظامی قابلیت پیدا کرنا بھی انکا فرض ہے۔ موخر الذکر فرض کی کماحقہٗ ادائگی کے لئے ضرورت
ہے کہ جس قدر بھی جلد ممکن ہو ان انجمنوں کا پورا انتظام عوام کے ہاتھ میں دیدیا جائے اور حکومت
اس میں کسی قسم کی مداخلت نہ کرے۔ لیکن باوجود ربع صدی گذر جانیکے ابھی حکومت کا اثر اور
دخل بدستور جاری ہے۔ بلکہ بدقسمتی سے بعض لوگوں کا تو یہ خیال ہے کہ حکومت کا اثر اور
زیادہ ہو۔

ان انجمنوں کے ذرائع بھی اسقدر محدود ہیں کہ انکی قوت پر زیادہ بھروسہ نہیں کیا جا سکتا
ہمارے کاشتکاروں کی قرضگیری جس انتہا کو پہنچ چکی ہے اسکا مقابلہ اگر ان انجمنوں کے
محدود ذرائع سے کیا جائے تو یہ کسی طرح بھی ممکن نظر نہیں آتا کہ مستقبل قریب میں یہ انجمنیں
ہمارے کاشتکاروں کی جملہ ضروریات کی کفیل بن سکیں۔

باوجود ان انجمنوں کے قیام کے ابھی مہاجنوں کے لئے قرض دینے کے کافی مواقع باقی ہیں۔ خصوصاً شادی بیاہ جیسی رسوم میں خرچ کرنے کے لئے جب انجمن سے قرض نہیں ملتا تو کسان مجبوراً پھر مہاجن کے پاس جاتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ زرعی ضروریات کے علاوہ اور کاموں کے لیے یہ انجمنیں قرض نہیں دے سکتیں بلکہ قحط سالی کے زمانے میں کاشتکار اور اسکے کنبے کی پرورش بھی ان انجمنوں کے احاطہ سے باہر ہے۔ اور انکی موجودہ حالت دیکھکر یہ کہا جاسکتا ہے کہ آتنی قوت پیدا ہونیکے لئے ابھی ایک عرصہ درکار ہے۔

جو کاشتکار اپنی غیر محدود ذمہ داری پر ان انجمنوں کے رکن بنتے ہیں انکے لئے بعض اوقات بڑی مصیبت کا سامنا ہوتا ہے۔ پھر اسکا مہاجن کے پاس جانا تقریباً ناممکن ہے لے دیکر قرض حاصل کرنیکا ایک ہی ذریعہ باقی رہتا ہے اور وہ زرتقاوی ہے۔ اس صورت میں حکومت کو انکی جائداد پر اختیار کلی حاصل ہوجاتا ہے اور باوجود بعد میں زرتقاوی لینے کے عدم ادائگی کی صورت میں سب سے پہلے حکومت ہی کو اس جائداد پر اپنا حق ملکیت ثابت کرنیکا موقع ملتا ہے اور اس طرح انجمہائے امداد باہمی کو نقصان پہنچتا ہے۔

غرض بحیثیت مجموعی یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان انجمنوں میں بھی باوجود انکی مفید کارگذاری کے ابھی اتنی قوت نہیں ہے کہ وہ ہمارے کاشتکاروں کو قرضگیری کی لعنت سے ہمیشہ کے لئے نجات دلاسکیں۔ صورت حال کی اصلاح کا وہی ایک ذریعہ ہوسکتا ہے جس کا ہم گذشتہ مضمون میں بھی ذکر کرچکے ہیں یعنی کاشتکاروں کو انکے فرصت کے وقت میں جو وہ بیکاری میں گذارتے ہیں کوئی کام دیا جائے جس سے وہ اپنی آمدنی میں تھوڑا بہت اضافہ کرسکیں۔ صرف اسی صورت میں انکے بڑھتی ہوئی قرضگیری کی کسی حد تک روک تھام ہوسکتی ہے۔ علاوہ اس کے اشاعت علم اور اصلاح رسوم کا بھی انتظام ضروری ہے۔

احوال غالب از کلام غالب

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

غالب کی بڑی خوش نصیبی ہے کہ اسکی قدر نہ صرف اس کی زندگی میں ہوئی بلکہ مرنے کے بعد اس سے زیادہ ہوئی۔ زندگی میں بہت سے ایسے حالات و اسباب ہو سکتے ہیں کہ بے لوث و غیر جانبدارانہ قدر و ستایش کا صحیح اندازہ نہ ہو سکے لیکن ایسے زمانے میں جب کہ شاعر کے دیکھنے والے بھی گنتی کے رہ گئے ہوں شاعر کی قدر ہونا بے شبہ اس کی اصلی قدر اور اسکے کمال کی واقعی دلیل ہے۔

غالب کے کلام پر تبصرے اور تنقیدیں۔ شرحیں اور دیباچے بہت لکھے گئے۔ لیکن اس کے حالات اور خصائص طبعی پر کافی نظر تنقید نہیں ڈالی گئی۔ صرف مولانا حالی نے حق شاگردی ادا کیا ہے۔ اور اگرچہ نہایت تفصیل سے حالات لکھے ہیں لیکن ان میں شاگردانہ ارادت کیشی و عقیدت مندی کا رنگ غالب ہے۔ غالب صرف اعلیٰ دماغ کا انسان نہ تھا بلکہ بڑا دل بھی رکھتا تھا۔ لیکن انسان تھا اور انسان لغزشوں سے پاک نہیں ہوتا۔ غالب خوددار، پابند وضع، وسیع الاخلاق اور بقول حالی "حیوان ظریف"، تھا۔ لیکن خودداری کے ساتھ حسد و خوشامد۔ قناعت کیساتھ بے صبری، خوش خوئی کے ساتھ طعن و شکایت، ظرافت کے ساتھ ہجو و بدگوئی بھی ہندوستان کے اس بہترین و برترین شاعر کی سرشت میں پنہاں تھی۔ لیکن جس طرح شکسپیر کا سرقہ شکار اس کے کمال شاعری کو داغدار نہیں کر سکتا۔ اسی طرح انسانی کمزوریوں کے اتفاقی و ہنگامی اظہار سے غالب کا پایہ بلندیت نہیں ہوتا۔ کسی انسان کے حالات کے دوران تحقیق میں اس کے کسی عیب کی طرف

اشارہ کردینا علمی نقطۂ نظر سے نہ آڈگر ُ وا ئوتا گُم باخیر کے منافی ہے۔ نہ اس کی شہرت کو داغدار بنانیکے مترادف۔ بلکہ فطرت انسانی کے تنوع کا مطالعہ ہے اور دلچسپ مطالعہ۔

غالب کا مذہب بھی آج کل معرض بحث میں ہے اس نے ایک مثنوی میں اپنے عقائد جس خوبی وصفائی سے لکھے ہیں وہ اگرچہ کسی کی فرمایش سے سہی لیکن بلاشبہ اس کے ذاتی معتقدات ہیں۔ اس فرمایش کا اثر گرفتاری کا خوف نہ تھا جس نے بے تکلف کہلوایا تھا "صاحب آدھا مسلمان۔ اس لئے کہ شراب پیتا ہوں سور نہیں کھاتا"

اس مختصر تمہید کے بعد ہم اس کے حالات وعادات جو اس کے کلام اُردو فارسی میں دستیاب ہو سکے ہیں بغیر اپنے مزید ریمارک کے غالب ہی کی زبان سے پیش کرتے ہیں۔ حامد حسن قادری بچھراونی۔ اکمانپور

غالب کی ولادت

غالب چو زناسازی فرجام نصیب
ہم ہیم عدو دارم وہم ذوق حبیب

تاریخ ولادت من از عالم قدس
ہم شورش شوق آمد و ہم لفظ غریب

۱۲۱۲ ۱۲۱۲

غالب کا نسب

غالب از خاک پاک تورانیم
لاجرم در نسب فرومندیم

ترک زادیم و در نژاد ہمے
بسترگان قوم پیوندیم

ایبکیم از جماعۂ اتراک
در تمامی زماہ دہ چندیم

پیشہ آبائی

فن آبائے ماکشاورزی است
مرزبان زادۂ سمرقندیم

سو پشت سے ہے پیشہ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

غالب بہ گہر ز دودۂ زادشمم ۔ زاں رو بہ صفائے دم تیغ است دمم
چوں رفت سپہبدی زدم چنگ بہ شعر ۔ شد تیر شکستہ نیاگاں قلمم

غالب کا مذہب

شرط است کہ بہر ضبط آداب و رسوم ۔ خیزد بعد از نبی امام معصوم
ز اجماع چہ گوئی بہ علی باز گرائے ۔ مہ جائے نشین مہر باشد نہ نجوم

علی راست بعد از نبی جائے او ۔ ہماں حکم کل دارد اجزائے او
ہمانا پس از خاتم المرسلیں ۔ بود تا بہ مہدی علی جانشیں
نژاد علی با محمد یکے است ۔ محمد ہماں تا محمد یکے است
ز احمد الف نام ایزد بود ۔ ز میم آشکارا محمد بود
الف میم را چوں شوی خواستار ۔ نماند ز احمد بجز ہشت و چار

منصور فرقۂ علی اللّٰہیان منم ۔ آوازۂ انا اسد اللہ بر آورم
غالب نام آورم نام و نشانم مپرس ۔ ہم اسد اللہ ام و ہم اسد اللّٰہیم

غالب کا مسلک

غالب آزادۂ موحد کیشم ۔ بر پاکی خویشتن گواہ خویشم

آزادہ رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلح کل ۔ ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم ۔ ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

غالب کے عقائد

استمداد از اولیا

نور حق است احمد و لمعان نور ۔ از نبی در اولیا دارد ظہور
ہر ولی پرتو پذیر است از نبی ۔ چوں مہ از خور مستنیر است از نبی
از نبی ور از ولی خواہی مدد ۔ تا نہ پنداری کہ نا جائز بود
بر نیاید کار بے فرمان شاہ ۔ لیک آئیں ہاست بر خاصان شاہ

هر که اعدای تو در حق نیز فراست　　هر چه از دوست خواستی هم از خداست

بر لب جو رسی اگر آبی خورده　　آب از موجی بجام آورده

آب از موج آید اندر جام تو　　لیکن از دریا بود آشام تو

وقت حاجت هر که گوید یا علی　　یا حقش کار است جو یوزش یا علی

یا محمد جان فزاید گفتنش　　یا علی مشکل کشاید گفتنش

چون اعانت خواهی از یزدان پاک　　یا معین الدین اگر گوئی چه باک

الهمان را زانکه دانش نارسا است　　گفتگو با یه سر حرف ندا است

مولوی معنوی عبد العزیز　　وان رفیع الدین دانشمند نیز

شاه عبد القادر دانش سگال　　کاین دو تن را بود در گوهر جمال

بردن نام نبی و اولیا　　خود در دا گفتند با حرف ندا

تا نپنداری ز پیران خواستیم　　حاجت خود را ز یزدان خواستیم

لیک در پوزش بدرگاه رفیع　　ما همی آریم پیران را شفیع

این چنین پوزش روا نبود چرا　　بحث با عارف خطا نبود چرا

مولد پیغمبر

در سخن در مولد پیغمبر است　　بزم گاه دلکش و جان پرور است

موی مبارک

نکهت موی مبارک جانفزاست　　بارگ جانش همی پیوندهاست

بر تن نیکو تر از جان رسته است　　لاجرم از آب حیوان رسته است

دلنشین با بود زان رشته موی　　ده که گردانند کسی زان موی روی

نقش قدم

هر کرا دل هست و ایمان نیز هم　　چون نوازد عشق با نقش قدم

در ره دین تا قدم بنهاده اند　　عشق بازان را نشانها داده اند

بروا ز خوشتیم دو صد فرسنگ شک　　می برم این نقش پا بر سنگ شک

نقش پای کانچنین افتاده است　　اهل دل را دلنشین افتاده است

کے نشیند در دل آں بدگہر — کش دلے از سنگ باشد سخت تر

پیرہن مبارک

بر رداو پیرہن کز مصطفیٰ است — جاں نفشاندن زاہدے کے رواست

عشق گر با پیرہن در بار داست — نیست بہر جامہ از بہر خدا است

عرس وایں شمع و چراغ افروختن — عود در مجمر بر آتش سوختن

جمع گشتن در یکے ایواں ہمی — پنج آیت خواندن از قرآں ہمی

ناں بناں خواہندگاں دادن دگر — مردہ را رحمت فرستادن دگر

گر پئے ترویح روح اولیا است — در حقیقت آنہم از بہر خدا است

اولیا را گر گرامی داشتیم — زپے رومی و شامی داشتیم

از برائے آں کہ ایں آزادگاں — از رہ حق جاں بجاناں دادگاں

از شہود حق طرازے داشتند — با خدائے خویش رازے داشتند

نور چشم آفرینش بودہ اند — شمع روشن ساز بینش بودہ اند

ہست رسم خاص در ہر مرز بوم — خود چہ می خواہی ز نفی ایں رسوم

نفی رسم کفر ما ہم مے کنیم — داد با دانش فراہم می کنیم

نفی کفر آئین ارباب صفاست — نفی فیض اے تیرہ دل رسم کجاست

نفی رسم ورہ ہوا را می کشد — نفی فیض است اینکہ ارا می کشد

اے گرفتار خم و پیچ خیال — نفی بے اثبات نبود جز ضلال

معجزات

ور تو گوئی می کنم اثبات حق — از چہ روئی منکر آیات حق

معجزات انبیا آیات کیست — دیں صفت ہا را ظہور از ذات کیست

امکان نظیر

ویں کہ می گوئی توانا کردگار — چوں محمد دیگرے آرد بکار

با خداوند گیتی آفریں — ممتنع نبود ظہور ایں چنیں

گرچہ فخرِ دودۂ آدم بود — ہم بقدرِ خاتمیت کم بود
صورتِ آرایشِ عالم نگر — یک مہ و یک مہر و یک خاتم نگر
این کہ می گویم جوابے بیش نیست — مہر و مہ را جلوہ تابے بیش نیست
آنکہ مہر و ماہ و اختر آفرید — می تواند مہر دیگر آفرید
حق دو مہر از سوئے خاور آورد — کور بادا آں کہ نا باور آورد
قدرتِ حق بیش ازیں ہم بودہ است — ہرچہ اندیشی کم از کم بودہ است
لیک در یک عالم از روئے یقیں — خود نمی گنجد دو ختم المرسلیں
یک جہاں تا ہست یک خاتم بس است — قدرتِ حق را نہ یک عالم بس است
خواہد از ہر ذرہ آرد عالمے — ہم بود ہر عالمے را خاتمے
ہر کجا ہنگامۂ عالم بود — رحمۃ للعالمینے ہم بود
کثرتِ ابداعِ عالم خوب تر — یا بیک عالم دو خاتم خوب تر
در یکے عالم دو تا خاتم مجوے — صد ہزاراں عالم و خاتم بگوے
غالب ایں اندیشہ نپذیرم ہمی — خردہ ہم بر خویشتن می گیرم ہمی
اے کہ ختم المرسلینش خواندہ — دانم از روئے یقینش خواندہ
ایں الف لامے کہ استغراق راست — حکم ناطق معنیِ اطلاق راست
منشاء ایجادِ ہر عالم یکیست — گر دو صد عالم بود خاتم یکیست
خود ہمی گوئی کہ نورش اول است — از ہمہ عالم ظہورش اول است
اولیت را بود شانے تمام — کے بہر فردے پذیرد انقسام
جوہرِ کل برنتابد تثنیہ — در محمد رہ نیابد تثنیہ
تا نورزی اندر امکاں بود رنگ — حیز امکاں بود بر شکل تنگ
ہیم امکاں اندر احد منزوی است — چوں ز امکاں بگذری دانی کہ حبیب

صانع عالم چنیں کرد اختیار — کش بعالم شل نبود زینہار
ایں نہ عجز است اختیار است آنکہ — خواجہ بے ہمتا بود لا ریب فیہ
ہر کرا با بست باید بیند وخدا — ہیچو اونی نقش کے بندد خدا
ہم گہر مہر منیر ستش چوں بود — سایہ چوں نبود نظیر ستش چوں بود
منفرد اندر کمال ذاتی است — لاجرم مثلش محال ذاتی است
زیں عقیدت برنگردم والسلام — نامہ را در می نوردم والسلام

غالب کا مشرب

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد — پر طبیعت ادھر نہیں آتی
روزہ مرا ایمان ہے غالب لیکن — خسخانہ و برفاب کہاں سے لاؤں
درعالم بے زری کہ تلخست حیات — طاعت نتواں کرد بامید نجات
اے کاش زحق اشارت صوم و صلوٰۃ — بودے بوجود مال چوں حج و زکوٰۃ
فرصت اگرت دست دہد مغتنم انگار — ساقی و مغنی و شرابے و سرودے
زنہار ازاں قوم نباشی کہ فریبند — حق را بسجودے و نبی را بدرودے
ساقی چو من پشنگی و افراسیابیم — دانی کہ اصل گوہرم از دودۂ جم است
میراث جم کہ مے بود اینک بمن سپار — زیں پس رسد بہشت کہ میراث آدم است
در من ہوس بادہ طبیعی است کہ غالب — پیمانہ ز جمشید رساند نسبم را
خوش بود فارغ ز بند کفر و ایماں زیستن — حیف کافر مردن و آوخ مسلماں زیستن
کارے عجب افتادہ بدیں شیفتہ ما را — مومن نبود غالب و کافر نتواں گفت
زاہد ز طعنہ برق فسوسم بجاں مزن — نسبت مکن بزندقہ اے زشت خو مرا
گوئی کہ با کلام مجیدت رجوع نیست — دل تیرہ شد ز کلفت ایں گفتگو مرا
حق است مصحف و بود از روے اعتقاد — در عزت کلام الٰہی غلو مرا

ہر صفحہ زاں صحیفہ شکیں رقم بچشم — باشد نکو ترا ز خط روے نکو مرا
شیطان عدوست لیک انا نا مہ سرورق — بخشد خط امان ز نہیب عدو مرا
دانم کہ امر و نہی بود در کلام حسن — سیرابی نمی است ازاں آب جو مرا
با ایں ہمہ کہ در خم و پیچ و غم و تعب — سرگشتہ دارد ایں فلک خنگ جو مرا
بر خاستست گرد ز سر چشمۂ حواس — وز حافظہ نماندہ نمے در سبو مرا
لا تقربوا الصلوٰۃ ز نہیم بخاطر است — وز امر یاد ماندہ کلوا واشربوا مرا

غالب کے اخلاق

خودداری — اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو — آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

علوی ہمت — بندگی میں بھی وہ آزادۂ و خود بیں ہیں کہ ہم — اُلٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

ہنگامۂ زبونی ہمت ہے انفعال — حاصل نہ کیجئے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو
وارستگی بہانۂ بیگانگی نہیں — اپنے سے کر نہ غیر سے وحشت ہی کیوں نہ ہو

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس — برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

تھی نو آموز فنا ہمت دشوار پسند — سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

بے تکلف در بلا بودن بہ از بیم بلا — قعر دریا سلسبیل و روے دریا آتش است

یادرفتگاں — بہ نظم و نثر مولانا ظہوری زندہ ام غالب — رگ جاں کردہ ام شیرازۂ اوراق کتابش را

مارا مدد ز فیض ظہوری است در سخن — چوں جام بادہ راتبہ خوار خمیم ما

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ — آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب — کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

ذکر احباب — یکہ راند ی سخن از نکتہ سرایان عجم — چہ بامنت بسیار نہی از کم شان
ہند را خوش نفسانند سخنور کہ بود — باد در خلوت شان مشک فشاں از دم شان
مومن و نیر و صہبائی و علوی وانگاہ — حسرتی اشرف و آزردہ بود اعظم شان

غالب سوختہ جاں گرچہ نیرزد بشمار ——— ہست در بزم سخن ہمنفس و ہمدم شاں

غالب ز حسرتی چہ سرائی کہ در غزل ——— چوں او تلاش معنی و مضموں نکرد کس

غالب بہ فن گفتگو نازد بدیں ارزش کہ او ——— ننوشت در دیوان غزل تا مصطفیٰ خاں خوش نکرد

غالب اگر بہ بزم شعر و ری رسیده دور نیست ——— کش بفراق حسرتی دل ز سخنوری گرفت

غالب آزردہ سر خوش نیست کہ از مستی قرب ——— ہم بداں وحی کہ آوردہ غزلخواں شدہ است

شرط است کہ روے دل فراشم ہمہ عمر ——— خونابہ بدل ز دیدہ پاشم ہمہ عمر

کافر باشم اگر بمرگ مومن ——— چوں کعبہ سیہ پوش نباشم ہمہ عمر

یاد عجم و بیزاری ہند

غالب ز ہند نیست نوائے کہ می کشم ——— گوئی ز اصفہان و ہرات و قمیم ما

غالب سخن ز ہند بروں بر کہ کس اینجا ——— سنگ از گہر و شعبدہ ز اعجاز ندانست

غالب از آب و ہوائے ہند بسمل گشت نطق ——— خیز تا خود را بہ اصفاہان و شیراز افکنم

غالب از ہندوستاں بگریز فرصت مفت تست ——— در نجف مردن خوش است و در صفاہان زیستن

غالب از خاک کدورت خیز ہندم دل گرفت ——— اصفہان ہے، یزد ہے، شیراز ہے، تبریز ہے

خودستائی

اگر ذوق سخن بدہر آئیں بودے ——— دیوان مرا شہرت پرویں بودے

غالب اگر ایں فن سخن دیں بودے ——— آں دیں را ایزدی کتاب ایں بودے

ما نبودیم بدیں مرتبہ راضی غالب ——— شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فن ما

نرنجم گر بصورت از گدایاں بودہ ام غالب ——— بدار الملک معنی می کنم فرماں روائی ہا

شعر غالب نبود وحی و نگوئیم ولے ——— تو و یزداں نتواں گفت کہ الہامے ہست

چند رنگیں نکتۂ دلکش تکلف برطرف ——— دیدہ ام دیوان غالب انتخابی بیش نیست

چوں نیست تاب برق تجلی کلیم را ——— کے در سخن بہ غالب آتش بیاں رسد

از نازکی بدہر مکرر نمے شود ——— نقشیکہ کلک غالب خونیں رقم کشد

اندریں شیوۂ گفتار کہ داری غالب ——— گر ترقی نکنی شیخ علی را مانی

شکایاتِ زمانہ

زندگی اپنی جب اس طرح سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

کچھ تو دے اے فلکِ ناانصاف
آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

غالب کچھ اپنی سعی سے لہنا نہیں مجھے
خرمن جلے اگر نہ ملخ کھائے کشت کو

لوں وام بختِ خفتہ سے اک خوابِ خوش ولے
غالب یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں

ہمہ ناامیدی ہمہ بدگمانی
میں دل ہوں فریبِ وفاخوردگاں کا

درماندگی میں غالب کچھ بن پڑے تو جانوں
جب رشتہ بے گرہ تھا ناخن گرہ کشا تھا

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل
دیکھکر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

با ایں ہمہ آرایشِ گفتار کہ گفتم
از جبہہ بختم نبود فاصلہ چیں را

بخت صلۂ مدح و قبولِ غزلم نیست
تسکیں بچہ بخشم دلِ ہنگامہ گزیں را

در بانگ زنی کاں ہمہ دادند بحافظ
گویم بحلش باد ولیکن چہ شد ایں را

ملزم کردہ اند ہاں بدروغ
حقِ من خوردہ اند ہیں بگزاف

آہ از اقربائے بے آزرم
داد از حاکمانِ ناانصاف

ایکہ در بزمِ شہنشاہِ سخن ور گفتہ
کے بیکرنگی فلاں در شعر ہم رنگِ منست

راست گفتی لیک می دانی کہ بود جائے طعن
کمتر از بانگِ دہل گر نغمۂ چنگِ منست

نیست نقصاں یکہ دو جزو است از سواد ریختہ
کاں دو دم برگے ز نخلستانِ فرہنگِ منست

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ
بگزر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگِ منست

فارسی بیں تا بدانی کاندر اقلیمِ خیال
مانی و ارژنگم و آں نسخہ ارژنگِ منست

کے درخشد جوہرِ آئینہ تا باقیست زنگ
صیقلِ آئینہ ام ایں جوہر آں زنگِ منست

ہاں من و یزداں بجائے شکوہ بر دہر دو فات
تا نہ پنداری ببر خاشِ تو آہنگِ منست

دوست بودی شکوہ سر کردم ولے از جرمِ تو
کایں ہمہ بیداد بر من از دلِ تنگِ منست

بختِ من ناساز و خوی دوست زاں ناسازتر
تا چہ پیش آید کنوں با بختِ خود جنگِ منست

دشمنی رابهم فنی شرطاست آن نی کریست   از تو بود نغمه و ساز یست که در چنگ مست
در سخن چون بزبان دمنوآ من نه   چون دولت را بیچ وتاب از شک اهنگ مست
راست میگویم من و از راست سرنتوان کشید   هرچه در گفتار فخر تست آن ننگ منست
هزار معنی سر جوش خاص نطق منست   گر اهل و ذوق دل و گوی از عسل بردا ست
ز رفتگان بیکی گر تو ار دم رود ا د   مدان که خوبی آرایش غزل برد است
مراست ننگ وی فخر ادست کان سخن   بسعی فکر رسا جا بدان محل برد است
مبر گمان تو ار د یقین شناس که دزد   متاع من ز نهانخانه ازل برد ست

غالب بدین زمانه هرکس که ودرسی   مضمون غیر و لفظ خودش بر زبان او ست
زین مایه از کجا که بنالد بخویشتن   هر گنج شائگان که بود رائگان او ست
کس را زدست بردخیالش نجات نیست   گر بیش از و گذشته وگر در زمان او ست
مضمون هر که خوش ادا می کند بناز   گوئی به بزم اهل سخن ترجمان او ست
اما به کنه حسن ادا نا رسیده است   می لرزد از (؟) و دلم رازدان او ست
جز من کسی بدرو سخن در نمی رسد   گو خوش بخوان که ابجنی مدح خوان او ست
آری نه جلب بود نه تمسک از هر که هست   نی دستخط نه مهر نه نام و نشان او ست
مضمون شعر لوث بود فی زمانه   یعنی بدست هر که بیفتاد آن او ست
اضطراب بسمل از ما ترکتاز از هم قنان   اضطراب بسملی و ترکتازی بوده است
ما و درد و داغ و همکاران ما و برگ و ساز   درد و داغی بوده است و برگ و سازی بوده است

ظرافت | ایا زیان زده غالب که از صدیقه بخت   نمی رسد بتو خار و خسی ز هیچ سبیل
چو لازم است که پروردگار تا دم مرگ   بود برزق ضرور یه عباد کفیل
چراست اینکه نداری زر از سیاه و سفید   چراست اینکه نیابی بر از کثیر و قلیل
فتاده در سر این رشته عقده ورنه   نمرده تو و نی رازق العباد بخیل

زچند سال بمرگ تو و تباہی رزق ۔ شدست حکم خود از پیشگاہ رب جلیل
فرشتۂ کہ وکیل است بر خزائن رزق ۔ نکرد ہیچ توقف برزق در تعطیل
دوم فرشتہ کہ یا وستش بخیر مقرون باد ۔ روانداشت ور املاک شیوہ تعجیل
لطیفۂ کنم از قول شاعرے تضمین ۔ کہ در لطیفہ مرا در اکسے نبود عدیل
اگر خدائے بداند کہ زندۂ تو ہنوز ۔ ہزار مشت زند بر دہان عزرائیل

چوں الف بیگ در کہن سالی ۔ پسرے یافت سر بسر غمزہ
نام او ہمزہ بیگ کرد بلے ۔ الف منحنی بود ہمزہ

ہر کس ز حقیقت خبرے داشتہ است ۔ بر خاک رہ عجز سرے داشتہ است
زاہد ز خدا ارم بدعوے طلبد ۔ شداد ہما نا پسرے داشتہ است

بہ آدم زن، بہ شیطان طوق لعنت ۔ سپردند از رہ تکریم و تذلیل
ولیکن در اسیری طوق آدم ۔ گران تر آمد از طوق عزازیل

گردہ جہدے کہ در ویرانی کاشانہ ام ۔ چرخ در آرایش ہنگامۂ عالم نکرد
گر بہجوت راندہ باشم نکتۂ بر خود مپیچ ۔ [illegible] زانکہ حرفے زانچہ گفتم خاطرم خرم نکرد
بیتے از استاد دیدم ۔ ذوقکے بخشد لیک ۔ ہیچ در تسکین نیفزود و ز زحمت کم نکرد
ہجو تو ناقابلے در صلب آدم دیدہ بود ۔ زان سبب ابلیس ملعون سجدہ بر آدم نکرد
ماشاء اللہ بودنت در صلب آدم تہمت است ۔ پیش ہر کس گفتم این اندیشہ باور ہم نکرد

دیدی آں بدگہر و مہر و ولایش بہ یزید ۔ کہ بخشم آید اگر زشت و پلیدش گویند
زانکہ او خود پسر ابن علی تیغ نراند ۔ خواجہ از ننگ نخواہد کہ یزیدش گویند
گفتم البتہ کہ شبیر بداں مے ارزد ۔ کہ شہیدش بنویسند و سعیدش گویند
گفت زاں رو کہ عزیزاں ہمہ مسلم بودند ۔ نتواں کرد گوارا کہ شہیدش گویند

بیت

ایکہ شایستۂ آنی کہ ترا ۔ جم و فغفور و سکندر گویم

چوں نداری سرِ شاہی ناچار حاکم و والی و داور گویم
لیک غم سخت گرفتست مرا غم نگویم دراز در گویم
زاں نیارم کہ باندازۂ شوق مدح نواب گورنر گویم
چارہ آنست کہ چوں غمزدگاں غم دل پیش تو یکسر گویم
گر زبے مہری گردوں نالم گر ز ناسازی اختر گویم
چوں تو دانی کہ چہ حالست مرا از ادب نیست کہ دیگر گویم
گویم ایں سال مبارکبادت ویں دو صد سال برابر گویم

ہزار بار فزوں گویم و کم است ہنوز گورنری بہ جسن تامسن مبارکباد

اے خداوند ہنرمند ہنرپرور من مہر دیدار فلک مرتبہ سیسل بیڈن
بامید توام از یاری اختر فارغ در پناہ توام از گردش گردوں ایمن
حیف باشد کہ ز الطاف تو ماند محروم ہیچو من بندۂ دیرین و نکوخواہ کہن
نالم از غم کہ نہ شائستہ و درخور باشد خاص در عہد تو ناکامی دنویسیِ من

غالب کی مرغوب اشیاء

غالب من و خدا کہ سرانجام برشگال غیر از شراب و انبہ برفاب و قند نیست
ہمہ گر میوۂ فردوس بخوانت باشد غالب آں انبۂ بنگالہ فراموش مباد

تعلقات خانگی کی ناخوشگواری

زانجا کہ دلم بوہم در بند نبود با ہیچ علاقہ سخت پیوند نبود
مقصود من از کعبہ و آہنگ سفر جز ترک دیار و زن و فرزند نبود

اے آنکہ براہ کعبہ روے داری دانم کہ گزیدہ آرزوے داری
ایں گونہ کہ تند می خرامی، دانم در خانہ زن ستیزہ خوے داری

آں مرد کہ زن گرفت دانا نبود از غصہ فراغتش ہمانا نبود
دارد بجہاں خانہ و زن نیست درو نازم بخدا چرا توانا نبود

گیر کہ در روز حشر چوں تو یقینی بر سر دوزخ نہند تیرہ تہبنن

لیک نباشد دراں عشق مصیبت ۔۔۔ درطلب نان وجامہ کشمکش از زن
لیک نباشد دراں مقام صعوبت ۔۔۔ شو تقاضائے ناروائے مہاجن

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود ۔۔۔ ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں (غالب)
محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا ۔۔۔ یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا ۔۔۔ درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

ہرچند سبکدوش ہوئے بت شکنی میں ۔۔۔ ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگ گراں اور

ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود ۔۔۔ قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

ہے مشتمل نمود صور پر وجود بحر ۔۔۔ یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن ۔۔۔ ہم کو تقلید تنک ظرفی منصور نہیں

ہے وہی بدمستی ہر ذرہ کا خود عذر خواہ ۔۔۔ جس کے جلوے سے زمیں تا آسماں سرشار ہے

جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے ۔۔۔ ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس بھیس میں جو آئے

ہاں کھائیو مت فریب ہستی ۔۔۔ ہرچند کہیں کہ ہے نہیں ہے

ز وہم نقش خیالی کشیدہ ورنہ ۔۔۔ وجود خلق چو عنقا بسر نایاب است

آں راز کہ در سینہ نہانست نہ وعظ است ۔۔۔ بردار تواں گفت بہ منبر نتواں گفت

ہم از احاطۂ تست اینکہ در جہاں مارا ۔۔۔ قدم بہ بتکدہ و سر بر آستانۂ تست

رخ کشودند ولب ہرزہ سرایم بستند ۔۔۔ دل ربودند و دو چشم نگرانم دادند

مقصود ما ز دیر و حرم جز حبیب نیست ۔۔۔ ہر جا کنیم سجدہ بداں آستاں رسد

کفر و دیں چیست جز آلایش پندار وجود ۔۔۔ پاک شو پاک کہ ہم کفر تو دیں تو شود
خرابیم در رضایش در خرابی ہائے ما باشد ۔۔۔ ز چشم بد نگہدار و خدا یا دوست کاماں را (نظیری)

قفس و دام را گناہے نیست ۔۔۔ ریختن در نہاد بال و پر است
سپہر را تو بتاراج ما گماشتۂ ۔۔۔ نہ ہر چہ دزد ز ما برد در خزانۂ تست

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لیکر بہشت کو

تا نیفتد ہر کہ تن پرور بود
خوش بود گر وانہ نبود دام را

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بےخبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

بس ہجوم ناامیدی خاک میں مل جائے گی
یہ جو اک لذت ہماری سعی بے حاصل میں ہے

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
ناامیدی اسکی دیکھا چاہئے

ہم کو ان سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

شادم زور و دل کہ مغز شکیب ریخت
نومیدے کہ راحت جاوید بودہ است

ہر گونہ حسرتے کہ ز ایام مے کشیم
دردتہ پیالہ امید بودہ است

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا؟

ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین
ہاں منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش کرنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق ای خضر
نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لئے

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی!

پاک خور امروز و زنہار از پے فردا منہ
در شریعت بادہ امروز آب و فردا آتش است

"باید زمے ہر آئینہ پرہیز" گفتہ اند
آرے دروغ مصلحت آمیز گفتہ اند

در قالب ملا اثرش پردہ کش شد
خاکے کہ قضا در تن گوسالہ فرو ریخت

غالب اگر نہ خرقہ و مصحف بہم فروخت
پرسد چرا کہ زخ مے لعل فام چیست ؟

رضواں چو شہد و شیر بغالب حوالہ کرد
بیچارہ بازداد و مے مشکبو گرفت .

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد　　یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

اپنی شاعری کے متعلق پیشین گوئی

تا ز دیوانم کہ سرمست سخن خواہد شدن　　این مے از قحط خریداری کہن خواہد شدن
کوکبم را در عدم اوج قبولے بودہ است　　شہرت شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن
مطرب از شعرم بہر بزمے کہ خواہد زد نوا　　چاکہا تا جیب پیرہن خواہد شدن
حرف حرفم در مذاق فتنہ جا خواہد گرفت　　دستگاہ ناز شیخ و برہمن خواہد شدن

نفس شاعری کے متعلق پیشین گوئی

ہے چہ میگویم اگر این ست وضع روزگار　　دفتر اشعار باب سوختن خواہد شدن
چشم کور آئینہ دعوے بکف خواہد گرفت　　دست شل مشاطہ زلف سخن خواہد شدن
شاہد مضمون کہ اینک شہری جان و دل است　　روستا آوارہ کام و دہن خواہد شدن
زاغ زاغ اندر ہوائے نغمہ بال و پر زنان　　ہم نوائے پردہ سنجان چمن خواہد شدن

انجام گیتی

کل من علیہا فان

شاد باش اے دل درین محفل کہ ہر جا نغمہ ایست　　شیون رنج فراق جان و تن خواہد شدن
ہم فروغ شمع ہستی تیرگی خواہد گزید　　ہم بساط بزم مستی پر شکن خواہد شدن

ویبقی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام

گرد بیدار وجود از ہم گریز خواہد نشست　　بحر توحید عیانی موجزن خواہد شدن

غزل

مصور جذبات حضرت ثاقب لکھنوی مدظلہٗ

تیرا سرمہ پھیل کر پھر کیوں سمٹ کر رہ گیا
اے شب وصلت یہ کیسا داغ دل پر رہ گیا

موت ہی اچھی کہ آئی تو مراد اہل ہجر
میری شہرگ سے لپٹکر اُن کا خنجر رہ گیا

عشق کی دو ایک راہیں ہیں تو دل کو ڈھونڈ لو
مجھکو کیا معلوم کس کوچے میں مر کر رہ گیا

رات بھر نقش و نگارِ خون دل میں تھی نمود
صبح کے ہوتے ہی سادہ ہو کے دفتر رہ گیا

اس اندھیرے گھر میں تھی یارب یہ کیسی روک ٹوک
جتنا مجمع ساتھ تھا تربت کے باہر رہ گیا

نکلے عبرت کی زباں کہتا رہیگا کچھ نہ کچھ
صحن گلشن میں اگر میرا کوئی پر رہ گیا

مرنیوالوں کو نہ پوچھ اے کشتۂ نیرنگ دہر
بس اسی کی زندگی ہے جو تڑپ کر رہ گیا

خوب سنبھلا میں نگاہ مست ساقی کے حضور
کانپتے ہاتھوں سے گرتے گرتے ساغر رہ گیا

میں نہیں لیکن مرا افسانہ اُنکے دلمیں ہے
جانتا ہوں کہ کس رگ میں یہ نشتر رہ گیا

مٹ گیا دنیا سے ہر نقش وفا اے دل مگر
یہ تعجب ہے کہ تیرا نام کیونکر رہ گیا

سرفروشی ہے ہیں ہم ساقی رہے اسکا خیال
خون اُبلیگا جو خالی کوئی ساغر رہ گیا

امتحانگاہِ جہاں میں انتخاب اتنا ہوا
اک مرا سر ایک قاتل ایک خنجر رہ گیا

اُنکی بزم ناز میں تو سانس بھی دل نے نہ لی
نالہ کش برسوں کا اک تصویر بنکر رہ گیا

ایک رگ باقی ہے اسپر بھی ہے قاتل کی نگاہ
عمر ہمدم اور تیرا ساتھ دم بھر رہ گیا

رات دن کرتے ہیں ثاقب دست کے گھر کا طواف
کچھ ملے ہی گا جو گردش میں مقدر رہ گیا

ولہ

دل کہاں ہاں ذکر دل سینے کے باہر رہ گیا
خنجر آنکے پاس میرے دونش پر سر رہ گیا

آشیانے کے تنزل سے بہت خوش ہوں کہ وہ
اس قدر اترا کہ پھولوں کے برابر رہ گیا

شام ہونیکے لئے کافی ہے بزم دہر میں
وہ جگر کا داغ جو آنکھوں کے اندر رہ گیا

دنگ ہے صیاد سنکر ذکر شبہائے قفس
عمر جو گزری چمن میں اُسکا دفتر رہ گیا

قصہ طوفانوں کا دمو دو نگا دلوں سے ایکدن
گر شب فرقت رہی اور دیدۂ تر رہ گیا

مرنے والوں نے بڑی مشکل سے کھولی تھی زباں
آپ کے آگے کہاں وہ شور محشر رہ گیا

توڑ کر پھینک اس کو میرا خون ناحق پوچھکر
رات دن تجھکو رلائے گا جو خنجر رہ گیا

صبر کی سل رکھ کے دل پر کوئی اٹھا ہیں
لوح تربت بنکے سینے پر یہ پتھر رہ گیا

ضعف میں تھک کر کہیں بیٹھا تو اٹھنا محال
نقش پا ہوں رہگیا جس سرزمیں پر رہ گیا

اک لحد پر لوح حسرت نصب ہے اے ظلم کیش
یہ ہے منزل اس مسافر کی جو تھک کر رہ گیا

در پہ لینے کے لئے آیا تھا کچھ دینا پڑا
اُٹھ گیا میں سنگ در پر جب مرا سر رہ گیا

کھل گیا دروازۂ زنداں ہمیشہ کے لئے
جو مرے سر نے بنایا تھا وہی در رہ گیا

دل کے نالے سد راہ صبح تھے شام فراق
ہو کے اونچا نعرۂ اللہ اکبر رہ گیا

شکوۂ کم یابی مے دل کو زیبا ہو تو کیوں ؛
دیکھ کر ساقی کا منہ محفل میں ساغر رہ گیا

دست بُرد چرخ سے بچنا کسی کا تھا محال
درد دل ثاقبؔ مرے سینے میں کیونکر رہ گیا

تنقید و تبصرہ

"اصلاح سخن"

حضرت شوق سندیلوی نے ستم کیا کہ وقت واحد میں تیس چالیس استادوں کے شاگرد ہو گئے۔ یہ بھید کہ وہ دوسرے سے بھی اصلاح لیتے ہیں، کسی پر ظاہر نہ ہونے دیا۔ اور ہر ایک کے پاس ایک ہی غزل بھیجکر اصلاح کی درخواست کی۔ استادوں نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق مختلف بلکہ بعض صورتوں میں متضاد اصلاحیں دیں۔ ایک ہی شعر کو کسی نے لغو بتا کے کاٹ دیا دوسرے نے اسی کی داد دی، اور کئی کئی صاد بنائے چند سال میں اصلاحوں کا کافی ذخیرہ جمع ہو گیا تو ہرجائی شاگرد نے اپنی اصلی غزلیں اور سب استادوں کی اصلاحیں "اصلاح سخن" کے نام سے یکجا چھاپ دیں کہ مشاہیر شعرائے عصر کے مذاق شعر کی یادگار رہے۔ استادوں نے اصلاح کے ساتھ جو خطوط وقتاً فوقتاً بھیجے تھے انہیں بھی اصلاح سخن کے ضمیمے میں شائع کر دیا ہے۔ ان میں بعض استاد ایسی بے تکلفی کی باتیں لکھ گئے ہیں کہ شاید انہیں چھپا ہوا دیکھ کر شرمائیں گے۔ اور پیچ و تاب کھائیں گے۔ مگر لائق شاگرد اپنے التماس میں لکھتے ہیں کہ "اگر استاد کو یہ امر کچھ ناگوار گزرے تو مجھے معاف کریں میں نے جو کچھ کیا ہے وہ ضیافت طبع ارباب ذوق کے لئے کیا ہے اور اساتذۂ معتبر کے فیوض عام کرنے کے لئے" اس عذر گناہ کے باوجود مجھے امید نہیں کہ ہندوستان کے سنجیدہ حلقوں میں مصنف کی یہ شوخی مقبول ہو۔

بہر حال اصلاح سخن اپنی وضع کی بالکل نادر کتاب ہے اور اس میں ایک خاص قسم کی دلچسپی ایسی پیدا ہو گئی ہے کہ خواہ مخواہ پڑھنے کو جی گدگداتا ہے۔ لیکن موضوع کتاب کے اس اجمالی بیان پر تبصرہ ختم نہیں ہوتا۔ کیونکہ "اصلاح سخن" در اصل ہمارے شاعری

اصلاح کے اس مجموعے میں ہم اپنی شاعری کی بعض عجیب و غریب خصوصیات کا مطالعہ کے تخیل کا ایک سبق آموز مرقع پیش کرتی ہے اور شوق صاحب کی ان سولہ غزلوں اور ان کی کر سکتے ہیں۔ اگرچہ ہر شاعر خاص کر "استاد" کا دیوان ان خصوصیات کا حامل ہوتا ہے مگر ہمارے کلیات و دواوین کو اول سے آخر تک پڑھنا دشوار ہے۔ برخلاف اس کے اصلاح سخن میں مختلف شعرا کی طبع آزمائی نے بزم مشاعرہ کی سی کیفیت پیدا کر دی ہے اور اس کے مطالعہ میں دلچسپی قائم رہتی ہے۔ ان خصوصیات کے خلاف جن کا اوپر میں نے اشارہ کیا، مولوی حالی مرحوم اور نئے مذاق کے لوگوں نے پچاس برس سے لڑائی بانده رکھی ہے۔ مگر معلوم ہوا کہ ہندوستان کے بیالیس مشہور معصر شعرا میں جن سے شوق صاحب نے اصلاح کی درخواست کی، سوائے سر محمد اقبال کے باقی سب اس قدیم طرز شاعری کے دلدادہ ہیں اور گو زبان سے اسے "وہبی" کہتے ہوں لیکن حقیقت میں اسے ایک اکتسابی چیز سمجھتے ہیں اور ہے بھی یہی کہ ہم نے شعر کو ایسی محدود قسم کی صنعت بنالیا ہے کہ تھوڑی سی مشقت و مہارت سے ہر موزوں طبع شاعر بن سکتا ہے۔ گویا ہماری شاعری ایک ادنیٰ قسم کی موسیقی رہ گئی ہے۔ اگرچہ اسے گایا نہیں جاتا بلکہ بھونڈے پن سے تحت اللفظ پڑھا جاتا یا بصورت تحریر کاغذ پر لکھ دیا جاتا ہے۔

لیکن اس طول طویل بحث کو چھوڑ کر اصلاح سخن کے سلسلے میں ایک عجیب رسم کی مثال پیش کرتا ہوں جس کی معقولیت سمجھنے سے میں ہمیشہ قاصر رہا:-

شوق صاحب کی پہلی ہی غزل کا دوسرا مطلع یہ ہے ؎

یوں ترے عشق میں انگشت نما ہو جانا   آج پورا تھا مقدر کا لکھا ہو جانا

غالباً ہر استاد نے جن کے پاس غزل بھیجی گئی تھی۔ اس شعر میں کچھ نہ کچھ ترمیم فرمائی ہو گی مگر ذیل میں صرف آٹھ استادوں کے افادات نقل کرتا ہوں کہ انہوں نے اصلاح دے کر اس شعر کی کیا سے کیا صورت بنا دی۔

(۱) بزمِ اغیار میں اس بت کا خفا ہو جانا — جاں نثاروں کا ہی انگشت نما ہو جانا

(۲) مجھکو ڈر ہے کہیں تجھکو بھی کرے بدنام — یوں مرا عشق میں انگشت نما ہو جانا

(۳) وہ ترا شرم سے پابندِ حیا ہو جانا — وہ مرا خلق میں انگشت نما ہو جانا

(۴) اہلِ باطن کیلئے عزتِ دارین یہ ہے — عشقِ دلدار میں انگشت نما ہو جانا

(۵) چاند کو دعوئے الفت ہے تو سیکھے — جستجو میں تری انگشت نما ہو جانا

(۶) شہرتِ عشق کی معراج ہے مانندِ ہلال — تیرے بدنام کو انگشت نما ہو جانا

(۷) کہہ رہا ہوں سہ نوسی کہ بنسی ماتھمیل نہیں — اس طرح عشق میں انگشت نما ہو جانا

(۸) آخر اس بت کی تغافل نے کیا کام تمام — آج پورا تھا مقدر کا لکھا ہو جانا

میں تسلیم کئے لیتا ہوں کہ ان میں سے ہر شعر شاگرد کے شعر سے بہتر ہے مگر سوال یہ ہے کہ کوئی غیرتمند یا صداقت پسند شاگرد اس بات کو کیونکر گوارا کریگا کہ اپنا شعر کاٹ کے اس کی بجائے استاد کا شعر غزل میں داخل کرے اور اسے اپنا ہی سمجھے اور اپنا ہی کہہ کے دوسروں کے سامنے پیش کرے؟

ہمارے ملک میں شاعری کا جو مضحکہ انگیز تخیل لوگوں کے دل میں جاگزیں ہے۔ اس کے ثبوت میں شاید یہی ایک مثال پیش کردینی کافی ہوگی۔

اصلاحِ سخن (۲۳۴) صفحے پر بہت صاف ستھری چھپی ہے اور تین روپے میں حکیم بہاؤالدین صاحب صدیقی وہائٹ گنج ہردوئی کے پتے سے مل سکتی ہے فقط

اندھیرا

ابھی سورج ڈوبا نہیں تھا، لیکن اُسکی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ آسمان پر بادل پچھم کی طرف سر جھکائے ہوئے سنہری کرنوں میں نہائے ہوئے پیتل کی طرح چمک رہے تھے۔ ہوا دن بھر کی تھکی ہوئی رُک رُک کر چل رہی تھی، چڑیاں بسیرے کیلئے اونگھتی درختوں پر جمع ہو رہی تھیں۔ بھگواندین ایک پاسی، اور منگل، اُسی گانوٗں کا ایک کرمی شہر سے گھر واپس جا رہے تھے انکے سامنے سڑک ایک سفید تاگے کیطرح، جس کا سرا کھو گیا ہو، دور تک پڑی دکھائی دیتی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف جیسا کہ ہندوستان میں ہر جگہ پایا جاتا ہے: نالے تھے: نالے کے پار کبھی ادسر کبھی کھیت، اور ذرا دور درختوں کے آڑ سے جھانکتے ہوئے گانوٗں، یا جھومتے ہوئے آموں کے کنج۔

رات اندھیری ہونے والی تھی اور اُنکا گانوٗں ابھی بہت دور تھا، اس لئے دونو قدم بڑھائے چلے جا رہے تھے۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد بھگواندین ٹھہر گیا اور چاروں طرف دیکھ کر کہنے لگا

"اب سانجھ ہوئی گئی، دن دن تو پہنچ نہ پیبا[۱] - آوٗ جرا ستائی لیں"

ستانیکی ضرورت سب سے بڑی دلیل اُس کے پاس یہ تھی کہ دونو پسینہ میں نہائے ہوئے تھے، اور ہانپ رہے تھے۔ منگل بھی کافی تھک گیا تھا، لیکن وہ بیکار دیر کرنے پر راضی نہیں ہو سکا۔

"ستائی کے کا کری ہو، سہج سہج چلے چلو۔ اندھیری رات ماں کا مالوم کا ہوئی جائے"

"ہوئی کا جئی[۲] ہے؟ کون سا کھجانا لئے جات ہو جو تم کا چورن کا ڈر ہے"۔ بھگواندین نے کہا، اور سڑک کے کنارے ایک درخت کی جڑ پر جا کر بیٹھ گیا۔ منگل نے پورب سے بڑھتے ہوئے اندھیرے کی طرف دیکھا، پھر آگے کی طرف مگر بھگواندین کے پاس ایک جگہ ڈھونڈ لی۔

---

[۱] پائیں گے۔

[۲] ہو جائے گا

تھوڑی دیر تک خاموش رہنے کے بعد اُس نے کہا
" ہم کہن کہ رات اندہیری ہوئی ہے، سڑک جیسی ہے تم آپے جانت ہو۔ کہوں گڈھا مان بیر پر گوا تو رات بھر بیٹھ کے کون ٹانگ سینکی ہے "
گڑھے وڈھے کچھو ناہیں ہیں۔ تم یار اندہیارے مان ڈرات ہو " بھگواندین نے مسکراکر کہا اور اپنی بات کا اثر معلوم کرنے کے لئے اس نے منگل کی طرف دیکھا منگل نے تیوری چڑھائی اور زمین کو گھورتے ہوئے جواب دیا۔
" تم جیسے پہلوان کے ساتھ بھلا کون ڈرئی ہے۔ تم تو ایک ہاتھ مان دس چورن کا لٹائی دیو ...... "
ای مان گُستہ ہونی کی کون بات ہے۔ ہم تو ایسن ہنسی ماں کہدے رہن ... " بھگواندین کے لہجہ میں اس قدر افسوس اور پشیمانی تھی کہ منگل کی خفگی جاتی رہی۔ لیکن اُس نے اسے چھپانیکی کوشش کی اور کہا
" جانت ہن تم پاسی جات کے ہو۔ لاٹھی باندہت ہو۔ مگر دوسرے آدمی کا کھیال تو رکھا کرو ...... "
بھگواندین نے اس کے جواب میں صرف اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھا، ٹھنڈی سانس بھری اور ادہر اُدہر دیکھنے لگا۔
جب وہ اُٹھ کر پھر چلے تو سورج ڈوب چکا تھا۔ پچھم کی طرف سے کچھ دھندلی سی روشنی کے سوا راستہ دکھانیکے لئے اور کوئی سامان نہ تھا۔ سڑک جیسی خراب اور خطرناک منگل نے بتائی تھی نہ تھی، مگر شام کے وقت راستہ چلنے والے کو ڈرانے کے لئے، اگر وہ دل کا کمزور بھی ہو سڑک کے دونو طرف گڑھے کافی تھے، اور چھوٹے چھوٹے پل بھی، جن میں خواہ مخواہ خیال ہوتا ہے کہ چور چھپے بیٹھے ہیں۔ رفتہ رفتہ جو ذرا سی روشنی تھی وہ بھی جاتی رہی، سڑک بجائے سفید کے

لہ سینکے گا ۔ سلہ غصہ ہوئے

مٹیالے رنگ کی ہوگئی۔ گڑھوں میں اندھیرا کالے پانی کی طرح بھر گیا۔ جھاڑیوں اور درختوں نے ایک کالی کملی سی اوڑھ لی۔ درختوں پر چڑیاں چپ چاپ سو رہی تھیں اور سوا منگل اور بھگواندین کے قدموں کی آہٹ کے ہر طرف "گھنی" خاموشی تھی۔

منگل کے ہاتھ میں لاٹھی تھی، اور اتنا روپیہ بھی نہ تھا کہ اسے چوروں کا ڈر ہو لیکن اُس کی حرکتوں سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے حواس قائم رکھنے کی خاص کوشش کر رہا ہے۔ اگر کبھی اُسکا سر پےُ اُلکل تو وہ کانپتا یا گالی دیتا کسی طرح سے اپنی جھنجھلاہٹ اور گھبراہٹ کو ظاہر کرتا، اگر کبھی اسے کوئی چیز ملتی یا چلتی نظر آتی تو وہ کانپ جاتا اور غور سے اُس طرف دیکھنے لگتا۔ بھگواندین نے اُس کی کیفیت کو محسوس کیا اور دلاسے کے لئے کہنے لگا

"ہمری سمجھ ماں یو کبھوں نہ آوا کہ لوگ بھلا ڈرات کاہیکا ہیں جو کبھوں جنگل ہوئے شیر چیتے ہوئیں، سانپ بچھو ہوئیں تو باتوٹھے ہے۔ ہیاں تو سب آپنے آپ ڈرائے جات ہیں" اور یہ دکھانیکے لئے کہ اُسکا اشارہ منگل کیطرف نہیں اُس نے ایک بات[1] اور جوڑ دی "اب ہمرے اپنے گاؤں دیکھو۔ کوؤ رات کا گھر سے دس کدم باہر ناہیں جات ہے۔ بھلا یو بات کا ہوئے؟"

لیکن منگل نے تقریر کے آخری حصہ کا خیال نہیں کیا اور سمجھ گیا کہ بھگواندین نے سارا حال معلوم کر لیا ہے اور اب اُسے اپنی بہادری دکھانا چاہتا ہے۔ بھگواندین نے اُس کی بدگمانی اور بڑھا دی:

"ہم سے سب ہجار بار کہن، رات کا ہواں نہ جاؤ، دن کے بارہ بجے شہید مردن پر نہ جاؤ، درکھت پر نہ چڑھو، یو نہ کرو، اُو نہ کرو۔ ہم ایک نہ مانن، جو من مان آوا سو کیا، اور ابہیں تک دیکھو جندہ ہن۔"

منگل نے اپنی جھنجھلاہٹ دکھانیکے لئے بجائے خود بھگواندین پر حملہ کرنیکے اُسکی بات کو

---

[1] ایک بات بھی ہے۔

غلط ثابت کرنا چاہا اور منہ بنا کر کہا۔

"ہونھہ! یو تو سب ہی مگر گاؤں والن پار سال جون موچی مرگوا رہے۔ اُمّسے پوچھو بے کہن کہ ای راستے پر تم کا وہی بھوت ملے ہے جون[1] دوئی برس پہلے ایک اہیر کا بچھا کیو رہے ایک نہ سنن۔ آٹھو بھوا[3] کا۔ دوئی دن بیہوس پڑے رہے تیسرے دن ٹھنڈے ہوئی گئے۔"

منگل کے لہجے سے بھگوان دین سمجھ گیا کہ اس نے اُس کی بات بری مانی ہے، مگر بجائے جواب دینے کے اس نے سمجھانے کی کوشش کی . . . ."

"اب ای کا کوئی کا کرے۔ جی کا مرنا ہوت ہے او کی ہوس کب ٹھیک رہت ہیں"

"یو تو سبئے جانت ہیں . . . ."

"ہم تو یو جانت ہن . . . آدمی کا نہ چور ڈرائے سکت ہیں نہ شیر چیتے نہ بھوت پریت . . . آدمی خودی اپنے آپ کا ڈراوا کرت ہے . . . ہمرے چاچا ناوت رہیں . . ."

اور یہاں پر بھگوان دین نے ایک قصہ سُنایا جو اُسکے چچا کے بچپن کا ایک واقعہ تھا۔

اُسی گاؤں میں جاڑے کے موسم میں ایک مرتبہ رات کے وقت کچھ لوگوں نے آگ جلائی تھی اور اُس کے چاروں طرف بیٹھے ہاتھ پیر گرم کر رہے تھے۔ ہر طرف سے انہیں اندھیرا گھیرے ہوئے تھا، ایسا اندھیرا جس میں تاروں کی نازک شرمیلی روشنی زمین سے کہیں اوپر ہی رہ جاتی ہے جیسے تیر گھنے درخت کی شاخوں میں اٹک جاتا ہے، مگر یہ اُس اندھیرے کا پیٹ بھرنے کے لئے کافی نہ تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ایک کالا ہیبت ناک دیو اُس بیچاری آگ کو بھی تک رہا ہے۔ کبھی اِدھر سے کبھی اُدھر سے اس کی طرف لپکتا ہے اور اسکی گردن مروڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔ آگ ایک سہمی ہوئی چڑیا کیطرح کبھی جھپٹ کر اس کونے میں پناہ لیتی کبھی اس میں۔ کچھ دیر تک تو لوگ یہ تماشا دیکھتے رہے لیکن رفتہ رفتہ ان پر بھی اسکا اثر پڑنے لگا۔ اور آخر کار جب اندھیرا حملہ کرتا اور آگ اُس سے بچنے کی کوشش کرتی تو انکے

---

[1] جس نے۔ [2] کیا تھا۔ [3] ہوا کیا۔

بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے اور وہ ایک دوسرے سے اور لس کر بیٹھ جاتے، گویا کہ انہیں اپنی جان بھی خطرہ میں معلوم ہوتی تھی۔ اس وقت انہیں چاہیے تھا کہ کسی طرح کی گفتگو چھیڑ دیں اور اپنی توجہ دوسری طرف کر لیں، مگر جب کھیتی پر ویرانی ہو چکی تو سب خاموش ہو گئے اور اندھیرے کے خوف کو دور کرنے کے لئے انکی سمجھ میں کوئی بات نہ آئی۔ کوئی ایک گھنٹہ تک سب ایسے ہی سہمے بیٹھے رہے، اور کسی کے منہ سے ایک بات نہ نکلی۔ سونے کا وقت بھی آ گیا۔ لیکن آگ کے پاس سے کوئی نہ اٹھا۔

بھگواندین کا چچا جو اس زمانہ میں ایک لڑکا تھا اور اپنے بتکے پن کے لئے مشہور تھا، سب کے چہروں کو دیکھ کر بول اٹھا

"یہ تو جان پڑت ہے، ایسی رات ہو سے جہاں بھوت پریت ہیوں کی طرح درخت پر سے ٹپکت ہیں"

یہ سنتے ہی سب کے سب چلا اٹھے۔ عورتوں نے اسے برا بھلا کہنا شروع کیا مرد اسے سمجھانے لگے۔ لیکن جس خیال کو بھگواندین کے چچا نے ظاہر کیا تھا وہ سب کے دلوں میں موجود تھا۔ بے اختیار سب ڈراونے قصہ سننے سنانے لگے، اور جتنا انکا ڈر بڑھتا تھا اتنے ہی زیادہ شوق سے سب قصہ سنتے تھے۔ ایک پیاس سی سب کو لگ گئی جو بننے سے اور تیز ہوتی تھی۔

ایک نے پاس کے گاؤں کے ایک پہلوان کا قصہ سنایا۔ وہ ایک بہت بہادر آدمی تھا اور بھوت پریت کی کہانیوں پر ہنسا کرتا تھا۔ لیکن ایک مرتبہ جب وہ ایک باغ سے اندھیری رات کو گذرا تو کسی نے ایک درخت پر سے کہا،

"اب کی بچا اچھے پھنسیو[1]"

پہلوان سے لوگوں نے کہا تھا کہ بھوت پریت ناک سے بولتے ہیں، اور یہ آواز بھی ویسی ہی تھی۔ مگر پہلوان کو پھر بھی یقین نہ آیا، وہ سمجھا کہ کوئی اسے ڈرانا چاہتا ہے

---

[1] پھنسے

اور اُس نے للکار کر کہا :

"آؤ نکل آؤ۔ دیکھیں تم کا کرلے ہو"

اس کے بعد معلوم نہیں کیا ہوا۔ دوسرے دن ایک اہیر نے اُسے باغ کے کنارے پڑا پایا۔ اُسکا چہرہ نیلا ہو گیا تھا آنکھیں باہر گری پڑی تھیں۔ صاف ظاہر تھا کہ کسی نے اُس کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ اُسی کے پاس ایک ٹوٹی لاٹھی بھی پڑی تھی۔

سُننے والوں نے "دیا رے دیا رے" کی صدا بلند کی پیچھے پھر پھر کر دیکھنے لگے ایک کو چھینک آئی تو سب کانپ گئے اور چلا اُٹھے مگر یہ قصہ ختم ہی ہوا تھا کہ ایک بڈھا اپنی بیتی ایک کہانی سنانے لگا اور سب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ بڈھے کی عمر کوئی ستر سال کی تھی اور وہ بولتے بولتے اکثر کھانسنے کھنکھارنے کے لئے رُک جاتا تھا مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ اُسکا بیان اتنا اچھا تھا کہ سب سانس روکے سنتے رہے

بڈھے نے پہلے تو اپنی جوانی کا حال بتایا۔ وہ بہت تیز دوڑا کرتا تھا، اور دو اور کئی میل ایک ہی رفتار سے جا سکتا تھا۔ آس پاس کے زمینداروں میں وہ ڈاک گاڑی کے نام سے مشہور تھا اور جب کبھی کوئی سندیس بہت جلد بھیجنا ہوتا تو وہ اُسے بلایا کرتے تھے ایک مرتبہ وہ ایسے ہی کسی کام سے رات کو واپس آرہا تھا، اندھیرے میں راستہ بھول گیا اور ایک کنج میں گھس گیا جہاں ایک بھوت رہا کرتا تھا۔ وہ ایک درخت کے نیچے سے گذر رہا تھا کہ ایکبارگی اُس کی نگاہ اوپر کی طرف اُٹھ گئی اور اُس نے دو گول گول، زرد اور چمکیلی آنکھیں دیکھیں جو اُسے گھور رہی تھیں۔ وہ جانے جس کی آنکھیں رہی ہوں، اس کو معلوم ہو گیا کہ کوئی اُس پر جھپٹنے والا ہے اور وہ الٹا بھاگا۔ جیسے وہ نیچے بھاگ رہا تھا ویسے ہی درختوں پر کی کوئی چیز اچھلتی پھاندتی ہوئی اُسکا پیچھا کر رہی تھی۔ بھاگتے بھاگتے وہ ایک کھلے میدان میں پہنچ گیا اور اسی وقت کسی نے ناک سے چلا کر کہا۔

"اب کے سار نکل گیو، مگر پھر کبھوں آیو تو گلا گھونٹ دیبا"

ٹملا خاموش ہوگیا۔ اُس کے بعد ہی کسی اور نے اپنی کہانی سنائی اور یوں ہی سلسلہ جاری رہا، بھوتوں کے ڈر نے سب کو ایسا بدحواس کر دیا تھا کہ وہ آگ میں لکڑی ڈالنا بھول گئے اور جب اسکا خیال آیا تو کسی کی جرات نہ ہوئی کہ جاکر ادھر اُدھر سے کچھ لکڑیاں بین لائے ایک دوسرے کو للکارتے اور شرم دلاتے رہے لیکن معلوم ہوا کہ سب مجبور ہیں۔ وہ سب گویا کسی طاقت کے قبضے میں آگئے تھے اور اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ آگ بجھتی گئی۔ اُس کی گرمی کم ہونے لگی تو ایک دوسرے کو دھکے دے کر حلقہ سے باہر نکالنے لگے۔ کچھ لوگ ان دھکوں سے بچنے کے لئے ہمت کر کے اُٹھ کھڑے ہوئے اور آپس میں گھر جانے کے مسئلہ پر غور کرنے لگے۔ کوئی اکیلا جانے پر راضی نہیں تھا اور سب کے سب دو دو نہیں تو الگ الگ ضرور تھے۔ مگر وہ بحث ہی میں مشغول تھے کہ ایک لڑکی کے ماتھے پر ایک سوکھی پتی آکر لگ گئی جیسے ہوا کسی طرف سے اڑا لائی تھی۔ لڑکی چیخ اٹھی جو لوگ گھر جانیکے لئے کھڑے ہوئے تھے وہ سب بھاگ کر واپس آگئے اب سارے کے سارے کھڑے ہوگئے۔ سردی اور ڈر سے سب کانپ رہے تھے۔ ہرنوں کے ایک غول کی طرح جسے شکاریوں نے گھیر لیا ہو، کوئی ادھر بھاگنے کی صلاح دیتا تھا کوئی اُدھر۔ لیکن دس قدم چل کر سب پھر واپس بھاگ جاتے اور پھر ایک ہی جگہ پر جمع ہو جاتے۔ ۔

"اب بتاؤ" ٹھگوا ندین نے منگل سے پوچھا "ای سب کون بھوت دیکھن رہیں؟ سب آپے آپ تو ڈرات رہیں۔ ۔ ۔ ۔"

منگل نے باوجود اپنی خفگی کے سارا قصہ بڑے غور سے سنا تھا، اور اُسکی بھی آخرکار وہی حالت ہوگئی جو قصہ میں ان لوگوں کی تھی۔ درخت اُسے کالے بھجنگ بھوت معلوم ہونے لگے۔ جھاڑیاں عجیب عجیب خوفناک جانور بن گئیں۔ اگر آنکھیں کھولتا تو یہ اندیشہ تھا کہ کہیں کچھ دکھائی نہ دے، اگر بند کرتا تو ٹھوکر کھانے کے علاوہ یہ ڈر تھا کہ کہیں اُس پر کوئی اچانک حملہ نہ کر دے۔ اس کی کمر ٹیڑھی ہوگئی، سر جھکا کر کھانے لگا پیروں میں کپکپی آگئی

بھگوانڈین کی بات کا اُس نے کچھ جواب نہ دیا، اور نہ اپنے آپ سے یہ پوچھا کہ یہ ڈر کس کا ہے اور کیوں ہے۔ بھگوانڈین نے یہ دیکھکر کہ منگل باتیں نہیں کرنا چاہتا اپنا مطلب سمجھانے کی اور زیادہ کوشش نہیں کی، اور کسی سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ دور وہ اسی طرح چلے تھے کہ منگل ایک مرتبہ سہمی ہوئی آواز میں "ہائے رے" چلایا اور اچک کر بھگوانڈین کے پیروں کے پاس گر پڑا۔ اُس نے اتفاق سے کہیں آنکھیں پوری کھول لیں اور آگے سڑک کے پاس اسے ایک بڑا چتکبرا جانور پچھلے پیروں پر بیٹھا نظر آیا اُس نے اپنے آپ کو یقین دلایا کہ وہ ایک جھاڑی ہے اور کچھ نہیں۔ لیکن اندھیرے میں نہ حواس کہنا مانتے ہیں نہ خیال۔ جب وہ چل ذرا اور پاس پہنچا تو اُسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ جانور اٹھ کر کھڑا ہو گیا ہے منگل نے پھر اپنے حواس درست کرنے کی کوشش کی، لیکن دماغ میں جو تصویر بنی شروع ہوئی تھی وہ بنتی رہی۔ آنکھیں اُسکی قریب قریب بند تھیں، مگر اس پر بھی اُسے دکھائی دیتا تھا اُس نے دیکھا کہ جب وہ جانور کے برابر پہنچا تو جانور نے ایک چھلانگ ماری۔ . . منگل اچک کر اپنے آپ کو بچانا چاہتا تھا، مگر وہ صرف لڑکھڑا کر بھگوانڈین کے پانوں پر گر گیا۔

بھگوانڈین خود گھبرا گیا۔ اُس نے جلدی سے منگل کو اٹھا کر کھڑا کیا، اُس کے کپڑے جھاڑے اور پوچھا:

"یو تم کا بھلا ہوئی کا گو اجو آپے آپ گر پڑیو؟"

منگل نے ادھر اُدھر غور سے دیکھا اور جب اسے یقین ہو گیا کہ دراصل سب خیال ہی خیال تھا تو اُسے بہت شرمندگی ہوئی اور اپنے اوپر غصہ بھی آیا۔ مگر بھگوانڈین کے سوال کا اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"بھئی دیکھو" بھگوانڈین نے کچھ دیر انتظار کر کے کہا "تم پھر ایسا کری ہو تو ہم تم کا چھوڑ کے چلے جیبا۔ تم تو ہم ہوں کا ڈرائے دے ہو؟"

ا؎ جائیں گے

"جاؤ، چلے جاؤ۔ تم کا ہم کب روکے رہیں،" منگل نے تسو کھے لہجہ میں کہا۔ "ہم کا تمرے نباگھر نہ پہنچ پیایہ۔"

بھگوان دین کو منگل کی حرکت بہت ناپسند آئی تھی، کیونکہ وہ سمجھ گیا کہ منگل آپ ہی آپ ڈر گیا تھا۔ اُس کے بعد جب منگل نے بجائے اُسکا احسان ماننے کے اور زبان درازی شروع کی وہ خفا ہو گیا اور ارادہ کر لیا کہ منگل کو چھوڑ کر آگے نکل جائے گا لیکن کچھ قدم آگے چلنے کے بعد اسے رحم آ گیا اور اُس نے ارادہ بدل دیا۔ اب منگل کی باری تھی:

"جاؤ جاؤ، چلے کاہے ناہیں جات ہو!" اس نے دانت پیس کر کہا، جب اُس نے دیکھا کہ بھگوان دین ٹھہر گیا، "تم سار بدنام ہم کا کرت ہو اور ڈرات کھو دہو"

بھگوان دین اسکے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"ہم بچاس بار ای سڑک پر گئے ہیں، ہم کا کبھوں کچھ نہ دکھائی دیا، نہ ہم کبھوں ڈرین آج بھگوان جانے ہم کا کا سوجھا جو تم جیسے نامردن کے ساتھ ہوئی لین[۱]۔ کا کہن تمری بڑھیا کا کھیال آئی جات ہی نہیں تو گردن مروڑ کے تم کا ای نالی ماں پھینک دیتین۔ تم جیسے نامردے ......"

منگل پہلے تو بھگوان دین کو غور سے دیکھتا رہا۔ جب بھگوان دین نے گردن مروڑنے کی دھمکی دی تو اُس سے نہ رہا گیا، اور بھگوان دین نے اپنا جملہ ختم بھی نہیں کیا تھا کہ اُس نے گھما کر بھگوان دین کے ایک لاٹھی ماری۔ لاٹھی کنپٹی پر پڑی اور بھگوان دین چکر کھا کر گر پڑا لیکن منگل نے اپنے وار کا نتیجہ نہیں دیکھا۔ لاٹھی مارتے ہی اس کے کانوں میں شور سا ہونے لگا۔ آنکھوں کے سامنے ایک پردہ پڑ گیا اور بغیر سوچے سمجھے وہ اُس جگہ سے بھاگا۔ جتنا وہ تیز بھاگتا تھا اور جتنی دور وہ نکلتا جاتا تھا اُتنا ہی اس میں اسکا احساس بڑھتا جاتا تھا کہ اُس کی حرکت کی خبر مشہور ہو گئی ہے۔ زمین درخت، ہوا سب جان گئے ہیں اور

---

[۱] پائیں گے۔ [۲] ہو لئے

اُس کے لئے کوئی بچنے کا طریقہ نہیں۔ کبھی ایکبارگی اُسے سامنے ایک گڈھا نظر آتا، اور جب وہ اسے پھاند کر دوسری طرف پہنچتا تو معلوم ہوتا کہ کچھ بھی نہیں تھا۔ کبھی اُسکے سامنے درخت کا درخت آکر کھڑا ہوجاتا اور جب وہ سمجھا کہ بس اب ٹکر گئی اور سر پھٹا تو معلوم ہوجاتا تھا کہ سوائے ہوا کے کچھ نہیں۔ کبھی اُسے خیال ہوتا کہ درخت نالے نالیاں سب اُس کے پیچھے دوڑے آرہے ہیں اور سب مل کر اُسکا راستہ روک لیں گے۔ درختوں اور نالے نالیوں کی عداوت نے تو اُس کے دل میں اتنی وحشت نہیں پیدا کی۔ لیکن جب اسے ایکبارگی وہ قصے یاد آتے جو بھگوا دین نے اسے سنائے تھے تو اس کی ہمت جواب دیدیتی۔ مگر کیا ہوسکتا تھا؟

منگل بھاگتا رہا۔ کچھ دیر بعد جب اُسکا دم ٹوٹ گیا تو اس نے اپنی رفتار کم کی اور اپنے آپ سے پوچھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ اتفاق سے وہ سڑک ہی پر جا رہا تھا اور کچھ سوچنے کے بعد اُس نے یہ بھی معلوم کرلیا کہ وہ گاؤں ہی کی طرف جا رہا ہے لیکن اسی پر اُسے یاد آگیا کہ آگے کے راستہ پر درخت بہت گھنے ہیں اور سڑک کے دونو طرف اونچے اونچے ٹیلے بھی ہیں۔ منگل نے پکا ارادہ کیا کہ اب بیکار کسی چیز سے نہ ڈرے گا۔ دل میں جو وہم باقی تھا اُسے نکالنے کی کوشش کی۔ مگر دیکھا تو ہاتھ میں لاٹھی بھی نہیں تھی۔ واپس جانے کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہا۔

پہلے تو وہ آہستہ آہستہ چلتا رہا، اور اپنے اوپر قابو رکھا لیکن پھر بھی ذرا سی آہٹ بھی ہوتی تو اُس کے کان کھڑے ہوجاتے۔ ایک مرتبہ سڑک کے پاس ایک درخت پر کچھ آواز سی ہوئی تو اُس نے اپنی چال تیز کردی۔ پھر یہ سوچ کر کہ اس رفتار سے چلا تو بہت دیر ہوجائیگی اُس نے دوڑنا شروع کردیا۔ دوڑ رہا تھا کہ اُسے پیچھے سے کسی جانور کے چلنے کی آواز سنائی دی، اور مڑ کر دیکھا تو واقعی کتے کے قد کا کوئی جانور آرہا تھا۔ منگل نے فوراً طے کرلیا کہ یہ بھیڑیئے کے سوا کچھ نہیں اور پھر اسی طرح سے بدحواس ہوکر بھاگا۔ اگر

اُس نے اپنے پیچھے ایک نظر اور ڈالی ہوتی تو اُسے معلوم ہو جاتا کہ جیسے وہ ایک طرف کو بھاگا تھا ویسے ہی لومڑی بھی دوسری طرف کو بھاگ گئی تھی۔ لیکن اُس میں اب اتنی جرات کہاں تھی.....

وہ اس قدر تھک گیا تھا کہ بیہوش ہو کر گرنے والا تھا، مگر آخری وقت اُس کو دور سڑک پر ایک لمبا سا جسم پڑا ہوا دکھائی دیا۔ منگل نے دیکھتے ہی پکارنا شروع کیا:

"بھگوان دین! بھگوان دین!"

اُس کے پکارنے سے پاس کے درختوں پر کچھ چڑیاں جاگ اٹھیں اور پر پھڑپھڑانے لگیں۔

شذرات

کیمبرج یونیورسٹی نے عہد جدید کی تاریخ پر مستند اور جامع کتابوں کا جو سلسلہ شائع کیا ہے وہی اہل علم کو اس علم پرور یونیورسٹی کا ممنون احسان بنانے کے لئے کافی تھا اب جو نیا سلسلہ عہد قدیم کی تاریخ کا چھپنا شروع ہوا ہے وہ اس علمی کارنامے کی تکمیل کر دے گا اور کیمبرج کی عزت و احترام اور احسان مندی کا نقش طالبان علم کے دلوں میں اور بھی گہرا بٹھا دے گا۔ اس سلسلہ میں تمام اقوام عالم کی قدیم تاریخ لکھی جائے گی لیکن مرکزی حیثیت یونان و روما کی تاریخ کو حاصل ہوگی

بعض وقت دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یورپ کے علمی حلقوں میں قاموسوں، معلموں وغیرہ کی اتنی کثرت کہیں ذہنی انحطاط کا پیش خیمہ تو نہیں ہے مختلف قوموں خصوصاً مسلمانوں کی تمدنی تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ جب لوگوں کے ذہن میں جودت، نظر میں بلندی اور فکر میں اجتہاد نہیں رہتا تو وہ بجائے نئی کتابیں لکھنے کے پرانی کتابوں کے مضامین کو جمع کرکے قاموس اور معلم بنایا کرتے ہیں یا اُنکی شرحیں لکھا کرتے ہیں یوروپ میں بظاہر یہاں تک تو نوبت نہیں پہنچی کیونکہ جو قاموس وہاں شائع ہوتے ہیں محض پرانی کتابوں کا مجموعہ اور خلاصہ نہیں بلکہ نئے مصنفوں کی علمی جد و جہد کا نتیجہ ہوتے ہیں پھر بھی کبھی کبھی شبہ ہوتا ہے کہ یوروپ کو فکر و تحقیق کی جو داد دینا تھی دے چکا اب وہ محض اپنی ذہنی کمائی کو جمع اور محفوظ کرنے کی فکر میں ہے۔

حال میں جرمنی میں قدر دانان شکسپیر کی انجمن کا باسٹھواں سالانہ جلسہ ہوا تھا جس میں بہت سے وسیع مقالے شکسپیر کی تصانیف پر پڑھے گئے جن میں خاص طور پر قابل ذکر فریڈرک

گونڈولف کا مضمون انٹانی وکلیوپٹرا پر ہے۔ علاوہ شیکسپیر کی تصانیف کی ادبی اور علمی تنقید کے اس انجمن کے فرائض میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ اپنے ملک کی اسٹیج کو شیکسپیر کے ڈراموں کا قدر دان بنائے۔ انجمن کی رپورٹ میں بیان کیا گیا کہ ۱۹۲۵ء میں شیکسپیر کے مختلف ڈرامے ۱۸۰۵ بار جرمنی کے تھیٹروں میں دکھائے گئے۔ اس انجمن کے جلسوں اور سالانہ کارگذاری کی کیفیت ہر سال ایک Year Book میں چھپتی ہے جس کا مطالعہ ہر شیکسپیر کے شیدائی کے لئے لازمی ہے۔

لندن میں گذشتہ ماہ ڈاکٹر مانٹیسوری نے اپنے طریقۂ تعلیم کو سکھانے کے لئے متعدد لکچر دئے۔ انہوں نے کہا کہ اس طریقۂ تعلیم کے بنیادی اصول دو ہیں ایک تو یہ کہ اشیاء کے علم کے لئے محض تصور یا مشاہدہ کافی نہ سمجھا جائے بلکہ جس شے کا علم حاصل کرنا ہو اُسکا استعمال کرایا جائے۔ دوسرے یہ کہ تعلیم کے عمل میں بچہ کی توجہ کا مرکز استاد یا اُسکا حکم نہ رہے بلکہ خود اپنے افعال۔ انہیں اصولوں کے ماتحت بچوں کے ہاتھ سے ایسے بہت سے کام کرائے جاتے ہیں جن میں خاص توجہ کی ضرورت ہو تاکہ ایک تو کام کی فکر میں بچہ استاد کی موجودگی کو بھول جائے اور دوسرے اپنے کام کے موضوع کا واضح اور گہرا علم اُسے حاصل ہوجائے۔ ڈاکٹر صاحبہ نے مثال کے طور پر کئی کاموں کا ذکر کیا مثلاً کمرے میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک اس طرح دوڑنا کہ شور نہ ہو۔ ایک گلاس سے دوسرے گلاس میں پانی اس طرح اونڈیلنا کہ ایک قطرہ بھی نہ گرنے پائے وغیرہ وغیرہ

ان میں سے پہلا اصول ظاہر ہے کہ بہت محدود دائرہ میں کام آسکتا ہے جو چیزیں علم کی موضوع ہیں اُنمیں سے بہت کم اُس طرح "استعمال" ہوسکتی ہیں جس طرح ڈاکٹر صاحبہ چاہتی ہیں۔ پھر بھی جہاںتک محسوسات کا تعلق ہے واقعی اس طریقہ سے بہتر کوئی طریقۂ مشاہدہ کا نہیں ہے

الا صاحبہ کا دوسرا اصول بھی بعض شرطوں کے ساتھ قبول کئے جانے کے قابل ہے اس میں شبہ نہیں کہ بچوں کی طبیعت کو کسی چیز پر پوری طرح جمانے سے اُن میں یکسوئی، سلیقہ اور محنت ظرپیدا ہوگی اور اپنی شخصیت اور ذمہ داری کا احساس بھی ہوگا لیکن یہ طریقہ ہمیشہ مفید نہیں ہے تعلیم کی جان وہ تعلق ہے جو استاد اور شاگرد میں ہوتا ہے اور وہ اثر جو ایک دوسرے پر پڑتا ہے اس لئے جہاں استاد کے لئے بچہ کی "شخصیت" کا احساس ضروری ہے ہاں کبھی کبھی بچہ کے لئے بھی یہ بہتر ہے کہ اُسکی توجہ کا مرکز استاد کی شخصیت ہو۔

کسی پچھلی اشاعت میں کلکتہ یونیورسٹی کے جلسہ تقسیم اسناد کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر جادو ناتھ سرکار کے خطبۂ صدارت پر تبصرہ کر چکے ہیں۔ حال میں پروفیسر رادھاکرشن نے بنگال کی انجمن مدرسین کالج و یونیورسٹی کے جلسہ میں جو تقریر کی ہے وہ ہمارے اُن خیالات کی بہت پر زور تائید کرتی ہے جنکا اظہار ہم نے اس موقعہ پر کیا تھا۔ پروفیسر صاحب دوران تقریر میں فرماتے ہیں "حکومت (ہند) کی تعلیمی پالیسی اپنے مقصد اور دائرہ عمل کے لحاظ سے بہت محدود رہی ہے۔ وہ ہندوستانیوں کو ایک بیرونی حکومت کے اطاعت کیش اور کارگزار آلۂ کار بنانے میں کامیاب ہوئی لیکن انہیں ایک آزاد قوم کے خوددار شہری بننے میں اس نے کوئی مدد نہیں دی۔"

جن مقاصد کو پیش نظر رکھ کر ہندوستانی مدارس میں تعلیم دیجاتی ہے انکے متعلق پروفیسر صاحب فرماتے ہیں۔

"تاریخ ہندوستان کی تعلیم محض اس غرض سے دیجاتی ہے کہ ہمارے دل پر یہ نقش ہوجائے کہ ہندوستان ناکام رہا۔ غلامی کی سب سے بڑی شکل وہ مایوسی اور افسردہ دلی ہے جو مفتوح قوموں میں پیدا ہو جاتی ہے اور جس کے سبب سے انہیں اپنی ذات پر بھروسہ نہیں رہتا۔ سچی تعلیم کا منشا یہ ہونا چاہیے کہ افتخار قومی اور خودداری کی چنگاری

کو ان طوفانوں سے بچا کر جو اسے معدوم کرنا چاہتے ہیں روشن رکھے۔ اگر ہماری دولت اور وسائل معاش جاتے رہیں تو ہم انہیں کل حاصل کر سکتے ہیں لیکن اگر ہمارے دل سے قومی احساس جاتا رہے تو ہمارے بچنے کی کوئی امید نہیں۔ گرے ہوئے اٹھ سکتے ہیں مگر مرے زندہ نہیں ہو سکتے۔"

پروفیسر صاحب حکومت پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ اس نے قومیت کو زندہ کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی ورنہ جب امریکہ باوجود اس قدر اختلاف کے ایک قوم بن گیا تو ہندوستان میں قومیت پیدا ہو جانا محال کیوں سمجھا جائے۔ آپ یونیورسٹی میں رفارم کے بڑے حامی ہیں۔ آپ کے خیال میں یونیورسٹیوں کو قوم سے بہت گہرا تعلق ہونا چاہئے اور ہر یونیورسٹی کی مجلس تعلیمی میں قوم کے نمائندوں کی کافی تعداد ہونا چاہئے۔ موجودہ صورت کہ یونیورسٹیوں کی مجالس تعلیمی ایک طرح کا دربار بن گئی ہیں جن میں کرسی دینے کے لئے صاحبان منصب وجاہ کی تلاش ہوتی ہے۔ آپ کے خیال میں سخت قابل افسوس ہے۔

خدا کرے پروفیسر صاحب کی یہ تقریر محض بنگالی خطابت کا نمونہ ثابت ہو بلکہ اس کا کوئی اثر خود پروفیسر صاحب کی سیرت و عمل پر بھی ظاہر ہو۔

کتبہ الیس ایم نصیر

جلد | ماہ ذی الحجہ ۱۳۴۵ھ مطابق جون ۱۹۲۷ء | نمبر ۶

وائے براؤن!

ذهبوا به وكل بالخلفه — صعقات موسى يوم دك الطور

فيه الفصاحة والسماحة والتقى — والبأس اجمع والحجى والخير

يبكى عليه وما استقر قراره — فى اللحد حتى صافحته الحور

والشمس فى كبد السماء مريضة — والارض واجفة تكاد تمور

(متنبی)

[illegible] ہستی ہے جس نے علوم عربیہ و فارسیہ کے زبردست عالم اور مشرق کے فدائی، [illegible] [illegible] نہ سنا! ان علوم کا کون ایسا شایق ہے جو اُن سے واقف نہیں، لیکن ہے [illegible] اس کی علم دوستی، مشرق پرستی اور شرق نوازی سے [illegible] [illegible] ہونے کے بعد کون ہے جس [illegible]

پروفیسر مرحوم کی ترکوں اور ایرانیوں کے ساتھ فطری محبت والفت، انکی طبعی مشرق پسندی اور مشرق پرستی، ایران اور ایرانیوں کے لئے انکا عشق مفرط، شغف شدید اور ازخود رفتگی، علوم شرقیہ کی طرف انکا طبعی ذاتی میلان، انکی تحصیل میں انکی مافوق العادت جد وجہد، ان علوم کی خدمت میں انکی غیر معمولی محنت، جانفشانی، تن دہی، فداکاری، ازخودگذشتگی، اور دائمی مستعدی، انکا علمی مذاق سلیم، انکی وسعت نظر، انکی گوناگوں اور بوقلمون علمی دلچسپیاں، انکی حق پسندی اور صداقت پروری، اور سچائی کی راہ میں انکی مختلف النوع ذاتی قربانیاں، احباب کے ساتھ انکی محبت قلبی، اور طلبہ کیساتھ انکا مخلصانہ مربیانہ بلکہ پدرانہ برتاؤ، انکی طبعی ظرافت، سلسل عالمانہ گفتگو اور دلکش تقریر وتحریر، انکے عادات واطوار، رفتار وگفتار، الغرض انکی ہر ادا اور انکا ہر انداز اہل مشرق کی محبت ومودت میں ڈوبا ہوا تھا، اور مشرقیوں کی دلکشی، اور دلربائی کے لئے ساحرانہ اثر رکھتا تھا۔

مشرق کی فرط محبت، عشق مفرط اور غایت غلو کیوجہ سے اسکی کمزوریوں میں انکو فطرت کی اصلی طاقت دکھائی دیتی تھی، مشرق کے پرانے نیچے کچے جھونپڑے، گندہ شہر، تاریک مکانات بیجا تکلفات اور تکلیف دہ رسوم میں انکو روح پرور خوبیاں اور حقیقی انسانیت کی سچی تصویر نظر آتی تھی۔ برون کے سفرنامہ ایران کا ایک ایک حرف غور سے پڑھو اور دیکھو کہ ایرانیوں کی کمزوریوں کو کیسے دلچسپ الفاظ میں بیان کرتے ہیں اور انکی ہر ادا پر کس طرح لوٹ ہوے جاتے ہیں، انکے تہذیب وتمدن پر کس طرح دل دیتے ہیں کل مستشرقین یورپ کی زندگی کا بغور مطالعہ کرو اور پھر انکا برون کی زندگی سے مقابلہ کرو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ برون اور دیگر مستشرقین یورپ میں کیا فرق ہے۔ مرزا محمد قزوینی کی رائے بالکل صحیح ہے کہ جبسے یورپ اور امریکا میں مشرقی عربی اور فارسی علوم وفنون کا چرچہ ہوا اُس زمانہ سے آجتک ایک بھی ایسا مستشرق نہیں پیدا ہوا جس نے ان علوم وفنون کی خدمت خلوص نیت، اور مشرق اور علوم مشرقی کی محبت خالص اور مودت محض کی وجہ سے کی ہو، اس کلیہ سے اگر کوئی مستثنیٰ ہے تو صرف برون کی ذات۔ انکے علاوہ ایک یورپین یا امریکن مستشرق نے بھی اُس محبت خاص خالص قلبی سے جو زوایا نہفتہ ہائے روح میں جاگزیں ہو

اور تمام شوائب اغراض سیاسی وجاہی ومالی سے بالکل مبرا اور معرا ہو، ادبیات، ذوقیات اور معنویات ایران کی آجتک ایسی زبردست خدمت نہیں کی۔ یورپ میں علوم عربیہ وفارسیہ کی تاریخ پر ایک غائر نظر ڈالو تو تمہیں مرزا محمد کی رائے واضح ولائح ہوجائے گی اور معلوم ہوگا کہ مستشرقین یورپ میں ایک ہی ایسی ہستی پیدا ہوئی جس کو مشرق اسکے تہذیب وتمدن اور علوم وفنون کیساتھ دلی ہمدردی، اور سچی دلچسپی تھی اور وہ ہستی براؤن کی تھی۔

ممالک مغربی میں علوم مشرقی کی تحصیل وتدریس کی ابتدا تیرہویں صدی سے خیال کیجاتی ہے جبکہ مجلس مستشرقین یورپ نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ عربوں کے علوم وفنون کو پوری سعی وکوشش کیساتھ حاصل کیا جائے، اسی فیصلہ کے بعد فرانس انگلستان اور اٹلی کی یونیورسٹیوں میں عربی پروفیسر کا عہدہ قائم کیا گیا اور عربی زبان کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام کیا گیا۔ فرانس انگلستان اور اٹلی کے افکار واعمال کا اثر جرمنی پر بھی پڑا۔ ۱۵ صدی کے وسط میں آلات طباعت کی ایجاد واختراع کیوجہ سے عربی کتابوں کے لاطینی تراجم تمام یورپ میں شائع ہوگئے، اور سولہویں اور سترہویں صدی میں یہی لاطینی تراجم یورپ کی اکثر یونیورسٹیوں میں درس میں رہے اٹھارہویں صدی میں پرشیا کے بادشاہ فریڈرک دی گریٹ کی علم دوستی اور علماپروری کی بدولت جرمنی میں علوم مشرقیہ کے مذاق کو بھی بہت زیادہ ترقی ہوئی، رفتہ رفتہ یہ ذوق وشوق یورپ کے چپہ چپہ میں سرایت کر گیا، اور انیسویں صدی میں جب مشرق کا تعلق یورپ کیساتھ مختلف سیاسی وجوہ سے بڑھا اور اسٹیم شپ کی ایجاد کی بدولت یہ تعلق اور زیادہ گہرا ہوا تو اہل یورپ میں مشرقی علوم کا مذاق بھی زیادہ عام اور وسیع ہوگیا۔

اٹھارہویں صدی کے آخری حصہ سے نقل وتقلید کی جگہ عقل وحجت نے لینی شروع کی اصول استدلال طریقہ فکر اور انداز تخیل میں ایک زبردست تغیر پیدا ہونے لگا۔ ان جدید حالات کیوجہ سے ایک طرف تو علوم جدیدہ کی بنیاد پڑنی شروع ہوئی۔ دوسری طرف قدیم علوم کی نئے اصول کے مطابق تحقیق تدقیق اور تنقید کیجانے لگی۔ تلاش اور جستجو کی زبردست لہر زندگی اور

اس کی ہر شاخ میں نفوذ کر رہی تھی، ہر علم اور ہر فن کی بنیاد استقرا کے اصولوں پر رکھی جا رہی تھی۔ مشرقی علوم اس رو کے اثر سے نہ بچ سکتے تھے نہ بچے۔ قدیم غلط لاطینی تراجم پر اعتبار کرنے کی جگہ اصل عربی کتابوں کا مطالعہ کیا جانے لگا اور عربوں کے علوم و فنون کی از سر نو تحقیق و تدقیق شروع ہوئی۔ انیسویں صدی میں ڈچ، جرمن، فرانسیسی اور چند انگریزی مستشرقین نے اس کے متعلق جان توڑ کوششیں کیں، کمیاب عربی کتابوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر انکی تصحیح کی، اور بغایت احتیاط کے ساتھ انہیں شائع کیا اور انکے ساتھ مختلف قسم کی فہرستیں ضم کیں جنکی وجہ سے انکے مطالعہ میں آسانی ہو گئی۔ بعض کتابوں کے صحیح جدید تراجم شائع کئے۔ یورپ کے مختلف کتبخانوں میں عربی و فارسی وغیرہ کی کتابوں کی جو کثیر تعداد اب تک جمع ہو چکی تھی انکا تنقیدی مطالعہ کیا اور انکی تفصیلی فہرستیں طبع کرائیں۔ یونانی اور دیگر زبانوں کے عربی تراجم کا اصل کتابوں سے مقابلہ کیا اور عربوں کی محنت و مشقت کی داد دی اور بعض مقامات میں انکی غلطیاں بیان کیں۔ بعض موضوع پر مختلف زمانوں کے عرب مصنفین اور نیز ایک ہی زمانے کے مختلف مصنفین کی تصنیفات کا مقابلہ کر کے ان موضوعوں پر قابل قدر تنقیدی کتابیں لکھیں، عرب علوم و فنون اور اسلامی اقوام کی تاریخ پر محنت و جانفشانی کے ساتھ کتابیں تحریر کیں۔ عربی فارسی اور دیگر مشرقی زبانوں اور علوم کی اشاعت اور ترقی کے لئے انجمنوں اور رسالوں کی بنیادیں رکھیں جنکی ایک کثیر تعداد آج بھی قابل قدر کام کر رہی ہے اسطرح انیسویں صدی میں فلائشر، ڈریسی، ڈوزی، خولسن فلوگل، گولڈزیہر، وخوے، اسٹائن شنائیڈر، ہامر، رائٹ، نولڈکے، زخاؤ، وغیرہم نے علوم مشرقیہ کے بعض شاخوں کے تنقیدی مطالعہ کو حد تک پہنچا دیا، اور بعض علوم کے جدید طریقہ مطالعہ کی بنیاد رکھدی۔

یہ ہے یورپ کے علوم مشرقیہ عربیہ و فارسیہ کے متعلق جد و جہد اور کوشش اور تلاش و جستجو کا مختصر خاکہ مغرب کی اس محنت و جانفشانی کا شکریہ ادا کرنیکے لئے اگر مشرق کا ایک ایک ذرہ بھی یکتن اور یک زبان ہو کر کوشش کرے تو منت پذیری کا حق ادا نہ ہوگا۔ لیکن اگر

اس تاریخ کا نظرِ غائر سے مطالعہ کیا جائے اور اس مبارک اور قابلِ آفریں ارادہ و اہتمام احیائے علوم مشرقیہ کے مالہ و ماعلیہ کا تجزیہ و تحلیل کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ ساری کدوکاوش تن دہی اور فداکاری، مشرق کی خالص محبت اور علوم مشرقیہ کی ان میل مودت کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ اس کے ہر طبقہ میں خودغرضی کا قوی عنصر اس زبردست حرکت کا اصلی باعث تھا۔

تیرھویں صدی کا یورپ کا اہم فیصلہ جو اس تمام تحریک کا اصلی ابتدائی باعث تھا، وہ خود مشرق کی ہمدردی پر مبنی تھا، بلکہ اس سے نفرت و کراہت پر، حروب صلیبیہ میں عربوں سے زبردست اور فاش شکستیں کھانے کے بعد عیسائی یورپ کو یہ خیال ہوا کہ عربوں پر فتح حاصل کرنے کے لئے انکے علوم کو حاصل کرنا ضروری ہے جب عربوں کے علوم یورپ کے قرون وسطےٰ کے علوم و فنون سے اعلیٰ و افضل ثابت ہوئے تو انہوں نے قوائے دماغی کی تربیت و تکمیل کے لئے انہیں علوم و فنون کو پڑھنا شروع کر دیا، اور جب اس میں انکو فی الجملہ کامیابی حاصل ہوئی تو اسے ان لوگوں نے اپنی مشرقی فتوحات کا آلہ اور ذریعہ بنالیا، یہی وجہ ہے کہ یورپین مستشرقین کی تصنیفات میں اکثر اہل مشرق کے متعلق بیجا حملے، یونانیوں اور رومیوں کی اہل مشرق پر تقریباً ہر حیثیت سے تفوق کی غیر منصفانہ کوشش اکثر نظر آتی ہے۔

برون کی ذات ان تمام کمزوریوں سے پاک ہے انکا علوم عربیہ کے ساتھ شغف اور شوق خالص محبت اور مودت پر مبنی ہے انہوں نے تو جیسا کہ آئندہ کی تفصیل سے معلوم ہوگا خود انگلستان کی ایران کے متعلق جابرانہ سیاست کے خلاف ایسی زبردست آواز بلند کی کہ حکومت برطانیہ کو بھی سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ برون کی زندگی کی تصویر کے ہر خط اور ہر رنگ روپ سے صداقت اور حق پرستی کی ادا ظاہر ہوتی ہے اور ہمارے ملک کے نوجوان تو اس کے ہر خط و خال سے اپنی آئندہ زندگی کا پورا خاکہ تیار کر سکتے ہیں۔

ابتک ہندوستان کے چند رسائل میں پروفیسر مرحوم کے متعلق جو مضامین شائع ہوئے ہیں ان میں انکی زندگی کا ایک رخ بھی اچھی طرح نہیں دکھایا گیا ہے لہذا آئندہ چند صفحات میں برون کی زندگی کے عام حالات، ان کی علمی خدمات اور انکی شخصیت کے متعلق ایک مختصر لیکن حتی الوسع مکمل اور تنقیدی

تبصرہ پیش کرنیکی کوشش کیجائے گی۔

برعان کی پیدائش اور انکی ابتدائی تعلیم | انگلستان کے حصہ گلوسٹر شایر میں دورسلے کے قریب ایک جگہ اولے ہے اسی تعلم میں پروفیسر ایڈورڈ گرنیول برون، رفروری ۱۸۶۲ء میں پیدا ہوئے تھے انکی والدسر بنجامن برون خوشحال آدمی تھے۔ ہاتھرن لیسلی کمپنی جہاز سازان Hawthorn Leslie & Co Engineers & Shipbuilders سے تعلق رکھتے تھے، زمانہ مدید تک کمپنی مذکور کے رکن رکین اور صدر رہے تھے۔ بنجامن موصوف کا خیال تھا کہ اپنے نوزائیدہ صاحبزادہ کو انجنیری کی تعلیم دیکر اپنا قائم مقام بنائیں۔ چنانچہ انہوں نے اسی خیال سے اپنے ہونہار بچہ کو پہلے توگلینالسونڈ کے اسکول میں داخل کیا اور اسکے بعد ایٹن کے مشہور آفاق مدرسہ میں بھیجدیا لیکن فطرت کی نیرنگیاں اور طبائع کا تقاضا دیکھو کہ جس انداز کے اسکولوں کی تعریف و تمہید میں گبن جیسا ذہین طباع اور نقاد مورخ اور مشہور انشا پرداز اپنی ذاتی تحریر کردہ سوانح عمری میں رطب اللسان ہے وہ برون جیسے زبردست عقیل و فہیم اور ذوہین اور غائر دماغ رکھنے والے ادیب اور مشہور و معروف مورخ ادبیات کی نظر میں نوجوانوں کے قوائے عقلی و دماغی کے لئے سراسر مضر اور نقصان رساں دکھائی دیتے ہیں۔ بہرحال کمسن برون نے بادل نخواستہ اپنی ابتدائی زندگی کے چند عزیز سال یہاں کسی طرح صرف کئے اور ۱۸۷۷ء میں تقریبا ساڑھے پندرہ سال کی عمر میں یونانی اور لاطینی زبانوں کا علم و شوق حاصل کئے بغیر، انہوں نے ایٹن کے اسکول کو خیرباد کہا۔

اس کے بعد کچھ توکمسنی اور کچھ انجنیری سے طبعی نفرت کیوجہ سے تقریبا دو سال کسی کالج اور یونیورسٹی میں داخل نہوئے۔ اسی زمانہ میں ترکوں اور روسیوں کی جنگ چھڑی، اور ترقی کرتی رہی اس جنگ نے برون کی آئندہ زندگی کی کایا پلٹ دی، اور ایڈورڈ برون کے متعلق انکے والد کے سارے خیالات پر پانی پھیر دیا۔ ابتداء تو اس جنگ میں عام کمسن انگریز طلبہ کی طرح معمولی دلچسپی لیتے رہے اور جنگ کی خبریں اور ارباب حل و عقد حکومت برطانیہ کے اس جنگ کے متعلق عام خیالات تحقیقات، اور رویے کا نقادانہ اور غائر مطالعہ کرتے رہے لیکن رفتہ رفتہ ترکوں کی شجاعت، حقانیت

مظلومیت انکی پے درپے شکست اور حب وطن میں انکی غیر معمولی قربانیوں نے کمسن برون کے ننھے سے دل کو موہ لیا۔ یہ معصوم اور حق پسند بچہ انگریزوں کا ترکوں کے ساتھ غیر منصفانہ برتاؤ انکے خلاف متعصبانہ پروپگنڈا، اور جابرانہ جانبداری کی تاب نہ لاسکا۔ اسکا دل ترکوں کی محبت و عشق سے لبریز ہوگیا چنانچہ برون اپنے سفرنامہ ایران میں خود لکھتے ہیں۔ کہ جنگ کے ختم ہونیکے قبل ترکوں کی حمایت میں اپنی جان بھی دیدینے کو تیار تھا، اور سقوط پلونا کا میرے دل پر ایسا سخت صدمہ پہنچا تھا کہ میں یہ محسوس کرتا تھا کہ یہ مصیبت خود میرے ملک کے کسی حصہ پر نازل ہوئی ہے۔

اس جوش محبت اور عشق مفرط کا یہ قدرتی تقاضا تھا کہ انکے دل میں ترکوں کی امداد و اعانت کا خیال پیدا ہو چنانچہ ایسا ہی ہوا، اپنی کمسنی کے جوش و خروش میں انہوں نے یہ ارادہ کیا کہ بجائے انجنیری کے فوجی تعلیم حاصل کریں اس کے بعد انگریزی فوج میں داخل ہوکر اپنی فوجی تعلیم کی تکمیل کریں جب انگریزی فوج میں کپتان کے عہدے تک ترقی کرجائیں تو انگریزی ملازمت سے استعفاء داخل کرکے ترکی میں داخل ہوجائیں۔ برون خود لکھتے ہیں کہ ان خیالات کو لوگ مجنونانہ یا احمقانہ بیوقوفی اور کمسنی کی بدعقلیوں سے زیادہ وقعت نہ دینگے، لیکن وہ کمسنی کی بدعقلی کا نتیجہ ہو یا حق پسندی اور صداقت پرستی کا یہ سچے حقایق ہیں اور میرے اُس زمانہ کے تخیلات کی ہوبہو تصویر پیش کرتے ہیں۔

ان خیالات کی تکمیل و تعمیل کے لئے ایک مدت مدید کی ضرورت تھی اور بچپن کے جوش و خروش کا یہ تقاضا تھا کہ خیال و عمل میں زمانی اتحاد ہو، لہذا محبت و شغف کے جوش اور تموج نے اپنے لئے ایک دوسرا راستہ نکالا، اور برون نے ترکی زبان سیکھنے کا قصد کیا۔ انگلستان کے جس حصہ میں برون کا قیام تھا وہاں ترکی زبان سیکھنے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ بلکہ وہاں کے کسی باشندے کو یہ خبر بھی نہ تھی کہ دنیا میں کوئی ترکی زبان بھی ہے نہ اسکی اطلاع تھی کہ اس زبان کے حصول کی کیا صورتیں اور ذرائع ہوسکتے ہیں۔ بہت جستجو اور تلاش کے بعد برون کو بارکری ترکش گرامر کا پتہ چلا، اور کسی استاد کے نہ ملنے کی وجہ سے انہوں نے خود ہی اسکا مطالعہ شروع کیا۔ ابتدا میں تو انکو اسکے مطالعہ میں

بڑی دقتیں پیش آئیں غیر زبان جس کی الف بے بھی نہ معلوم اُس کے قواعد کا بلا امداد واعدے سمجھ لینا
کوئی آسان کام نہیں ہے اور وہ بھی ایسی زبان جسکا ہر عنوان انگریزی اور یورپین زبانوں سے بالکل علیحدہ
اور جداگانہ ہو لیکن جب سچا شوق راہبر ہوتا ہے تو وہ خود ہی سیدھے راستہ پر لگا دیتا ہے۔ ابتدا میں
تو برون کو اس بات کا پتہ بھی مشکل سے اور ایک عرصہ کے بعد چلا کہ ترکی زبان دہنی جانب سے لکھی
جاتی ہے۔ باوجود ان تمام دقتوں کے انہوں نے کچھ دنوں اپنا ذاتی مطالعہ جاری رکھا۔ قضا و قدر کے
فرشتوں کو انکی مستعدی اور ہمت پر رحم آیا اور قدرت کیطرف سے انکو دو تین مہینوں کے بعد ایک اُستاد
ملگیا یہ ایک غریب پادری تھا جو ایک زمانہ تک ترکی میں مقیم رہا تھا اور انگلستان میں ترکوں کی عام
مخالفت اور نفرت کی وجہ سے اپنے مقلدین کی اٹھکیلیوں اور ستم ظریفیوں کا شکار رہوا تھا کیونکہ اُس کے
خیال میں ترک برسر ناحق نہ تھے۔ برون نے اس پادری کو ایک خداداد نعمت خیال کیا، اور اس سے
ترکی زبان سیکھنے میں مدد لینے لگے

سر بنجامن کو ایڈورڈ برون کے فوجی تعلیم کے خیال سے سخت اختلاف تھا، اور ایڈورڈ برون
کو انجنیری تعلیم سے نفرت۔ باپ بیٹے میں یہ کشمکش کچھ دنوں جاری رہی، آخر کار سر بنجامن نے انجنیری کی
جگہ ڈاکٹری کی تعلیم پر اپنی رضامندی ظاہر کی ایڈورڈ برون بھی اس پر راضی ہو گئے۔ اور ۱۸۷۹ء میں
کیمبرج یونیورسٹی میں پیمبروک کالج میں داخل ہو گئے۔ اور جس برون کو ایٹن کی فضا سے نفرت تھی
اُسے کیمبرج کی آزادانہ زندگی، اعلیٰ طریقہ تعلیم اور وہاں کے ماہرین علوم کے زبردست فاضلانہ لکچر
اتنے پسند آئے کہ وہ کیمبرج پر فریفتہ ہو گئے۔ برون کہتے ہیں کہ جو اس یونیورسٹی کی آب و ہوا
میں رہ کر خوش نہوا۔ اُس میں خوش ہونیکی نہ صلاحیت ہے نہ وہ کبھی خوش ہو سکتا ہے۔ آکسفورڈ
سے گبن کو ایسی نفرت تھی کہ مرتے دم تک وہ اس کی شکایت کرتا رہا، لیکن کیمبرج سے برون کو
وہ الفت تھی کہ انہوں نے مرتے دم تک کیمبرج کو نہ چھوڑا۔ یہ بھی طبائع کے قدرتی اختلاف کا نتیجہ
تھا، ورنہ ان دونوں یونیورسٹیوں میں اگر فرق ہے تو وہ اتنا زبردست نہیں جتنا ان دونوں
کے انداز خیال اور تباین آراء سے ظاہر ہوتا ہے۔

کیمبرج میں انکا اصل موضوع علم طب تھا لیکن علوم مشرقیہ کا سچا شوق اور صحیح ذوق دیکھو کہ اپنی مختلف قسم کی مصروفیتوں کے باوجود بھی انہوں نے مشرقی زبانوں کا دامن نہ چھوڑا۔ ترکی زبان کی تعلیم کا انتظام اُس زمانہ میں کیمبرج میں نہ تھا۔ اس وجہ سے وہ ترکی پڑھنے کے لئے ہر پندرھویں دن کیمبرج سے لندن جایا کرتے تھے، اور کیمبرج میں علم طب کیساتھ ساتھ اپنے فرصت کے وقتوں میں پروفیسر پامر سے عربی پڑھا کرتے تھے کیونکہ اُنکو اتنک کی ترکی کی تعلیم سے یہ معلوم ہو گیا تھا، کہ اس زبان کی پوری مہارت اور اسکا پختہ علم عربی پڑھے بغیر نہیں حاصل ہو سکتا۔ پروفیسر پامر کی قابلیت اور طریقہ تعلیم کی خوبی اور جدت، اور ذاتی شوق اور فطری صلاحیت کی وجہ سے تقریباً تین مہینہ میں ایڈورڈ براون نے اتنی عربی سیکھ لی کہ وہ خود لکھتے ہیں کہ ساڑھے پانچ برسوں میں ایٹن میں اتنی یونانی اور لاطینی نہ سیکھ سکے تھے

جب انہوں نے ایک حد تک عربی اور ترکی زبانیں سیکھ لیں تو اُنکو فارسی زبان سیکھنے کا شوق پیدا ہوا لیکن اس کے لئے وقت کہاں سے آئے۔ خود طب کی تعلیم، عربی اور ترکی زبانوں کا سیکھنا، اور کیمبرج کی مختلف النوع اور کثیر التعداد اعمال و اشغال کیا کم تھے کہ ان پر اضافہ کیا جاتا۔ لیکن براون کے شوق و ذوق نے اس کے لئے بھی وقت نکال ہی لیا۔ ۱۸۸۱ء کی گرمیوں کی تعطیل میں انہوں نے ایک ہندو طالب علم سے فارسی شروع کی۔

اس طالب علم کو فڈل (ستار جیسا ایک باجہ) بجانے کا نہایت شوق تھا، لیکن اسکو اس کا کوئی سلیقہ نہ تھا اسوجہ سے کوئی داد دینے والا نہ ملتا تھا۔ براون سے اُس نے یہ شرط کی اگر یہ ایک گھنٹہ روزآنہ اُس کی فڈل سنینگے تو وہ انہیں ایک گھنٹہ فارسی پڑھائے گا، براون کو اس باجے کا کوئی خاص ذوق نہ تھا، لیکن فارسی پڑھنے کے خیال سے انہوں نے یہ مصیبت بھی گوارا کر لی۔ بیچارے روزانہ گھنٹہ بھر بیٹھکر اُس کی تن تن سنتے اور جھوٹھ موٹھ داد بھی دیا کرتے جب جا کے کچھ فارسی پڑھنا نصیب ہوتا۔

تین سال تک براون ایک طرف ذاتی شوق سے عربی ترکی اور فارسی پڑھتے رہے دوسری طرف اپنے والد کے حکم سے تحصیل علم طب میں مشغول رہے جب یونیورسٹی کے امتحان کا زمانہ آیا تو

انکے والد نے ان سے یہ وعدہ کیا کہ اگر یہ طب میں ٹرائپوس پاس کر لینگے تو وہ انکو تعطیلوں میں استنبول کی سیاحت کے لئے انعام روپیہ دینگے۔ برون کو یہ رشوت ایک نعمت غیر مترقبہ معلوم ہوئی۔ انہوں نے محنت کی اور انعام حاصل کر کے تعطیلوں میں استنبول سیاحت کر آئے۔ اس سیاحت نے ان کے دل میں اہل مشرق کی محبت اور بھی بڑھا دی۔

اس کے بعد اپنی طبی تعلیم کے سلسلہ میں کچھ دنوں اور کیمبرج میں مقیم رہے اور مشرقی زبانوں کا مطالعہ بھی جاری رکھا۔ جب یہ اپنی طبی تعلیم کی تکمیل عملیات کے لئے لندن گئے تو وہاں ایک فارسی فاضل مرزا محمد باقر سے ملاقات ہوئی۔

مرزا محمد باقر بہت بڑے سیاح تھے عربی فارسی میں ید طولےٰ رکھتے تھے اور اپنے دوران سیاحت میں انہوں نے اور کئی زبانیں بھی سیکھ لی تھیں مختلف وقتوں میں مختلف مذاہب اختیار کئے تھے اور آخر میں انہوں نے ایک نیا ذاتی مذہب اختیار کر لیا تھا جس میں مختلف مذاہب کے عناصر شامل تھے مرزا کے اندر بہتیری کمزوریاں بھی تھیں اور یہ تصوف کیطرف بھی بہت مائل تھے۔

مرزا سے برون نے دیوان حافظ اور مثنوی جلال الدین رومی پڑھنی شروع کی لیکن مرزا روزانہ کچھ دیر پڑھانے کے بعد اپنی تصانیف پر لکچر دینا شروع کر دیتے تھے، اور قلیل الفرصت برون کے اوقات کا کثیر حصہ اپنے مذہب کی تعریف اور خود اپنی توصیف میں ضائع کر دیا کرتے تھے۔ مگر مرزا کی قابلیت اور فضل کیوجہ سے برون نے سب کچھ گوارا کیا، اور باوجود مرزا کی ضدی لڑائی اور خود پسند طبیعت کے انکے ساتھ اپنے تعلقات قائم رکھے۔ یہ مرزا کے یہاں روزانہ جایا کرتے اور انکی صحبت میں گھنٹوں صرف کیا کرتے۔ انہیں کی صحبت میں انہوں نے فارسی زبان کے ہندوستانی لب ولہجہ کو جو ہندو طالب علم کی تعلیم کا نتیجہ تھا، اور جس سے انکو نہایت نفرت تھی بدل کر ایرانی تلفظ اور لب ولہجہ سیکھا، اور انہیں کی صحبت کی وجہ سے برون کی طبیعت پر بھی تصوف کا رنگ چڑھ گیا۔

۱۸۸۷ء میں برون نے ڈاکٹری کا آخری امتحان پاس کیا، اور علاج و معالجہ کی سند حاصل کی، لیکن علم طب کے متعلق برون کی کدو کاوش صرف حکم پدری کی تعمیل کے خیال سے تھی خود انکو

علم طب سے نہیں بلکہ السنۂ شرقیہ سے شغف تھا۔ اسی وجہ سے انہوں نے اپنی خواہش سے السنۂ شرقیہ کے حاصل کرنیکے بعد ماڈرن لینگویجز میں ٹرائیوس پاس کیا۔ اور اس امر کی انتہائی کوشش کی کہ کسی طرح کوئی ایسا موقعہ ملے کہ مشرق اور علوم مشرقیہ کی خدمت میں تمام عمر صرف کرسکیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے کونسلر سروس کے لئے بھی سعی بلیغ کی۔ اور انکا خیال تھا کہ السنۂ شرقیہ کا علم مشرقی ملازمت کے لئے مفید ہوگا۔ لیکن حکومت برطانیہ کے اصول دنیا سے نرالے ہیں۔ انکی درخواست کے جواب میں سرکار کیطرف سے اطلاع دی گئی کہ مشرق میں ملازمت کرنیکے لئے مشرقی زبانوں کا علم ضروری نہیں۔ بلکہ یونانی۔ لاطینی اور ہسپینی زبان کا جاننا ضروری ہے خلاصہ یہ کہ انکی ساری کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔ اور آخرکار انکو مجبور ہوکر ڈاکٹری ہی کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔

لیکن جس زبردست طاقت نے برون کے دل میں مشرق کی محبت ودیعت کی تھی، اُس نے سارا انتظام پہلے ہی کرلیا تھا جس کی بیچارے برون کو کوئی خبر نہ تھی جب برون ناامید ہوکر ڈاکٹری شروع کرنیکا اہتمام کررہے تھے تو قضا و قدر کے فرشتے انسان کی کم بینی عقل و دماغ پر ہنس رہے تھے۔ انکی اٹکھیلیاں دیکھو کہ جب برون کی حسرت و یاس انتہا کو پہنچ گئی اور یہ ڈاکٹری شروع کرنیکا انتظام کرنے لگے تو ایک روز بے نشان و گمان انکے پاس کیمبرج سے ایک تار آیا۔ اس تار میں انکی آئندہ زندگی کا فیصلہ مخفی تھا۔ پہلے تو انہوں نے حالت یاس میں نہایت بے توجہی سے اس تار کو کھولا اُسکے مضمون کو پڑھا تو اچھل پڑے، کہ جس چیز سے غایت کوشش کے بعد ناامید ہوکر ہاتھ دھو بیٹھے تھے وہ اب بے محنت و کوشش مل گئی، اس تار میں انکو اطلاع دی گئی تھی کہ یہ پمبروک کالج کے فیلو منتخب کئے گئے۔

دوسرے دن برون کیمبرج گئے اور وہاں انہوں نے تمام معاملات اور حالات کی تنقیح کی اور تفصیل معلوم کی۔ اب تو انکو انکی مراد ملی تھی فیلوشپ کے پہلے سال میں انہوں نے کالج سے فارس جانے کی اجازت حاصل کی اور ترکی کے راستہ سے فارس گئے اور اس قدیم ملک کے کل اہم شہروں کی سیر کی۔ وہاں کے ہر طبقہ اور ہر قسم کے لوگوں سے ملے۔ اور اُنکی صحبتوں سے فائدہ اٹھایا۔ فارسیوں

کے مذاہب، ہر مذہب کے مختلف فرقوں، اُنکے رسوم، عادات، خیالات، افکار اور اعمال کا نہایت غائر اور نقادانہ مطالعہ کیا اور اس ملک اور اسکے باشندوں کے متعلق اپنے اپنے وسیع معلومات کی بنیاد ڈالی جسمیں بقول ڈاکٹر نکلسن یورپ کا ایک مستشرق بھی اُنکا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

ایران سے واپس آئے تو کیمبرج یونیورسٹی میں فارسی کے لکچرر مقرر ہو گئے۔ چودہ سال کے بعد چارلس ریو کی جگہ پر عربک کی سرادم اسمتہ کی پروفیسری مل گئی اور جنوری سنہ ۱۹۲۶ء تک اسی پر رہے۔

سنہ ۱۹۲۵ء میں تاریخ ادبیات ایران کی چوتھی جلد کی تکمیل کے کچھ ہی دنوں بعد یکایک قلب کے مرض میں مبتلا ہو گئے چند ماہ کے بعد رو بصحت ہو رہے تھے کہ جولائی میں یکایک اُنکی بیوی کا انتقال ہو گیا، اس زبردست صدمہ کا جو اثر اُنکے قویٰ پر پڑا اُس سے وہ جانبر نہ ہو سکے، اور آخر ۵ جنوری سنہ ۲۶ء کو جاں بحق تسلیم ہوئے۔

عرب فرانسیسی ادبیات میں

فرانسیسی از منہ وسطیٰ کی ادبیات میں عربوں کا ذکر بہت ملتا ہے، یہ مضمون بجائے خود اسقدر وسیع ہے کہ اس پر بہت کچھ کام کیا جاسکتا ہے موسیو بیدیئے (پروفیسر کالج دے فرانس) کے چند لکچر سنکر مجھے اس موضوع کے خاص طور پر مطالعہ کرنیکا شوق پیدا ہوا جتنی تیاری کرنی چاہئے اتنی میں نہیں کرسکتا کیونکہ میرے پاس اس کے لئے وقت نہیں، جو کچھ تھوڑا بہت پڑھا یا سنا ہے وہ ناظرین جامعہ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں، موضوع اتنا وسیع ہے کہ شاید بہت دنوں تک میں سلسلہ وار طریقہ پر ناظرین جامعہ کی ضیافت طبع کے لئے تھوڑا تھوڑا حصہ بھیجتا رہوں گا۔ مضمون کی تیاری کیلئے میں نے موسیو گوتز موسیو پری، اور موسیو بیدیئے کی مختلف کتابوں سے بلا تکلف فائدہ اٹھایا ہے۔

یوسف

ہر قوم کی ادبیات میں حمدیہ شاعری سب سے پہلے ظہور میں آتی ہے، حمدیہ شاعری انسان کے ان جذبات کا اظہار ہے جو فطرت کو دیکھکر اس کے دل میں پیدا ہوتے ہیں، ابتدائی انسان اپنے آپ کو مجبور اور بے بس دیکھکر، فطرت کی قہاریوں سے ڈر کر اور اسکی مہربانیوں سے بہرہ ور ہوکر بشکر میں اور خوف سے اپنا سر جھکاتا ہے، سر جھکاتے ہی منہ ہی منہ میں کچھ گنگناتا ہے، یہی گنگنانا حمدیہ شاعری کا آغاز ہے، دنیا کے ہر کونے میں انسانوں نے اپنے مالک کی تعریف میں بھجن گائے ہیں، اس لئے یہ کہنا غلط نہیں کہ حمدیہ شاعری اتنی ہی پرانی ہے جتنا خود وجود انسانی یا یوں کہئے کہ خود انسان کو فطرت سے علیحدہ اپنے وجود کا احساس و شعور۔

رزمیہ شاعری اسوقت شروع ہوئی جب انسان نے سماجی زندگی بسر کرنا سیکھی، اس صنف شعر کی بنیاد انسان کی بڑائی اور فطری کمزوری شخصیت پرستی ہے، سماجی وجود قائم رکھنے کے لئے جن سورماؤں نے بڑی بڑی بہادریوں کے کام کئے، انکی تعریفیں ہوئیں انکی خدمتوں کے اعتراف میں

گیت بنائے گئے اور سارے سماج میں ان سورماؤں کی دھوم مچ گئی، اُن سورماؤں نے سماج کی اس خلقی کمزوری سے خوب فائدہ اٹھایا، انہوں نے ایسا ڈھنگ ڈالا کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے انکا اور انکی اولاد کا دنیا میں بول بالا رہے، بادشاہی اور نوابی اسی طرح قائم ہوئی، سورماؤں کی سورمائی ختم ہوگئی لیکن بھاٹوں کا جھوٹے سورماؤں کی تعریف کرنا ختم نہوا، ہر ملک میں ایسا ہی ہوا فرانسیسی رزمیہ شاعری کا بھی یہی حال ہے، شارلیمن، رولاں اور ولیم اس کے مستحق تھے کہ سارا سماج انکی تعریفوں میں جتنے گیت بنائے اور گائے وہ کم ہیں، یہ فرانسیسی قوم کے اصلی سورما ہیں، انہوں نے عربوں کے بڑھتے سیلاب کو ہمیشہ کے لئے روک دیا، فرانسیسی قوم میں یگانگت اور ہم جنسی پیدا کی، سب کو اس بات کا احساس کرا دیا کہ فرانس انکا وطن ہے، یہاں تک ٹھیک ہے، لیکن چند صدیوں بعد سورمائی تو فرانس کی سرزمین سے مٹ جاتی ہے لیکن نوابی عہد میں جھوٹ موٹ کے سورماؤں کے سراہنے والے بھاٹ رہ جاتے ہیں، فرانسیسی ادبیات کا یہ طور ہمارے ایشیائی شعرا کے مبالغہ آمیز قصیدوں سے کم نہیں، ہر نواب کے یہاں بھاٹ ملازم رہنے لگے، بمصداق جسکا کھائے اسی کا بجائے، ان بھاٹوں نے اپنے اپنے ممدوحوں کی تعریف میں آسمان کے تارے توڑنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔

مغربی شاعری کی تیسری بڑی قسم ناٹک ہے مجھے یہاں اسوقت کوئی بحث نہیں لیکن ضمناً اتنا کہدوں کہ ناٹک کا آغاز اسوقت ہوا جب لوگ جھوٹی رزمیہ شاعری سے تھک گئے، اُدہر کلیسا نے زندگی پر کافی قابو حاصل کرلیا، لوگوں نے اپنی وفاداریوں اور اپنا خلوص دنیاوی سورماؤں کی جانب سے اٹھا کر مذہبی پیشواؤں کے لئے وقف کر دیا، ناٹک کا آغاز کلیسا میں ہوتا ہے لیکن بعد میں یہی کلیسا کا پروردہ اپنے آقا کا گھر مسمار کرنے میں جو حصہ لیتا ہے وہ دنیا جانتی ہے، ناٹک کلیسا کی خدمت سے گھبرا کر زندگی کی خدمت شروع کرتا ہے، ناٹک کی نئی محبوبہ نظر زندگی ہے، زندگی اپنے اصلی رنگ و

۱؎ اگرچہ قومیت کا جدید تخیل نئی بات ہے لیکن رولاں کے گیت کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فرانسیسیوں کو وطنیت کا احساس گیارہویں صدی میں بھی ویسا ہی تھا جیسا اب ہے چنانچہ رولاں اور اس کے ساتھی پیارے فرانس کا ذکر شمالی اسپین کی پہاڑیوں میں نہایت حسرت کے ساتھ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

روپ میں۔

فرانسیسی رزمیہ شاعری کا آغاز فرانسیسی رزمیہ شاعری کے مختلف عناصر کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ذرا فرانس کے اندرونی اور بیرونی حالات و تعلقات کو پیش نظر رکھ لیا جائے۔ پہلے اندرونی حالت کو لیجئے۔ دسویں گیارہویں صدی عیسوی میں فرانس میں تین قوتیں اپنا اپنا کام الگ الگ کرتی دکھائی دیتی ہیں، وہ تین قوتیں یہ ہیں، گولوارومن، جرمن اور کلیسا، پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی میں جرمنوں کا طوفان سارے مغربی یورپ پر چھا گیا، فرانس تو پڑوس میں تھا بھلا اس طوفان کے اثرات سے کیسے محفوظ رہتا۔ اسوقت فرانس میں سلت نسل کے لوگ آباد تھے، انہوں نے رومی تہذیب رسم و رواج اور زبان اختیار کرلی تھی، جرمنوں نے فتح کرنے کو یہ علاقے فتح تو کر لئے لیکن بالآخر رومی تہذیب کے آگے سر جھکاتے ہی بن پڑی۔ گو سوارومن کمزور تھے، جرمنی کے جنگلوں سے جو تازہ دم لوگ نکلے تھے حوصلوں اور قوتوں میں ان سے بہت زیادہ تھے، لیکن گولوارومن کے پاس ایک کاری ہتھیار تھا، جسکا وار کبھی انسانی تاریخ میں خالی نہیں گیا، انہوں نے نہ زبان ہلائی نہ تلوار اٹھائی، میٹھے میٹھے وحشی جرمنوں کو رام کرلیا اور رام بھی ایسا کیا کہ چند صدیوں بعد یہی جرمن "پیارے فرانس" کی آبرو بچانے میں پیش پیش نظر آتے ہیں، چنانچہ فرانسیسی رزمیہ گیتوں کے سورماؤں کے نام بیشتر جرمن ہیں، مثلاً رومان، ریم وغیرہ۔ جرمن چند صدیوں میں اپنی زبان بھول بھال گئے گولوارومن کی روایات، زبان اور تہذیب اختیار کرلی، لیکن مزاج جو ایک ورثی چیز ہے بڑی مشکل سے بدلتا ہے۔ جرمنی کے جنگلوں میں جنگ و پیکار دن رات کا شغل تھا۔ فرانس کے زرخیز میدانوں میں چین سے زندگی بسر کرنا دشوار معلوم ہوا آپس کی لڑائیاں شروع ہوگئیں لیکن شاہین کی شخصیت نے اس سلگتی آگ کو بجھا دیا۔

تیسری بڑی قوت جو اس زمانہ کی فرانسیسی سوسائٹی میں برسر کار تھی کلیسا ہے۔ باوجود کلیسا کی ہشتی اور امن کی تعلیم کے جرمن مزاج پر اسکا ذرہ برابر اثر نہیں ہوا، بالآخر اپنی لاج رکھنے کے لئے اور اپنا اثر قائم کرنے کے لئے کلیسا نے عربوں کے خلاف جنگ کو ثواب کہنا شروع

کیا، فرانسیسی تازہ دم قوم جو گولواز، رومن اور جرمنوں کے میل سے بنی تھی، کلیسا کی اس آواز لبیک کہتی ہوئی عربوں پر ٹوٹ پڑی۔ یہ نئی فرانسیسی قوم تازہ دم تھی، جنگجو تھی اور مذہبی تھی، چنانچہ رزمیہ گیتوں میں خدا، یسوع، کنواری اور فرشتوں کا کثرت سے ذکر ہے، گولواز رومن کے پرانے گیتوں اور کہانیوں میں مافوق الفطرت مظاہر پری، دیو اور بھوت کی شکل میں دکھائے جاتے ہیں لیکن اس نئی قوم نے کلیسا کی ساری روایتوں کو بطور اعتقاد اپنے ادبیات اور اپنی زندگی میں داخل کر لیا۔

دسویں صدی میں فرانس کی اندرونی حالت یہ تھی، دو مختلف نسلوں کے میل سے ایک قوم تیار ہو رہی تھی، سلٹ تہذیب کی پرانی بنیادوں پر تازہ دم جرمنوں نے اپنے فطری جوش و خروش سے نئے رواج اور نئی روایتیں قائم کیں۔ کلیسا نے سب کو ایک ہی رنگ میں رنگ دیا، مرکزی حکومت کی مضبوطی نے آپس کے جنگ و پیکار کا خاتمہ کر دیا۔ ایک بڑی حد تک فرانس کے باشندے اپنے کو ایک قوم کہہ سکتے تھے۔ ان تمام باتوں سے بڑھ کر جس بات نے فرانسیسیوں کو اتحاد پر آمادہ کیا وہ عربوں کا خطرہ تھا، جنوبی اور مغربی فرانس تک عربوں کے حملے ہو چکے تھے، اسپین پر تو آٹھویں نویں صدی عیسوی ہی میں عربوں کا پورا قبضہ ہو چکا تھا۔

شارلیمین نے پہلے عربوں کے خطرہ کو فرانسیسیوں نے محسوس کر لیا تھا، لیکن اب وقت آ گیا تھا کہ باقاعدہ عربوں کی بڑھتی فوجوں کی روک تھام کیجائے۔ نویں صدی عیسوی میں فرانسیسیوں کو شمالی اسپین کے پہاڑی علاقوں میں کو رونسیوالا کی مشہور شکست باسک قوم کے ہاتھوں کھانی پڑی، باسک قوم عرصے تک نہ مسلمانوں کی محکوم ہوئی اور نہ فرانسیسیوں کی اس نے اپنی آزادی قائم رکھی، لیکن اس شکست کو مسلمانوں کے سر تھوپا گیا۔ چنانچہ "رولان کا گیت" اسی شکست کی یاد میں لکھا گیا ہے، اور اسی شکست کے بعد شارلیمین نے عربوں سے خوب دل کھول کے بدلے لیے۔

فرانسیسی رزمیہ شاعری کا یہ پہلا دور ہے، فرانسیسی قوم وطن اور مذہب کی آبرو بچانے کے لئے عربوں کے خلاف تلوار اٹھاتی ہے، عربوں سے اسپین اور جنوبی فرانس میں جو معرکے ہوئے اور جن سورماؤں نے بڑے بڑے کارنامے اور قربانیاں کیں انکے تشکر اور اعتراف میں پوری

قوم نے گیتوں کا تحفہ پیش کیا۔ چنانچہ اب تک نہیں معلوم کہ ان رزمیہ گیتوں کا مصنف کون ہے، ان کے بنانے والوں کا نام کسی کو معلوم نہیں بس اتنا پتہ چلتا ہے کہ میلوں اور مذہبی تیوہاروں کے موقعہ پر ہر جگہ یہ گیت گائے جاتے تھے اور ملک کے اس کونے سے لیکر اُس کونے تک بچے بچے کی زبان پر تھے۔ اس دور کے گیتوں کی یہ خصوصیت ہے کہ ہر سورما وطن اور مذہب کی خاطر خلوص اور جوش سے بھرا ہوا ہے، شجاعت میں ایک خفیف جھلک سفاکی کی دکھائی دیتی ہے، عورت کا ذکر بہت کم ہے، جہاں ذکر ہے نہایت سرسری طور پر محبت اور راز و نیاز بالکل نہیں، محبت اور عشق ان تمام لطافتوں سے خالی ہے جو بعد کے دوروں میں ہر سورما کے لئے ایک ضروری وصف ہے، مذہبیت کے غلو کی وجہ سے تمسخر و مذاق بہت کم پایا جاتا ہے، جب مذاق کیا جاتا ہے تو نہایت بھونڈے پن سے۔

رزمیہ شاعری کا دوسرا دور (۱۲۰۰ - ۱۱۰۰) ہے، یہ وہ زمانہ ہے کہ فرانسیسیوں کو عربوں کی طرف سے کچھ اطمینان حاصل ہو چکا تھا، شارلیمین کے بعد مرکزی حکومت کمزور ہاتھوں میں چلی گئی شارلیمین کے جانشینوں میں کوئی بڑی شخصیت جو اپنے اندر کوئی خاص کشش رکھتی ہو، نہ تھی ملک کے انتظام میں خرابی پیدا ہونے لگی، ہر حصہ میں مرکزی حکومت کے خلاف بغاوتیں شروع ہو گئیں، ہر بڑے زمیندار نے نوابی اختیارات حاصل کر لئے اب ان نوابوں میں آپس کی جوتا بیزار شروع ہوئی، ہر نواب کی کوشش تھی کہ وہ اپنی خود مختاری قائم رکھے، ہر نواب نے اپنی گڈھی میں اپنا دربار الگ جمایا۔ اپنے دربار میں اہل علم اور اہل ہنر جمع کئے، مصاحبوں میں بھاٹ بھی داخل ہوئے۔ بھاٹ کی قدر و منزلت جتنی اس زمانہ میں ہوئی پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی، وہ گیت بناتا تھا، گاتا تھا نواب صاحب کی تعریف میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتا تھا، نواب صاحب کے جذبۂ خودستائی کو تسکین ہوتی تھی، سورمائی تو نام کو باقی نہیں رہی تھی لیکن اپنے کو سورما اور بہادر کہلوانے میں مزہ آتا تھا۔ ان تعریفی گیتوں کو سنکر شاید ہمارے ایشیائی ممدوح بھی شرما جائینگے۔

اس دوسرے دور کے گیت پہلے دور کے گیتوں سے بالکل مختلف ہیں، ان گیتوں میں خلوص

سچائی، اور جوش نام کو نہیں، انکی زبان میں عیس پھسا پن ہی خیالات بلندی اور شرافت سے عاری ہیں، انداز اور طرز ادا میں زور بالکل نہیں، زور اور جوش آئے کہاں سے، یہ وہ متاع نہیں جسے پیسے سے خریدا جا سکے۔ بھاٹ نواب صاحب کا نمکخوار ہے، انکی تعریف میں گیت گاتا ہی بس۔ ان گیتوں کی خصوصیت یہ ہے کہ آپس کی خانہ جنگیوں کو مفصل بیان کیا گیا ہے، ہر بھاٹ اپنے نواب کو فرانس کے سارے نوابوں سے بڑھ چڑھ کر دکھانے کی کوشش کرتا ہے، زبان میں چونکہ زور اور روانی نہیں اس لئے تصنع ہے، عورت ان گیتوں کا خاص موضوع ہے۔ اس دور کے سورما میں اگلے سورماؤں کی سی مذہبیت اور عورت کیطرف سے بے نیازی نہیں، ہر سورما تقریباً عاشق مزاج ہے اور کسی نہ کسی مہ جبین پر پہلی ہی نظر میں عاشق ہو جاتا ہے، باقی داستان ان تدابیر پر مشتمل ہوتی ہے جو ہمارا سورما اپنی محبوبہ سے وصل حاصل کرنے کے لئے اختیار کرتا ہے یعنی کسی دوسرے نواب سے لڑائی، یا اپنی محبوبہ کے خاندان والوں پر جبر یا عنایات،

فرانسیسی رزمیہ شاعری کا تیسرا دور (۱۳۰۰-۱۲۰۰ء) مسیحی جہادوں کا زمانہ ہے، ہمیں یہ توقع ہونی چاہئے تھی کہ اس دور کے گیتوں (Chansons) میں پہلے دور کے گیتوں کی طرح جوش خلوص ہوگا کیونکہ مسیحی جہادوں کی محرک یہی چیز تھی جس نے تین صدی قبل پوری فرانسیسی قوم کو اسپین اور جنوبی فرانس کے عربوں کے خلاف ابھار دیا تھا، لیکن نہیں اب نہیں مسیحی جہادوں کی محرک کہاں تک یہی مذہبیت اور خلوص تھا، یہ مسئلہ اب تک تاریخ کا غیر فیصل شدہ مسئلہ ہے، ان جہادوں کے روح رواں کون تھے ؟ کلیسا، اطالوی تاجر اور فرانس کے بعض نواب اگرچہ بعد میں انگلستان اور اسٹریا بھی ان جہادوں میں شریک ہو گئے لیکن جہادوں کا خیال سب سے پہلے فرانس میں سوچا گیا سب سے پہلے مجاہدین یہیں تیار ہوئے اور آخر وقت تک ان جہادوں کو کامیاب بنانے کے لئے فرانس ہی زر و قوت دیتا رہا۔

کلیسا کی نیت ہمیشہ سے یہ رہی کہ اپنا مذہبی اور دنیاوی اقتدار کسی طرح کم نہ ہونے دے اس مطلب کے لئے اس نے روز ایک نیا شگوفہ چھیڑا، "عالمگیر حکومت" کا بے معنی خواب وہ ہمیشہ دیکھ

کیا، اس خواب کو جب جب اس نے زندگی میں عملدر آمد کرنیکی کوشش کی تب تب اسے رسوائیاں
اٹھانی پڑیں، چند سالوں کے لئے اگرچہ بیت المقدس اور اسکے نواح میں مسیحیوں کو کامیابی حاصل ہوگئی
لیکن نوابی نے کلیسا کو وہاں بھی ذلیل کیا بیت المقدس کی کنجی حوالہ کرکے ساری حکومت اپنے ہاتھوں میں
رکھی، نوابوں نے جو اسقدر ظاہری جوش وخروش سے کلیسائی آواز پر لبیک کہا اسمیں خلوص مطلق نہ تھا
چنانچہ بعض مورخین کا خیال ہے کہ مسیحی جہاد نوابی استعماریت (Feudal Colonisation) کے
علاوہ اور کچھ نہیں، نوابوں نے یہ کوشش کی تھی کہ فرانس کے باہر بھی بالکل اسی نہج پر جس طرح فرانس
میں اپنے لئے جاگیروں کا ڈول ڈالیں، چنانچہ بیت المقدس پر قبضے کے قلیل عرصہ میں ان نوابوں
میں جو جوتم پیزار ہوئی وہ ہرگز کسی قسم کے مذہبی خلوص پر دال نہیں، فرانس کی مرکزی حکومت نے اس
لئے جہادوں کو سراہا کہ اس طرح بادشاہ کو کچھ دنوں کے لئے نوابوں سے اطمینان حاصل ہو جائے، اس
طرح جہادوں کے ذریعہ خودسرے نوابوں کی توجہ دوسری طرف پلٹ گئی اور بادشاہ کی بلا دوسرے
کے سر پڑی۔ عام مجاہدین میں ممکن ہے بعض مخلص بھی ہوں جنہوں نے خاص مذہب کی خاطر جہادوں
میں حصہ لیا ہو لیکن اکثریت انمیں بھی ان لوگوں کی ہے جو دولت اور عورتوں کی خاطر گئے نہ کہ اللہ
کی خاطر، چنانچہ ان مجاہدین نے اپنے دوران قیام میں جس بربریت کا ثبوت دیا ہے اس سے مسیحی مورخ
بھی انکار نہیں کرتے، ان سب کو اطالوی تاجر اس لئے مالی مدد دیتے رہے کہ انہیں امید تھی کہ اس
طرح وہ ایشیائے کوچک کی ساری منڈیوں پر قابو پالینگے اور جب انہوں نے یہ امید پوری ہوتی
نہ دیکھی تو الگ ہو گئے۔ غرضکہ مسیحی جہادوں کے متعلق یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ انمیں شریک ہونیوالوں
میں ہر ایک کا کوئی نہ کوئی دنیاوی اور خالص دنیاوی مطلب تھا، پھر یہ کس طرح ہو کہ اس دور
کی شاعری میں وہ جوش وخلوص ملے جو تین صدی قبل کے گیتوں میں ہمیں ملتا ہے، ان گیتوں کا
بنانے والا بھی اپنا مخصوص مطلب پیش نظر رکھتا ہے اور وہ بھی جس کے لئے یہ گیت بنائے گئے ہیں،
اصل میں یہ رزمیہ شاعری کے زوال کا زمانہ ہے، اس دور کے گیت ایسے ہیں جیسے بے خوشبو کے
پھول، زبان خوب سلجھی ہوئی اور شستہ ہے، شائستہ الفاظ کا طومار ہے جن کے کوئی معنی نہیں۔

میں نے اس تمہید میں فرانسیسی رزمیہ شاعری کے مختلف عناصر اور اس کے الگ الگ عنوانوں کو ناظرین جامعہ کی خدمت میں پیش کیا ہے، اب میں اپنے آئندہ مضمونوں میں ان گیتوں سے براہ راست بحث کرونگا جن میں عربوں کا ذکر ہے ان سے لڑائیوں کے بیان ہیں اور ان پر اپنی فوقیت بتائی گئی ہے، ان گیتوں میں اسلام اور پیغمبر اسلام کے متعلق جن خیالات کا اظہار ہے وہ اس امر پر دال ہے کہ کلیسا نے کس کس بری طرح اسلام پر الزامات جڑے ہیں، ان گیتوں میں مسیحی سورماؤں کی بہادریاں اسی طرح مبالغہ سے بیان کی گئی ہیں جس طرح ہمارے غلط مورخوں نے (اگر انہیں مورخ کہا جا سکے) حضرت خالد اور امیر حمزہ کے جنگی کارنامے بیان کئے ہیں، جس طرح اسلامی سورماؤں کی مدد کے لئے ملا اعلیٰ کی تمام قوتیں اپنی خدمات پیش کرتی ہیں

سلطنت برطانیہ کا جدید تخیل

(سلطنت میں نوآبادیوں کا درجہ)

سلطنت برطانیہ مشتمل ہے برطانیہ عظمٰی[1] (یعنی انگلینڈ اور اسکاٹلینڈ) آئرلینڈ، کناڈا، جنوبی افریقہ آسٹریلیا، ہندوستان اور دوسرے مقبوضات پر۔ اب تک سلطنت کے اندر برطانیہ عظمٰی کو ایک خاص درجہ امتیاز حاصل تھا، اور قانوناً ملک معظم اور برطانوی پارلیمنٹ ہی کو حکومت کا حق حاصل تھا۔ اگرچہ نوآبادیوں یعنی کناڈا، جنوبی افریقہ اور آسٹریلیا وغیرہ کو جنہیں انگریزی قوم کے لوگ نقل وطن کرکے جا آباد ہوئے ہیں، حکومت خود اختیاری حاصل تھی، مگر قانوناً برطانوی یا انگریزی پارلیمنٹ کو انکے ہر معاملہ میں دخل دینے کا حق تھا، اور خارجی معاملات تو ہمیشہ برطانوی پارلیمنٹ ہی کے ہاتھوں میں رہا کئے

لیکن چند ماہ قبل امپیریل کانفرنس نے جو قرارداد منظور کی ہے اس سے سلطنت برطانیہ کے نظام اساسی میں عجیب و غریب تبدیلی ہوگئی ہے۔ اس قرارداد کی رو سے نوآبادیوں یعنی کناڈا، جنوبی افریقہ اور آسٹریلیا وغیرہ کی حکومتیں اپنے داخلی و خارجی معاملات میں پوری طرح آزاد ہوگئی ہیں، اور برطانوی پارلیمنٹ کو اس بات کا حق نہیں رہا کہ وہ نوآبادیوں کی حکومت میں ان کی مرضی کے خلاف کسی قسم کی مداخلت کرسکے۔ مرتبہ کے لحاظ سے بھی اب برطانیہ عظمٰی کو نوآبادیوں پر کوئی فوق نہیں رہا۔ گویا سلطنت برطانیہ چھوٹے پیمانہ پر ایک طرح کی جمعیت اقوام (League of Nations) ہوگئی ہے جس میں برطانیہ عظمٰی اور نوآبادیاں مساوی الرتبہ اراکین کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان اراکین کو اس حد تک آزادی حاصل ہوگئی ہے کہ اگر وہ چاہیں تو انکا سلطنت برطانیہ سے الگ ہوجانا بھی بعید از امکان نہیں ہے۔

اگرچہ امپیریل کانفرنس کے فیصلہ کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہے، اور یہ محض برطانیہ عظمٰی اور نوآبادیوں کے درمیان ایک سمجھوتہ تصور کیا جاتا ہے، لیکن پھر بھی عملاً اس کی اہمیت بالکل ان

[1] اس مضمون میں جہاں جہاں "برطانیہ عظمٰی" کا نام آیا ہے اس سے مراد جزائر برطانیہ اور ان کی حکومت ہے

قوانین کی سی ہے جنہیں سلطنت کی قانون ساز جماعت یعنی برطانوی پارلیمنٹ منظور کرتی ہے

بصورت موجودہ برطانیہ عظمیٰ اور نوآبادیات میں اتحاد کا قانونی

رشتہ صرف شاہ برطانیہ کی ذات ہی یعنی تمام نوآبادیاں شاہ برطانیہ کو اپنا بادشاہ تسلیم کرتی ہیں اور اس طرح قانوناً اس کی رعایا ہیں لیکن بادشاہ کا سیاسی اقتدار محض برائے نام ہے۔ کیونکہ نوآبادیوں کو حکومت خود اختیاری عطا کرنے کے بعد سے بادشاہ نے یہ دستور رفتہ رفتہ بالکل ترک کر دیا ہے کہ وہ کسی ایسے قانون کو نوآبادیوں میں نافذ کرے جو ان کی مرضی کے خلاف ہو۔ اور امپیریل کانفرنس کے فیصلے نے اس دستور کو اور بھی مستحکم کر دیا۔ اور یہ بات اب محال ہو گئی ہے کہ بادشاہ نوآبادیوں پر کوئی جبری قانون نافذ کرے۔

اس اتحاد کو ہم ایک طرح کا شخصی اتحاد (Personal Union) کہہ سکتے ہیں جس میں متعدد آزاد سلطنتیں حق وراثت کے پہنچنے سے ایک ہی بادشاہ کے زیر حکومت آکر متحد ہو جاتی ہیں۔ لیکن انکا سارا انتظام داخلی و خارجی ایک دوسرے سے اس حد تک الگ رہتا ہے جس حد تک انکے مفاد مقتضی ہوں۔

موجودہ طریق عمل سے سلطنت برطانیہ کی جو شکل ہو گئی ہے اسکی مثال تاریخ میں کہیں نہیں ملتی کسی زمانہ میں بھی ایسی سلطنت نہیں قائم ہوئی جس کے اندر دنیا کے بڑے بڑے ملک اتنے دور دراز فاصلہ پر رہ کر اور تقریباً مکمل سیاسی آزادی کے رکھتے ہوئے ایک بادشاہ کی اطاعت میں جبر سے نہیں بلکہ برضا خود متحد رہیں۔ اور قدرةً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اجزائے سلطنت اتنی آزادی رکھتے ہوئے کیا ہمیشہ متحد رہ سکیں گے؟ کیا نوآبادیوں کو زیادہ سے زیادہ آزادی دیدینا انشقاق کا پیش خیمہ نہیں ہے؟ اس سوال کے جواب میں کوئی یقینی پیشین گوئی غالبًا نہ کیجا سکے۔ مگر موجودہ حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہو کہ نوآبادیوں کے محض آزادی حاصل کر لینے اور برطانیہ عظمیٰ کے مساوی درجہ پاجانے سے سلطنت برطانیہ کا شیرازہ نہیں بکھریگا۔ یہ آزادی حقیقةً اجزائے سلطنت کے اتحاد کو ممکن بنانے کے لئے روا رکھی گئی ہے جو اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ اتحاد زیادہ سے زیادہ مفید اور کم سے کم

نقصان دہ ہو۔

جس خیال پر سلطنت برطانیہ نے آج عمل کیا ہے وہ کوئی نیا خیال نہیں ہے۔ ۱۷۷۵ء میں انگلستان کے مشہور مقرر اور مدبر ایڈمنڈ برک نے امریکہ کی نو آبادیوں سے مصالحت کرنے کے لئے پارلیمنٹ میں تجویز پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ "میرے نزدیک نو آبادیوں کو قابو میں رکھنے کا ذریعہ وہ گہری محبت ہی جو نام و نسل کے اشتراک، اغراض کے اتفاق اور تحفظ میں مساوات کے ہونے سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ رشتے اگرچہ لطافت میں ہوا کی مانند ہیں مگر پائیداری میں آہنی زنجیروں کی مثل ہیں"

یہ قول صحیح تھا۔ مفاد کا رشتہ ہی مضبوط ترین رشتہ ہے۔ مگر پارلیمنٹ نے اس نصیحت کو نہ مانا اور امریکہ پر بزور شمشیر اپنا حق حکومت جتانا چاہا۔ تلوار کا فیصلہ امریکہ والوں ہی کے موافق ہوا اور ان نو آبادیوں نے برطانوی جوئے کو اپنے کاندھے سے اتار کر اس عظیم الشان ملک کی بنیاد ڈالی جو آج ممالک متحدہ امریکہ کے نام سے موسوم ہے

اس شکست نے انگریزی ارباب سیاست کو یہ سبق ہمیشہ کیلئے سکھا دیا کہ نو آبادیوں کے ساتھ انہیں ہمیشہ فیاضی اور وسیع النظری کے ساتھ پیش آنا چاہئے۔ انہوں نے اس بڑے سبب کو سمجھ لیا جو ایک انسان کو دوسرے انسان سے ایک جماعت کو دوسری جماعت سے ملاتا ہے ... یعنی مفاد۔ چنانچہ اسکے بعد سے ہمیں انگلستان کی نو آبادی پالیسی میں بین تبدیلی نظر آتی ہے

یہ وہی پالیسی ہے جسے آج ہم زیادہ ترقی یافتہ شکل میں پاتے ہیں۔ اس کی ابتدا اندرونی حکومت خود اختیاری سے ہوئی تھی اور اسکی انتہا مکمل آزادی میں ہے۔ اسمیں کوئی شبہ نہیں کہ خارجی معاملات سلطنت اب بھی برطانوی مدبروں کی رہنمائی میں رکھے گئے ہیں۔ لیکن یہ رہنمائی حاکم اپنے محکوم کی نہ کریگا بلکہ ایک بڑا بھائی دوسرے چھوٹے بھائیوں کی کریگا۔ اور ہر معاملہ میں نو آبادیوں کی رائے کو پوری وقعت دیجائیگی۔ نیز انہیں انفرادی حیثیت سے کارروائیاں کرنے کا بھی اختیار رہیگا۔ چنانچہ انہیں اسکا حق حاصل ہوگا کہ وہ سلطنت کے دوسرے ارکین کے ساتھ کسی جنگ میں نہ شریک ہوں، یا کسی

ایسے معاہدہ کی پابندی سے اپنے کو بری کرلیں جو برطانیہ عظمےٰ نے دوسرے ممالک کیساتھ کیا ہے یا دوسرے ملکوں کے ساتھ اپنی ضروریات کے مطابق انفرادی حیثیت سے خود بھی معاہدے کرلیں۔

سلطنت برطانیہ اتنی وسیع ہے اور نوآبادیاں ایکدوسرے سے ایسی بعید ہیں کہ انکے مفاد بہت سے خانگی معاملات میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف اور غیر متعلق ہیں۔ اسکے لئے یہی بہتر ہے کہ ہر ایک کو اپنے معاملات کا تصفیہ آپ ہی کرلینے دیا جائے۔ اور ہر ایک اپنی پالیسی کا آپ ہی ذمہ دار ہو۔

اور سلطنت کا موجودہ طرز عمل اسی حقیقت کے احساس کا نتیجہ ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سلطنت کے ارباب حل وعقد نے اس امر سے چشم پوشی نہیں کی ہے کہ اگر ایک طرف برطانیہ عظمےٰ اور اسکی نوآبادیوں کے بہت سے اغراض مشترک ہیں تو دوسری طرف بہت سے اغراض مختلف بھی ہیں۔ اور آپس کے تعلقات اسی وقت تک قائم رہ سکتے ہیں جب تک اشتراک اغراض کے ساتھ ساتھ اختلاف اغراض کو بھی پوری اہمیت دیجائے۔ اور بجائے اس کے کہ سلطنت کے تمام اجزا کو ایک ہی حکومت کی زنجیر میں جکڑ کر واحد کردیا جائے، انہیں آزادی دے کر اختلاف کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اتحاد پیدا کیا جائے کیونکہ پہلی صورت گلا گھونٹنے والی ہوگی، اور اسکا نتیجہ یا تو زنجیر کی شکست ہوگا یا سلطنت کی موت۔ نوآبادیوں کی آزادی سے انکے تعلقات سلطنت کے اندر خوشگوار اور مفید تر ہوتے جائینگے اور اس لئے سلطنت میں استحکام کا زیادہ امکان ہے۔

برطانیہ عظمیٰ ونیز نوآبادیوں کے اہل الرائے اصحاب کو اس نئی شاہراہ کے "راست،، ہونے کا یقین کامل ہے جو سلطنت نے اپنے لئے نکالی ہے۔ یہ کسی دباؤ، خانہ جنگی یا خوف کے سبب نہیں ہے، بلکہ انتہائی رواداری اور مصلحت اندیشی پر مبنی ہے۔ اور یہی اسکے صحیح ہونیکی سب سے بڑی ضمانت ہے۔ کچھ اور تحریر کرنے سے قبل انگریزی کے ایک مضمون کا اقتباس درج کیا جاتا ہے جس سے معلوم ہوگا کہ سلطنت کی موجودہ روش کو انگریز بالعموم کس نظر سے دیکھتے ہیں۔

> امپیریل کانفرنس نے جو نیا اصول کار سلطنت برطانیہ کے لئے وضع کیا ہے اسپر دوسری قومیں حیرت کا اظہار کرتی ہیں اور بعض لوگوں کے خیال میں تو اس سلطنت کا خاتمہ ہوگیا

لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ لوگوں کی حیرت اور غلط فہمی کا سبب یہ ہے کہ وہ ہمارے اس جدید نقطۂ نظر کو نہیں سمجھ سکتے جو سلطنت کی بابت ہم نے قایم کیا ہے۔ جرمنی اور خصوصاً پروشیا Prussian کے ذہن میں سلطنت کا جو تصور ہے اس سے ہمارا نقطۂ نظر اصولی اختلاف رکھتا ہے۔ اور ان تمام نظریوں کی بین طور پر تردید کرتا ہے جو سیاسی نظاموں کو زور قوت قائم رکھنے کے حق میں ہیں۔

آیئے ذرا پھر غور کریں اور دیکھیں کہ آیا واقعی دوسری قوموں کے خیال کے مطابق سلطنت برطانیہ کا قائم رہنا ناممکن ہوگیا ہے یا اس کی موجودہ روش میں کوئی نیا طریق کار، کوئی نیا اصول مضمر ہے جو سکھاتا ہے کہ نظام کو افراد کے برضائے خود گروہ میں شامل ہونے اور خیالات کے موافق ہونے سے بننا چاہیئے، اور اس تخیل کی بالکل ضد ہے جسے جنگ عظیم سے قبل پروشیا کی ریاست میں فروغ حاصل ہوا تھا یعنی طاقت ہی حق کا سرچشمہ ہے اور سلطنت بذات خود ایسے حقوق رکھتی ہے جو ان حقوق سے بالاتر ہیں جو اسے افراد نے عطا کئے ہیں۔

امپیریل کانفرنس نے سلطنت کے لئے جو اصول بنایا ہے وہ ان پرانے اصولوں کے خلاف ہی جو صدیوں تک یورپ کے بیشتر حصوں میں رائج رہے ہیں۔ اور انکی بعض ان نئی شکلوں کے بھی خلاف ہی جنہیں پرانے اصول ادھر چل کے تبدیل ہوگئے تھے۔

قرارداد کے الفاظ یہ ہیں

"وہ (یعنی نوآبادیاں) سلطنت کے اندر خود مختار حکومتوں کا درجہ رکھتی ہیں (یہ) مرتبہ میں مساوی اور اپنے داخلی و خارجی معاملات میں کسی طرح بھی ایک دوسرے کے ماتحت نہیں ہیں۔ البتہ ملک معظم کی مشترک اطاعت انہیں متحد کرتی ہے، اور وہ برطانیہ کی دولت متحدہ اقوام British Commonwealth of N میں بحیثیت آزاد اراکین کے شریک کیجاتی ہیں"

اب اسکا انطباق کیونکر ہوگا؟ حریت کا یہ ایک مکمل اعلان ہے۔ مگر حریت ہی کیا چیز؟

اس کے معنی کیا ہیں؟ کیا یہ محض انفرادی خودمختاری کا نام ہے یا کسی تعین مقصد کو حاصل
کرنے کے لئے آزادی عمل کے استعمال کا نام۔ کیا اس کے معنی محض حقوق کو تسلیم
کرلینا ہیں بغیر اس کے کہ عوض میں کچھ ایسے فرائض بھی عائد ہوں جنہیں آزادی سے انا
اور ادا کیا جائے؟ کیا انسانوں اور جماعتوں پر اتنا اعتماد کیا جاسکتا ہے کہ انہیں
باہم حسن سلوک سے پیش آنیکی توقع پر چھوڑ دیا جائے؟ کہ یہی اس آزادی کے معنی
ہیں؟ اگر ایسا ہے تو مہذب انسانوں کے آئندہ نظام کا مسئلہ نصف سے زیادہ حل
ہوجائیگا۔ اگر نہیں تو ممکن ہے "سلطنت" کا وہ تخیل جو "طاقت" کو "حق" قرار دیتا
ہے اور جس کی انتہا سلطنت کو ایک طرح کا "خدائی حق" دیکر فرعون بے سامان بنا دینے
پر ہوتی ہے، اتنے عقیدتمندوں کے رکھنے میں حق بجانب ثابت ہو اور انسان اسی
طے کئے ہوئے راستہ پر پھر لوٹ جائے جس کی تاریخ تباہیوں اور مصیبتوں کے قصہ سے
بھری پڑی ہے۔

ایک طرح سے اس کے نتائج میں جمعیت اقوام کا مستقبل بھی ہوگا۔ جمعیت اقوام جس
خیال پر مبنی ہے، فروعات سے قطع نظر تقریباً وہی "برطانوی دولت متحدہ اقوام"
(British Commonwealth of Nations) کا ہے یعنی "مطلق آزادی" کے
برخلاف "اضافی آزادی" کا اصول۔ ایک "مطلق آزادی" پر عمل کرنے والی سلطنت
اسکا حاکم خواہ کوئی بادشاہ ہو، یا ڈکٹیٹر، یا چند سرآوردہ لوگوں کا ایک گروہ، اس
بات کی روادار نہ ہوگی کہ اس کے اختیارات پر حرف گیری کی جائے یا اسکی حاکمیت
(Homogeneity) دوسری ریاستوں کے اختیارات وحقوق کو اس کے مساوی
قرار دیکر، محدود کردیجائے لیکن برطانوی سلطنت و نیز جمعیت اقوام کے اندر سلطنتوں
کی حاکمیت کا محدود ہونا روا رکھا جاتا ہے۔ اور انکو یہ حق نہیں دیا جاتا کہ دوسروں
کے مفاد کا لحاظ کئے بغیر محض اپنے ذاتی اغراض کو حاصل کرنیکی کوشش کریں۔

سلطنت برطانیہ چھوٹے پیمانہ پر ایک طرح کی جمعیت اقوام ہے۔ اس برطانوی جمعیت
اقوام نے اپنا ایک خاص اصول، ایک خاص تطر تنظیم سیاسی پیش کیا ہے۔ یہ ایک ایسا
نظریہ ہے جسے عمل میں پہلے لایا گیا اور لفظوں کی شکل میں بعد کو۔ اگر اس نظریہ پر عمل نہ ہو چکا
ہوتا اور اسکی حیثیت محض ایک خیالی یا علمی بحث کی ہوتی، تو اسپر چنداں توجہ نہ کیجاتی۔
لیکن یہ ایک امر واقعہ کا ترجمان ہے۔ یہ ایک چلتے ہوئے کاروبار کا اصول کار ہے
اس کی ابتدا جنوبی افریقہ کی جنگ (جنگ بوئر Boer War) اور اسکے نتائج مابعد
سے ہوئی۔ اسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور کناڈا کو برطانیہ کی امداد کیلئے فوج بھیجنے پر مجبور نہیں
کیا جا سکتا تھا۔ انہوں نے فوج اپنی مرضی سے بھیجی تھی۔ کیونکہ انہیں یقین تھا کہ کوئی ایسی
چیز خطرے میں ہے جو سلطنت برطانیہ کی زندگی کے لئے ضروری ہے۔ اور پھر افریقہ
والوں کی شکست کے بعد جو صلح ہوئی اس کے شرائط میں انتقامی جذبہ کی جھلک نہ تھی
بلکہ انکے مقرر کرنے میں پوری فیاضی سے کام لیا گیا۔ اور سلطنت کے اندر جنوبی افریقہ
والوں کو وہی مرتبہ دیا گیا جو دوسری نوآبادیوں کا تھا۔ اگر سخت دلی اور تنگ نظری سے
کام لیا جاتا تو ہم ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم میں جنرل لوئی بوتھا، اور جنرل جین سمٹس جیسے لوگوں
کے ہاتھ میں برطانوی افواج کی کمان نہ دیکھتے۔ نہ انہیں کابینہ حرب War Cabinet میں
یا پیرس کی صلح کانفرنس میں برطانوی مدبروں کے دوش بدوش بٹھایا جاتے
معلوم ہوتا ہے کہ کناڈا والے امپیریل کانفرنس کے فیصلہ کو کسی قدر بدگمانی کی نظر سے
دیکھتے ہیں۔ کیونکہ وہ اسے بڑی حد تک جنوبی افریقہ کی خواہش اور اصرار کا نتیجہ سمجھتے
ہیں۔ اس کے علاوہ ایک تکلیف دہ شبہ یہ بھی ہے کہ کہیں "مساوات مرتبت" کے یہ معنی
نہ ہوں کہ اب تحفظ سلطنت کے لئے نوآبادیاں بھی اپنی اپنی حیثیت کے تناسب سے
انگلستان کے برابر اعانت کریں۔ حالانکہ اب تک انگلستان ہی تحفظ کے بوجھ کو زیادہ تر
برداشت کرتا رہا ہے۔ کناڈا والوں کو ان باتوں کا ذرا بھی خوف نہیں کرنا چاہئے

جنوبی افریقہ یا آئرلینڈ والوں نے اگر آزادی اور مساوات کا مطالبہ کیا تو یہ محض اس لئے
کہ انکو سلطنت کے موجودہ اصول (آزادی) کا بہت ناکافی عملی تجربہ تھا۔ اور وہ
امتحان لیکر دیکھنا چاہتے تھے کہ واقعتہً ان اصولوں پر عمل بھی کیا جاتا ہے یا نہیں۔
اور جب انہوں نے دیکھ لیا کہ سلطنت اس امتحان میں پوری اتری تو وہ مطمئن ہو گئے
اب، کہ جبر یا دباؤ کا سوال جاتا رہا ہے، اشتراک اغراض اور حسن نیت ہی سے سلطنت
کے مختلف اجزا متحد رہ سکتے ہیں۔ یہ طرز عمل دنیا کا ایک نرالا واقعہ ہے تاریخ میں
پہلی بار ایک عالمگیر حکومت نے بالقصد اپنے وجود کی بنا رکنوں کے حسن نیت
پر رکھی ہے۔

کیا یہ حسن نیت آئندہ پیدا ہونیوالی مشکلات کا مقابلہ کر سکتا ہے؟ کیا متضاد مفاد برطانیہ
عظمیٰ اور نوآبادیوں کو ایک دوسرے سے الگ نہ کر دینگے؟ میرے خیال میں ایسا
نہ ہوگا بشرطیکہ سلطنت کے اصول کو ترقی دی گئی اور داخلی وخارجی تمام معاملات
میں اسپر عمل کرنیکی کوشش کی گئی۔ آزادی کا مطلب فقط "جینا اور جینے دینا"
ہی نہیں ہے۔ بلکہ سمجھ بوجھ کر ایک دوسرے کی مدد کرنا ہے۔ اگر سمجھ سے کام نہ لیا گیا
تو محض حسن نیت بیکار بلکہ تکلیف دہ شے ثابت ہوگی۔ اس آدمی کی طرح، جو خیر طلب
تو ہے، مگر معاملہ فہم اور موقع شناس نہیں ہے، سلطنت بھی برابر فاش
غلطیوں کا ارتکاب کرتی رہے گی "اصول آزادی" پر کاربند ہونا تمام سیاسی طریق
کار پر عمل کرنے سے زیادہ مشکل ہے اس کے لئے دقیق علم اور سمجھ کی اور سخت ضبط
نفس کی ضرورت ہے۔ آزادی کے یہ معنی ہیں کہ ہم دوسروں کے اس حق کو تسلیم کریں کہ وہ
خیال اور عمل میں ہم سے اختلاف کر سکتے ہیں۔ اسکے لئے محض رواداری کافی نہ ہوگی۔
اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم سمجھیں کہ لوگ ہم سے کیوں اختلاف رکھتے ہیں۔ اس طرح
شبہ کے موقعوں پر دوسروں کو فائدہ پہنچ سکتا ہے، کیونکہ دوسروں کو محض اس لئے کہ وہ ہم

سے اختلاف رکھتے ہیں غلطی پر سمجھنے کی بجائے ہمیں یہ خیال ہونے لگیگا کہ اگرچہ ہم خود غلطی پر نہیں
ہیں لیکن ممکن ہے دوسروں کا خیال بھی اپنی جگہ صحیح ہو کسی بات کی صحت یا عدم صحت کا انحصار
بالکل صورت حالات پر ہے۔ اور جس حد تک ہم گرد و پیش کے حالات کو ایک دوسرے کے لئے
برابر اہمیت دینگے تاکہ سب کے سب انکو سامنے رکھکر ایک ہی فیصلہ پر پہنچ سکیں اسی حد تک
سلطنت برطانیہ کے اندر اتحاد اور اشتراک عمل قائم کیا جاسکتا ہے
سلطنت برطانیہ کے لوازمات میں سے ایک منصب شاہی کو برقرار رکھنا ہے۔ اسپر علاً سب
متفق ہیں۔ دوسرا قیام امن ہے۔ اس پر بھی عام طور سے اتفاق ہے۔ اگرچہ یہ بالکل مبہم ہے
کہ قیام امن کا بہترین ذریعہ کیا ہے۔ امپیریل کانفرنس میں تو اس بات پر سب کے سب متفق
ہوئے کہ فی الحال معاملات خارجہ کا سرانجام جسکا خاص مقصد یہ ہے کہ امن قائم رکھاجائے
بالکل حکومت برطانیہ ہی کے ہاتھوں میں رہے۔ لوکارنو کانفرنس میں برطانیہ نے مغربی
یورپ کے امن کی ضامن بنکر جو ذمہ داریاں لیں انکی تائید نوآبادیوں کی حکومتوں نے بھی کی
اس تائید سے حکومت برطانیہ کے لئے اور بھی ضروری ہوگیا ہے کہ وہ معاملات خارجہ میں
اپنا رویہ ایسا رکھے کہ اسکو ہمیشہ نوآبادیوں کی اخلاقی اور مادی امداد مل سکے۔ اگر یہ امداد
ہمیشہ کیلئے حاصل کرنی ہے تو برطانیہ کی خارجی حکمت عملی ایسی صاف وصریح ہونی چاہئے کہ
نوآبادیوں کے لوگ سمجھ سکیں کہ کیا ہو رہا ہے اور کیوں ؟
اس اقتباس کے پڑھنے سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ انگریز سلطنت کے موجودہ طرز عمل سے بالکل
مطمئن ہیں۔
جیسا کہ مذکور ہوچکا ہے سلطنت نے یہ طرز عمل دو متضاد قوتوں کے ماتحت اختیار کیا ہے۔ ایک طرف تو نوآبادیوں
کی انفرادیت آزادی کا مطالبہ کرتی ہے۔ دوسری طرف سلطنت کے مشترک اغراض اتحاد کی ضرورت
پیدا کرتے ہیں جبتک ان دونوں قوتوں کا توازن قایم رہیگا سلطنت کی موجودہ شکل بھی قایم رہے گی
لیکن اگر انمیں سے کوئی قوت کمزور پڑگئی تو دوسری قوت کو لازمی طور پر غلبہ ہوگا جس کا اثر سلطنت کے

طرزعمل پر پورا پورا پڑے گا۔

اس سے ایک بدیہی نتیجہ نکلتا ہے۔ اگر موخرالذکر قوت یعنی "ضرورت اتحاد" کمزور پڑ جائے تو سلطنت کا اتحاد شکست ہو سکتا ہے (آگے ہم جو کچھ لکھیں گے اس سے اندازہ ہو سکیگا کہ کیا واقعی اس موخرالذکر قوت کے کمزور پڑ جانیکا اندیشہ ہے یا نہیں) لیکن یہاں اسکے تسلیم کرلینے کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اگر یہ قوت کمزور پڑ گئی تو پھر اجزائے سلطنت برطانیہ کا منتشر ہو جانا بالکل ممکن بلکہ لازمی ہے۔

کیونکہ ضرورت اتحاد کے کمزور پڑ جانیکا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ دنیا میں ایسی صورت حال پیدا ہو جائے جس سے ارالین "برطانوی دولت متحدہ اقوام" کا اتحاد یا تو بالکل غیر ضروری یا سرے سے انکے مفاد کے خلاف ہو۔ ایسی حالت میں مدبرین سلطنت اس کے ٹوٹنے کو خوشی سے گوارا کرینگے یہ نتیجہ صرف حال کے طرز عمل ہی سے نہیں بلکہ ماضی پر بھی نظر ڈالنے سے نکلتا ہے۔ برطانوی نوآبادیوں کی تاریخ میں نمایاں ترین واقعہ "مفاد" کی بڑھتی ہوئی اہمیت ہے جو انکے اور برطانیہ کے تعلقات کی تعین میں ہمیشہ پیش نظر رکھی جاتی ہے اور تدبر و وسعت نظر کا تقاضا بھی یہی ہے کہ انسان دنیا کے کاروبار کو افادی نقطہ نظر سے دیکھے۔ یہی وہ اصول ہے جس پر کار بند ہونا زندگی کے رائج الوقت طریقوں میں آنے والے تغیرات کے مطابق بن جانے کی صلاحیت پیدا کرتا ہے۔ برطانوی مدبروں کے گذشتہ و موجودہ طرز عمل سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ انکے نزدیک سلطنت بت بنا کر پوجنے کے لئے نہیں بلکہ قوم کے مفاد کے لئے ہے۔ اور اگر مفاد کا یہی تقاضا ہے، تو سلطنت کو جس طرح کبھی قایم کیا گیا تھا اسی طرح توڑ بھی دیا جائے گا۔

اس موقع پر بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں مثلاً کیا حالات تھے جن کے ماتحت سلطنت برطانیہ نے موجودہ روش اختیار کی ہے۔ وہ کونسی قوتیں ہیں جو اس کے اجزا کو متحد کئے ہوئے ہیں اور وہ کونسی قوتیں ہیں جو انیں کامل اتحاد نہیں پیدا ہونے دیتیں اور ہر ایک کا ایک مستقل وجود قائم رکھنے کی ضرورت پیدا کرتی ہیں۔ ان میں سے اس وقت کسکو غلبہ حاصل ہے۔ کونسی قوتیں زیادہ پائدار ہیں وغیرہ

ان سوالوں کا جواب بہت اہم ہے۔ نہ صرف اس لئے کہ ان سے سلطنت برطانیہ کے موجودہ طرزعمل کی توجیہ ہوتی ہے، بلکہ اسلئے بھی کہ اجزائے سلطنت کو متحد کرنے

والے اور متفرق کرنے والے اسباب کی قوتوں کا موازنہ کرنیکے بعد تھوڑا بہت یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ سلطنت کبتک اور کن شرائط کے ماتحت قائم رہ سکتی ہے

ذیل میں ان سوالوں کا جواب دینے کی کوشش کیجاتی ہے۔ سب سے پہلے ہم ان خاص خاص اسباب کو ایک ایک کرکے تحریر کرتے ہیں جو بظاہر سلطنت برطانیہ کے مختلف اجزا کو آپس میں متحد رکھے ہوئے ہیں۔

نسلی اور تاریخی تعلق | تقدیر کا لکھا کچھ یونہی تھا کہ انگریز کناڈا، اسٹریلیا، جنوبی افریقہ وغیرہ میں جاکر نو آبادیاں قائم کریں۔ اور شاہ برطانیہ کی رعایا ہونیکے سبب انکی حکومتیں برطانوی پارلیمنٹ کے زیر اقتدار رہیں۔ یہ اقتدار اگرچہ آہستہ آہستہ کم ہوتا گیا، لیکن اسکی تدریجی کمی کیساتھ تعلقات اور بھی خوشگوار ہوتے گئے۔ اتنے عرصہ تک قائم رہنے کے سبب برطانیہ اور نو آبادیوں کا تعلق دونوں کے نزدیک اتنا عزیز اور محترم ہوگیا ہے کہ اسکا ٹوٹنا کسی غیر معمولی سبب سے ہی ممکن ہے۔

شاہ برطانیہ | تمام نو آبادیاں شاہ برطانیہ کو اپنا بادشاہ تسلیم کرتی ہیں اور قومی و نسلی تعلق ہونیکی وجہ سے اس کی ذات سے ویسی ہی الفت و محبت رکھتی ہیں جیسی اپنے قومی بادشاہ سے ہوسکتی ہے۔ بادشاہ سے محبت لازمی طور پر وفاداری کا جذبہ پیدا کرتی ہے، جو نو آبادیوں کو بادشاہ کی اطاعت سے منہ موڑکر اور سلطنت کے شیرازہ کو توڑکر قطعاً آزاد ہوجانے سے ہمیشہ روکے گا۔ بادشاہ کی شخصیت کا جو اثر نو آبادیوں پر ہے اسکی نوعیت و اہمیت کا پورا اندازہ کچھ وہی لوگ کرسکتے ہیں جنکے ملک میں عرصہ سے ہردلعزیز بادشاہی حکومت رہی ہو اور بادشاہ کی ذات کے ساتھ محبت، احترام، اطاعت اور وفاداری کی روایات قائم ہوں۔ تاہم اتنا ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ انسان فطرتاً محبت، اطاعت و وفاداری کے جذبات رکھتا ہے۔ اور جب یہ کسی شئے کی خواہ وہ کوئی شخص ہو یا جماعت، یا نظام، ایک بار وابستہ ہوچکتے ہیں تو عام حالتوں میں انکا تعلق مستقل ہوجاتا ہے اگلے وقتوں کے مسلمانوں کے دل میں اپنے خلیفہ کے لئے جو جگہ تھی (اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ شاہ انگلستان بھی عیسائیوں کے ایک فرقہ کا جو "کلیسائے انگلستان" یا (انگلش چرچ) کا پیرو کہلاتا ہے اور بڑی حد تک انگلستان اور نو آبادیوں کے انگریزوں پر مشتمل ہے، دینی پیشوا ہے) یا جمہوریت پسند

فرانسیسیوں کے دل میں اپنی جمہوریت کے لئے جو جگہ ہے وہی جگہ شاہ برطانیہ کے لئے ان انگریزوں کے دل میں جنہوں نے نوآبادیوں کو اپنا وطن بنالیا ہے۔

زبان، طرز معاشرت اور تمدن کی یکسانی | انگریز جب نوآبادیوں میں آکر بسے تو قدرۃً وہی زبان، وہی مذہب وہی طرز معاشرت، اور وہی تخیلات اپنے ساتھ لائے جو انکے اصلی وطن یعنی انگلستان میں رائج تھے۔ اتنے عرصہ تک جدا رہنے کے باعث اگرچہ کچھ تبدیلیاں بھی ضرور پیدا ہوگئی ہیں مگر بحیثیت مجموعی نوآبادیوں کی تہذیب اور طرز معاشرت میں کوئی ایسا بنیادی تغیر نہیں ہوا ہے جس سے آپس کا میل جول ناپسندیدہ سمجھا جانے لگے۔ چنانچہ انگلستان اور نوآبادیوں کے انگریز ایک دوسرے سے بلاتکلف ملتے جلتے ہیں اور اور کوئی غیریت نہیں محسوس کرتے۔ اس سے دو فائدے ہیں ایک تو یہ کہ انگلستان اور نوآبادیوں کے باشندے آپس میں یگانگی محسوس کرتے ہیں جس سے انکا باہمی تعلق مضبوط ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اہل انگلستان کو نوآبادیوں میں جاکر سکونت پذیر ہونے میں ایسی رکاوٹیں نہیں پیش آتیں جیسی اجنبی ممالک میں پیش آسکتی ہیں۔

انگلستان اور نوآبادیوں کا تعلق قائم رہنے کا ایک بہت بڑا سبب یہ بھی ہے کہ ایک طرف انگلستان کو اپنی زائد آبادی کے لئے ملک درکار ہے تو دوسری طرف نوآبادیوں کو اپنے ملک کی قلیل التعداد آبادی کو بڑھانے کی ضرورت ہے۔ انگلستان کے لئے آسٹریلیا، کناڈا وغیرہ نوآبادیوں سے بہتر اور کوئی جگہ نہیں ہے جہاں وہ اپنی زائد آبادی کو بھیجے۔ نہ صرف اس لئے کہ یہ مقامات اپنی یگانگی کی وجہ سے موزوں ہیں، بلکہ اس لئے بھی کہ انگریز تارکان وطن جو یہاں آباد ہوتے ہیں قطعی طور پر اور وطن سے جدا نہیں ہوجاتے بلکہ یہاں رہ کر بھی اپنی ترقی اور خوشحالی سے اسکی قوت کو بڑھاتے ہیں۔ نوآبادیوں کے لئے بھی انگلستان سے آکر آباد ہونیوالے لوگ زیادہ قابل ترجیح ہونگے۔ کیونکہ ان کی زبان، نسل، تہذیب، اور معیار زندگی تقریباً ایک ہی ہیں۔

حفاظتی یا فوجی مصالح | انگلستان اور نوآبادیوں کے درمیان سب سے مضبوط اور دیرپا رشتہ اتحاد حفاظتی یا فوجی مصالح ہیں۔ سلطنت برطانیہ دو باتوں کی پوری ضمانت کرتی ہے۔ اراکین سلطنت (یعنی برطانیہ عظمیٰ اور نوآبادیات وغیرہ) کے درمیان دائمی امن اور انکی بیرونی حملوں سے حفاظت۔ اس مقابلہ اور رقابت کے زمانہ میں ہر ملک کی خارجی حکمت عملی کی کامیابی کا مدار توازن قوت کو اپنے موافق برقرار رکھنے پر ہے۔ روز بروز دنیا

شطرنج کی بساط کی مانند ہوتی جارہی ہے جس میں ہر ملک ایک مہرے کی حیثیت رکھتا ہے اور اسکا زندہ رہنا بس اسی پر منحصر ہے کہ اپنے کو بہت سے قوی ملکوں کے نذر کر رکھے۔ خوشامد سے، دہمکی سے، مراعات کا لالچ دلا کر، طرح طرح سے پٹی پڑھا کر، غرضیکہ جس طرح ممکن ہوتا ہے دشمن کے ساتھیوں کو توڑنے اور اپنے جتھے کو مضبوط کرنے کی کوشش برابر جاری رہتی ہے۔ ایسی حالت میں اگر اتفاق نے انگریزوں کو ایک عظیم الشان سلطنت کا وارث بنا دیا ہے تو اسکے یہ معنی ہیں کہ انہیں دنیا کے مختلف حصوں میں مستقل حلیف مل گئے ہیں جو ہر خطرہ میں ایک دوسرے کی حمایت کے لئے تیار ہیں۔ یہ برطانیہ عظمےٰ اور نوآبادیوں کی انتہائی خوش نصیبی ہے کیونکہ بصورت موجودہ سلطنت کا ہر رکن اپنی پشت پر ایک عالمگیر سلطنت کو، ختم ہونے والے ذرائع اور لامحدود قوت کیساتھ پاتا ہے۔ اسی لامحدود قوت کی بدولت انگلستان اور نوآبادیوں نے یورپ، امریکہ، بحر پاسفک، اور ایشیا اور افریقہ کے بہت سے مقامات پر قوت کے توازن کو فیصلہ کن طریق پر اپنے موافق رکھا ہے اور دنیا کے چپہ چپہ میں نہ صرف اپنے حقوق کی مدافعت بلکہ اکثر جارحانہ کارروائیاں بھی کامیابی سے کی ہیں۔ یہاں ان دیگر بیشمار ذرائع کو نہیں بتایا جاسکتا جو اتحاد کی بدولت سلطنت برطانیہ کو اپنی حفاظت کیلئے میسر آسکتے ہیں۔ لیکن فوجی طاقتوں کے متعلق کچھ کہنا ضروری ہے۔ کیونکہ برطانیہ اور نوآبادیوں کے مشترک فوجی طاقتوں پر ہی سلطنت کی بقا منحصر ہے۔ اور فوجی مصالح ہی سب سے بڑھ کر اتحاد کی ضرورت پیدا کرتے ہیں۔

انگلستان زمانہ دراز سے دنیا کی سب سے بڑی بحری طاقت رہا ہے اس کی بدولت وہ نوآبادیوں کے قائم کرنے اور اپنی تجارت کو فروغ دینے میں پوری طرح کامیاب ہوا۔ موجودہ زمانہ میں جبکہ دوسرے ممالک نے بھی بحری قوت کافی بڑھالی ہے، انگلستان کو پہلے سے کہیں زیادہ قوی رہنے کی ضرورت ہے لیکن اس کے لئے کثیر اخراجات درکار ہیں۔ اگر نوآبادیوں کی جانب سے تھوڑی بہت مدد بھی برطانیہ کو ملتی رہی تو اسکا بار بہت کچھ ہلکا ہوسکتا ہے۔ اگرچہ شاید برطانیہ اس معاملہ میں بالکل نوآبادیوں کا دست نگر رہنا مصلحت کے خلاف سمجھے۔

نوآبادیوں کو بھی انگریزی بیڑے کی سخت ضرورت ہے کیونکہ انکے سواحل بہت کافی طویل ہیں

جنگی حفاظت کے واسطے زبردست بحری طاقت درکار ہے۔ اور بصورت موجودہ نوآبادیوں کے لئے یہ بہت دشوار ہے کہ وہ اسکا بار تنہا اٹھاسکیں۔
بحری طاقت کیطرح بری طاقت کے مقابلہ میں بھی برطانیہ اور نوآبادیوں کو ایک دوسری کی مدد درکار ہے جنگی بیڑوں کے کثیر اخراجات کے ہوتے ہوئے برطانیہ عظمیٰ کیلئے یہ آسان نہیں ہے کہ وہ اپنی بری طاقت کو بھی اسی پیمانہ پر رکھے۔ نوآبادیوں کیلئے یہ تقریباً ناممکن ہے کہ اپنی قلیل تعداد آبادی کے بل پر تنہا ایسی طاقتور فوجیں تیار کر سکیں جو آسٹریلیا اور کناڈا جیسے وسیع ممالک کی محافظت کر سکے سلطنت کے قایم رہنے سے یہی فائدہ ہے کہ اس کے ہر رکن کی حفاظت کے لئے سلطنت کی متحدہ فوج کام میں لائی جا سکتی ہے۔ اس فوجی اتحاد سے کئی بار فائدہ بھی اٹھایا جا چکا ہے۔ اس کے ذریعہ نازک موقعوں پر جس طرح جنگی دشواریوں کی عقدہ کشائی ہوئی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سلطنت کا اتحاد اپنے اندر ایک عظیم الشان فوجی طاقت پوشیدہ رکھتا ہے ۱۸۹۹ء میں جب انگریزوں کو جنوبی افریقہ میں "بوئر" قوم سے جنگ کرنی پڑی تو اسی اتحادی فوج کی مدد سے انگریزوں نے بوئروں کو شکست دی اس جنگ کے حالات کی تحقیق کے واسطے جو رائل کمیشن مقرر ہوا اس نے اپنی رپورٹ کے اندر سلطنت کی جنگی صلاحیت کا ان الفاظ میں تذکرہ کیا۔

> "اگر اس جنگ سے ہمیں کسی بات کا علم ہوتا ہے تو وہ یہ کہ ساری سلطنت یعنی حکومت متحدہ (برطانیہ عظمیٰ) نوآبادیوں اور ممالک مقبوضہ میں ایک محفوظ فوجی طاقت موجود ہے جسے بوجوہ چند ہم کسی باقاعدہ فوج کی صورت میں لانا نہیں چاہتے۔ مگر جس کی طرف بروقت ضرورت اسی طرح رجوع کر سکتے ہیں جس طرح ۱۸۹۹ء میں کیا۔"

اسی طرح ۱۹۱۴ء کی جنگ میں بھی یہی "اتحادی فوج" برطانیہ کے کام آئی۔ اس موقع پر بھی سلطنت کی فوجی صلاحیت کے اعتراف میں کہا گیا کہ "کناڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کی فوجوں نے جو شاندار خدمات انجام دی ہیں ان سے اندازہ ہوا کہ سلطنت کے دور دراز حصوں میں فوجی قوت کا ایک خزانہ موجود ہے۔"

ایک اور فوجی مصلحت بھی نوآبادیوں کے سلطنت برطانیہ کے جزو رہنے کے حق میں ہے یعنی

ان بحری مقبوضات سے فائدہ اٹھانے کا خیال جو فوجی کارروائیوں کے لئے خاص اہمیت رکھتے ہیں مثلاً سنگاپور ایک طرح سے بحر پاسفک کا دروازہ ہے۔ اس پر برطانیہ کا قبضہ ہونے کی وجہ سے اسٹریلیا اپنے کو بہت محفوظ خیال کرتا ہے۔ اگر اسٹریلیا سلطنت برطانیہ کا رکن نہ ہوتا، یا سنگاپور برطانیہ کے قبضے میں ہونے کے بجائے جاپان یا کسی اور دشمن طاقت کے قبضے میں ہوتا تو اسکو اسٹریلیا کے خلاف فوجی کارروائی کے لئے بہت موثر طریقہ پر استعمال کیا جا سکتا تھا۔ اسی طرح بحیرہ احمر اور بحر ہند پر برطانیہ کا اقتدار ہونے کی وجہ سے ہندوستان اور جنوبی افریقہ کے سواحل بہت محفوظ ہیں۔

اقتصادی مصالح | سلطنت برطانیہ کے قائم رہنے سے اس کے اراکین کو کچھ اقتصادی فوائد بھی ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ قابل ذکر وہ مراعات ہیں جو برطانیہ عظمیٰ اور نوآبادیاں ایک دوسرے کیساتھ تجارتی معاملات میں کرتی ہیں۔ یہ مراعات بیشتر "ترجیح" Preference کی شکل میں کی جاتی ہیں۔ "ترجیح" سے مراد یہ ہے کہ اراکین سلطنت ایک دوسرے کے بھیجے ہوئے مال کو خریدنے میں دوسرے ملکوں کے مال پر ترجیح دیں۔ خریداروں کو اس بات کی ترغیب دینے کے لئے کہ وہ سلطنت کے کسی رکن کی بھیجی ہوئی اشیاء کو ترجیح دیں۔ یا تو ان اشیاء پر ٹیکس بالکل معاف کر دیا جاتا ہے۔ یا دوسرے ملکوں کی اشیاء کے مقابلہ میں کم کر دیا جاتا ہے یا دوسرے ملکوں کی انہیں اشیاء پر ٹیکس بڑھا دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے یہ اشیاء دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں سستی بکتی ہیں اور زیادہ خریدی جاتی ہیں ان مراعات سے برطانیہ عظمیٰ کو سب سے بڑھ کر فائدہ رہا ہے۔ کیونکہ اس کی مصنوعات نوآبادیوں میں خوب بکتی ہیں۔ برطانیہ عظمیٰ کو تمام سلطنت کی حفاظت کا بوجھ اپنے سر لینے کا معاوضہ اگر کچھ ملتا ہے تو بس انہیں مراعات کی صورت میں۔

وسائل آمد و رفت و خبر رسانی | دوری ان خاص اسباب میں سے ایک ہے جو سلطنت برطانیہ کے اجزا میں افتراق پیدا کر سکتے ہیں۔ لیکن زمانہ جدید کی سائنس کی ایجادوں نے اس سبب کی اہمیت کو بہت کچھ گھٹا دیا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اگر وسائل آمد و رفت و خبر رسانی اسقدر ترقی یافتہ شکل میں نہ ہوتے تو سلطنت کا شیرازہ کبھی کا بکھر چکا ہوتا۔ بحری جہاز، ہوائی جہاز، تار برقی اور لاسلکی نے سلطنت کے دور افتادہ

اجزا میں اس سے زیادہ قرب پیدا کر دیا ہے جتنا کہ قدرۃً ہے۔ اور فاصلہ کم کرنیوالی ایجادوں کی روز افزوں ترقی کو دیکھتے ہوئے یہ امید کرنا بیجا نہ ہوگا کہ کچھ عرصہ بعد دوری کی زیادہ اہمیت نہیں رہیگی

ہم دیکھ چکے ہیں کہ برطانیہ عظمیٰ اور نوآبادیوں کا مفاد کس طرح ایک دوسرے سے وابستہ ہے اور کیوں انکے لئے ایک مرکز رکھنا ضروری ہے۔ آئیے اب ذرا ان اسباب پر بھی نظر ڈالیں جو ارکین سلطنت کو خودمختاری کیطرف لیجاتے ہیں اور انہیں مرکز سے ہٹا کر سلطنت کے اندر افتراق پیدا کر سکتے ہیں۔

خودمختاری کا جذبہ اور انفرادیت کا احساس

جلد یا بدیر تمام نوآبادیوں نے حکومت خوداختیاری حاصل کرلی۔ انسان کی یہ فطرت ہے کہ جب وہ کسی اصول پر عامل ہوتا ہے تو اس کے منطقی حد تک پہنچا دیتا ہے۔ نوآبادیوں نے بھی آزادی حاصل کرلینے کے بعد یہی کیا انہوں نے صرف سیاسی آزادی کے حاصل کرنے پر اکتفا نہ کی بلکہ رفتہ رفتہ اقتصادی اور فوجی معاملات میں بھی اپنے آپ کو آزاد کرالیا۔ اس آزادی سے بہت سی پیچیدگیاں ایسی پیدا ہوتی ہیں جو نوآبادیوں کو سیاسی، اقتصادی اور فوجی حیثیتوں سے الگ رہنے پر مجبور کرتی ہیں۔ انکا تفصیلی تذکرہ بعد میں آئیگا۔ یہاں ہم صرف آزادی کے مجموعی اثر کو لیتے ہیں جس نے دوسرے مقامی حالات (مثلاً اختلاف نسل[1]، مذہب، موقع محل، رسوم وغیرہ) سے ملکر نوآبادیوں کے اندر ایک احساس انفرادیت کا بھی پیدا کرادیا ہے۔ کناڈا، جنوبی افریقہ اور آسٹریلیا کے رہنے والے جہاں اپنے آپ کو برطانوی رعایا سمجھتے ہیں وہاں اپنے اپنے ملکوں کا شہری بھی تصور کرتے ہیں۔ جہاں وہ سلطنت برطانیہ کیساتھ وفادار رہنا اپنا فرض سمجھتے ہیں وہاں اپنے خاص وطنوں سے محبت اور مقامی عصبیت بھی رکھتے ہیں۔ کسی طرح انکے دل سے یہ احساس دور نہیں ہو سکتا کہ جس ملک میں وہ رہتے ہیں وہ سلطنت برطانیہ کا جزو ہونے کے علاوہ ایک انفرادی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ اور اپنی تاریخ میں، اپنے رجحانات میں، اپنے مسائل زندگی میں برطانیہ سے بہت بڑی حد تک جدا ہے۔ یہ مقامی عصبیت (Local Patriotism) نوآبادیوں کو سلطنت

---

[1] نوآبادیوں کے باشندے صرف انگریزی نسل کے نہیں ہیں خصوصاً کناڈا اور جنوبی افریقہ میں آبادی کا بڑا عنصر فرانسیسی اور ڈچ نسل کے لوگوں پر مشتمل ہے۔ اسیطرح مذہب میں بھی اختلاف ہے۔ اگرچہ سب عیسائی ہیں مگر مختلف فرقوں سے تعلق رکھتے ہیں

کے اندر ضم ہو کر اپنی شخصیت کو بالکل کھو دینے سے روکتی ہے

<u>کامل اتحاد میں سیاسی دشواریاں</u>[1] اوپر لکھا جاچکا ہے کہ بحالت موجودہ بہت سی ایسی پیچیدگیاں پیدا ہوگئی ہیں جو نوآبادیوں کو اپنا سیاسی، اقتصادی اور فوجی وجود الگ قائم کرنے پر مجبور کرتی ہیں اور کامل اتحاد کی اجازت نہیں دیتیں۔

پہلے ہم ان سیاسی پیچیدگیوں پر نظر ڈالتے ہیں جو کامل اتحاد میں مانع آتی ہیں۔ ارباب سیاست اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ ایک بڑی سلطنت کے لئے، جس کے باشندے نسل، مذہب، مقامی مسائل اور عصبیت میں کافی اختلاف رکھتے ہوں ایسا نظام حکومت ناموزوں ہے جس کے اندر بہت زیادہ مرکزیت ہو۔ چنانچہ ایسی سلطنت میں صوبوں کی مقامی حکومتوں کو بہت زیادہ اختیارات حکومت حاصل ہوتے ہیں تاکہ ہر صوبے کی مقامی حکومت اپنے مقامی مسائل کو جو دوسرے صوبوں سے مختلف یا غیر متعلق ہوں، اپنے طور پر طے کرلیا کرے۔ اور مرکزی حکومت صرف ان معاملات کو اپنے ہاتھ میں رکھتی ہے جنکا تعلق تمام سلطنت سے بحیثیت مجموعی ہو۔ اس طرح ایک طرف تو مرکزی حکومت کا بار ہلکا ہوتا ہے دوسری طرف انتظام بھی زیادہ بہتر طریق پر ہوتا ہے، کیونکہ مقامی حکومتیں ذمہ داریوں کے محدود ہونے کی وجہ سے زیادہ توجہ کیساتھ، اور مقامی حالات و ضروریات سے باخبر ہونیکی وجہ سے زیادہ صحت کیساتھ ان مسائل کا تصفیہ کرسکتی ہیں جو ہر صوبے میں الگ الگ پیش آتے رہتے ہیں۔

سلطنت برطانیہ کا تجربہ بھی یہی ہے، اب تو خیر اسمیں بڑی وسعت آگئی ہے، مگر جب اس کی نوآبادیاں صرف نئی دنیا (امریکہ) ہی میں تھیں اسوقت بھی مرکزی حکومت (برطانوی پارلیمنٹ) اس پالیسی میں ناکام رہی کہ نوآبادیوں کے ہر جزوی معاملہ میں دخل در معقولات دے۔ اور اسکو مجبور ہونا پڑا کہ مقامی حکومت کا اختیار نوآبادیوں کی حکومت کو دے۔ اگرچہ اسکی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ برطانوی حکومت اپنے اختیارات کو جا بے جا اپنے فائدے کے لئے بھی استعمال کیا کرتی تھی جس سے نوآبادیوں میں نارضامندی پھیل گئی اور انہوں نے آزادی کا مطالبہ کیا، لیکن اگر ایسا نہ ہوتا تو بھی انتظام میں سہولت کے لئے مرکزی حکومت کے اقتدار میں کمی اور مقامی حکومت کے اختیار میں زیادتی ضروری کرنی پڑتی

---

[1] کامل اتحاد سے مراد یہ ہے کہ امپائر سلطنت کا سارا سیاسی، اقتصادی، اور فوجی نظام ایک ہو

اس لئے کوئی ایسا نظام تو خارج از بحث ہے جس میں نوآبادیاں صرف چھوٹی صوبوں کی حیثیت رکھیں، انہیں کوئی اختیار نہ ہو اور سب کچھ برطانوی پارلیمنٹ کرے خصوصاً[1] ایسی حالت میں کہ وہ محض برطانیہ عظمے (انگلینڈ و اسکاٹلینڈ) اور آئرلینڈ کی نمائندہ جماعت ہیں اور نوآبادیوں کی اسکے اندر کوئی آواز نہیں لیکن کسی فیڈرل طرز حکومت کا خیال بھی آنا ہی ناممکن العمل ہے جتنا یونٹری طرز حکومت کا خیال۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جو ایک برٹش امپیریل فیڈریشن کا خواب دیکھتے ہیں۔ اور اس کے لئے اسکیمیں بھی پیش کی گئی ہیں۔ لیکن یہ سب محض خیالی باتیں ہیں۔ حکومت کے ارباب حل و عقد سمجھتے ہیں کہ یہ محال ہے۔ اسی وجہ سے انہوں نے اس کی تائید نہیں کی

اس کے مختلف وجوہ ہیں جنمیں سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ امپیریل فیڈریشن کی اسکیم سلطنت کے نظام اساسی میں بہت سے ناپسندیدہ و بنیادی تغیرات چاہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ امپیریل فیڈریشن کے لئے ایک فیڈرل پارلیمنٹ کی ضرورت ہوگی۔ اُس پارلیمنٹ کے اختیارات کیا ہونگے؟ انگلستان کی پارلیمنٹ جو اب تک سلطنت کی واحد حکمراں جمعیت رہی ہے۔ اُسکا کیا درجہ ہوگا؟ کیا وہ فیڈرل پارلیمنٹ کی ماتحت ہوگی؟ کیا اُس کے اختیارات جو سیاست خارجہ سے متعلق ہیں، اور جو اب تک بلا شرکت غیرے اس کے ہاتھوں میں رہے ہیں، اس سے لے لئے جائینگے؟ کیا برطانوی مجلس کابینہ، کیا برطانوی وزیر اعظم، سلطنت کے داخلی اور خارجی حکمت عملیوں کے مقرر کرنے کے مکمل حقوق نہ رکھیں گے؟ کیا برطانوی پارلیمنٹ کی محض ثانوی حیثیت رہ جائیگی؟ کیا اسکا درجہ وہی رہ جائیگا جو فیڈرل حکومتوں کی ریاستوں کی مقامی پارلیمنٹوں کا ہوتا ہے؟ فیڈریشن کی اسکیم میں یہ سوالات ناگزیر طور پر پیدا ہوتے ہیں۔ اور انکا کوئی قابل عمل جواب نہیں ملتا۔ فیڈرل پارلیمنٹ لازمی طور پر برطانوی پارلیمنٹ کی اہمیت اور اسکے اختیارات کو کم کردے گی۔ انگریزی رائے عامہ اس کے لئے بالکل تیار نہیں ہے وہ کسی صورت میں بھی اس یادگار زمانہ پارلیمنٹ کے وسعت اختیارات اور آزادی عمل کو گھٹتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی جو صدیوں سے انکے ملی جذبات کی ترجمان اور حقوق کی محافظ رہی ہے۔

اس کی وجہ صرف انگریزوں کی غیرت قومی ہی نہیں ہے، بلکہ مفاد کے تحفظ کا خیال بھی ہے۔

---

[1] یونٹری طرز حکومت

نہ صرف انگلستان بلکہ نوآبادیوں کے لئے بھی یہ مشکل ہے کہ وہ اپنے بہت سے اہم مسائل کو ایک ایسی جمعیت کے ہاتھوں میں دیدیں جو انکے ملک کے علاوہ دوسرے ملکوں کے نمائندوں پر بھی مشتمل ہو کیونکہ اگر کسی امر میں اتفاق رائے نہو سکا تو برطانیہ عظمیٰ یا نوآبادیوں میں سے کسی نہ کسی کو تو ضرور اپنی مرضی کے خلاف فیڈرل پارلیمنٹ کے فیصلہ کو ماننا پڑیگا جو کسی طرح گوارا نہیں کیا جائیگا۔ فیڈریشن اگر چھوٹی چھوٹی ریاستوں پر مشتمل ہو تو اس کے ایک یا چند ارکین کو کثرت رائے کا پابند بنایا جاسکتا ہے لیکن سلطنت برطانیہ کے ارکین (برطانیہ عظمیٰ، آسٹریلیا، کناڈا، جنوبی افریقہ وغیرہ) اتنے بڑے، قوی اور وسیع مفاد رکھنے والے ہیں کہ وہ اپنی مرضی کے خلاف کسی کے فیصلہ کا پابند ہونا ہرگز پسند نہ کرینگے۔ ممکن ہے اس دشواری کا حل یہ بتایا جائے کہ فیڈرل پارلیمنٹ میں تمام فیصلوں کا اتفاق رائے سے پاس ہونا ضروری قرار دیا جائے۔ مگر اس صورت میں فیڈرل پارلیمنٹ کا کام چلانا بہت دشوار ہوگا اور وقتاً فوقتاً اختلافات سے ناچاقی پیدا ہونیکا احتمال ہے۔

پھر اگر کوئی ایسی اسکیم سلطنت برطانیہ کے لئے ناقابل عمل ہے تو اسے تیسری صورت ہی اختیار کرنی پڑے گی، اور یہی کیا بھی گیا، کہ ارکین سلطنت کو مساوی الرتبہ اور آزاد قرار دیکر چھوڑ دیا جائے اور ان سے توقع کیجائے کہ وہ اپنے ونیز دیگر ارکین سلطنت کے مفاد کی خاطر اتحاد قائم رکھیں گے۔ لیکن انکے اندر اس صورت میں کوئی مضبوط قانونی یا مشترک تعلق نہیں رہتا جس سے اس امر کا بہت کچھ امکان ہے کہ آئندہ کبھی نوآبادیاں سلطنت سے بالکل جدا ہوجائیں۔

اقتصادی پیچیدگیاں | ہم کہہ چکے ہیں اقتصادی پیچیدگیاں بھی ہر رکن سلطنت کو اپنا مستقل وجود قائم رکھنے پر اسی طرح مجبور کرتے ہیں جس طرح سیاسی پیچیدگیاں۔ اب آیئے ذرا دیکھیں کہ وہ کیا ہیں اور ان سے کیا دشواریاں پیدا ہوتی ہیں۔

سیاسی آزادی کی طرح اقتصادی آزادی بھی حریت قومی کا ایک جزو ہے سلطنت کا کوئی رکن اس کو نہیں پسند کرتا کہ اسکی ملکی تجارت، صنعت وحرفت، زراعت، اور محصولات وغیرہ پر ایسے قوانین کا نفاذ ہو سکے جنکے بنانیوالے غیر ملکی ہوں۔ انکے رائج الوقت اصول دولت کی پیدائش، تقسیم اور صرف کے متعلق قانون سازی کا حق صرف قومی حکومت کو دیتے ہیں، کہ حسن انتظام و مصلحت اندیشی کا یہی تقاضا ہے

یہ سب اسی لئے کہ دوسرے امور کی نسبت اقتصادی معاملات میں اشتراک اغراض جن کے لئے متفقہ پالیسی کی ضرورت ہے بہت کم ہیں اور بعض اوقات تو اغراض میں تصادم ہونیکا بھی احتمال ہوجاتا ہے علاوہ بریں ہر رکن سلطنت اپنے مخصوص مسائل رکھتا اور اپنے مخصوص خیال کے مطابق اسکا حل تلاش کرنا چاہتا ہے۔

سلطنت کا سارا اقتصادی نظام بالکل ایک رکھنا تو خیر بڑی بات ہے کسی ایک معاملہ میں بھی متفقہ پالیسی ایک متعین حد سے زیادہ مضرت رساں اور اس لئے ناقابل عمل سمجھی جاتی ہے۔ اوپر ان تجارتی مراعات کا ذکر آچکا ہے جو اراکین سلطنت ایک دوسرے کو بصورت "ترجیح" دیتے ہیں غالباً یہی سب سے بڑا فائدہ ہے جو سلطنت کے قیام سے برطانیہ عظمیٰ اور نوآبادیوں کی تجارت کو پہنچتا ہے۔ لیکن ذرا غور کیجئے، نوآبادیاں مصنوعات کے لئے خام پیداوار اور غلہ وغیرہ میں انگلستان کی محتاج نہیں ہیں بلکہ خود انگلستان انکا محتاج ہے۔ پھر اگر نوآبادیاں اپنے ملک کی صنعت و حرفت کو ترقی دیکر انگلستان کے ہم پلہ ہوجائیں تو وہ مراعات جو بصورت "ترجیح" Preference انگلستان کو دیجاتی ہیں وہ انگلستان کی مصنوعات کو کیونکر دی جائینگی۔ کیا نوآبادیاں اپنی مصنوعات کے مقابلہ میں انگریزی اشیاء کی بکری پسند کرسکتی ہیں؟ یہ دقت یہیں پر ختم نہیں ہوتی۔ فرض کرلیجئے انگلستان نے کسی فائدے کی غرض سے ڈنمارک کی اشیاء از قسم مکھن، پنیر وغیرہ پر ٹیکس کم یا بالکل معاف کرنا چاہا اور کناڈا کا بھی یہ مطالبہ ہوا کہ کناڈا سے آئی ہوئی انہیں اشیاء کے لئے مراعات دیجائیں تو اس صورت میں انگلستان کے لئے کیا چارہ کار رہیگا وہ کس ملک کی اشیاء پر ٹیکس لگانے میں رعایت کریگا۔ کہ انکی بکری زیادہ ہو۔ فرض کرلیجئے انگلستان اور ڈنمارک میں پہلے ہی سے ان اشیا کیساتھ رعایت کرنیکے متعلق معاہدہ ہوچکا ہو۔ کیا انگلستان اس معاہدہ کو توڑ کر اپنا نقصان کریگا؟ کیا اگر اس قسم کے معاہدے نہ بھی ہوں، اور اس قسم کی رعایتیں غیر ملکی اشیا کے ساتھ کرنیکی ضرورت بھی نہ ہو تاہم انگلستان نوآبادیوں کی تمام اشیاء کے ساتھ ٹیکس میں رعایت کرسکتا ہے؟ کیا مصنوعات کے لئے استعمال ہونیوالی اشیاء خام جو نوآبادیوں سے آتی ہیں انکی بکری زیادہ کرنیکے لئے دوسرے

ملکوں کی اشیاء پر ٹیکس لگانا انگلستان کی مصنوعات کو نقصان نہیں پہنچائیگا؟ کیا دوسری ضرورت کی چیزیں مثلاً غلہ وغیرہ جن کے بغیر زندگی محال ہے۔ مراعات کے سبب مہنگی نہ ہو جائنگی؟ کیا انگلستان کے مزدوروں کے لئے یہ ایک مصیبت نہ ہوگی؟ کیا، اگر ان تمام امور سے قطع نظر کیا جائے، ٹیکسوں کے معاف کرنے سے ملکی خزانہ پر برا اثر نہیں پڑیگا؟

مراعات سے جو کچھ فائدہ برطانیہ اور نوآبادیوں کی تجارت کو پہنچتا ہے وہ کتنا بے حقیقت اور عارضی معلوم ہونے لگتا ہے جب ہم ان دشواریوں اور پیچیدگیوں پر نظر ڈالتے ہیں جنکا اوپر تذکرہ کیا گیا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ ان سے برطانیہ کی مصنوعات کو اُسی وقت تک نفع ہے جبتک نوآبادیاں خود صنعت و حرفت میں ترقی نہیں کرتیں اور جبتک انکی مالی حالت ایسی ہوتی ہے کہ وہ اس نقصان کو بآسانی برداشت کرلیں جو ٹیکسوں کے معاف کرنے سے لازمی طور پر ہر رکن سلطنت کو ہوتا ہے۔ نیز جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مراعات کی پالیسی نہ صرف ارکین سلطنت کو اکثر ممالک غیر سے آزادانہ تجارتی معاہدوں کے کرنے سے روکتی اور ضروریات زندگی کے گراں ہو جانے کا سبب بنتی ہے بلکہ آگے چلکر خود دیسی مصنوعات کے لئے بھی تباہ کن ثابت ہوگی۔ کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تجارتی مراعات سے وسیع پیمانہ پر فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا اس کے حدود بہت تنگ اور جلد جلد ختم ہونیوالے ہیں۔

فوجی مصالح | سلطنت کے اندر سب سے مضبوط رشتہ اتحاد فوجی مصالح ہیں لیکن یہی فوجی مصالح ایک حد تک نوآبادیوں کو اپنا جدا جدا وجود قائم رکھنے کی بھی ضرورت پیدا کرتے ہیں۔ سیاسی آزادی کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ نوآبادیاں رفتہ رفتہ اپنی فوج کو بالکل اپنے ہاتھوں میں لے لیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس وقت نوآبادیوں کی فوجیں انکے ملکی افسروں ہی کے زیر کمان ہیں اور انہیں کی حکومتوں کے حکم سے نقل و حرکت کر سکتی ہیں۔ برطانوی حکومت نوآبادیوں کی فوج کو صرف اس صورت میں استعمال کر سکتی ہے کہ نوآبادیاں اس پر راضی ہوں۔ بالفاظ دیگر نوآبادیاں برطانیہ کے فوجی اقتدار سے بالکل آزاد ہوگئی ہیں۔ اس سے فائدہ یہ ہے کہ انکے سپاہیوں اور انکی دولت کو جنگ میں اسی وقت کام میں لایا

جا سکتا ہے جب انکی قوم کا اس میں نفع ہو اور انکی قومی حکومت اس کی اجازت دے۔ وہ ہندوستان کی طرح اپنے وسائل کو اپنے مقاصد کے خلاف استعمال کرنے پر مجبور نہیں ہیں۔ یہی حال جنگی بیڑوں کا بھی ہے اگرچہ بحری جنگ میں بیڑوں کا منتشر رکھنا اصول جنگ کے خلاف ہے اور کامیاب طریقہ یہ ہے کہ تمام بیڑوں کو مجتمع رکھا جائے اور انکی متحدہ قوت سے دشمن کے بیڑوں کو تباہ کیا جائے۔ لیکن نوآبادیاں اس کو گوارا نہیں کرتیں کہ انکے جنگی بیڑے برطانوی افسروں کے ماتحت رہیں بجز ایسے اوقات کے جبکہ اسکے سوا کوئی چارہ نہو، اور وہ بھی عارضی طور سے۔ اس طرح بروقت ضرورت ارکین سلطنت کی حربی قوتوں کا اشتراک عمل تو ممکن ہے مگر اسی طرح جس طرح آزاد سلطنتیں ایک مشترک دشمن کے خلاف اشتراک عمل کرتی ہیں کسی جبر سے نہیں۔ چنانچہ ان ایام میں بھی ہم ایک مثال ایسی دیکھتے ہیں جس میں برطانیہ کی فوجی کارروائیوں میں نوآبادیوں نے بالکل اشتراک عمل نہیں کیا۔ یہ مثال چین کی ہے۔ جہاں صرف برطانوی اور ہندوستانی سپاہی بھیجے گئے اور نوآبادیاں غیر جانب دار رہیں۔

یہی نہیں بلکہ نوآبادیاں فوجی اخراجات کے لئے کوئی مستقل رقم بھی برطانوی حکومت کو دینا پسند نہیں کرتیں۔ اس کی وجہ بھی حاکمیت قومی کا پاس ہی ہے۔ نوآبادیاں یہ نہیں چاہتیں کہ وہ ایک معتدبہ رقم سالانہ ایسے کام میں صرف کریں جس کے تعین کا انہیں کوئی اختیار نہو۔

برطانیہ کی فوجی امداد سے مستغنی ہونیکے نئے اسباب

آسٹریلیا اور کناڈا دونوں نوآبادیوں کے سواحل بحر پاسفک سے ٹکراتے ہیں۔ اور انکے اہم مسائل بہت کچھ اس سمندر سے وابستہ ہیں ریاستہائے متحدہ امریکہ کا بھی بحر پاسفک سے گہرا تعلق ہے۔ جاپان انکا اور خصوصاً ریاستہائے متحدہ امریکہ اور آسٹریلیا کا بڑا رقیب ہے۔ اور ان ممالک کو نہ صرف جاپان بلکہ ساری "زرد" نسل[1] سے جو عنقریب بحر پاسفک میں زبردست طاقت بننے والی ہے خطرہ ہے، اتفاق سے آسٹریلیا کناڈا اور ریاستہائے متحدہ امریکہ نسل، مذہب، زبان، اور تہذیب و تمدن میں تقریباً ایک ہیں لہذا انکے لئے یہ جتنا ضروری ہے اتنا ہی آسان بھی ہے کہ وہ

[1] زرد نسل سے مراد منگول نسل کے لوگ ہیں جو مشرقی ایشیا یعنی چین، جاپان، برما، سیام وغیرہ میں پھیلے ہوتے ہیں۔

بحر پاسفک میں اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے زرد مشرقی اور غیر عیسائی اتحاد کے مقابلہ میں سفید مغربی اور عیسائی اتحاد قائم کریں کناڈا اور آسٹریلیا کو اس طرح ایک نیا حلیف مل جاتا ہے جس کی امداد پر وہ بھروسہ کر سکتے ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ امریکہ کی مدد کی ضرورت و اہمیت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ امداد کے اس نئے ذریعے کے پیدا ہو جانے سے نوآبادیوں کو برطانیہ کی امداد کی اتنی شدید ضرورت باقی نہیں رہتی جتنی ہونی چاہئے تھی۔ اوپر ہم بیان کر چکے ہیں کہ حفاظتی مصالح سلطنت کے اندر سب سے مضبوط رشتہ اتحاد ہیں۔ لیکن امریکہ کی امداد برطانیہ سے اتحاد قائم رکھنے کی ضرورت و اہمیت کو بہت کچھ گھٹا دیتی ہے جس سے اتحاد کا سب سے مضبوط رشتہ بھی بہت نتیجہ خیز حد تک کمزور پڑ جاتا ہے۔

جنوبی افریقہ کو بصورت موجودہ غیر ملکیوں سے کوئی اہم خطرہ نہیں ہے۔ اس لئے وہ بھی حفاظت کے معاملہ میں اپنے کو ایک حد تک مستغنی سمجھتا ہے۔ اور جو کچھ مسائل خارجی یا داخلی اس کے سامنے ہیں انہیں تنہا حل کرنے کی صلاحیت اپنے اندر پاتا ہے۔ بلکہ وہاں کے سفید باشندے، سیاسی حقوق کے معاملہ میں جو استبدادی پالیسی اختیار کرنا چاہتے ہیں (یعنی جنوبی افریقہ کے اصلی اور ہندوستانی باشندوں کو سیاسی حقوق سے محروم کرکے سفید نسل کا استبداد قائم رکھنا) اس میں جنوبی افریقہ سلطنت برطانیہ کا رکن ہونے کی وجہ سے پوری طرح آزاد نہیں ہے۔ کیونکہ برطانوی حکومت جنوبی افریقہ کو حد سے زیادہ استبدادی پالیسی اختیار کرنے سے روکتی ہے۔ انہیں وجوہ سے جنوبی افریقہ زیادہ سے زیادہ آزادی کا خواہشمند ہے۔

یہ باتیں سلطنت کے اسباب اتحاد کو کمزور کرتی اور اسے افتراق کی طرف لیجاتی ہیں۔

نوآبادیوں کی بڑھتی ہوئی قوت

تمام اتحاد پیدا کرنے والے اسباب کو ایک نام سے پکارا جا سکتا ہے . . . کمزوری اور افتراق پیدا کرنے والی قوتوں کے لئے بھی ایک لفظ مستعمل ہو سکتا ہے . . . . طاقت۔ کمزوری ارکان سلطنت کو ایک دوسرے کا محتاج بنا دیتی ہے جس کا نتیجہ ہے اتحاد۔ طاقت ان کے اندر استغنا پیدا کرتی ہے۔ جس کا نتیجہ ہے افتراق۔

یہ تھا اور بتایا جا چکا ہے

کہ کس طرح دولت، آبادی اور فوجی قوت کی کمی ارکین سلطنت کو اتحاد پر مجبور کرتی ہے۔ یہ کمی روز بروز دور ہوتی جارہی ہے۔ تمام نوآبادیاں زرخیز علاقوں اور قیمتی کانوں سے مالامال ہیں۔ وہ اپنی ضرورت کے لئے خام پیداوار بہت کچھ اپنے ہی ملک سے حاصل کرسکتی ہیں اور دوسرے ملکوں کی محتاج نہیں ہیں ان کے اندر صنعت و حرفت میں ترقی کرنے کی بھی کافی صلاحیت موجود ہے اور قدرت کی طرف سے جو ہشیار ذرائع انہیں حصول دولت کے لئے عطا ہوئے ہیں (مثلاً کانیں، جنگلات، زرخیز زمینیں، موتی والے سمندر وغیرہ) ان سے فائدہ اٹھاکر دنیز ملکی صنعت و حرفت کو ترقی دیکر وہ دنیا کی دولتمند ترین ملکوں میں سے ہوسکتی ہیں۔ نوآبادیاں ترقی و دولت کے ان موقعوں سے بےخبر نہیں ہیں۔ اور ان سے پوری طرح فائدہ اٹھانے کی کوشش کررہی ہیں۔

دولت کیساتھ آبادی بھی بڑھ رہی ہے، بلکہ ایک کا دوسرے پر بہت ہی مفید اثر پڑ رہا ہے اگرچہ اس وقت نوآبادیوں کی آبادی بہت زیادہ نہیں لیکن اسکے اندر آبادی کی گنجایش بہت ہی۔ اور یہاں کے باشندوں کی فارغ البال زندگی سے ترغیب پاکر ممالک غیر سے لوگ برابر آآکر سکونت پذیر ہورہے ہیں۔ آبادی کے بڑھ جانے سے نوآبادیوں کے وسیع ملکوں کی قوت بھی غیرمعمولی طور پر ترقی کرجائیگی کیونکہ انہیں ایک طرف قدرت کی عطاکردہ دولت سے پوری طرح مستفیض ہونے کے لئے کافی آدمی ملجائینگے جس سے دولت میں ترقی ہوگی۔ دوسری طرف ملک کی حفاظت کے لئے بہت بڑی فوج بھی تیار ہوسکے گی جو فی الحال آبادی کی کمی سے ممکن نہیں ہے۔

فوجی طاقت کا بڑھ جانا افتراق کیطرف لیجانیوالی قوتوں کا پلہ بہت اہم حد تک جھکا دیگا۔ ممکن ہو یہ کہا جائے کہ سلطنت کی مشترک فوج جنگ کام میں لائی جاسکتی ہے، نوآبادیاں اپنی مقامی فوج کو بڑھاکر زیربار ہونا پسند نہیں کرینگی۔ لیکن موجودہ حالات کے اندر ایسی نشانیاں ہیں، جو نوآبادیوں کی زبردست فوجی قوت بنجانے کی پیشین گوئی کرتی ہیں۔ نوآبادیاں اب اس حد تک خودمختار ہوگئی ہیں کہ وہ تنہا ممالک غیر سے معاہدے بھی کرسکتی ہیں۔ اس وقت اگرچہ اس اختیار کی استعمال بہت محدود

ہے۔ مگر کیا آئندہ اس میں وسعت نہیں پیدا ہو سکتی؟ کیا بحر پاسفک کے اندر زر ونسل کے طاقت پکڑ جانے
کے بعد آسٹریلیا اور کناڈا کو ایسے خارجی مسائل کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا جنہیں انہیں سلطنت سے آزاد
اور بے تعلق رہ کر کچھ کارروائیاں کرنی پڑیں؟ کیا اس صورت میں انہیں اپنی پالیسی کی پشت پناہی
کے لیے مقامی فوج کو مضبوط کرنا پڑیگا؟ ہم آج دیکھتے ہیں کہ برطانیہ عظمے کی جانب سے چین میں فوجی
کارروائیاں ہوتی ہیں اور تمام نوآبادیاں غیر جانبدار رہتی ہیں۔ کیا آئندہ ایسا ممکن نہیں کہ نوآبادیوں
میں سے کوئی ایک تنہا فوجی کارروائیوں پر مجبور ہو۔ اور دوسرے ارکین سلطنت غیر جانبدار ہیں۔
کم از کم اُسوقت تک کہ انکی غیر جانبداری سے محارب رکن سلطنت کی تباہی کا اندیشہ نہ ہو؟

وہ زمانہ عنقریب آنیوالا ہے، اگر دنیا کے اندر دائمی قیام امن کی کوئی صورت نہ نکلی،
جب دوسرے ممالک کو خواہ وہ سلطنت برطانیہ کے ارکین ہوں یا نوآبادیوں کے حلیف، اس
بات پر مجبور ہونا پڑیگا کہ اپنے سیاسی و اقتصادی مصالح کی بنا پر کسی ایک رکن سلطنت کی خاطر
جنگ میں حتی الامکان حصہ نہ لیں اور اسے اپنا معاملہ آپ طے کر لینے دیں۔ اس صورت میں بغیر
زبردست بری و بحری فوج کے ارکین سلطنت اپنی دشواریوں کا کیونکر مقابلہ کر سکتے ہیں؟

پھر اگر نوآبادیاں دولت، آبادی اور فوجی قوت میں ترقی کر جائیں تو وہ بڑی حد تک سلطنت
کی امداد سے مستغنی ہو جائیں گی۔ یہ استغنا اتحاد کی ضرورت کو بہت کچھ کم کرنیوالا ثابت ہوگا۔

مضمون اب اتنا طویل ہو گیا ہے کہ چند اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو جنکا اس ضمن میں ذکر آنا چاہئے
تھا نظر انداز کرنا پڑتا ہے۔ تاہم جو کچھ تحریر کیا جاچکا ہے وہ ارکین سلطنت برطانیہ کے درمیان اتحاد و افتراق
پیدا کرنے والی قوتوں کا اندازہ کرنے کے لئے کافی ہے۔ اس سے یہ بھی پتہ چل سکتا ہے کہ سلطنت برطانیہ
موجودہ شکل اختیار کرنے پر کیوں مجبور تھی یعنی کیوں، اگر اتحاد کی ضرورت ہے، تو ارکین سلطنت
بالکل متحد ہو کر ایک ہی حکومت کے ماتحت نہیں آجاتے، اور کیوں اگر آزادی عمل کی خواہش ہے
تو وہ بالکل ایک دوسرے سے جدا ہو کر آزاد نہیں ہو جاتے۔ طوالت ہی کے خوف سے متحد کرنیوالی اور متفرق
کرنیوالی قوتوں کا مقابلہ کرنا اور انکا اثر جو سلطنت کے مستقبل پر پڑنیوالا ہے ان پر رائے زنی کرنا خود

ناظرین کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ البتہ ایک کرید جو دل میں باقی رہ جاتی ہے کہ کیا سلطنت برطانیہ کے شکست کا بھی کوئی امکان ہے۔ اور اگر ہے تو کیونکر اس کے لئے ذیل میں چند اسباب لکھے ہیں جن کے پیدا ہو جانے سے سلطنت کے ٹوٹنے کا امکان ہے

(۱) کسی عالمگیر سلطنت کا قیام جس کے رکن دنیا کے تمام ممالک ہوں اور جس میں سلطنت برطانیہ بھی مدغم ہو جائے

(۲) نوآبادیوں کا طاقت پکڑ جانا (آبادی، دولت اور فوجی قوت کی ترقی سے)

(۳) نوآبادیوں کی صنعتی آزادی (یعنی ملکی صنعت و حرفت کی ترقی جس سے ملکی مصنوعات اور غیر ملکی خصوصاً برطانوی مصنوعات کا آپس میں مقابلہ شروع ہو جائے۔ اور نوآبادیاں برطانیہ کی رقیب بن جائیں۔

(۴) دنیا کے نظام اقتصادی میں تبدیلیاں۔

ان میں سے ہر ایک بہت کافی اہمیت رکھتا ہے۔ اور تفصیل کا محتاج ہے لیکن اس مضمون میں کسی تفصیل کی گنجایش نہیں۔ اس لئے ختم کیا جاتا ہے۔ البتہ صرف ایک امر کیطرف توجہ دلانی ضروری ہے اوپر جو کچھ سلطنت کے بارے میں لکھا گیا ہے اس کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یقیناً ایسا ہو گا۔ البتہ اسکا امکان ہے۔

سرائے

ہمارے قدیم قصوں اور افسانوں کے موضوعات میں ایک مقبول عام اور دلچسپ موضوع "مسافر اور بھٹیاری" بھی ہے۔ بی بھٹیاری، میاں مسافر کی بیوی تو نہیں ہوتیں مگر (ہمیں ڈر ہے کہیں کوئی بھٹیارے صاحب خفا نہ ہوجائیں) بعض امور خانہ داری کے انتظام و اہتمام کی نوعیت کچھ اس قسم کی ہوتی ہے کہ بعض اوقات دونوں کی بحث و تکرار اچھا خاصا میاں بیوی کا سا جھگڑا ہوجاتا ہے۔ یہ مثل کہ "مسافر کا گھر سرائے" کچھ بلاوجہ مشہور نہیں ہوگئی۔ ایک مسافر کے لئے گھر کا تصور اس قدر دل خوش کن ہوتا ہے کہ وہ تھوڑی دیر کے لئے سفر کی تمام تکالیف و مصائب کو بھول جاتا ہے لیکن افسوس کہ آج کل جہاں ہماری اور بہت سی پرانی اچھی چیزیں مٹتی جاتی ہیں، انکے ساتھ سرائے بھی معرض خطر میں آگئی ہے۔

ہندوؤں کی شاندار قدیم تہذیب میں ایک انوکھی بات یہ ہے کہ اس میں سرائے کا وجود نہیں پایا جاتا۔ ہندوستان میں سرائے کی بنا، اسلامی عہد میں پڑی۔ اور مسلمان حکمرانوں میں جس نے سب سے پیشتر اس ضروری ادارہ کی اصلاح کی وہ شیر شاہ سوری ہے۔ اس نے سڑک اعظم کے علاوہ ملک کی دیگر شاہراہوں پر پختہ سرائیں تعمیر کرائیں اور بھٹیاریوں کے لئے ایک خاص قسم کا لباس "تلک" مقرر کیا جو تقریباً تمام شمالی ہند میں اب تک رائج ہے۔ اس نے سرائے کے لئے کچھ قوانین بھی وضع کئے۔ اس عہد کی سرائیں آبادی سے علیحدہ پرفضا مقامات میں ہیں۔ شیر شاہ نے بڑی بڑی سراؤں میں ہوشیار ہندو مسلمان باورچی بھی مقرر کئے۔ لیکن سرائے کا دارومدار ملک کی معاشرت پر ہے۔ حکومت کو اس کی زیادہ ضرورت نہیں! یہ ملک کے تمدن کا آئینہ ہے۔ دکن نے ہزارہا سال کی عمر کے بعد آج تک کوئی اچھی سرائے نہیں پیدا کی، البتہ کہیں کہیں اسلامی عہد کی ویران سرائیں اپنے بنانے والوں کی تہذیب کا مرثیہ پڑھ رہی ہیں۔ یہاں ڈاک بنگلہ کو چھوڑ کر مسافر کو کسی تکیہ، خانقاہ، عاشور خانہ، مسجد یا مندر میں

قیام کرنا پڑتا ہے، برخلاف اس کے شمالی ہند کے چھوٹے چھوٹے قصبوں میں صاف ستھری سرائیں نظر آتی ہیں۔ اس نمایاں فرق کی بڑی وجہ مسلمان آبادی کی قلت ہے۔ یہاں ہندی معاشرت یا چھوت چھات نے اسکا گلا دبا دیا۔ دکنی ہندو جس طرح ستالباہن کے زمانہ میں ایک لوٹے اور ڈور کے ذریعہ سے بنارس تک پہنچتا تھا، آج بھی جب کہ ذرائع سفر بہت آسان ہو گئے ہیں، بیک بینی و دو گوش سفر کرتا ہے۔ دکن کے بڑے اسٹیشنوں پر خصوصاً رات کے وقت آریائی تہذیب کا نظارہ قابل دید ہوتا ہے۔ تین تین اینٹوں کے بیسیوں چولھے برابر برابر گرم ہوتے ہیں جن پر ٹھیکریاں رکھی ہوتی ہیں اور مسافر (مرد اور عورت) آٹا گوندھتے اور روٹیاں پکاتے نظر آتے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ دراوڑی عہد کے کسی قافلہ نے ڈیرہ ڈالا ہے۔

بھٹیاریاں عموماً زندہ اور خوش مزاج ہوتی ہیں، انکے لباس اور وضع قطع سے ہرگز نہیں معلوم ہوتا کہ یہ اونٹ گاڑیاں یا یکے چلانے والوں کی عورتیں ہیں۔ دن بھر کا تھکا ماندہ مسافر جو کسی یکے والے کی متحاریوں یا گاڑیبان کی سلنٹے بازی اور شام دہی کے بعد (جس کو بیلوں نے ٹھنڈے دل سے سنکر اپنی رفتار میں کوئی تیزی پیدا نہیں کی) سرائے میں قدم رکھتا ہے تو بھٹیاریوں کا ایک غول اس کو خوش آمدید کہتا اور سامان چھیننے کی کوشش کرتا ہے، اس کشمکش میں مسافر کوئی فیصلہ بھی نہیں کرنے پاتا کہ اپنے سامان کے ساتھ مجبوراً کسی ایک کے حوالہ ہو جاتا ہے۔ اس پر غوغائیوں کی طرح (جس کو دلی میں ڈومنی اور نواح دلی میں بھٹیاری کہتے ہیں) سرائے میں ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا ہے۔ بھٹیاری سامان رکھتی جاتی ہے اور دوسری سے جس سے ابھی ابھی اس نے مسافر کو چھینا ہے، لڑتی جاتی ہے۔ یہ جنگ عموماً گھنٹہ آدھ گھنٹہ اور بعض اوقات مسافر کی روانگی کے بعد دو دو تین تین دن جاری رہتی ہے۔ دوران جنگ میں بھٹیاری اپنے مسافر یا مال غنیمت، کو مخاطب کرکے اپنی حریف کے عیب نکالتی اور اپنے حق میزبانی کو مرجح قرار دیتی ہے۔

رات کو جبکہ تمام مسافر اپنی اپنی کوٹھریوں کے آگے چارپائیوں پر دراز ہو جاتے ہیں تو

سونے سے پیشتر مسافر اپنے برابر والے سے سرگرم گفتگو ہو جاتا ہے۔ اس وقت کسی باقاعدہ تعارف کی ضرورت نہیں ہوتی۔ موضوعات گفتگو میں ورود و سفر، خانگی معاملات، گھی، غلہ یا دیگر اجناس کا نرخ، غرض معاشی و تمدنی مسائل سے لے کر مذہبی، سیاسی، علمی، یا وہ جو بعض رسالوں کے سرورق پر مرقوم ہوتے ہیں تمام مسائل زیر بحث آجاتے ہیں۔ فجر کو بعض مسافر اپنی چارپائیوں پر جن کے کھٹملوں نے ان کی گہری نیند میں خلل ڈالنے کی بیکار کوششیں کی ہیں، تلاوت قرآن میں مشغول نظر آتے ہیں اور سرائے کا کونہ والا چبوترہ مسجد قلندری بن جاتا ہے۔

دنیا کی تمام چیزیں فنا ہونے والی ہیں، شاید سرائے بھی اپنی عمر طبیعی کو پہنچ چکی ہے کیونکہ یہ رونا صرف ہمارے ہی ملک میں نہیں بلکہ انگلستان بھی جو اپنی سرایوں کے لئے مشہور ہے ان کا نوحہ خواں ہے۔

سرائے کے بڑے دشمن، ہم نہیں کہتے کہ دولتمند لوگ، کودن، اندھے، کمزور معدہ والے شیخی باز یا اپنے نفس کو دھوکہ دینے والے حضرات ہیں، بلکہ انکے اثرات ہیں۔ دوسروں کی راہ مارنے والے اس قسم کے لوگ آج کل کیوں اس قدر طاقتور ہیں اور کس لئے خدا نے ان کو یہ عارضی افتخار بخشا ہے۔ ہم اس راز کو معلوم کرنا نہیں چاہتے، یہ اس زندگی کی مخفی باتوں میں مضمر ہے لیکن یہ کہ وہ قوی ہیں، تمام لوگ، سرائے کو پسند کرنے والے یعنی صحیح طور سے زندگی بسر کرنے والے خوب جانتے اور ان پر افسوس کرتے ہیں۔ ان کی طاقت کا اثر ہم پر پڑتا ہے گویا ہمارا گوشت کھاتے اور خون چوستے ہیں، یہ بڑے پرخور ہیں۔

پرخوری سرائے کو تباہ کرتی ہے، اگرچہ بظاہر ہمارا یہ دعوے خلاف عقل معلوم ہوتا ہے کیونکہ زیادہ کھانے والے مسافر عموماً سرائے میں ٹہرنے والے ہوتے ہیں۔ لیکن یہ بلاخوری جس کو ناپ شناپ ہڑپ کرنا یا الابلا چٹ کر جانا کہتے ہیں، دوسری چیز ہے۔ یہ مشروبات سے مثبات تک پہنچتی ہے اور بجائے خود مشہر شدہ ہے۔ یہ پردہ کی آڑ میں ایک گلاس ڈھکوستی اور چھپاتی ہے، اس میں کوئی مصاحبت نہیں ہوتی۔ یہ ایک گھناونی چیز ہے جو ہماری قدیم

میدہ بھی سادی سرایوں کو تباہ کرتی ہے اور انکی جگہ پہلے ایک شراب کا محل تیار کرتی اور پھر اس کو ایک نہایت خوفناک سکان کی صورت میں بدل دیتی ہے۔ جہاں چائے قہوہ اور جوتیں کھاتی ہوئی تولیں خرذخت ہوتی ہیں۔ انکا ایک گھونٹ منہ سے لیکر معدہ تک آگ لگا دیتا ہے یہ محل مایوسی کی آماجگاہیں ہیں جو افسردہ دلوں کے قلوب کو تھوڑی دیر کے لئے متحرک کر دیتے ہیں۔

سرائے کے دشمنوں میں عیش وعشرت بھی شامل ہے امراء نئی ایک خاص آبادی شہر کے اس حصہ میں رکھتے ہیں جو معمولی باشندوں سے بارہ پتھر باہر ہوا تکے پڑوس میں کوئی سرائے نہیں بن سکتی۔ ہماری سمجھ میں یہ بھید نہیں آیا کہ آخر اس کشیدگی یا تخلیہ کی علت کیا ہے؟

سرائے کی جان کے لئے افلاس بھی ایک وبال ہے جس طرح کسی مفلس کی گزر امراء کے حلقہ میں نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح کسی دولتمند شہر میں غریب سرائے بھی نہیں جی سکتی۔ ہمارے ملک کے غدار شہروں میں بعض اچھی خاصی سرائیں ہمارے دیکھتے دیکھتے میدان بن گئیں جہاں کمزور لڑکے فٹ بال اور "طاقتور" جوان ٹینس کھیلتے ہیں بعض سرایوں کو زمین کے برابر کر دیا گیا اور انکی خاک پر لوہے لکڑی اور کنکریٹ کے ہوٹل تعمیر ہو گئے ہیں، یہ تناسخ نہیں بلکہ قتل ہے۔

بہت سی ایماندار سرائیں ہوٹل کہلاتی ہیں، ہمارا اس میں کوئی حرج نہیں اور نہ غالباً کسی اور مسافر یا انسان کو (تمام انسان مسافر ہیں) ہونا چاہئے کیونکہ یہ صرف نام ہے بعض ہوٹل بھی سرائے کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ ہوٹل نما سرائیں خدا کے سامنے پیش ہونے سے پہلے ہی اپنی کردار کو پہنچ جاتی ہیں۔

قصبات کی سرایوں کو ریل کے انجن نے بھی تنزل کر دیا ہے کیونکہ مسافر قدیم زمانہ میں کوچ در کوچ، منزل در منزل نیا دانہ کھاتے نیا پانی پیتے سفر کیا کرتے تھے اور اب تیر کی طرح سیدھے چلے جاتے ہیں طویل سے طویل سفر میں بھی ان کو کسی سرائے میں ٹھہرنے کی ضرورت نہیں ہوتی

وہ سرائیں جو رات کو مسافروں، بیل گاڑیوں، گھوڑوں اور شکرموں سے پر ہوتی تھیں آج کل ساہوکاروں کے غلے کے گودام بن گئی ہیں۔

ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ جس طرح ادونی تمام عمر گاتا ہے مگر اسے گانا نہیں آتا اسی طرح بھٹیاری بھی تمام عمر کھانا پکاتی ہے مگر اسے کھانا پکانا نہیں آتا۔ برخلاف اس کے عالیشان ہوٹلوں کی صاف ستھری میزوں پر انواع و اقسام کے کھانوں کی ایک طویل فہرست زبان حال سے فبای آلاء ربکما تکذبان۔۔ کا ورد لگاتی ہے۔ لیکن ہمیں معلوم ہے کہ اس فہرست اور کھانے کے بل کی طباعت کا خرچ گھی کے خرچ سے (بشرطیکہ ان کھانوں میں گھی پڑتا ہو) کچھ کم نہیں ہوتا اس میں بھی شبہ نہیں کہ برسات کے موسم میں ہوٹل کا مقیم اپنے کمرہ کی کھڑکی یا چھجے پر سے بارش کا لطف اٹھاتا ہے اور سرائے کے مسافر کو شب کے وقت جبکہ ایک طرف اس کی کوٹھری یا چھپر ٹپک رہا ہو اور دوسرے کونے میں بھٹیاری کی بکری مینہ کی بوچھار سے بھیگ کر ناکی صدا لگا رہی ہو، بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی اگر وہ مسافر بخار یا درد سر کی تکلیف کر ذرا کراہے تو برابر والے مسافر پر اس کی تیمارداری فرض ہو جاتی ہے، یہ نہیں ہوتا کہ عظیم الشان ہوٹل کے کسی کمرہ میں ایک شخص درد قولنج کے مارے تڑپ رہا ہے مگر اس کی کراہٹ برابر والے مقیم کے فلسفیانہ استغراق کو نہیں توڑ سکتی جو اس وقت آئینہ اور شانہ میں مشغول ہے اور اگر کراہٹ سے اس کی کچی نیند میں (بڑے لوگوں کو گہری نیند کم نصیب ہوتی ہے) خلل واقع ہوتا ہے تو نفرت سے کمرہ کا دروازہ بند کر لیا جاتا ہے۔

سرائے میں سامان تفریح بالکل نہیں ہوتا۔ برخلاف اس کے ہوٹل میں ہر قسم کی تفریح ممکن ہے۔ یہاں ٹینس کورٹ، سکیٹنگ ہال، بلیرڈ روم سے لیکر شطرنج گنجفہ بازی، قمار بازی یا اس قسم کی دیگر بازیوں کا میدان بہت وسیع ہوتا ہے، علاوہ ازیں بعض بڑے ہوٹلوں میں کتب خانے بھی ہوتے ہیں جن میں مختلف علوم و فنون کی کتب، رسالہ موٹررانی، جہازرانی، سینما نیز شورت سکار، سفرنامے، روزنامے، موسیقی، ہارمونیم نوازی، صابون سازی، گائڈ بک

ریلوے ٹائم ٹیبل غرض قرآن کے علاوہ تمام رائج الوقت ادب کا معقول ذخیرہ ہوتا ہے جس کو مسافر ضرورتاً یا بلا ضرورت پڑھتا ہے لیکن سب سے پہلے دلچسپ ادبی پارہ وہ ہوتا ہے جس کو ہوٹل کا بوائے مسافر کی روانگی کے وقت ایک صاف ستھری طشتری میں پیش کرتا ہے۔ شاید یہ مراثی انیس کا کوئی بند ہوتا ہے جس کا مطالعہ مقیم کو رلاتا نہیں تو رونے کی صورت ضرور بنا دیتا ہے۔

قصبات سے بہت سی سرائیں نابود ہو چکی ہیں اور شہروں سے تقریباً بالکل غائب ہوگئیں۔ اگرچہ قانون قدرت بھی یہی ہے کہ پرانی چیزیں مٹتی جائیں اور نئی ان کی جگہ لیتی جائیں۔ لیکن یہ مبادلہ گراں بہت ہے۔ سرائے ہمدردی و مواخات کا مدرسہ ہے اور ہوٹل عیش و عشرت اور ظاہر پرستی کی نمائش گاہ۔ برادران ملک تیلون کی یاد میں لنگوٹی تو کھو بیٹھے کہیں ایسا نہ ہو کہ ہوٹل کے خیال میں ہم کو سراتے سے بھی ہاتھ دھونا پڑے۔

قوت برق

جس طرح مادہ کی تخلیق اور اُسکا فنا کرنا ہمارے حدِ امکان سے باہر ہے اُسی طرح قوت کو بھی ہم نہ پیدا کر سکتے ہیں اور نہ فنا کر سکتے۔ ہماری قدرت میں جو کچھ ہے وہ صرف یہ ہے کہ ہم جس طرح مادہ کی ہیئت بدلکر دوسری ہیئت میں تبدیل کر سکتے مگر اُس کے کسی جزو کو بالکل فنا یا نابود نہیں کر سکتے اسی طرح ہم قوت کے کسی چھوٹے سے چھوٹے جزو یا کسر کو بالکل فنا نہیں کر سکتے، صرف اُسکی صورت بدل سکتے ہیں۔ اگرچہ بادی النظر میں ہم کو مادہ کے اجزا فنا ہوتے ہوئے معلوم ہوں۔ ہم ایک پونڈ کوئلہ جلا کر صرف چند اونس راکھ دیکھتے ہیں۔ اور یہ خیال کرتے ہیں کہ بقیہ حصہ کوئلہ فنا ہو گیا۔ اگر ہم اُس کے تمام دھوئیں اور اُن گیسوں کو جو اسمیں سے خارج ہو رہے ہیں احتیاط سے ایک جگہ محفوظ رکھیں تو ہم کو معلوم ہو جائیگا کہ ایک پونڈ کوئلہ کے اجزا نے اپنی صورت مختلف اجزا میں تبدیل کی ہے اور جو چیز ایک کوئلہ کے ڈلے کی شکل میں تھی وہ مختلف گیسوں کی شکل میں تبدیل ہو گئی ہے جسمیں کا ایک جزو راکھ بھی ہے، اسی طرح قوت کی مختلف شکلیں ہیں جو ہمیشہ ایک شکل سے دوسری شکل میں خود تبدیل ہوتی رہتی ہیں یا کیجا سکتی ہیں۔ مثلاً سورج کی گرمی سے ہوا و دریا چلنا پانی کے بخارات کا بھاپ بنکر سمندر سے اڑنا اور کرہ بالائی پر پہنچ کر منجمد ہو کر پھر برسنا کسی پہاڑی جھیل پر جمع ہو جانا اور پھر آبشار بنکر زمین پر گرنا۔ یہ ایک قدرتی سلسلہ ہے جو ابتدائے آفرینش سے جاری ہے اور جاری رہیگا۔ قوت کی اس طرح تبدیل شکل کو اصطلاح علمی میں بقائے قوت Conservation of Energy کہتے ہیں۔

ہر قسم کی قوت کو ہم دوسری قوت میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ کوئلہ کی مثال کو پھر لو۔ ہم کوئلہ جلاتے ہیں اُس سے حرارتی قوت پیدا ہوتی ہے۔ حرارت کو ہم حرکت میں تبدیل کرتے ہیں، حرکت کو ہم برقی قوت میں تبدیل کرتے ہیں۔ یہی برقی قوت دوسرے آلات کو یا تو گرم کرتی ہے مثلاً لیمپ یا برقی چولھا وغیرہ یا پھر حرکت میں تبدیل ہو جائیگی مثلاً برقی موٹر یا محرک۔ ان سب قوتوں کو ہم نہایت صحیح آلات سے اگر ناپیں تو معلوم ہو جائیگا کہ جسقدر کوئلہ ہم نے جلایا تھا وہ سب مختلف قوتوں میں تبدیل ہو گیا ہے

مثلاً ایک پونڈ عمدہ بنگال کے کوئلہ میں ۱۰ ہزار سے چودہ ہزار بجا[۱] ہوتے ہیں۔ اسمیں ۷۰ سے ۹۳ فیصدی جلنے والا مادہ یعنی کاربن ہوتا ہے۔ ۳ سے ۶ ہائیڈروجن۔ ۲ سے بیس فیصدی تک آکسیجن۔ ایک سے ڈہائی فیصدی نائٹروجن نصف سے پانچ فیصدی تک گندھک پندرہ فیصدی تک راکھ۔ کچھ پانی وغیرہ ہوتے ہیں۔ فرض کیجئے آپنے بوائلر بھبکہ میں ایک پونڈ کوئلہ جلایا۔ اسمیں سے ۱۲ ہزار بجا پیدا ہوسے۔ راکھ میں کچھ حرارت ضائع ہوگی۔ بھبکہ کی دیواروں میں کچھ حرارت جذب ہوکر ضائع ہوجائیگی۔ چمنی کے ذریعہ دہوئیں میں بہت سی غائب ہوجائیگی۔ باقی کی حرارت پانی میں جذب ہوکر پانی کو بھاپ میں تبدیل کرتی ہے۔ یہ بھاپ حرکت حاصل کرتی ہے اور اسمیں ڈیڑہ سو دو سو پونڈ فی مربع انچ کا دباؤ یا دھکیل دینے کی قوت پیدا ہوجاتی ہے۔ یہ قوت ایک سلنڈر یا اسطوانہ میں جاکر ایک پسٹن کو دھکیلتی ہے۔ یہ پسٹن ایک دھرے کو حرکت دیتا ہے جو ایک سلسلہ مشینوں کو حرکت دیکر مطلوبہ کام انجام دیتا ہے۔ اگر اس تمام تفصیل کے اجزا کو ہم باریک اور صحیح آلات کے ذریعہ ناپینگے تو آخر میں سب کو حرارت میں منتقل کرکے ایک پونڈ کوئلہ کی حرارت کا مجموعہ آجائیگا فرانسیسی طبیعی معلم جول نے تجربہ سے ثابت کردیا کہ ایک بجا میں اسقدر قوت ہوتی ہے کہ وہ ۷۷۸ فٹ پونڈ کام کرسکے۔ یعنی ایک پونڈ کو ۷۷۸ فٹ حرکت دے یا ۷۷۸ پونڈ کو ایک فٹ حرکت دے۔ کسی دو عدد دونکو فٹ اور پونڈ تصور کریں جنکا حاصل ضرب ۷۷۸ ہو اسے فٹ پونڈ کہتے ہیں[۲]۔ حرارت کی قوت کو ہم نے تمہید میں اس وجہ سے زیادہ تفصیل سے بیان کیا کہ دنیا کی ہر قسم کی قوت حرارت میں بآسانی تبدیل ہوسکتی ہے۔ ایک پتھر اگر اوپر سے گرے تو وہ بھی حرارت پیدا کرتا ہے۔ ہم تالی بجائیں تو حرارت پیدا ہوتی ہے۔ آبشار کا پانی جب زمین پر پہنچتا ہے تو حرارت

---

[۱] بجا مخفف ہے برطانوی حرارتی اکائی کا جسے انگریزی میں British Thermal Units کہتے ہیں اور B.Th.U. لکھا جاتا ہے۔ اگر ۳۹ درجہ ف پر ایک پونڈ خالص مقطر پانی ہو اور اسے جو مقدار حرارت ایک درجہ گرم کردیگی اُسے ایک برطانی حرارت اکائی کہتے ہیں جس طرح انگریزی اوزان اور پیمانے بے اصول اور غیر سائنٹفک ہیں اسی طرح یہ پیمانہ بھی مہمل ہیں

[۲] یہاں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ایک طاقت اسپ یعنی Horse Power ۳۳۰۰۰ فٹ پونڈ فی منٹ کے برابر ہوتی ہے خیال یہ کیا جاتا ہے کہ ایک گھوڑا ایک منٹ میں ۳۳ ہزار فٹ پونڈ کام کرتا ہے
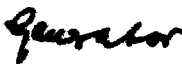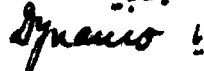
پیدا کرتا ہے۔ بہت سے اجزا میں جب کیمیاوی تغیر پیدا ہوتا ہے تو حرارت پیدا ہوتی ہے۔ کوئلہ میں یا لکڑی میں حرارت عمر بھر مقید رہے مگر جب ہم چاہیں اسے جلا کر اسمیں سے حرارت لے سکتے ہیں اور ہر حرارت کو ہم دوسری قوتوں میں خصوصاً بجلی میں آسانی تبدیل کر سکتے ہیں۔ ریڈیم میں سے ہر وقت حرارت خارج ہوتی رہتی ہے۔ خود حرارت دراصل مادہ کے سالمات کے تغیر کا نام ہے۔ ان سالمات کو جس طرح بھی ہم متغیر کر دیں حرارت پیدا ہو گی۔ اور جب حرارت پیدا ہو گی تو اسے مناسب ادوات یا آلات و مشینوں کے ذریعہ ہم حرکت میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ ایک بجائے ، ، فٹ پونڈ کے اور ایک پونڈ کوئلہ میں ۲۸ طاقت اسپ ہی۔ مگر ہم جب دو سے چار پونڈ کوئلہ جلاتے ہیں تب صرف ایک طاقت اسپ ہم کو دستیاب ہوتی ہی۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ تقریباً پانسو گنا طاقت بیکار ضائع جاتی ہے۔

بلندی پر چٹان رکھی ہو ہم اسکی قوت کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کس قدر بلندی پر کتنے وزن کی چٹان ہے۔ یہ اس کر توانائی بالقوہ ہے۔ پانی کا خزانہ کسی بلند سطح پر جمع ہے۔ اسمیں بھی اسی قدر توانائی ہے جتنی ہماری کوئلہ کی کان میں ہوتی ہے۔ کوئلہ کو جلا کر ہم اسکی قوت توانائی کو حرکت میں منتقل کرتے ہیں اسی طرح بلندی پر سے ہم پانی کو گرا کر قوت فعل میں منتقل کر سکتے ہیں۔ ہر قسم کی قوت اور حرارت کا یہ خاصہ ہی کہ وہ انسان سے چھپنا چاہتی ہی۔ یہ صرف جانوران صحرائی ہی نہیں ہیں جو حضرت انسان سی گھبراتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ جس طرح گھوڑا، بیل، بچھو وغیرہ ان ذات شریف کے قبضہ میں آ گئے ہیں اور یہ جس طرح چاہتے ہیں اُن سے کام لیتے ہیں۔ اُسی طرح قوائے فطرت حرارت وغیرہ بھی ہمیشہ چاہتی ہے کہ انکے دسترس سے بھاگے۔ جب انکا داؤ چلتا ہے تو یہ ضرور اسے اپنے قابو میں لاتے ہیں۔

ہم نے جسقدر مثالیں اوپر دی ہیں اُن سے ثابت ہوا کہ جب حرارت کو ہم تبدیل کرنا چاہتے ہیں تو وہ غائب ہونیکی اور کام نکرنیکی کوشش کرتی ہے۔ یہ قانون حرارت ہی کہ جس طرح پانی ہمیشہ ایک سطح پر رہنا چاہتا ہے اسی طرح حرارت ہر جگہ کی برابر درجہ تپش رکھنا چاہتی ہے۔ لوہے کو سرخ تپالو تھوڑی دیر کے بعد تم دیکھو گے کہ وہ ٹھنڈا ہو گیا۔ اُسکی حرارت کہاں گئی۔ آس پاس کے اجسام

میں حرارت کر سکتا نہیں قدر سے گرم کر دیا۔ اگر مختلف درجہ حرارت نہوں تو تمام دنیا آج فنا ہو جائے
یہ اختلاف درجہ حرارت ہی ہے کہ ہم سورج سے گرمی پاتے ہیں۔ اگر سورج کی گرمی کا درجہ حرارت ایک
ہو تو انتقال حرارت نہو سکے اور ہم کو گرمی بھی نہ معلوم ہو۔ گرمی اور سردی دنیا کی ہر چیز کی طرح اعتباری
ہیں۔ جو حرارت ہم ایک پونڈ کوئلہ سے حاصل کی تھی وہ مختلف طریقوں سے فضائے عالم میں پہنچکر ضائع
ہو گئی۔ اسی لئے انجنوں کو ایسی مختلف چیزوں سے ڈھکتے ہیں جو حرارت کو روک سکیں۔ یہاں تک
حرارت اور قوت کے تعلق کو بیان کر کے ہم بجلی کے پیدا کرنے کے اصول کو بیان کرتے ہیں۔

اقتصادی اور تجارتی اغراض کے لئے بجلی پیدا کرنیکی[1] صرف دو ترکیبیں ہیں۔ ایک بیٹری کے ذریعہ
دوسری ڈائنامو کے ذریعہ۔ بیٹری بھی اسقدر سستی نہیں جتنا ڈائنامو۔ البتہ عارضی اور کم مقدار
قوت برقی کے لئے بیٹری[2] کافی ہے

مقناطیس کو زمانہ دراز سے ہم لوگ جانتے ہیں۔ ایک سلاخی مقناطیس کو لو اگر اُسے ایک سوئی
پر توازن کیساتھ معلق سادہ دیں تو وہ مڑکر فوراً شمالاً جنوباً ہو جائیگا۔ جو سرا شمال کی طرف ہوگا اُسکا
نام "شمال تلاش کنندہ قطب"، مگر اختصاراً شمالی قطب اور دوسرے کو اسی طرح مختصراً جنوبی قطب کہینگے
ان دونوں قطبوں میں سے مقناطیسی شعاعیں نکلتی رہتی ہیں اور اگر لوہا یا دوسرا مقناطیس ان شعاعوں
کی زد میں آجائے تو وہ اُنکی طرف کھینچنے لگیگا۔ آپکے پاس اگر کوئی قطب نما ہو تو اُسکے پاس ایک
لوہے کا ٹکڑا لائیے دیکھیے کہ اُسکی سوئی کس طرح اُنکی طرف متوجہ ہو جاتی ہے۔ یہ شعاعیں اگرچہ غیر مرئی ہیں
مگر اُنکے اثرات سے ہم معلوم کر سکتے ہیں بلکہ صحیح طور پر نقشہ کھینچ سکتے ہیں کہ انکا راستہ کیسا ہے
ایک سادہ سلاخی مقناطیس کی یہ شکل ہے۔ دیکھو شکل ۱۔

---

[1] بجلی پیدا کرنا بلفظ تو غلط ہے مگر اصطلاحاً اس طرح ہی بولتے ہیں اور Generator
یا Dynamo بجلی پیدا کرنیوالا اُس مشین کو بولتے ہیں جسکا ذکر یہاں آرہا ہے۔

[2] بیٹری کے متعلق ہم ایک مستقل کتاب لکھ رہے ہیں۔
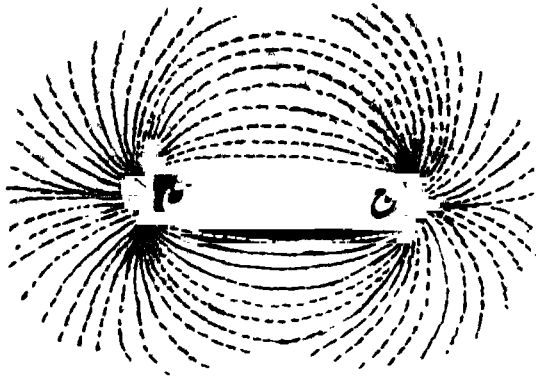
اس شکل کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قطبیں پر شعاعیں زیادہ گھنی ہیں اور جیسے جیسے قطبین سے دور ہوتی جاتی ہیں انکی شکل چھدری ہوتی جاتی ہے نظریہ یہی کہ شمالی قطب سے نکلنے والی شعاعیں قطب شمالی تک چلی جاتی ہیں اور وہاں سے زمین کے محور میں سے گزر کر قطب جنوبی میں سے ہوکر پھر مقناطیس کے جنوبی قطب میں داخل ہوجاتی ہیں اور یہی دورہ تسلسل ہمیشہ قائم رکھتی ہیں یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ایک جنس کے قطب ایک دوسرے کو دھکیلتے ہیں اور مختلف جنس کے قطب ایک دوسرے کو جذب یا ایک دوسرے سے ملنے کی کوشش کرتے ہیں مثلاً قطب نما کے شمالی قطب کو ایک مقناطیس کے قریب لاؤ اگر مقناطیس کے سرے کیطرف جھکے تو سمجھو کہ یہ مقناطیس کا سرا جنوبی ہے اور اگر وہ اس سے پرے کی طرف ہٹے تو سمجھو کہ یہ سرا شمالی ہے۔ اگر ایک گھوڑے کے نعل کی شکل کا مقناطیس لیں تو ہم دیکھینگے کہ جو حصہ سرے کے پاس ہے وہاں سے زیادہ گھنی یا کثیف شعاعیں نکلتی ہیں اور آخری سرے کی شعاعیں زیادہ منتشر ہوتی ہیں۔
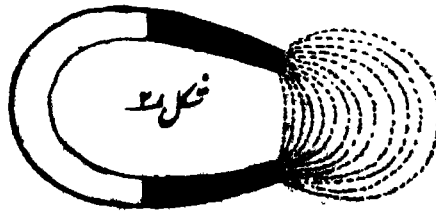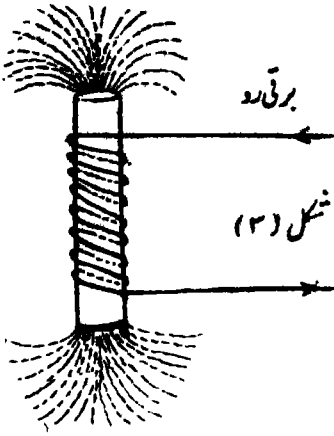
مقناطیس جو کانوں سے نکلتا ہے وہ میل کچیل
سے بھرا ہوتا ہے اور وہ اسقدر زوردار نہیں ہوتا جتنا
مصنوعی۔ مصنوعی کی دو قسمیں ہیں ایک وہ مقناطیس جسے
مستقل Permanent کہتے ہیں۔ دوسرا برقی
مقناطیس مستقل مقناطیس بنانیکی ترکیب تو یہ ہے کہ ایک
نہایت عمدہ فولادی سلاخ پر کسی دوسرے مستقل مقناطیس
کے سرے کو شمالاً جنوباً پھیرتے رہیں تو تھوڑی دیر میں یہ خود مقناطیس ہو جائیگا۔ اور تادیر قائم رہیگا
اسے مستقل مقناطیس کہتے ہیں۔

برقی مقناطیس سب سے زیادہ اہم اور تجارتی اغراض کے لئے سب سے زیادہ کارآمد ہے۔ اگر ایک
لوہے کی معمولی سلاخ کے چاروں طرف تانبے کا تار لپیٹ دیں۔ اس تار پر پہلے سوت کا تاگا لپٹا ہوا
ہو اور اس تار میں بجلی کی رو چھوڑیں تو اس سادہ لوہے کی سلاخ میں تمام مقناطیسی خصوصیات پائی
جائینگی۔ جسوقت برقی رو بند کر دی جائیگی تو اسمیں سے وہ تمام مقناطیسی خصوصیات زائل ہو جائینگی
تجارتی اور صنعتی اغراض کے لئے یہ اس وجہ سے بھی زیادہ مفید ہے کہ حسب ضرورت ہم برقی رو کو کم و بیش
کر سکتے ہیں اور مقناطیس کو بھی کمزور اور قوی بنا سکتے ہیں۔ ان مقناطیسی شعاعوں کے راستہ میں اگر
ہم ایک تانبے کی سلاخ لیکر اوپر نیچے یعنی شعاعوں کے ساتھ زاویہ قائم بناتے ہوئے حرکت دیں تو ہم
دیکھینگے کہ اس سلاخ کے دونوں سروں پر بجلی پیدا ہو گئی۔ جو آلے سے ناپ سکتا ہے۔ وہ امیر پیما کہلاتا
ہے۔ اگر ایک تار ہم ایک سرے سے لیکر امیر پیما میں سے نکال کر دوسرے سرے کے ساتھ ملا دیں
تو ہم دیکھینگے کہ سوئی حرکت کر کے اُس مقدار بجلی کو جو پیدا ہو رہی ہے بتا دیگی۔

اس متحرک سلاخ کی رفتار کے گھٹنے بڑھنے سے بھی بجلی کی پیدائش میں کمی زیادتی ہوتی رہتی ہے
ملاحظہ ہو شکل نمبر ۴۔

شکل

اسی اصول پر وہ مقناطیس بنائے جاتے ہیں جو لوہے کو بغیر پکڑے ہوئے صرف کشش سے اٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ تک لیجاتے ہیں۔ اور جہاں برقی رو کم کر دی یا کاٹ دی بس لوہے کے بڑے اجسام مقناطیس سے علیحدہ ہوجاتے ہیں۔
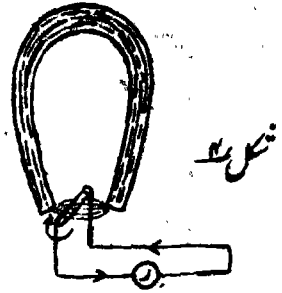
یہ اثر کہ بجلی ہو تو تار میں گر لوہے کی سادہ سلاخ میں مقناطیسی اثر پیدا کردے اصطلاح میں امالہ Induction کہتے ہیں شکل بالا دیکھنے سے معلوم ہو جائیگا کہ جب برقی رو رواں ہوتی ہے تو مقناطیس کی شعاعیں برقی رو سے زاویہ قائمہ بناتی ہیں۔ یہ مقناطیسی شعاعیں اپنے تمام افعال و اعمال میں اصل مقناطیس یا مستقل مقناطیس کے مشابہ ہوتی ہیں۔ اس لئے ہم برقی رو اور مقناطیس میں ایک قسم کا گہرا تعلق پاتے ہیں۔ اس نظریہ نے علم البرق کو جس قدر مستحکم کیا ہے کسی اور نظریہ نے نہیں کیا۔ اس نے ڈائنامو (یعنی وہ مشین جو بجلی پیدا کرتی ہے) کی ساخت میں بڑی مدد دی یعنی مقناطیس کی فضا میں جو مقناطیسی شعاعوں سے پر ہے اگر کسی موصل Conductor کو حرکت دیجائے تو وہ برقی رو پیدا کردے گا۔

یہاں ہم ایک نقشہ تجارتی ڈائنامو کا دیتے ہیں

(ا) = برقی مقناطیس

(ب) = تاروں کا گچھا جو گھومتا ہے

(س) دو برش جن کے ذریعہ بجلی جمع ہو کر بیرونی تاروں میں دوڑتی ہے۔
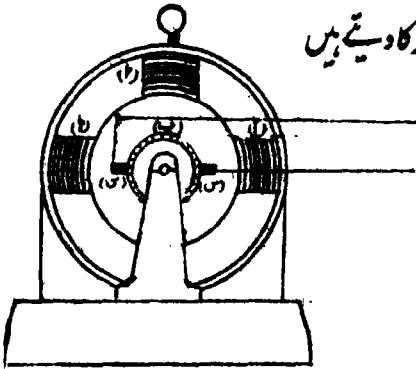
تمام بجلی گھروں میں اسی اصول پر عمل ہوتا ہے کہ ایک ڈائنامو ہوتا ہے جو بجلی پیدا کرتا ہے اور ایک دوسرا انجن ہوتا ہے جو اس تار کے مجموعہ کو حرکت دیتا ہے جو مقناطیسی شعاعوں کو کاٹتا ہے۔ سب سے پہلے جب انجن چلتا ہے تو ایک ہلکی برقی رو پیدا ہوتی ہے۔ اس رو سے مقناطیس کے گرد جو تاروں کا گچھا

انہیں ہٹا لیتے ہیں جسے اصطلاح میں تحریک کر دینا کہتے ہیں۔ جب انہیں کافی مقناطیسی قوت پیدا ہو جاتی
ہے تب تاروں کے لچھوں میں سے قوت برقی لیتے ہیں۔ یہ ابتدائی برقی رو بقیہ اثر مقناطیس سے پیدا ہوتی
ہے اگر یہ بقایا بالکل ضائع ہو جائے تو بیڑی سے تحریک دیکر لیتے ہیں۔ مگر ابھی قسم کے انجنوں میں ایسا کم
ہوتا ہے۔ اس انجن کو Prime Mover محرک ابتدائی کہتے ہیں۔ اس محرک ابتدائی کیلئے
مختلف اقسام کے انجن موجود ہیں جن سے ہم لوگ زیادہ واقف ہیں وہ بھاپ کا انجن ہے۔ اسمیں ایک بھٹی
میں آگ جلا کر پانی کو جوش دیکر بھاپ بناتے ہیں یہ بھاپ ایک اسطوانہ میں داخل ہو کر ایک پسٹن
کو دھکیلتی ہے اور پیہ کو حرکت دیتی ہے جو ڈانٹا ہو کے پیہ کو حرکت دیتا ہے۔ دوسری قسم کے انجن اندرونی
جلنے والے انجن کہلاتے ہیں۔ ایسں بجائے بھٹی میں آگ جلنے اور اس سے بھاپ لینے کے خود اسطوانہ
میں تیل یا گیس داخل ہوتی ہے اور اسمیں جب آگ لگ جاتی ہے تو وہ گیس ایک دھماکے کیسا تھ پھیلتی ہے
اس پھیلاؤ کے عمل میں وہ پسٹن کو دھکیل کر دہی عمل کرتی ہے جو بھاپ کے انجن نے کیا تھا تیسری قسم
انجنوں کی وہ ہے جسمیں صرف بھاپ کی رفتار متحرک پردوں پر ٹکرا کر انہیں حرکت دیتے ہیں۔ یہی اصول
بھاپ کی ٹربن یا پانی کی ٹربن میں ہوتا ہے۔ میں نے بعض اچھے تعلیم یافتہ لوگوں سے کہتے سنا ہے کہ
پانی سے جو بجلی پیدا ہوتی ہے وہ پانی کے اجزا کے ایک دوسرے سے رگڑنے سے پیدا ہوتی ہے یہ خیال
غلط ہے حقیقت میں بارش کا پانی جب بلند پہاڑیوں پر جمع ہو جاتا ہے اور وہاں سے گرتا ہے تو فی سو
فٹ کی بلندی پر تقریباً ۴۲ پاؤنڈ فی مربع انچ کا دباؤ پڑتا ہے، اس پانی کو جتنی زیادہ بلندی سے گرائیں
گے اسیقدر زیادہ دباؤ ہوگا۔ ہندوستان میں کشمیر۔ پونہ۔ شملہ۔ دارجلنگ وغیرہ میں ایسے بجلی گھر ہیں
یہ پانی بعض وقت پندرہ سو فٹ کی بلندی سے گرتا ہے جس کے معنی یہ ہوئے کہ ۶۳۰ پونڈ فی مربع انچ
کا دباؤ ہوا۔ اس میں کچھ قوت نلوں میں رگڑنے سے ضائع ہوتی ہے بقیہ قوت اُن متحرک پردوں پر
آکر ٹکراتی ہے جو ایک پہیہ میں لگے ہوتے ہیں اور وہ بڑی سرعت سے حرکت کرتے ہیں جو اُن تاروں
کو حرکت دیتا ہے جو فضائے مقناطیس کو قطع کرتے ہیں۔ اور اس طرح لاکھوں گھوڑوں کی قوت پیدا
ہو سکتی ہے۔

بعض جگہ ہوا سے چلنے والے بجلی گھر بھی ہیں مگر بجلی کے ڈائنامو کے لئے یکساں رفتار کا ہونا
چونکہ از بس لازمی ہے اور ہوا کی رفتار میں حرکت بہت بدلتی رہتی ہے یا دو میل فی گھنٹہ سے سو میل
فی گھنٹہ تک۔ لہذا یہ زیادہ قابل اعتبار بھی نہیں ہیں۔

اب ہم اس نظریہ کو ایک جگہ پھر جمع کرتے ہیں تاکہ ناظرین کو سب باتیں یاد ہو جاویں۔ (۱) مقناطیسی
فضا کا موجود ہونا۔ (۲) موصل (تار) کا ہونا۔ (۳) موصل میں حرکت پیدا کرنا۔ نتیجہ میں بجلی پیدا
ہو جاتی ہے۔ اس تعین کرنے کے بعد ہم کو اب دیکھنا چاہئے کہ اگر ہمارے پاس ایک ڈائنامو ہو
جس میں ہم بیرونی ذرائع سے بجلی لا کر اس کے مقناطیس کو تحریک دیدیں اور اسکے موصل کے
لچھوں میں بھی برقی رو دوڑا دیں تو کیا نتیجہ ہوگا۔ تجربہ نے ہمکو بتایا کہ یہ موصل کے لچھے جن میں برقی
رو دوڑا دی گئی ہے حرکت کرنے لگتے ہیں۔ اور وہ پہیہ جن پر موصل کے لچھے لپٹے ہوئے ہیں زور
سے حرکت کرنے لگتا ہے۔ اس پہیئے سے اگر کسی مشین کا تعلق کر دیا جائے تو وہ مشین چلنے لگیگی۔ اس
ڈائنامو کو جسے کسی محرک ابتدائی یعنی انجن نے حرکت نہیں دی ہے بلکہ برقی رو نے حرکت دی ہے اصطلاح
میں موٹر کہتے ہیں اسمیں بجلی باہر سے آتی ہے اور یہ موٹر بہت سے کام کرتی ہے۔ ٹراموے چلاتی ہے آٹے
کی چکی چلاتی ہے۔ کولھو چلاتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ مگر سب کا اصول وہی ایک ہی کہ باہر سے برقی رو آکر
مقناطیسی خواص پیدا کرتی ہے اور بجلی موصل کے لچھوں میں دوڑائی جاتی ہے اور پہیئے لچھے ایک پہیہ پر
لپٹے ہوتے ہیں چکر کھانے لگتے ہیں۔ اگر آپ کو مقناطیس کی وہ خصوصیت کہ وہ اپنے ہم جنس قطب کو
دھکیلتی ہے اور غیر جنس قطب کو کھینچتی ہے یاد ہے تو آپ آسانی سے سمجھ جائیں گے۔ برقی لچھے کے ایک
حصہ میں جب بجلی داخل ہوتی ہے تو اس میں مقناطیسی قوت پیدا کر دیتی ہے اس کے پاس دو مقناطیس
ہوتے ہیں ایک موافق دوسرا مخالف۔ اسی طرح پہیے میں متعدد مقناطیس لگے ہوتے ہیں۔ مخالف مقناطیس
اس لچھے کو کھینچتا ہے اور موافق دھکا دیتا ہے یہ دونوں قوتیں ملکر اس پہیے کو حرکت دیتی ہیں۔ اور
یہ رواں ہو کر اپنے ساتھ تمام مشینوں کو جو اس سے وابستہ ہوتی ہیں چلاتا ہے۔

دوامی حرکت

"دیکھئے صاحب۔ کوئی نہیں سنتا۔ وزیر صنعت بھی نہیں سنتا۔ میں نے سب سے کہہ دیکھا۔ ایک ایک کے پاس گیا۔ ہر ایک کی خوشامد کی لیکن کسی نے پرواہ بھی نہیں کی۔ کیا آپ مجھے تھوڑا سا وقت دے سکتے ہیں۔ کیوں صاحب۔ کیا آپ نہیں چاہتے کہ دنیا ترقی کرے۔ نوع انسان کو فائدہ پہنچے ...."

رضی نے ایک شخص کی آستین پکڑ کے جو ایک دوکان کے سامنے اپنی موٹر سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ نہایت بیتابانہ انداز میں کہنا شروع کر دیا۔ وہ پہلے تو متانت کیساتھ سنتا رہا لیکن جب اسکا سلسلہ کلام ختم ہی نہ ہوا تو اس نے روک کر کہا "دیکھو بھائی مجھے زیادہ فرصت نہیں ہے کہ تم سے بے سر و پا باتیں کیا کروں۔ آخر یہ بھی تو معلوم ہو کہ تمہارا مطلب کیا ہے۔ اور ہاں سنو میں تمہیں یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ اس طرح سڑک پر کسی شخص کا ہاتھ پکڑ کر باتیں نہیں کیا کرتے ہیں"۔ "مجھے معاف کیجئے" یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے پر شرمندگی اور خوشی کے آثار جھلکنے لگے اس کی آنکھیں کامیابی کی امید سے چمک اٹھیں اس نے جاری رکھتے ہوئے کہا "مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو تکلیف دی۔ اگر آپ سننے کے لئے تیار ہیں تو میں آپ کو بتلاتا ہوں کہ میں ایک عجیب و غریب ایجاد کر سکتا ہوں جس سے کاروباری دنیا میں زبردست انقلاب ہو جائے گا۔ پٹرول اور کوئلے کی ضرورت ہی نہ رہے گی۔ پھر کوئی سٹیم کاہے کو بنائے گا" وہ یہ کہتا جاتا تھا اور اسکا انداز گفتگو زیادہ فاتحانہ ہوتا جاتا تھا۔ اس نے مٹھیاں باندھ کر۔ نتھنے پھلا پھلا کر۔ شانوں کو سمیٹ سمیٹ کر۔ بلند آواز میں کہنا شروع کیا "مجھے معلوم ہے۔ میں ایک ایسا پہیہ ایجاد کر سکتا ہوں جو ایک مرتبہ حرکت دینے پر ہمیشہ ہمیشہ چلتا رہیگا یعنی بغیر چلائے۔ بغیر اس کے کہ کوئلہ جھونکا جائے یا پانی گرم کیا جائے ....."

"خبط ہے قطعی خبط۔ مجھے معاف کیجئے میں کچھ نہیں کر سکتا"، یہ کہتے ہوئے اس نے موٹر کی کھڑکی کھولی اور سیٹ پر بیٹھ کر گھومنے والا پہیہ ہاتھوں میں لے لیا "ہمیشہ کیسے چل سکتا ہے" اور اس نے موٹر کا سلف سٹارٹر دبا دیا۔

"اچھا ایک بات تو سنئے "

"جی نہیں۔ بس معاف کیجئے" اور موٹر روانہ ہوگئی۔

"توبہ۔ توبہ کیا بدتہذیب لوگ ہیں یکین صاحب۔ ایک شریف آدمی کو بات کرنیکے لئے وقت دیکر اس کی پوری بات بھی نہ سننا۔ یہ کہاں کی تہذیب ہے" وہ بڑبڑاتا ہوا ایک جانب کو چلدیا "دنیا کسقدر خودغرض ہے بس اپنے کام میں دیر نہو۔ خواہ دوسروں کا کام۔ سب ہی کے فائدے کا کام یونہی پڑا سڑجائے اسے صاحب کوئی میں اپنے لیے تو کہتا نہ تھا۔ اس میں تو ساری دنیا کا فائدہ تھا۔ . . . . "

رضی اسی طرح بازاروں میں۔ پارکوں میں۔ ہوٹلوں میں سڑکوں پر گھومتا پھرتا اور ہر ایک کے سامنے اپنی درخواست پیش کر دیتا لیکن آجتک اسکو کسی نے مالی امداد نہ دی جو وہ کام شروع کر سکتا وہ روز صبح اُٹھکر اسی طرح چکر لگاتا کبھی تو اسے انتہائی خوشی ہوتی۔ وہ سمجھتا کہ اب کامیابی قریب ہے اور یقینی۔ اور کبھی مایوس ہو کر چاہتا کہ خودکشی کرلے لیکن وہ چیز جو اُسکے سینہ کے اندر مدفون تھی اسے اس پر بھی تیار نہونے دیتی۔ رات کو جب وہ تھک کر اپنے بستر پر لیٹتا تو سب کو بُرا بھلا کہتا۔ خودغرض اور ظالم بتاتا سیکڑوں گالیاں دیتا لیکن صبح جب اُٹھتا تو پھر انہیں کے سامنے ہاتھ پھیلاتا۔

(۲)

"بھاؤ بھائی چلے جاؤ۔ صاحب سے اطلاع کر دو" رضی ایک عالیشان کوٹھی کے سامنے کھڑا ہوا چند ملازمین سے کہہ رہا تھا۔

"اجی اپنا کام کرو" ایک ملازم نے کہا "ہمارے صاحب تم جیسے آدمیوں سے ملا کریں تو وہ اسی کے ہو جائیں"۔

"ہاں اور کیا" دوسرا بولا "اور بھائی تمہیں خیال نہیں۔ ابھی پرسوں تیلی گھر کے بڑے صاحب ملنے آئے تھے تو ہمارے صاحب نے اُن سے بھی ملنے سے انکار کر دیا تھا"

"بھائی مجھے تو وقت دیا ہے۔ خاص طور پر بلایا ہے۔ تم جا کر ذرا اطلاع تو کر دو" رضی نے بڑی خوشامد سے کہا۔

"اچھا کہ دیکھ،، ایک نوکر نے دوسرے سے کہا، "لیکن بھائی کہیں خفا نہوں،،
"اب ہوا کریں جہاں صاحب خفا ہوتے ہیں وہاں ایک دفعہ اکی خطا بھی سہی،،
نوکر ادہر اندر داخل ہوا ادہر رضی نے اپنا کاغذوں کا بستہ کھولکر دیکھنا شروع کیا کہ کہیں کوئی چیز گھر چھوڑ تو نہیں آیا۔ خدا جانے کس ترکیب سے آج اس نے مسٹر سہراب جی پستونجی سے ملنے کے لئے وقت لے لیا تھا۔ علی الصبح اٹھکر غسل کیا۔ کپڑے بدلے اور تمام نقشے۔ کاغذات رجسٹر اور کتابیں وغیرہ لے کر روانہ ہوگیا۔ کئی دفعہ تو وہ راستہ سے پلٹا۔ کیونکہ اسے کوئی نہ کوئی بہت ہی ضروری چیز یاد آجاتی۔ جو وہ گھر بھول آیا تھا۔
"چلئے،، نوکر نے ہنسکر کہا،، صاحب بلا رہے ہیں" اور رضی جلدی جلدی بستہ باندھتے ہوئے اندر داخل ہوا،، آداب عرض ہے مسٹر رضی۔ آئے اپنی سکیم بیان کیجئے،،
"جی ہاں،، رضی کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں،، میں نے اپنی ساری زندگی اسی کام میں صرف کر دی۔ مجھے ایک بات مل گئی ہے۔ میں نے وہ چیز معلوم کر لی ہے جس کے ظاہر ہونے پر دنیا میں تہلکہ پڑ جائیگا۔ بس آپ کی امداد کی ضرورت ہے۔ آپ کا نام ہو جائے گا۔ اور پھر فائدہ بھی ہے۔ اگر آپنے یہ پہیہ چلا دیا تو لاکھوں، کروروں روپیہ کا فائدہ ہوگا،، اور پھر فوراً اس نے بستہ کھولکر تمام کمرے میں نقشے اور کاغذ پھیلا دئے۔ اور کھڑے ہو کر۔ بیٹھ کر۔ ادہر ادہر گھوم کر تمام اصول سمجھانے شروع کر دئے۔ اس کے بعد اس نے یہ بھی بتلایا کہ چھوٹے سے پیمانے پر اس نے ایک مشین تیار بھی کی تھی لیکن محض اسوجہ سے کہ سب چیزیں بہت چھوٹی چھوٹی تھیں۔ توازن درست نہوا اور مشین نہ چل سکی صاحب دنیا میں سارے کام روپیہ سے چلتے ہیں" یہ اس کے آخری الفاظ تھے جو اس نے درخواست کی صورت میں پیش کئے اور ایک آرام کرسی کھینچ کر اس پر بیٹھ گیا۔ اور امید وبیم کی حالت میں سہراب جی کا منہ تکنے لگا
"میں اس کام میں ضرور تمہاری مدد کروں گا" مسٹر سہراب جی نے کہا۔ وہ ایک زبردست تاجر تھا اور بڑا مالدار۔ اسے اس سے کچھ مطلب نہ تھا کہ بنی نوع انسان کو اس سکیم سے کیا فائدہ پہنچیگا وہ تو محض اس وجہ سے راضی ہو گیا کہ اسمیں لاکھوں روپیہ کے فائدہ کا امکان تھا۔

"لیکن تمہاری وہ چھوٹی مشین ابھی موجود ہے"

"جی ہاں۔ آپ دیکھ سکتے ہیں"

"اچھا۔ تو آج ہی ۱۱ بجے مجھے ۱۱ بجے کے قریب میں اسے چلکر دیکھوں گا"

"بہت خوب۔ ۱۱ بجے میں خود حاضر ہو جاؤنگا"۔ وہ یہ کہتا ہوا کمرے سے باہر نکل آیا خوشی کی وجہ سے اس کے پاؤں زمین پر نہ پڑتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو بہت ہلکا محسوس کرتا تھا۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہ ہوا میں اڑا چلا جا رہا ہو۔ کچھ دور چلکر وہ ایک دم رک گیا اور جیب سے گھڑی نکال کر دیکھی" ۸ ۱/۲ یعنی ۱۱ بجنے میں صرف ڈھائی گھنٹے ہیں"، اس نے اپنے دل میں کہا، "اگر میں گھر چلا گیا تو ممکن ہے کہ دیر ہو جائے اور میں ٹھیک وقت پر نہ پہنچ سکوں" اس خیال کے آتے ہی اس نے اپنا رخ پلٹ دیا اور قریب ہی کے ایک پارک کی جانب چلدیا۔ وہاں پہنچکر بستہ سرہانے رکھکر ہری ہری گھاس پر چاروں شانے چت لیٹ گیا۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں بحر تخیل میں تیرنے لگا۔ دریا کی موجیں اسے بہائے لئے جا رہی تھیں اور خدا جانے کہاں لئے جا رہی تھیں۔ یہ اسے بھی معلوم نہ تھا کبھی کبھی ہلکے ہلکے جھکولوں سے وہ آنکھیں کھول دیتا تھا مگر پھر بند کرلیتا تھا۔ ایک خاص کیفیت اس پر طاری تھی۔ کامیابی کے نشہ کا سرور تھا جس میں وہ مست تھا اور اسے خود اسمیں لطف آ رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس نے اپنے ذہن ہی میں تمام انتظامات کر لئے اور مشین بھی تیار کرلی۔ اس نے دیکھا کہ اخباروں نے اسکی اس حیرت انگیز ایجاد پر بڑے بڑے مقالے لکھے۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ ہوائی جہاز۔ ریلیں۔ موٹریں مشینیں سب کی سب اسی کے ایجاد کردہ طریقہ پر چل رہی ہیں۔ بازار میں ایک انقلاب ہو گیا ہے۔ کوئلے تیل پٹرول وغیرہ کا نرخ بالکل گر گیا ہے ..... یہ سوچتے سوچتے وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ "ہائیں گیارہ بجنے میں دس منٹ"، اس نے زور سے کہا اور مضطربانہ انداز میں سہراب جی کی کوٹھی کی جانب روانہ ہو گیا۔

(۳)

"مگر کم از کم مجھے یہ معلوم ہونا چاہئے"، رمنی نے بیلی روڈ کے زیر تعمیر مکان میں داخل ہوتے ہوئے کہا، "کہ اب اس کی تیاری میں کتنے دن لگیں گے"۔ اس نے اندر پہنچکر کوٹ اور ٹوپی اتار کر کھونٹی پر لٹکا دی

اور آستینیں چڑھا کر کام میں مشغول ہو گیا۔ اسی طرح کام کرتے ہوئے اسے ایک عرصہ ہو گیا تھا۔ مکان تقریباً تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔ ضرورت کے مطابق اسمیں سیکڑوں در۔ گذشتے اور سیڑھیاں تعمیر کی گئی تھیں گودام میں ہزاروں قسم کے پرزے تیار رکھے تھے۔ لاکھوں طرح کے تو پہیئے بنائے گئے تھے۔ چھوٹے چھوٹے بھی۔ بڑے بڑے بھی۔ دندانے دار بھی۔ سادے بھی۔ گول بھی بیضادی بھی غرضکہ انبار کے انبار پہیوں کے لگے ہوئے تھے۔

"اب کیا دیر ہے" اس نے دن کا کام ختم کرتے ہوئے دار وغہ کو بلا کر پوچھا۔ "آخر بھائی کبتک یہ عمارت ختم ہو گی"

"دیر کیا۔ عمارت تو قریب قریب ختم ہو چکی ہے۔ بس ایک تھوڑا سا کام باقی ہے میرے خیال میں ایک ہفتہ کے بعد مکمل ہو جائے گی" اور دار وغہ کا اندازہ صحیح نکلا۔ ایک ہفتہ۔ بعد مکان بالکل تیار ہو گیا۔ اور رضی نے فٹنگ شروع کر دی۔ دن بھر اور رات کے بارہ بارہ بجے تک لگا رہتا۔ چند ہی روز میں عمارت میں تمام پہیئے ہی پہیئے نظر آنے لگے۔ کام ابھی جاری تھا اور رضی کے انہماک کی یہ کیفیت تھی۔ کہ داڑھی اور سر کے بال بڑھ گئے تھے۔ کپڑے میلے چکیٹ ہو گئے تھے۔ چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ برسوں کا بیمار ہے لیکن اسے تو کسی چیز کا بھی ہوش نہ تھا وہ تو بالکل خود فراموشی کے عالم میں اپنے کام میں لگا تھا اور سمجھتا تھا کہ اب وہ دن دور نہیں ہے جبکہ وہ کامیاب ہو گا کتنی ہی صبح شام ہوئے اور کتنی ہی شامیں صبح ہو گئیں لیکن رضی برابر پہیئے جوڑتا رہا یہانتک کہ ایکدن گودام کے سب پہیئے ختم ہو گئے۔ لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ کچھ اسے پاگل سمجھتے اور کچھ تعجب کرتے لیکن نتیجہ کے اشتیاق میں سیکڑوں آدمی دیکھنے کے لئے جمع ہونے لگے۔

"بس ایک پہیہ کی ضرورت ہے" رضی نے آخری پہیہ لگاتے ہوئے کہا اور یکایک کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ ٹھوڑی پر انگلی رکھے۔ گردن نیچے کئے۔ کئی گھنٹے متواتر وہ اسی جگہ کھڑا سوچتا رہا۔

"مجھے اچھی طرح یاد ہے" اس نے اپنے دل میں کہا "کہ کسی جگہ ایک پہیہ کی ضرورت ہے اور بس۔ پھر یہ چلنے لگے گی۔ ذرا سی حرکت دینے سے ہمیشہ ہمیشہ چلتی رہے گی جبتک آگ۔ پانی۔ ہوا۔ اور خاک

کی حکومت قائم ہے اسوقت تک برابر چلا کرے گی ..... لیکن وہ ایک پہیہ۔ تو ۔ بالکل یاد نہیں پڑتا وہ کس قسم کا تھا۔ اور کہاں پر تھا۔ میں اسے بھولا نہیں ہوں۔ اب بھی اپنے دل کی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ لیکن ذہن کمبخت جواب دے گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ میرے سامنے موجود ہے مجھے خوب یاد ہے۔ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں لیکن اب نہیں خیال آتا۔"

اسی طرح وہ بیٹھا بیٹھا سوچا کرتا۔ اور سوچتے سوچتے وہیں پڑ کر سوجاتا۔ اب اس نے کھانا پینا بھی ترک کر دیا تھا۔ اور اُس کی حالت دیوانوں کی سی ہوگئی تھی۔ بیٹھے بیٹھے وہ چلا اٹھتا "ہاں ہاں۔ ملگیا" یہ کہتا ہوا اکثر دوڑ پڑتا "دیکھو دیکھو وہ ہے۔ بس یہی ہے" اس کے احباب کو جب اس نئے جنون کی خبر ہوئی تو انہیں سے اکثر اسے سمجھانے آئے۔ نذیر تو ایک سے زیادہ مرتبہ اس کے پاس آیا "چھوڑو بھی" نذیر نے اس کے پاس بیٹھکر کہا "سنا بھئی۔ اب اس خبط کو جانے دو"

"نہیں کیا" وہ جھنجلا اٹھتا "کس کس مشکل سے سہراب جی کو راضی کیا۔ اتنا روپیہ خرچ کرایا مہینوں محنت کرتے گذر گئے۔ اب صرف ایک پہیہ کی کمی ہے۔ بھلا کیسے چھوڑ سکتا ہوں اور پھر یہ بھی نہیں کہ جانتا نہ ہوں۔ معلوم ہے لیکن ذہن سے اتر گیا ہے۔ اسی لئے سوچتا ہوں کہ یاد آجائے" غرضکہ سب اسے سمجھاتے سمجھاتے تھک گئے حتیٰ کہ خود سہراب جی نے اس کی حالت پر رحم کھا کر کہا "جانے دو بھئی میرا اتنا روپیہ گیا تو جانے دو۔ لیکن اپنی جان کے پیچھے کیوں پڑے ہو۔ ہزاروں آدمیوں نے ایجادیں کرنے کی کوششیں کیں۔ کچھ کامیاب ہوئے۔ سیکڑوں ناکام بھی رہے۔ تو کہیں انہوں نے اپنی جانیں تھوڑی دیدیں"

"یہ بات نہیں ہے" رمنی نے ایک تنکے سے زمین کریدتے ہوئے کہا "میں تو جانتا ہوں بس ایک پہیہ کی کسر ہے۔ صرف یہ یاد نہیں آتا وہ کونسا پہیہ ہے۔ اس کے یاد آتے ہی پھر کیا بات ہے"

(۴)

اب تو کتنے ہی روز اسے جاگتے ہوگئے تھے کھانا نہ کھانے کی وجہ سے اتنا کمزور ہوگیا تھا کہ اٹھنا بیٹھنا بھی مشکل تھا۔ ایک ہی جگہ پڑا ہوا بڑبڑاتا رہتا۔ ایک دن اسی حالت میں خود بخود اس کی آنکھ لگ گئی۔ تھوڑی

دیر بعد اسے ایسا معلوم ہوا کہ ایک آواز اس کے کان میں آرہی ہے۔ وہ چونک کر اُٹھا۔ اسکا دل کہہ رہا تھا "اٹھو اور اپنا کام کرو دائمی حرکت کرنیوالی مشین کائنات عالم ہے۔ اور وہ پہیہ جو تو بھول گیا تو خود ہے" گھبرا کر وہ کھڑا ہوگیا اور بیساختہ چلا اٹھا "یاد آگیا سمجھ گیا۔ بس مجھے اپنا کام کرنا چاہئے۔ یہ سب دھوکا ہے" ساری یہ کہتا ہوا وہ ایک جانب کو چلدیا۔

اس دوران میں نذیر تجارت کے سلسلے میں باہر گیا ہوا تھا کئی برس کے بعد جب واپس آیا تو خیال کیا کہ لاؤ اپنے دوست کو دیکھ آئیں جانے کس حال میں ہے۔ بیلی روڈ پہنچکر اس مکان میں گیا جس میں مشین لگائی گئی تھی۔ دیکھا تو وہاں کا نقشہ ہی بدل چکا تھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ رضی نے ویسلی اسٹریٹ میں جوتے کی دوکان کرلی ہے۔ ویسلی اسٹریٹ پہنچکر دیکھا تو اُسکی حالت کچھ سے کچھ ہوگئی تھی "کہو بھئی" اس نے مذاقاً پوچھا "تمہاری مشین تیار ہوگئی"

"بالکل" رضی نے بھی اسی انداز میں جواب دیا "کبھی نہ رکنے والی مشین تو کائنات عالم ہے اور وہ بھولا ہوا پہیہ میں خود ہوں۔ ٹھیک ہے نا نذیر"

دونوں نے ملکر ایک قہقہہ لگایا اور راستہ چلنے والے اُنکی طرف مڑمڑ کر دیکھنے لگے۔

غزل

از علامہ میر غلام علی صاحب آزاد بلگرامی

(غیر مطبوعہ)

دل غمگین مرا خوش بہ زیارت کردی — خانہ را سوختی و باز عمارت کردی

آنکہ اسلوب مزاج تو شناسد داند — کہ بہ تیغ مژہ خود چہ اشارت کردی

ہیچ از دین و دل و طاقت من باقی نیست — بچہ تقصیر مرا اینہمہ غارت کردی

اے صبا رفتی و پیغام بتفصیل گفتی — آفریں خوب ادا حق سفارت کردی

دل خریدی و عوض مایۂ حرماں دادی — باد سود تو فزوں طرفہ تجارت کردی

خوب کردی کہ سحر از پے دریوزۂ فیض
مشہد اقدس آزاد زیارت کردی

دیگر

بروں آمد چراغ خلوت خم از نقاب امشب — گذشت از شیشۂ نہ آسماں نور شراب امشب

گل رخسار ساقی پرتوے انداخت در جامم — کہ آید از لب پیمانہ ام بوئے گلاب امشب

کواکب گرد من تا صبح چوں پروانہ مے گردد — کہ شمع طلعت آں ماہ را دیدم بخواب امشب

زیاراں معنی آموختن آزاد پرسیدم
زبان شمع محفل یافتم حاضر جواب امشب

اقتباسات

جمعیۃ مستشرقین المانی

گذشتہ اکتوبر میں شہر ہابرگ میں جرمن مستشرقین کی جو کانفرنس ہوئی تھی اسکا ذکر جامعہ کی کسی گذشتہ اشاعت میں ہو چکا ہے۔ اس اجلاس کی مفصل رپورٹ اب ہمارے سامنے ہے اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ علوم مشرقی کی تحقیق میں یہ "غیر مہذب" قوم کتنی کوشش صرف کر رہی ہے۔ علاوہ عام تقریروں کے مندرجہ ذیل شعبوں کے جلسے ہوئے

(۱) مصر، اسیریا اور ایشیائے کوچک کی زبانیں اور تمدن۔

(۲) عہد عتیق اور مباحث متعلقہ السنہ سامی۔

(۳) مشرق اسلامی۔

(۴) مشرق بازنطینی۔

(۵) ہندوستان، ایران اور وسطی ایشیا کی زبانیں اور تمدن۔

(۶) چین و جاپان کی زبانیں اور تمدن۔

(۷) جزائر ہند اور بحر جنوبی کی زبانیں اور تمدن۔

(۸) افریقہ کی زبانیں اور تمدن۔

سب شعبوں میں بلند پایہ تحقیقی مضامین پڑھے گئے۔ ان سب کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔ اسلامی علوم کے متعلق جو خاص خاص مضامین پیش کئے گئے انکا خلاصہ ہدیہ ناظرین ہے۔

۱۔ سابق وزیر اور موجودہ صدر جمعیۃ مستشرقین ڈاکٹر روزن نے ناصر خسرو کی شاعری، فلسفہ، اور سیاحت پر مضمون پڑھا اور پہلی جنگ صلیبی سے قبل کے تدنی حالات پر روشنی ڈالی۔ ناصر خسرو (ولادت ۱۰۰۳ع؛ وفات ۱۰۸۸ع) کو اسکے کمالات کے تنوع کے باعث پہلے مستشرقین دو بنام شخصیتوں سے تعبیر کرتے رہے۔ ایک نام نہاد خود تصنیف سوانح عمری نے اس کے حالات پر بہت کچھ پردہ ڈالا

اور مذہبی تعصب کے باعث بھی لوگوں نے اس کے متعلق طرح طرح کی باتیں باور کر رکھی تھیں۔ بعد میں جا کر کہیں ایتھے اور براون نے اسے صحیح شکل میں دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اس کا ایک دیوان (مطبوعہ تبریز ۱۲۸۰ھ) اور دو اور نظمیں روشنائی نامہ اور سعادت نامہ عرصہ سے موجود ہیں اور کچھ عرصہ ہوا دو نثر کی کتابیں "وجہ دین" اور "زاد المسافرین" طبع ہو کر شائقین تک پہنچ گئی ہیں۔ اول الذکر تو اس وجہ سے خاص اہمیت رکھتی ہے کہ مصنف یونانی تصور کائنات سے چلکر علمی بنیاد پر ایک اسلامی تصور کائنات پیش کرتا ہے، سفرنامہ۔ اس لئے بہت دلچسپ اور مفید ہے کہ جنگ صلیبی سے قبل اسلامی مشرق کے حالات اسی سے ملتے ہیں۔ اور کتاب اس زمانہ کے تمدنی حالات کے متعلق نہایت صحیح معلومات بہم پہنچاتی ہے جنہیں سے اکثر کے آثار کو بعد کے واقعات نے ہم سے ہمیشہ کے لئے پوشیدہ کر دیا۔ خود مصنف کے حالات زندگی اور اس کے تغیرات ذہنی کے لئے بھی فراہمی مواد کا بہترین ذریعہ یہی سفرنامہ ہے۔

فاضل مضمون نگار نے بتایا کہ چارلس شیفر کا شائع کردہ فرانسیسی ترجمہ اکثر جگہ ناقص ہے۔ زر، سکہ پیمانہ و اوزان کے متعلق دیباچہ میں متعدد غلطیاں ہیں جنکی وجہ سے کتاب کے قیمتی حصوں کے سمجھنے میں دقت ہوتی ہے اس اہم کتاب کو مع حواشی و تشریحات شائع کرنا ازبس ضروری ہے

۲۔ گرومان (پراگ) نے "اسلامی مشرق میں سحر اور گنڈے تعویذ" پر مضمون پڑھا اور مختلف قدیم لیفوں سے سحر کی عبارتیں نقل کر کے Gnostic سلسلہ سے اسکا تعلق ظاہر کیا اور نصرانی اور یہودی عناصر کی آمیزش کے ثبوت دئے

۳۔ باؤم اشٹارک (بون) نے اپنے مضمون "قران میں عیسائی اور یہودی طریق صلوٰۃ" میں اعداد و شمار کی مدد سے یہ ثابت کرنیکی کوشش کی کہ اصلی اسلامی نماز اور عیسائی طریقہ عبادت عام طور پر بالکل ایک سا ہے۔ لیکن یہودی طریق عبادت کا اثر اسلامی صلوٰۃ پر بہت کم معلوم ہوتا ہے

۴۔ مارگولیس (آکسفورڈ) نے ان قلمی نسخوں کی تفصیل بیان کی جن پر اس نے یاقوت کی معجم الادبا کی چوتھی جلد کی بنیاد رکھی ہے۔ انہیں سے ایک تو کسی قدیم نسخہ کی نقل ہے جو ایک دمشقی کتب فروش

ھ یہ دونوں کتابیں مکتبہ جامعہ ملیہ سے مل سکتی ہیں۔ مطبوعہ شرکت کاویانی برلن

نے پنسل سے لکھی اور جب اس نے کوئی ۳۰ برس ہوئے ہالینڈ کے قنصل کے ہاتھ فروخت کیا تھا۔
اس نقل کا عنوان ہے "مجموعہ تراجم ادبا منتخبہ خطیبہ قدیمہ" یہ شروع ہوتا ہے الحسین بن الحسن بن درہاں
کے ذکر سے اور آخری تذکرہ ہے عبید بن خثریہ کا۔ اس تذکرہ سے قبل کوئی اہم صفحے غائب ہیں جن میں
اکثر عبداللہ نام والے نکل گئے ہیں۔
اسکے علاوہ چند اوراق ہیں جو ایک بڑے قلمی نسخہ کے نمونے کے طور پر آئے تھے۔ اس قلمی نسخہ کا مالک ایک
حلبی شیخ بتایا جاتا ہے لیکن اس کے علمی خزائن کے متعلق اطلاعات نہایت متضاد قسم کی ہیں۔ کہا جاتا
ہے کہ الحسن بن محمد الصغانی، سے شروع ہو کر اس قلمی نسخہ میں ۲۳۶ اشخاص کا تذکرہ ہے اور آخر میں اس
میں بھی عبید بن شریہ ہے۔
کتاب کی ساتویں جلد کا حوالہ سیوطی نے بغیہ میں کثرت سے دیا ہے البتہ چوتھی جلد کا حوالہ کہیں
نہیں معلوم ہوتا۔ ہاں سالم بن احمد کا تذکرہ قلمی نسخہ میں اور بغیہ میں تقریباً لفظ بہ لفظ ایک ہے۔
۵۔ اسٹروتھان (گیبن) نے "خارجیین" پر مضمون پڑھا اور عمران بن حسان کی نظم اور ابو حمزہ مختار بن
عوف کی انقلابی تقریر کے الفاظ سے اس تحریک کی نفسی کیفیت اور اس کے اجتماعی عناصر کو واضح کیا
۶۔ شاخٹ (فرائی برگ) کے مضمون کا عنوان تھا "آئین بابل سے شرع اسلامی تک" قدیم
دستاویزوں کی مدد سے جنکا سلسلہ ولادت مسیح تک پہنچتا ہے مضمون نگار نے بابلی آئین معاہدہ
اور عربی قانون رواجی کا تعلق ظاہر کیا ہے جس پر اس کی رائے میں شرع اسلامی کی بنیاد ہے۔ اگرچہ یہ
رواجی قانون مسیح سے کوئی ۶۰۰ سال بعد پورا رائج ہوا تھا تاہم اسمیں اور بابلی آئین میں مختلف
طریقوں سے رشتہ بتلایا گیا۔
۷۔ اشپیس (بان): فلسفہ یونان اسلامی نظریات شرعی کی بنیاد کی حیثیت سے۔
مثال کے طور پر مضمون نگار نے کسی چیز کے تیاری کے بعد حق ملکیت میں حنفی اور شافعی فقہ
کے اختلاف کو پیش کیا ہے جس کی بنا اسکے نزدیک ان دو فقہوں کا مختلف فلسفہ یونانی کے دو
مختلف مذاہب سے متاثر ہونا ہے یعنی کسی دوسرے کی چیز سے ایک آدمی بالکل دوسری چیز

بنا لیتا ہے تو مالک کون ہے اصل مادہ کا مالک یا نئی چیز کا بنانیوالا ۔ شافعی کہتے ہیں جبکا اصلی مادہ تھا وہ مالک ہے حنفی کہتے ہیں جس نے نئی چیز بنائی وہ مالک ۔ ان مختلف فیصلوں کی وجہ یونانی فلسفہ میں دیکھاتی ہے۔ کیونکہ دراصل سوال فلسفہ کا ہی ہے۔ یعنی مسئلہ ہیولیٰ و شکل حنفی ایک مذہب کے قائل ہیں اور شکل کو اصل مانتے ہیں شافعی دوسرے مذہب کے ماننے والے ہیں اور ہیولیٰ کو اصل تسلیم کرتے ہیں۔

۸۔ کرامرز (لاندن) نے "آل عثمان کے بانی کا نام" پر مضمون پڑھا۔ یہ اسلامی نام اپنے بیٹے اورخان اور باپ ارتغرل کے ناموں کے درمیان کچھ بے جوڑ معلوم ہوتا ہے پھر ایک ایسے احول میں اس کا آنا جہاں کم و بیش شیعی اثر تھا اور بھی عجیب بات ہے۔ لوگوں نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ کوئی قدیم ترکی نام ہے جسے بعد کو معرب کر لیا گیا ہے۔ سب سے پہلے جو نام آتا ہے وہ عثمانجک ہے جسکا ذکر ابن بطوطہ اور ابن خلدون نے بھی کیا ہے۔ شمالی اناطولیہ میں ایک مقام کا نام عثمانجک ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ نام اسی مقام کے نام سے لیا گیا ہو۔ ابن بی بی نے ۱۳ ویں صدی عیسوی کے نصف اول میں اس نام کا ذکر کیا ہے مضمون نگار نے تفصیل سے آل عثمان اور شمالی اناطولیہ کے تعلق پر روشنی ڈالی۔

۹۔ برونشر نے اپنے مضمون "مغرب اقصیٰ میں شرع و سیاست" میں مراکشی آئین کے جدید رجحانات و ترمیمات کا ذکر کیا۔

۱۰۔ دیترش نے "شعرانی کے حالات اور اسکا مذہب خود نوشتہ سوانح عمری سے" پر مضمون پڑھا۔ اس میں عبدالوہاب الشعرانی کی کتاب لطائف المنن والاخلاق سے مصنف کے حالات جمع کئے گئے ہیں۔

۱۱۔ لائپزش کے مشہور پروفیسر فشر نے اپنی عربی لغت کی تفصیل بیان کی۔ اس لغت میں بالالتزام مندرجہ ذیل کتب ادب کے جملہ لغات شامل ہونگے۔ جاہلیت سے خلافت بنو امیہ کے ختم تک کے تمام شعرا کا مطبوعہ کلام؛ ضرب الامثال، قرآن، صحیح بخاری، صحیح مسلم، الجامع الصغیر سیوطی، قبل اسلام

اور ابتدا، اسلام کے عہد کے کتبے، قدیم پیاپرس، اس کے علاوہ بیانی اور علمی نثر کی کتابوں کے لغات بھی شامل ہونگے۔ نیز دیوان ابونواس، ابوالعلی المعری، متنبی اور مقامات ہمدانی و حریری کے لغات مختلف مشہور علما نے متذکرہ بالا کام کو تقسیم کر لیا ہے اور جسیم لغات میں مدد دی ہے۔ لغت جرمن زبان میں چھپیگا یعنی تمام مباحث، اور تفصیلات جرمن میں ہونگی۔ معانی انگریزی میں بھی درج کردیے جائینگے کتاب اس سال چھپنا شروع ہو گئی ہے۔ اور حصہ حصہ کر کے شائع ہوگی۔

گوکھلے نے ہندوستان کی سیاسی اور جماعتی زندگی پر جو احسانات کئے ہیں ان میں جمعیتہ خدام ہند کا قیام شاید سب سے اہم سمجھا جا سکتا ہے۔ اس جمعیتہ نے پچھلے دنوں اپنی زندگی کے ۲۲ سال پورے کئے۔ جو لوگ صدر یا ناظم بننے کے شوق سے انجمن سازی کے مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں لیکن جنہیں یہ سعادت چند ماہ سے زیادہ نصیب نہیں ہو سکتی کیونکہ جلد ہی انکی ذہانت کوئی بہتر ام یا زیادہ "چلتا ہوا" "پروگرام" سوجھا دیتی ہے وہ تو ایک روکھے پھیکے کم و بیش گمنامی کے اس کام کو جو اس جمعیتہ کے رکن انجام دیتے ہیں ۲۲ سال تک چلتے دیکھکر متعجب ہونگے لیکن سچ یہ ہے کہ اپنی بےنفسی اور استقلال، غور و فکر اور طالبعلمانہ انہماک سے اس جمعیتہ کے ارکین نے اپنے کو ملک کی سیاسی زندگی کا نہایت اہم جزو بنا دیا ہے۔ بائیسویں سالگرہ کی تقریب کو اس وجہ سے اور بھی اہمیت حاصل ہو گئی تھی کہ جمعیتہ کے صدر سری نواس شاستری صاحب جنوبی افریقہ میں حکومت ہند کا اول وکیل بنکر جا رہے ہیں اور جمعیتہ نے خاص طور پر انہیں اس عہدے کے قبول کرنیکی اجازت دی ہے۔

قوم کے دل میں جمعیتہ کے کام کی خوبی اور اہمیت کا جو خیال ہے اسکا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ گذشتہ آتشزدگی سے جمعیتہ کو جو نقصان پہنچا تھا اسکی تلافی قوم نے کافی رقم فراہم کر کے بہت جلد کر دی اور آتشزدہ مطبع کے لئے پہلے سے بہتر اور وسیع تر عمارت کے بننے کا کام شروع ہو گیا ہے۔ قوم کی یہ بروقت امداد بیشک قومی کام کرنیوالوں کے لئے حوصلہ افزا ہے لیکن تصویر کا دوسرا رُخ بھی ہے یعنی جمعیتہ کا پرچہ Servant of India باوجودیکہ ہندوستان کے سب سے بہتر اور موقر ہفتہ وار جرائد میں سے ہے نقصان کیساتھ چلایا جا رہا ہے، قومی بد مذاقی کا اور کیا ثبوت چاہئے جب فحش و دشنام سے پر جرائد کے مالک اپنی جیبیں بھر رہے ہوں اور ایسے پرچے اپنے مصارف بھی پورے نہ نکال سکے۔

اس جمعیۃ میں مسلمان رکن بھی رہے ہیں۔ لیکن الشاذ کالمعدوم! ہماری بدنصیب قوم سے جو صفات حسنہ نکل گئے ہیں ان میں شاید استقلال کے ساتھ اور پیچھے پڑکر تیاری کرنیکی صفت بھی ہے۔ "وصیت بالصبر" کرنیوالی یہ قوم افسوس کہ آج کسی کام کو چند ماہ یا چند سال سے زائد نہیں نباہ سکتی۔ اور اسکے مفلوج اعضا کے لئے "دہواں دہار" تقریروں اور "سنسنی خیز" افتتاحیوں سے کم درجہ کے محرکات بے اثر ثابت ہوتے ہیں۔ کاش منشیات سے اجتناب کے معاملہ میں دنیا کی یہ قابل تقلید قوم مسکرات ذہنی سے بھی اجتناب کی عادت ڈالے اور خاموشی و استقلال سے کام کرنے کا سلیقہ پھر حاصل کرلے۔

حال میں جنیوا میں اعلیٰ تعلیم کا ایک بین الاقوامی انسٹیٹیوٹ قائم ہوا ہے۔ جسکا مقصد سیاست بین الاقوام، قانون اور معاشیات کے عصری مسائل کی تحقیق ہے۔ اس کے مصارف کا کفیل بڑی حد تک مشہور امریکن کروڑپتی راک فلر کا وقف ہے۔ جماعت اساتذہ میں مختلف قوموں کے ماہران علوم شامل ہیں۔ ایک بہت اچھے کتب خانہ کا انتظام کیا گیا ہے اور خاص مسائل کے مطالعہ کرنے والوں کے لئے کتابوں کی فراہمی کا انتظام بھی ہے۔ عموماً مختلف ممالک کے فارغ التحصیل طلبہ اسمیں داخل ہوں گے اور بین الاقوامی تعاون و اتحاد کی بنیادیں استوار کرینگے۔

ہم اتحاد بین الملل کی ان کوششوں کو جنکا مرکز جنیوا جمعیۃ اقوام کے صدر مقام کی حیثیت سے بنتا جاتا ہے نتائج کے اعتبار سے کچھ بہت امید افزا نہیں سمجھتے اور اس حقیقت سے ناآشنا نہیں کہ جب امن و صلح کے پردہ میں بڑی بڑی سلطنتوں کے سیاسی اغراض پوشیدہ ہیں۔ لیکن ہم ان مساعی کو نظر استحسان سے دیکھے بغیر نہیں رہ سکتے جو قوموں میں باہمی تفہیم اور تفہم اور واقفیت پیدا کرنیکے لئے اس ضمن میں کیجارہی ہیں۔ ان کوششوں کے نتائج ظاہر ہے کہ ایک دن میں نہیں نکل سکتے لیکن جہاں سیاسی اغراض کی شطرنج کا نقشہ روز بروز بدلتا رہے گا وہاں یہ علمی کوششیں کچھ نہ کچھ پائدار اثر دکھائیگی ہونگی

ہمارے لئے یہ کوششیں اس لئے عبرت کا سامان ہیں کہ ان میں وہ قومیں شرکت کرتی ہیں جنکے باہمی سیاسی و قومی اختلافات ہرگز "گاؤکشی" اور "باجہ" سے کم اہم نہیں ہیں لیکن ہمارا کوئی راک خلر محمد ار ہندو اور مسلمان عالموں کو یکجا کرکے اس براعظم ہند کے "بین الاقوامی" مسئلہ کے غیر جانبدارانہ مطالعہ کا سامان مہیا کرنے کے تصور کو بھی اپنے ذہن میں جگہ دینے کیلئے تیار نہ ہوگا۔

تمام برطانوی سلطنت کی ایک تعلیمی کانفرنس ۲۰ جون کو منعقد ہونیوالی ہے۔ شہزادہ ویلز نے سلطنت کے تعلیمی مسائل سے واقفیت بہم پہنچانے کیلئے اسمیں شرکت کا قصد ظاہر کیا ہے۔ یہ کانفرنس اپنی قسم کا تیسرا اجتماع ہے۔ پہلا ۱۹۱۱ء اور دوسرا ۱۹۲۳ء میں منعقد ہوا تھا۔ اس مرتبہ کوئی ۷۰ نمائندے شرکت کرینگے۔ کانفرنس صرف نمائندوں کے لئے ہے، پریس اور پبلک کو شرکت کی اجازت نہیں۔ ہمارے "ماہرین تعلیم" کے لئے اس قسم کا جلسہ کسقدر دلچسپی سے خالی ہوتا کہ اتنی قلیل جماعت کے نعرہ ہائے تحسین انکی رونق بزم کے لئے کہاں کافی ہوتے ہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ سلطنت برطانیہ کے یہ تعلیمی ماہر اس قسم کی گرمی محفل سے گھبراتے ہیں اور اپنا کام قدر دانوں اور حواریوں کے مجمع سے علیحدہ ہی کرنا چاہتے ہیں تاکہ طلب تحسین دیانت رائے پر غالب نہ آجائے۔ مختلف حکومتوں کے مشورہ سے جو ایجنڈا ترتیب دیا گیا ہے اسمیں انتظامی امور کے علاوہ عام علمی دلچسپی کی چیزیں بھی ہیں۔ انتظامی کاموں کے متعلق مثلاً مختلف ممالک میں اساتذہ کے تبادلہ اور مختلف محکمہ جات تعلیم میں باہمی تبادلہ معلومات کے متعلق غالباً کمیٹیاں مقرر کردیجائینگی۔ عام مضامین جن پر بحث ہوگی چار حصوں میں تقسیم کردئے گئے ہیں یعنی (۱) تعلیم کا تعلق متعلم کی بعد کی زندگی سے، اس میں پیشہ کی تعلیم اور ابتدائی تعلیم کے بعد کے مسائل شامل ہونگے۔ (۲) منطقہ حارہ کے ان ممالک کے تعلیمی مسائل جن میں ایک سے زیادہ نسلیں آباد ہیں (۳) دیہی تعلیم (۴) جدید تعلیمی خیالات اور ترقیاں۔

ظاہر ہے کہ تمام مسائل پر سلطنت اور ان اجزا سلطنت کے نقطہ نظر سے غور ہوگا جو کم و بیش آزاد قوموں کی حیثیت سے اس سلطنت کے رکن ہیں۔ انہیں باہمی روابط کا قیام اور سلطنت کے مفاد

کے اعتبار سے تعلیمی اتحاد یقیناً ہر ایک رکن اور کل سلطنت کی تقویت کا باعث ہوگا لیکن ان غریبوں کے تعلیمی مسائل پر بھی غور ہوگا جنکی غلامی کے قائم رکھنے کی تدابیر نکالنا ہی سلطنت کی تقویت کا مرادف ہو ایسا ہونا فطری ہے اور اس کی شکایت بیکار لیکن افسوس ہے خود ان قوموں پر جو اپنے مفاد اور اپنے قومی اغراض پر خود اپنے ذہن سے غور نہیں کرنا چاہتیں اور جو کچھ دیکھتی ہیں دوسروں کی عینک سے جو کچھ سوچتی ہیں دوسروں کے دماغ سے۔ انکے لئے کانفرنس کی قراردادیں وحی و تنزیل کا مرتبہ رکھیں گی جن کی پابندی میں ہی بس انکے لئے نجات و فلاح ہے۔ اہل بصیرت کے لئے ایک کی دانشمندی کتنی سبق آموز اور دوسرے کا بھولا پن کیا عبرت انگیز ہے!

ٹریڈ یونین بل برطانوی پارلیمنٹ کا ایک معرکۃ الآرا مسئلہ ہے۔ اسکا ظاہر مقصد یہ ہے کہ حزب العمال کو بعض بے اصولیوں سے روکا جائے اور مزدوروں کو قانوناً اتنی آزادی باقی نہ رہے کہ وہ سرمایہ داروں سے جھگڑا پیدا ہونیکی صورت میں اپنے کارخانہ کے علاوہ دوسرے کارخانہ کے مزدوروں کی ہمدردی حاصل کرنے، یا ساری قوم یا اس کے کسی معتد بہ حصہ کو دھمکانے یا حکومت پر اپنے موافق مداخلت کرنیکے لئے دباؤ ڈالنے کی غرض سے ہڑتال کریں۔ پارلیمنٹ کے قدامت پسند عنصر میں اس قسم کا ایک قانون پاس کرانے کی پہلے ہی سے تحریک تھی کیونکہ ٹریڈ یونینوں کے ماتحت مزدور طبقہ بہت منظم طریقہ پر قوت حاصل کرتا جا رہا تھا لیکن اسکے لئے کوئی موقع نہیں ملتا تھا۔ کچھ عرصہ قبل جو عام ہڑتال ہوئی اس سے قدامت پسندوں کو موقع مل گیا۔ اور انہوں نے پارلیمنٹ میں ٹریڈ یونین بل پیش کر دیا۔

جو لوگ اس کے موافق ہیں وہ اسکو قومی مفاد کے لئے ضروری قرار دیتے ہیں کہ اس کے بغیر صنعت و حرفت میں سکون کے ساتھ ترقی نہیں ہو سکے گی اور ہڑتالوں سے ایک طرف سرمایہ دار تباہ ہونگے دوسری طرف ہڑتالوں کا نقصان حکومت کی غیر جانبداری کو خطرہ میں ڈالے گا۔ لیکن جو لوگ مخالف ہیں وہ اسے مزدوروں پر دست تعدی دراز کرنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں انکا خیال ہے کہ ٹریڈ یونین بل کے الفاظ میں

حتیٰ کہ پچھلے ہو کہ انسے توڑ مروڑ کر ترمیم کا مطلب نکالا جا سکتا ہے اور اس کی ضمانت نے سرمایہ داروں کو آئندہ کے جائز فائدہ اٹھانے کا موقع مل سکتا ہے۔ بالفاظ دیگر انگلستان میں جو طبقہ وارانہ جنگ شروع ہو گئی ہے اس کے لئے سرمایہ داروں نے ایک کامیاب حربہ حاصل کر لیا ہے۔

فریقین میں سے جو بھی حق پر ہو۔ پارلیمنٹ میں قدامت پسندوں کی اکثریت اس کے پاس ہونے کی ضمانت ہے۔ گویا آج کل جمہوریت "اکثریت" اور "حق" کو مرادف الفاظ قرار دیتی ہے کسی زمانہ میں "قوت" اور "حق" ہم معنی الفاظ سمجھے جاتے تھے۔ مگر یہ صرف لفظوں کا ادل بدل ہے ورنہ موجودہ آئینی حکومتوں کے نظام "قوت" ہی کو "اکثریت" کہتے ہیں ؎

ہے وہی ساز کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

برطانیہ کا یہ طرز عمل درحقیقت بالشوک روس کا جواب ہے۔ وہاں استبداد مزدوروں کا ہے یہاں سرمایہ داروں کا

جلد ۹ | ماہ محرم ۱۳۴۶ھ مطابق جولائی ۱۹۲۷ء | نمبر ۱

فہرست مضامین

برطانوی سیاست خارجہ

کہتے ہیں کہ سلطنت برطانیہ میں سورج کبھی نہیں ڈوبتا۔ پھر جتنی یہ سلطنت وسیع ہے اتنا ہی اسکی سیاسی ریشہ دوانیوں کا پھیلاؤ ہے۔ دنیا کا کوئی حصہ نہیں جہاں براہ راست یا بالواسطہ اس سلطنت کے اغراض کا سوال نہ پیدا ہوتا ہو، پھر جتنا اس کے اغراض اور اثر کا رقبہ وسیع ہے اسی قدر اُس کی سیاست گہری ہے۔ اس لئے برطانوی سلطنت کی سیاست خارجہ پر کوئی تفصیلی بحث ایک مختصر سے مضمون میں کیسے ممکن ہے سطور ذیل کا مقصد بھی یہ نہیں ہے بلکہ صرف اسقدر کہ اس سیاست کے موجودہ مسائل کے نام گنوا دئے جائیں تاکہ پھر ہر مسئلہ پر بعد کو جدا جدا بحث ہو سکے۔

ہر شخص جو سیاست عالم سے کچھ بھی واقف ہے دیکھ سکتا ہے کہ گذشتہ جنگ کے بعد سے برطانوی سیاستِ خارجہ کا رُخ بالکل پلٹ گیا ہے۔ جنگ سے پہلے اس سیاست کا مرکز براعظم یورپ کی دول عظمیٰ اور برطانیہ کے تعلقات میں مضمر تھا۔ پہلے فرانس سے، پھر فرانس اور روس سے، اسکے بعد جرمنی سے۔ جنگ نے کچھ عرصہ کے لئے تو ان میں دو طاقتوں کو یعنی جرمنی اور روس کو بیکار سا کر دیا ہے۔ تیسری طاقت فرانس بیشک آج یورپ میں سب سے قوی فوجی طاقت ہے لیکن برطانیہ کی بحری قوت کا مقابلہ کرنیکے لئے اس کے پاس کافی بیڑہ نہیں۔

برطانیہ کی سلطنت کی اساس اسکی بحری قوت ہے۔ اس کے وجود کا انحصار ہی اس بات پر ہے کہ سلطنت کے حصوں میں جو ایک دوسرے سے بہت دور ہیں ذرائع آمد و رفت قائم رہیں اور صرف جزائر برطانی ہی نہیں بلکہ دوسری "برطانوی قومیں" یعنی نوآبادیاں بھی دشمن کی زد سے محفوظ رہیں۔ اس ساری دنیا میں پھیلی ہوئی سلطنت کے لئے اگر کوئی خطرہ کا باعث ہو سکتا ہے تو وہی جس کے پاس طاقتور بیڑا ہو

ٹریفلگر اور واٹرلو کے معرکوں کے بعد کوئی ایک صدی تک برطانوی پھریرا بلاخوف رقیب دنیا کے سمندروں پر اڑتا رہا۔ اور کہیں بیسویں صدی کے شروع میں جرمنی کے بیڑے نے رقابت کا ڈر پیدا کیا۔ انگلستان نے اس خطرہ کو فوراً بھانپا۔ جرمنی سے اتحاد کی کوشش کی۔ اسکی بحری قوت میں اضافہ کی رفتار پر پابندیاں عائد کرنی چاہیں اور جب دونوں باتیں نہ ہو سکیں تو اپنی ساری سیاست کا مقصد یہ قرار دے دیا کہ اس حریف کو

بے ضرر بنا دیا جائے۔ قربانیاں کر کے اپنے سابق دشمن فرانس اور روس سے اتحاد کیا اور ایسی ترکیبیں کیں کہ گذشتہ جنگ میں دنیا کا بڑا حصہ جرمنی کے خلاف صف آرا تھا اور ساری دنیا نے جرمنوں سے جنگ کر کے انگریزوں کو اس بحری خطرہ سے نجات دلائی! -

لیکن اسی جنگ کے دوران میں دو حریف اور پیدا ہو گئے: یعنی ریاستہائے متحدہ امریکہ اور جاپان۔ جنگ نے ان دونوں ملکوں کی مالی اور بحری قوت کو مراتب بڑھا دیا ہے۔ اور اگر بیڑوں کی تعمیر کا کام اسی رفتار سے ہوتا رہا تو انکے پاس ایسے بیڑے ہوں گے کہ دنیا نے آجتک خیال میں بھی نہ دیکھے ہوں۔ ان دونوں ملکوں کی بحری قوت میں ترقی کا جو حال ہے اس نے انگلستان کی سیاست کو اپنے پرانے معیار قوت بحری سے کبھی کا اتار دیا ہے۔ پہلے یہ اصول تھا کہ برطانوی بیڑا دو سب سے بڑی بحری قوتوں کی مجموعی طاقت سے کم نہ ہونا چاہئے۔ اب معیار یہ رہ گیا ہے کہ اپنا بیڑا کسی دوسرے ملک سے کم نہ ہو۔ لیکن اگر سلطنت کو قائم رکھنا ہے تو اب اس سے نیچے اترنا ممکن نہیں۔

انمیں پہلا مسئلہ تو نسل کا مسئلہ ہے۔ سفید اور پیلی نسلیں ایک دوسرے کے مقابل ہیں۔ بحرالکاہل کے مغربی ساحل پر (چین و جاپان) پیلی نسل آباد ہے۔ مشرقی اور جنوبی ساحلوں پر سفید۔ مشرق میں ریاستہائے متحدہ اور کناڈا، جنوب میں اسٹریلیا اور نیوزی لینڈ۔ اس مسئلہ میں امریکہ اور ان نوآبادیوں کی انگریزی آبادی بالکل متحد الخیال ہے۔ اگر امریکہ کو یہ منظور نہیں کہ ملک کی سب آبادی، کارگذار لیکن کم احتیاج جاپانیوں کا سیلاب برباد کر دے تو کینیڈا اور اسٹریلیا بھی اسکے ہمنوا ہیں۔ ان ممالک کو سفید نسل کے قبضہ میں رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ پیلی نسل کو الگ ہی الگ رکھا جائے۔ امریکا اور برطانوی نوآبادیاں دونوں اس حکم کو اصول موضوعہ کی طرح مانتے ہیں۔ آسٹریلیا اور کناڈا اس معاملہ میں امریکہ کے ایسے ساتھ ہیں کہ اگر بفرض محال انگلستان انکے خلاف ہو جائے تو ان دونوں نوآبادیوں کے سلطنت برطانیہ سے جدا ہو جانیکا خاصہ اندیشہ ہے۔

دوسرا مسئلہ چین کے مستقبل کا ہے۔ یہاں امریکہ اور جاپان ٹکر کھاتے ہیں جاپان کا چھوٹا سا ملک اب اپنی بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے کافی نہیں۔ وہ اب کہیں اور جگہ چاہتی ہے اور سب سے قریب چین کا وسیع اور زرخیز ملک ہے۔ ۱۹۰۴ء کی جنگ روس و جاپان کے بعد کوریا پر قبضہ کر کے اس آرزوئے توسیع کو تسکین

کناڈا

ریاستہائے متحدہ امریکہ

بحر

جنوبی امریکہ

بحیرہ بیرنگ

سائبیریا (روس)

پیکنگ

کوریا

جاپان

چین

تبت

کینٹن

جزائر لوچو

جزیرہ ہینن

جزیرہ فلپاین

جزائر ہانولولو

الکاہل

جاوا

آسٹریلیا

تسمانیا

نیوزی لینڈ
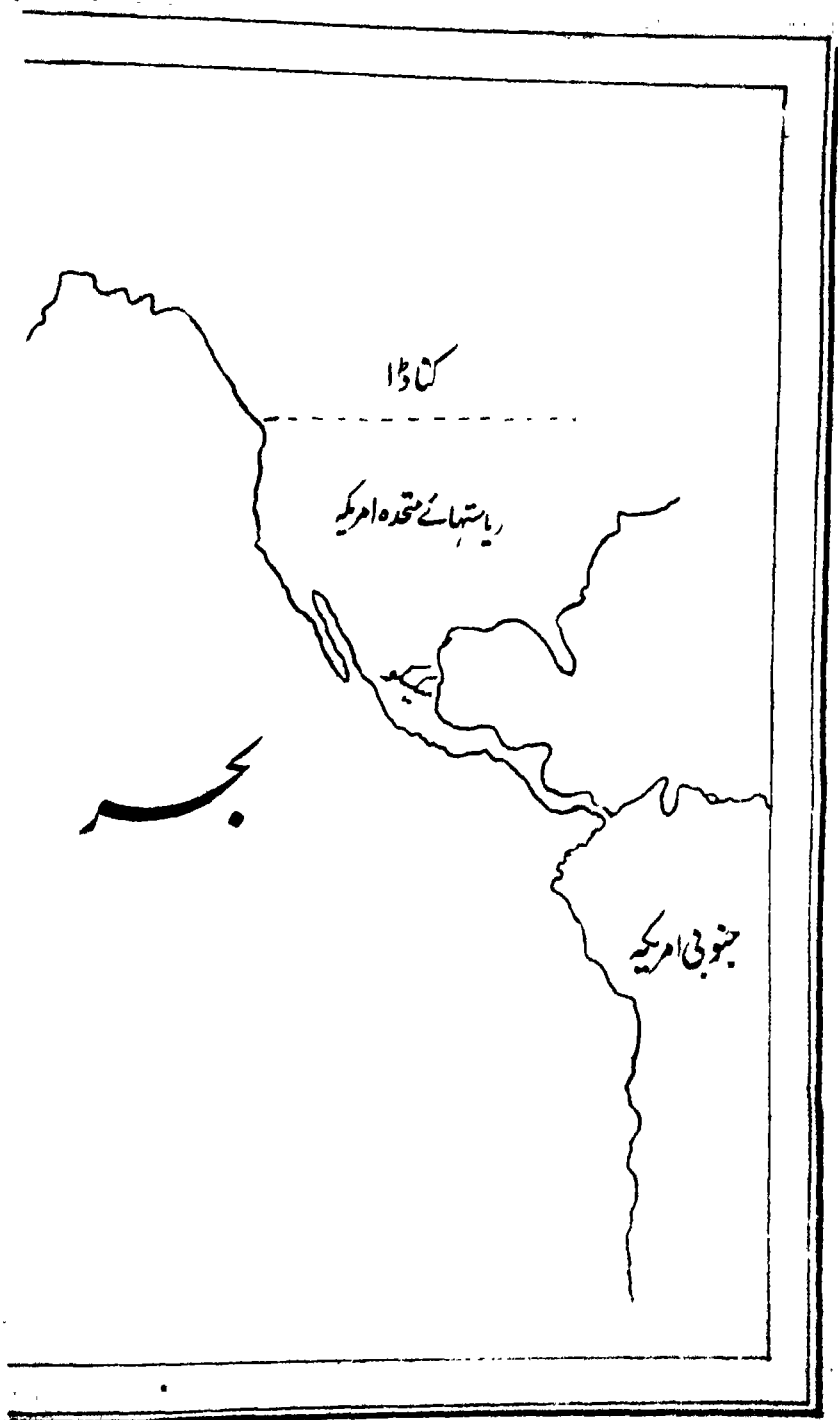
دی گئی تھی۔ بہ ۱۹۱۵ء میں جنگ عظیم کے شروع ہونے پر جاپان نے کیاؤ چاؤ لے لیا اور شانٹنگ میں قدم جمائے اور اپنے "۲۱ مطالبات" سے کل چین ہی کو جاپان کی باجگذار ریاست بنانے کی فکر کی تھی لیکن امریکہ اور انگلستان کی مخالفت نے بات نہ بننے دی۔

تیسرا مسئلہ بحرالکاہل میں اقتدار کا مسئلہ ہے۔ ہر چند یہ مسئلہ زیادہ تر جاپان اور امریکہ کا مسئلہ ہے تاہم اس سمندر ہی میں چونکہ کینیڈا، اسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے سواحل بھی ہیں۔ دوسرے ہندوستان میں اقتدار قائم رکھنے کیلئے بھی اس سمندر میں کافی طاقت ہونا ضروری ہے۔ اس لئے برطانیہ کو بحرالکاہل کے مسئلے سے بہت تعلق ہے۔ امریکہ کا تعلق چونکہ براعظم ایشیا سے روز بروز گہرا ہوتا جاتا ہے اور جزائر فلپائن اس کی نوآبادی ہیں اس لئے ضروری ہے کہ بحرالکاہل میں امریکہ کے جہازوں اور کیبل کی راہ میں کوئی چیز حائل نہ ہو۔ خط استوار کے شمال میں جاپان کو سابق جرمن مقبوضات کا نگران رہنے اور بحری تاروں کے مرکز جاپ کو جاپان کے سپرد ہو جانے سے امریکہ کے اس آمد و رفت کی راہ میں خطرے پیدا ہو گئے ہیں۔

سلطنت برطانیہ کی سیاست خارجہ کا سب سے اہم مسئلہ یہی امریکہ اور جاپان سے تعلق کا مسئلہ ہے۔ اسلحہ اور تیاری جنگ میں امریکہ کا مقابلہ کرنا زیادہ نتیجہ خیز نہیں معلوم ہوتا۔ ایک تو اس سے برطانوی مالیات پر تقریباً ناقابل برداشت بار پڑے گا۔ دوسرے خود امریکہ کے مالی ذرائع آج کم و بیش اتھاہ نظر آتے ہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ ایسا کیا گیا تو مخالفتیں جو پہلے سے موجود ہیں زیادہ شدید ہو جائیں گی اور باہمی جنگ کا اندیشہ قریب تر ہو جائے گا۔ موجودہ مخالفتیں زیادہ تر معاشی مخالفتیں ہیں۔ دوران جنگ میں ریاستہائے متحدہ امریکہ نے صنعت و جہاز سازی، تجارت و جہاز رانی میں حیرت انگیز ترقیاں کی ہیں اور آج ان میدانوں میں انگلستان کی سب سے قوی حریف ہیں۔ ایک مقروض قوم سے امریکہ آج دنیا کی سب سے بڑی قرض خواہ قوم ہو گئی ہے اور ساری دنیا کی ساہوکاری کے منصب سے انگلستان کو ہٹا رہی ہے۔ اسکے علاوہ دنیا کے تیل کے ذخائر کے لئے بھی دونوں قوموں میں خوب زور شور سے مقابلہ ہو رہا ہے۔ اور تیل کا مسئلہ صرف معاشی نفع نقصان کا مسئلہ نہیں بلکہ جہازوں میں ایندھن کے طور پر تیل زیادہ استعمال ہوتا ہے۔ اس لئے تیل کے ذخائر کا ہاتھ میں ہونا بحری قوت کی بقا کی ضمانت ہے۔ عراق کے تیل کے ذخائر کے متعلق یہ اختلاف ظاہر ہوا۔ کیونکہ

سال ریمو کے معاہدہ کی رو سے تو انگلستان کو جب عراق کی نگرانی سپرد کی گئی تو تیل بھی انگلستان کو دیا گیا تھا لیکن امریکہ نے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ نیز اس کے خلاف بھی جب ہالینڈ کی بڑی تیل کی کمپنی "رائل ڈچ" ROYAL DUTCH کو جو تمام تر انگریزی اثر میں ہے سماترا میں جمبی کے تیل کا ٹھیکہ دیا گیا۔ اس پر امریکہ نے مطالبہ کیا کہ امریکن مفاد کی حامل اسٹینڈرڈ آئل کمپنی STANDARD OIL Co. کے ساتھ بھی ساوی رعایات ہونی چاہئیں۔ انگلستان اور امریکہ کے باہمی تعلقات پر اثر ڈالنے والا ایک عنصر آئرلینڈ کا مسئلہ بھی تھا، کیونکہ امریکہ کی آبادی میں معتدبہ عنصر آئرش نسل کے لوگوں کا ہے۔ اگرچہ یہ مسئلہ تقریباً صاف ہو چلا ہے تاہم اب بھی کسی وقت ایسی پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں جن سے دونوں قوموں کے تعلق پر اثر پڑے۔

برطانیہ کی سیاست خارجہ کا قریبی مقصد یہ ہے کہ امریکہ سے مخالفت کی باتیں حتی الوسع کم کرے اور باہمی سمجھوتہ سے بحری جنگ کی تیاریوں پر حدود عائد کر کے دوستانہ تعلقات اور پر امن تعاون کی تدابیر نکالی جائیں۔

اس کوشش کی کامیابی میں جاپان اور انگلستان کے تعلقات حائل ہوتے ہیں۔ اور یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا جاپان کا دوست رہ کر برطانیہ امریکہ کے ساتھ چل سکتا ہے یا نہیں۔ جاپان اور انگلستان میں ۲۰ سال سے اوپر جو دوستانہ معاہدہ رہا ہے اس سے انگلستان کو بہت فائدہ ہوا۔ جنگ عظیم میں جاپان کی قوت برطانیہ کے ایشیائی مقبوضات کے لئے پشت پناہ ثابت ہوئی۔ کیاؤ چاؤ دشمن سے بلا انگریزی قربانیوں کے چھین لیا گیا۔ اسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کی فوجیں جاپانی جنگی جہازوں کی پناہ میں میدان جنگ میں پہنچیں لیکن جب اس معاہدہ کی تجدید کا وقت آیا تو امریکہ کی ناپسندیدگی کا اظہار ہونے لگا۔ برطانوی سلطنت کی جو کانفرنس ۱۹۲۱ء میں ہوئی اسمیں معلوم ہوا کہ خود برطانوی نو آبادیوں کے نمائندے بھی اس معاہدہ کے متعلق متفق الخیال نہیں ہیں۔ کنیڈا کے نمائندے نے اپنے ملک کی رائے عامہ کے مطابق تجدید معاہدہ کی مخالفت کی۔ بار بار اس پر بحثیں ہوئیں لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا اور بالآخر انگلستان کے وزیر لارڈ چانسلر نے یہ فقہی موشگافی کی کہ معاہدہ میں تجدید کی کوئی ضرورت ہی نہیں وہ یوں ہی چل سکتا ہے۔ لیکن اس سے مسئلہ کا کوئی حل نہ ہوا بلکہ معاہدہ صرف ملتوی ہو گیا تھا۔ سچ یہ ہے کہ معاہدہ کی جو قدر و قیمت انگلستان

کے لئے تھی ہیں تو روسی اور جرمن بیڑہ کی تباہی کے باعث بہت کمی آگئی تھی۔ ادھر نوآبادیاں امریکہ سے اتحاد چاہتی تھیں اور جاپان سے معاہدہ کی تجدید کے سخت خلاف تھیں۔ اب اس معاہدہ کو قائم رکھنے کی خواہش اگر تھی تو جاپان کو۔ اور اس لئے جب سلطنت کی کانفرنس میں معاملہ قطعی طور پر طے نہیں کیا گیا بلکہ یہ قرار پایا کہ معاہدہ ابھی سال بھر یونہیں چل سکتا ہے تو اسے جاپان نے اپنے فائدہ کی بات سمجھا لیکن انگلستان کا مقصد صاف ظاہر ہوگیا۔ وہ ایک طرف تو جاپان کو بھی بالکل چھوڑنا نہیں چاہتا اور دوسری طرف امریکہ سے قریب ہوکر انگریزی زبان بولنے والی قوموں کا اتحاد قائم کرنا چاہتا ہے۔ ادھر امریکہ کا رخ یورپ کی بہ نسبت ایشیا کی طرف زیادہ ہے۔ وہ کسی حالت میں بھی جاپان کے اقتدار کو مشرقی ایشیا میں بڑھنے نہیں دینا چاہتا لیکن جنگ کا فی الحال کوئی خواہشمند نہیں۔ جاپان اس لئے نہیں کہ ابھی اپنے کو کمزور پاتا ہے امریکہ اس وجہ سے نہیں کہ وہ جنگ میں جو حاصل کریگا وہ پرامن ترقی میں بھی حاصل کر سکتا ہے۔ انگلستان اس واسطے نہیں کہ خود اپنی سلطنت کے مسائل اور مشرق قریب اور افریقہ کی پیچیدگیاں اسکے لئے کافی ہیں اور یہ غیر متیقن بات ہے کہ اگر خود امریکہ سے جنگ ہوگئی تو یا اگر امریکہ اور جاپان میں جنگ ہوئی اور امریکہ کی مدد کرنی پڑی تو سلطنت کے لئے کیا خاص فوائد مترتب ہونگے۔ اسی وجہ سے انگلستان میں امریکہ جاپان اور انگلستان کے سہ طرفہ سمجھوتہ کا خیال پیدا ہوا۔ اور وہ صدر جمہوریہ امریکہ ہارڈنگ نے واشنگٹن میں ایک مجلس منعقد کی جس میں انگلستان اور جاپان ہی کو نہیں بلکہ چین، فرانس اور اٹلی کو بھی مدعو کیا۔ اول الذکر چار طاقتوں میں معاہدہ جزائر بحر الکاہل کے متعلق معاہدہ ہوگیا۔ یہ انگریزی جاپانی معاہدہ ختم ہوگیا۔ جاپان کے توسیعی حوصلے دب گئے، اور بحری سمجھوتہ کے ذریعہ بیڑوں میں اضافہ پر حدود عائد کردی گئیں۔ واشنگٹن کانفرنس کے نتائج کی تفصیل میں جانا یہاں مقصود نہیں۔ اس سے بہتر ہوا کہ معاملہ کافی دنوں کو ٹل گیا۔ لیکن اسمیں شک نہیں کہ برطانوی سیاست خارجہ کا سب سے اہم کام اب بھی ہے کہ امریکہ سے دوستی کو قائم رکھکر جاپان کو بھی مخالف نہ ہونے دے۔ کام مشکل ہے۔ لیکن برطانوی سیاست کی تاریخ اس قسم کے مشکل کاموں سے خالی نہیں ہے۔ اور اگرچہ برطانوی سیاسین کے لئے اس معاہدہ میں ادھر کھائی ہے، اُدھر خندق تاہم انہوں نے اپنے قومی مفاد کے لئے ہمیشہ جس زیرکی کا ثبوت دیا ہے اس سے بعید نہیں کہ اس صورت حال سے بھی فائدہ اٹھالیں۔

جہانتک یورپ میں برطانوی سیاست کا تعلق ہے فرانس سے تعلقات کا مسئلہ سب سے اہم ہے۔ دونوں
قوموں کی وہ طویل کشیدگی جو ۱۸۹۸ء میں فشودا کے واقعہ کی شکل میں فرانس کے لئے بڑی ذلت کا سامان مہیا
کر چکی تھی۔ ۸ر اپریل ۱۹۰۴ء کے معاہدہ مراکو کے بعد سے مخلصانہ دوستی میں بدل گئی تھی۔ یہ ائتلاف جنگ کے دوران
میں تو قائم رہا ہی اور آج بھی ضابطہ کے طور پر جاری ہے۔ لیکن ۱۹۲۰ء کے عہدنامہ وارسائی کے بعد سے اس
دوستی کی سخت آزمائشیں ہوئی ہیں۔ براعظم کے تعلقات اور مشرق قریب کے مسائل میں دونوں ملکوں میں اغراض
کا بہت تضاد پیدا ہو گیا ہے۔ براعظم میں خصوصًا اس لئے کہ انگلستان تو چاہتا ہے کہ یورپ میں تجارت کو فروغ
ہو اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں کہ مفتوح اقوام کی معاشی حالت ٹھیک نہ ہو جائے۔ انگلستان عام معاشی
حالت کی اصلاح کو اس سے زیادہ اہم سمجھتا ہے کہ جرمنی سے کچھ رقم بطور تاوان وصول کیجائے۔ لیکن فرانس
کو یہ ڈر لگا ہے کہ جرمنی کہیں پھر مضبوط نہ ہو جائے۔ وہ تو جرمنی کو اتنا کمزور کر دینا چاہتا ہے کہ پھر اس سے کسی
قسم کا خدشہ باقی نہ رہے۔ اسی وجہ سے اس نے رہائن کے علاقہ کو فرانس میں ہضم کرنیکی ناکام کوشش کی،
مغرب کے صنعتی اور کوئلہ والے علاقے جرمن سے علیحدہ کرنے چاہے۔ روس اور جرمنی کے درمیان پولینڈ
کو فاصل بنایا جو کم و بیش فرانس کی ایک ماتحت ریاست ہے اور براعظم پر فرانس کی فوجی قوت کا سہارا ہے۔ اسکے
علاوہ فرانس یہ بھی چاہتا ہے کہ اپنی مالیات کو درست کرنیکے لئے جرمنی سے جو کچھ وصول کر سکے۔ تاوان کی شکل
میں وصول کرلے۔ جرمنی اور انگلستان کے تعلقات میں جنگ سے پہلے تو برطانوی سیاست کا مقصد محض
سمندر میں جرمنی کے اثر اور اقتدار کو توڑنا تھا چنانچہ جنگ میں شکست کے بعد جرمنی کے پاس جنگی اور تجارتی
بیڑہ بس نام ہی کو چھوڑا گیا، نوآبادیاں سب کی سب چھین لی گئیں۔ اتحادی طاقتوں کے مقبوضات میں جرمنی
کی جو املاک تھیں اور جو جو حقوق تھے سب تلف کر دیئے گئے نیز تمام جرمن کیبل اسکے قبضہ سے نکال لئے گئے
اتحادی علاقوں سے تمام جرمنوں کو خارج کر دیا گیا۔ جب اتنا مجبور کر لیا اور دل کھول کر نیچا دکھا لیا تو سیاست کا رخ
بدلا۔ جرمن سلطنت اور جرمن معیشت کو اور تباہ کرنے میں اب انگلستان کا نقصان ہے۔ انگلستان کبھی یہ نہیں چاہتا کہ
براعظم میں کسی ایک طاقت کو ایسا اقتدار حاصل ہو جائے کہ اسکا توازن کسی دوسری طاقت کے ذریعہ نہ ہو سکے
اگر جرمنی کے ادھر بکھرے ہوئے اور جرمنی سے اس کے صنعتی علاقے اور اجناس خام کے ذخائر چھینے گئے تو پھر

فرانس کی بڑہتی ہوئی فوجی قوت کے مقابلہ کے لئے جرمنی کو کیسے استعمال کیا جاسکیگا ؟ جرمن معاشی زندگی کے انحطاط سے خود انگلستان کی معیشت پر بڑا اثر پڑے گا ۔ برطانیہ کی سیاست خارجہ ان وجوہ سے اب یہ چاہتی ہے کہ جرمنی کی طاقت میں کوئی مزید کمی نہ واقع ہو اور اسکی معاشی حالت ایسی ہوجائے کہ سلطنت برطانیہ سے تجارتی لین دین ہو سکے ۔ البتہ یہ بات بھی پیش نظر ہے کہ پھر کوئی ایسا موقع نہ دیا جائے کہ جرمنی خطرناک مقابل کی صورت اختیار کرسکے ۔

روس اور انگلستان تو در اصل ہمیشہ بڑے دشمن رہے ہیں لیکن انگریزوں کی سیاسی ہنر مندی تھی کہ جنگ عظیم میں روس انگلستان کے دوش بدوش تھا ۔ ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد بھی انگریزوں نے کرنسکی جمہوریت کو اپنے ساتھ رکھا اور جب کہیں لینن نے بولشوی جمہوریت قایم کی اسوقت جاکر روس نے انگلستان کا ساتھ چھوڑا ۔ اس کے بعد پیہم کوششیں کی گئیں کہ روس میں اندرونی بغاوت کے ذریعہ اس بولشوی حکومت کو تباہ کیا جائے ۔ لیکن یہ سب ناکام رہیں ۔ جب بولشوی حکومت کا استحکام مسلم ہوگیا تو سب سے پہلے انگلستان ہی نے تجارتی تعلقات کی صورت نکالی ۔ اس میں شک نہیں کہ چینی اور وسطی ایشیا میں روس کا بڑہتا ہوا اثر برطانوی سیاست کے لئے آنکھ کا کانٹا ہے ۔ لیکن جبتک اغراض کی یہ مضر مخالفت علانیہ نہ ہوجائے برطانوی سیاسی روسی تجارت کے فوائد سے بھی بہرہ اندوز ہونا چاہتے ہیں ۔ اور اگر روس کو بولشوی پروپاگنڈا میں مذہبی تبلیغ کا سا شغف نہ ہوتا تو مخالفتوں کے علانیہ اظہار تک یہ تجارتی تعلق اچھی طرح نبھتا ۔ اور اہل بصیرت کا خیال ہے کہ پچھلے دنوں روسی تجارتی وفد کے دفتر کی خلاف قانون تلاشی اور انقطاع تعلقات کا نظاہر اہم سیاسی واقعہ جو انگلستان میں پیش آیا اس کی تہ میں زیادہ تر انگلستان کی قدامت پسند حکومت کی یہ خواہش تھی کہ وہ ملک میں اپنی حریف مزدوروں کی حکومت کے آئندہ امکانات کو اس موقع سے فائدہ اٹھاکر کم کردے ۔

مشرق قریب میں انگلستان کو زیادہ تر فرانس سے واسطہ ہے جنگ کے بعد بڑے بڑے علاقے جو پہلے ترکی کے قبضہ میں تھے ان دونوں طاقتوں کے ہاتھ آئے جمعیت الاقوام کے قواعد کی دفعہ ۲۲ کی رو سے یہ طے پایا کہ یہ علاقے جو ترکوں سے علیحدہ کئے گئے ہیں خود مختار ملک ہیں لیکن جبتک یہ اپنی خود مختاری کو قایم

رکھنے کی قابلیت نہ پیدا کرلیں انگلستان یا فرانس انکی نگرانی کریں۔ ان علاقوں کی آبادی کی خواہشات کو بالائے طاق رکھکر ۲۴ اپریل ۱۹۲۰ء کو سان ریمو کے معاہدہ کی رو سے انگلستان اور فرانس نے ان علاقوں کو آپس میں بانٹ لیا۔ فرانس کو شام ملا۔ انگلستان کو عراق اور فلسطین۔ ان علاقوں میں انگریزی اور فرانسیسی سیاست اب تک ایک دوسرے کی مخالف رہی ہے۔ شام نے فیصل کو نکالا، انگلستان نے اسے عراق کے تخت پر بٹھایا۔ انگریزوں نے یونانی ترکی جنگ میں یونانیوں کا پورا پورا ساتھ دیا فرانس نے اسی زمانہ میں انگورہ کے عہد نامہ میں ترکوں سے اپنے تعلق کو استوار کیا وغیرہ وغیرہ۔ انگریزی سیاست آئندہ جنگ میں ترکوں کے مخالف جانیکے امکان کو پیش نظر رکھکر ترکوں کی مخالف ہے اور فرانسیسی سیاست کا مقصد ترکوں سے میل رکھنا ہے برطانوی سیاست اس بات کی پوری کوشش کررہی ہے کہ عربی دنیا ترکوں سے ہمیشہ کے لئے الگ ہوجائے عراق میں فیصل کی، حجاز میں شریف حسین کی مدد، اور فلسطین میں صیہونی تحریک کی حمایت اور یہودیوں کی قومی حکومت، کے قیام کی تدبیریں سب اسی غرض کے حصول کے ذریعے ہیں۔ عراق کے معاملات میں تو برطانوی نقطہ نظر سے خاطر خواہ ترقی ہورہی ہے، لیکن فلسطین میں یہودیوں کے قدم جمانے کا مسئلہ مشتبہ ہے پچھلے چند مہینوں سے وہاں آکر بسنے والے یہودی کثرت سے واپس جارہے ہیں اور صیہونی تحریک کے یورپی حامیتیوں میں بھی بہت بد دلی پھیل رہی ہے۔ ادہر حجاز میں شریف حسین کو نجدیوں نے نکال باہر کیا ہے بظاہر دونوں باتیں انگریزوں کی مرضی کے خلاف ہیں لیکن میدان سیاست کے یہ شاطر باد مخالف کے ان جھونکوں سے دل برداشتہ نہیں ہوتے۔ فلسطین میں عربوں کی تالیف قلوب ہورہی ہے۔ حجاز میں ابن سعود کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا جارہا ہے۔ نتیجہ ابھی معلوم نہیں لیکن یہ سب جانتے ہیں کہ کلیٹن صاحب سلطان ابن سعود سے معاہدہ کی گفتگو کررہے ہیں فلبی صاحب "مسلمان" ہوگئے ہیں، اور انگریزی اخبارات سلطان کے "تدبر" کی تعریفوں سے پر ہیں۔

ہندوستان میں برطانوی سیاست کے لئے پچھلی قومی تحریک نے بظاہر بہت سی مشکلیں پیدا کردی تھیں لیکن ہندو مسلم تعلقات کی کشیدگی نے اب ایک عرصہ کے لئے بالکل مطمئن کردیا ہے۔ لیکن خود ہندوستان آزادی کے علاوہ بیرون ہند ہندوستانیوں کا مسئلہ سلطنت کے ان گھر کے جھگڑوں میں ہے جنکا چکانا ضروری

ہے یعنی جنوبی افریقہ، کینیا، سابق جرمن مشرقی افریقہ میں ہندوستانیوں کیساتھ جو سلوک ہوتا ہے اسمیں خاندانی شکوہ شکایتوں کا رفع کرنا۔ اور اجزا سلطنت کے تعلقات میں ہمواری پیدا کرنا۔

مصر کو برطانوی اغراض کے تحفظ کے بعد ہر طرح کی "آزادی" دیدی گئی ہے جس کی حقیقت اور قدر کے نظاہر مصر اور دنیا کو وقتاً فوقتاً دکھا دئے جاتے ہیں تاکہ وہ لوگ بھول نہ جائیں" بظاہر ہندوستان اور مصر دونوں میں مجلس آئین، واصلاح ورعایات وحقوق کی میٹھی مگر خواب آور دا دویہ کا استعمال ابھی بہت دنوں جاری رہے گا۔

سطور بالا میں نہایت اختصار کے ساتھ ان مسائل کے بس نام لے دئے گئے ہیں جن سے برطانوی سیاست خارجہ دوچار ہے۔ سیاست کے طالبعلم کے لئے انمیں سے ہر مسئلہ بہت غور طلب اور مطالعہ کا محتاج ہے اور امید ہے کہ ہندوستان کے تعلیم یافتہ لوگ اپنی سیاسی دلچسپیوں کو روزانہ اخبارات کے "سنسنی خیز" مقالوں سے کچھ آگے بڑھا کر ان مسائل پر بھی ذرا گہری نظر ڈالینگے کہ انمیں سے اکثر دنیا کے مستقبل کے لئے اور خود ہمارے مستقبل کے واسطے بہتم بالشان اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ توقع بیجا نہ ہوگی کہ "جامعہ" کے صفحات میں کبھی کبھی ان مسائل پر تفصیلی بحث ہوا کرے گی۔

عرب فرانسیسی ادبیات میں

(۲)

رولان کا گیت

ناظرین جامعہ کے لئے رولان کے گیت کا ایک خاکہ پیش کیا جاتا ہے بعض جگہ اصل سے لفظ بلفظ ترجمہ کیا گیا ہے اور بیشتر محض خیالات کو لیکر عام فہم زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس نظم کی اگر ہر تفصیل کو لیا جائے تو بہت طول ہوگا۔ اس کے لئے فرصت کا انتظار ہے

یوسف

شارلیمن کی ذات سے ازمنہ وسطیٰ کی بہت ساری ادبی روایات اور کہانیاں وابستہ ہیں، رولان کا گیت بھی انہیں سے ایک ہے۔ اس گیت میں اگرچہ شارلیمن کی شخصیت رولان کے آگے ماند پڑگئی ہے لیکن رولان کے رتبہ کو اس بات سے چار چاند لگ گئے ہیں کہ وہ شارلیمن کا بھانجہ، اسکا درباری اور اس کی فوج کے سرداروں میں سے ایک ہے، اس گیت کے اصل مصنف کا کچھ پتہ نہیں صرف اتنا معلوم ہے کہ یہ گیت شارلیمن کی رونسوال کی شکست کے بعد وجود میں آیا، یہ شکست شارلیمن کو ۷۷۸ء میں باسک قوم کے ہاتھوں پرنیس کے پہاڑی دروں میں اٹھانی پڑی۔ اس شکست میں بعض مشہور سردار مارے گئے تھے ساری قوم میں ایک ہلچل مچ گئی مختلف اوقات میں بھاٹوں نے اس جنگ کے شہدا، کے حالات نظم کئے ہوں گے لیکن سب سے بڑھ کر تعجب کی بات یہ ہے کہ اس پوری نظم میں باسک قوم کا سرے سے ذکر ہی نہیں۔ اندلس کے عربوں کو دشمن قرار دیا گیا ہے۔ اسکی وجہ ممکن ہے یہ ہو کہ عربوں کے خلاف مسیحی دنیا میں عام ناراضگی پھیلی ہوئی تھی۔ بھاٹوں نے اپنی پبلک کے خیالات کی ترجمانی کرتے ہوے سارے واقعہ کو بالکل دوسرا ہی رنگ دے دیا، یا یہ کہ کلیسا نے مسلمانوں کے خلاف تبلیغ کے لیے یہ گیت بنوا کر بھاٹوں کے ذریعہ مشہور کرایا۔ غرضکہ اس باب میں مختلف ادبی نظریے پیش کئے جا سکتے ہیں اور بحث کیجا سکتی ہے، اس گیت کا مصنف کوئی بھی ہو لیکن یہ بات مسلم ہے کہ دسویں صدی عیسوی میں یا پہلے اور مذہبی تہواروں کے موقع پر یہ گیت گایا جاتا تھا اور اس کے بعد سے برابر

ازمنہ وسطیٰ میں یہ گیت نہایت مقبول رہا۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اسی سے کیا جاسکتا ہے کہ یہی رولان کی کہانی تھوڑے بہت فرق کیساتھ اطالوی اور ہسپانی ادب کے علاوہ جرمن اور ڈچ زبان تک میں موجود ہے۔

اس گیت میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں انہیں اکثر مبالغہ اور غلط بیانی دونوں سے کام لیا گیا ہے اس مبالغہ کی نوعیت بالکل وہی ہے جو مسلمان نسانہ گوؤں نے حضرت خالد اور حضرت حمزہ کے جنگی کارنامے بیان کرنے میں برتی ہے۔ مسلمانوں کے متعلق جو غلط بیانیاں ہیں وہ دو باتوں پر دال ہیں، یا تو جان بوجھکر کلیسا نے انکی اشاعت کی یا یہ کہ بھاٹوں کی معلومات محدود تھیں، انہوں نے جیسا سنا ویسا ہی نظم کردیا مثلاً مسلمانوں کو اپولو کا پرستار بتانا ایک قابل مضحکہ غلطی ہے۔ اصل میں اس گیت پر تاریخی حیثیت سے تنقید ہی نہ کرنی چاہیئے۔ اس گیت کے گانے والوں کو کبھی یہ گمان بھی نہ ہوا ہوگا کہ آئندہ چلکر کوئی انکی روایتوں پر تنقید کرنے بیٹھے گا۔ انہیں تو شاید اسکا بھی یقین ہو کہ کوئی ان گیتوں کو جمع کرکے لکھے گا اور پھر یہ بھی نظر رکھنا چاہیئے کہ ازمنہ وسطیٰ کی سوسائٹی اپنی تنقیدی قوت بہت کم استعمال کرتی تھی، سوچنے کا کام ایک مخصوص طبقہ کے ذمہ تھا۔ اس جماعت نے جو کہدیا سب نے امنّا صدقنا کردیا، اگرچہ اس لحاظ سے ازمنہ وسطیٰ کی سوسائٹی اور موجودہ سوسائٹی میں بہت بڑا فرق نہیں، پہلے مذہبی طبقہ عام لوگوں کے لیے سوچنے کا فرض ادا کرتا تھا۔ اب سیاسی جماعتیں بعینہ وہی فرض انجام دے رہی ہیں، عام آدمی نہ پہلے سوچتا تھا نہ اب سوچتا ہے۔ لیکن تاہم پھر بھی فرد آج پہلے سے زیادہ آزاد ہے۔

اس گیت کی ابتدا یوں ہے "ہمارے بادشاہ شارل اعظم پورے سات برس اندلس میں ٹھہرے یہانتک کہ سمندر کے کنارے تک جتنی زمین تھی ساری فتح کرلی، کوئی قلعہ کوئی شہر، کوئی فصیل رکاوٹ کیلیے باقی نہیں رہی، بس ایک شہر سارا گوس رہ گیا جو پہاڑی پر واقع ہے، بادشاہ مارسِل اس گدّی پر حکومت کرتا ہے۔ یہ بادشاہ خدا کو نہیں مانتا، یہ محمد کو پوجتا ہے اور اپولو کا پرستار ہے، وہ بھلا ہمارے مقابلہ میں کیا ٹھہر سکیگا، اسکی قسمت میں خواری لکھی ہے"

بادشاہ مارسِل کو جب شارلیمین کے اس ارادہ کی خبر ملتی ہے کہ وہ سارا گوس پر حملہ آور ہوگا تو وہ سراسیمہ ہوکر دربار منعقد کرتا ہے۔ سب مشیروں سے رائے لیتا ہے اور بعد میں یہ بات طے پاتی ہے کہ شارلیمین

کو کچھ دے دلا کر ٹال دینا اچھا ہے۔ بلاندکندران[1] اپنی لمبی سفید داڑھی کی قسم کھا کر کہتا ہے کہ "اگر ہم شیر، اونٹ، شکاری کتے اور چار سو خچر سونے چاندی سے لدے ہوئے سو پچاس رتھوں کے آج شارلیمن کے پاس نذرانہ کے طور پر بھجوا دیں تو میں ذمہ لیتا ہوں کہ وہ ہمارے شہر پر حملہ کا ارادہ فسخ کر دیگا۔ اس کے سپاہی ماندہ ہیں۔ اور وہ خود اپنے دیس واپس جانیکا متمنی ہے۔" بادشاہ مارسیل اپنے خواص میں سے کلارآن والی بالاگوئے، استمارآن[2]، بریامون، اور گرلان لمبی ڈارھی والے کو بلا بھیجتا ہے تاکہ ان سے آخری مشورہ کر کے کوئی فیصلہ کرے۔

چنانچہ فیصلہ یہ ہوتا ہے کہ بلاندکندران کی سرکردگی میں شارلیمن کو بہلانے کے لیے وفد بھیجا جائے بادشاہ شارلیمن کوردرن فتح کر چکا ہے۔ ایک سبزہ زار میں مع اپنے درباریوں کے فروکش ہے، اس شہر کے سارے بت پرستوں[3] نے مسیحی دین قبول کر لیا ہے سپاہی مگن ہیں۔ کوئی شطرنج کھیلتا ہے، کوئی پٹے بازی میں مشغول ہے۔ بلاندکندران اور اس کے ساتھیوں کو دیکھکر سب کے سب حیران رہ جاتے ہیں، وفد کی پیشی ہوتی ہے اور بادشاہ مارسیل کی سب شرطیں شارلیمن کے سامنے پیش کیجاتی ہیں۔

باوجود بلاندکندران کی چکنی چپڑی باتوں کے بادشاہ شارلیمن کو اعتبار نہیں ہوتا لیکن جب اس نے بلاندکندران کی زبان سے یہ سنا کہ بادشاہ مارسیل شاہی خاندان کے شہزادوں کو اور وہ خود اپنے دو بیٹوں کو کفالت کے طور پر شارلیمن کے حوالے کرنے کو تیار ہیں تو فوراً اس نے اپنا سر جھکایا، داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور آخری جواب دینے سے پہلے اپنے مشیروں کو مشورہ[4] کے لئے طلب کیا۔

---

[1] بلاندکندران بادشاہ مارسیل کے مشیروں میں سب سے زیادہ عاقل اور تجربہ کار ہے، اس گیت میں آخر تک اسکا ذکر ہے اسکی چالیں بڑی کارگر ہوتی ہیں شارلیمن کے پاس جو وفد مارسیل کیطرف سے گیا ہے اسمیں یہی شخص ترجمان اور امیر وفد ہے۔

[2] یہ نام بظاہر عرب نہیں معلوم ہوتے۔ معلوم نہیں انکی کیا اصلیت ہے۔

[3] یعنی مسلمان، مسلمانوں کے لیے لفظ Pa برابر اس گیت میں استعمال کیا گیا ہے، مذہبی اصطلاح میں اس لفظ کے معنی غیر مسیحی اور بت پرست دونوں ہیں۔

[4] اس گیت سے اس زمانہ کے طرز حکومت پر بہت روشنی پڑتی ہے، شارلیمن کوئی بات بھی بغیر اپنے مشیروں کے مشورہ بغیر نہیں کرتا، دراصل ابتدائی فرانک حکومت نے بہت دنوں تک اپنے اجداد کے جمہوری انسٹیٹیوشن فرانس میں بھی قائم رکھے

مشیر سب اپنی اپنی رائے دیتے ہیں، انمیں رولان اور گینلون کی شخصیتیں بہت اہمیت رکھتی ہیں کیونکہ
ساری کہانی انہیں دونوں کے کیرکٹروں کا بیان ہے، رولان جوان ناتجربہ کار اور جنگ کا خواہشمند ہے
برخلاف اس کے گینلون تجربہ کار ہے اور صلح کیطرف مائل نظر آتا ہے، رولان نے جب درباریوں کا یہ رنگ
دیکھا کہ وہ سب جنگ سے تھک گئے ہیں اور فرانس واپس جانے کیلئے کوئی نہ کوئی عذر ڈھونڈتے ہیں تو کڑک کر یوں
مخاطب ہوتا ہے "کیا تم لوگوں نے ماریل کی پرفریب باتوں کا یقین کرلیا۔ کیا سات سال ہم نے مفت میں
ان پہاڑوں میں جان کھپائی ہے۔ کیا میں نے نوبل، کومیل، والسترن، بتین، بلاگوے اور توریل عربوں
سے بیکار فتح کئے، یہ سب دھوکا ہے دھوکا! ماریل نے زیتون کی شاخیں[1] دیکر چند آدمی بھجوائے اور تم نے
انکی باتوں پر یقین کرلیا، واہ وا واہ وا"

طے یہ پایا کہ ماریل کے پاس بادشاہ شارل اپنے ایلچی بھیجے اور عربوں سے صلح کی چند شرطیں منظور کرائے۔
ایسی حالت میں دشمن کے ملک میں جانا اپنی جان پر کھیلنا تھا چنانچہ بادشاہ شارل کی خدمت کے جوش اور
اپنی بہادری کے گھمنڈ پر ضعیف العمر نواب نائم، رولان اور ربین کے پادری تربان نے باری باری اپنے
آپ کو پیش کیا لیکن شارل نے ان تینوں کی تجویزیں منظور نہ کیں۔ نواب نائم اس کام کے لیے بہت بڈھا تھا،
پادری تربان کے مشورہ کی ہر وقت اسے ضرورت تھی اور رولان ناتجربہ کار اور سیاسی چالوں سے ناواقف
ہونیکی بنا پر اس سفارت کے لیے موزوں نہ تھا۔ بالآخر رولان نے اٹھکر گینلون[2] کا نام پیش کیا جو درباریوں
میں سب سے زیادہ جنگ ختم کرنیکا حامی اور صلح کرنے کا آرزومند تھا۔ گینلون دلیں تو اس مصیبت سے نکل
چھٹنا چاہتا تھا لیکن جب اس نے دیکھا کہ شارل کو رولان کی اس تجویز سے اتفاق ہے تو خواہی نخواہی رضامندی
ظاہر کی، اُسے اداس دیکھکر رولان نے اسے جلانیکے لیے ٹھٹھہ مارا، رولان کی اس ہنسی نے زخم پر نمک کا کام

---

[1] زیتون کی شاخیں صلح کی نشانی سمجھی جاتی ہیں۔
[2] گینلون وہی شخص ہے جو آخر میں جاکر اپنے ہم وطنوں کو عربوں کے خلاف اور اپنی ذاتی پرخاش کی بنا پر دھوکا دے گا
برخلاف اس کے رولان شجاعت، جوانمردی اور حب الوطنی کا مجسمہ ہے، آجتک فرانسیسی مدارس میں بچوں کو رولان کا گیت
پڑھایا جاتا ہے تاکہ وہ اپنے سامنے حب الوطن کا ایک آئیڈیل قایم کرسکیں۔

کیا۔ چنانچہ اس نقشہ کو گینلون کبھی نہیں بھولیگا اور اپنی عیاریوں سے ایسی تدبیریں کریگا جو بالآخر رولان کی تباہی کا باعث ہوں گی۔

گینلون نے ہمت کی اور بادشاہ کیطرف یوں مخاطب ہوا "میں سارا گوس جاؤں گا، اگرچہ میں جانتا ہوں کہ وہاں جانا موت کے ہم معنی ہے، یہ واضح رہے کہ میری بیوی آپ کی بہن ہے، اس بیوی سے میرا ایک بیٹا ہے جسکا نام آپ جانتے ہیں، بادوان ہے، میں اپنی ساری زمین جائداد اُسے چھوڑے جاتا ہوں۔ میں اپنی آنکھوں سے شاید اب اسے نہ دیکھ سکوں گا، اسے آپ کے سپرد کرتا ہوں"، یہ کہکر وہ روانہ ہونا چاہتا تھا کہ بادشاہ نے دستانہ اور سونٹا دینا چاہا لیکن یہ دستانہ گینلون کے ہاتھ سے گر پڑا، دستانہ کا گرنا جنگجو فرانسیسیوں میں بڑی منحوس نشانی سمجھی جاتی ہے، سب لوگ کہنے لگے کہ نہ معلوم ہم پر کیا مصیبت نازل ہونیوالی ہے گینلون جانتا تھا کہ وہ کیا اور کون سی مصیبت ہے، اس نے کہا عنقریب تم سن لوگے یا دیکھ لوگے۔ بالآخر گینلون اپنی زرہ بہن پہنا کر اور ہتھیار لگا کر عرب ایلچیوں کے ساتھ اندلس کیطرف روانہ ہوتا ہے بلانڈکندران سے راستہ میں یوں باتیں شروع ہوتی ہیں :-

بلانڈکندران۔ تمہارا بادشاہ شارل واقعی عجیب وغریب انسان ہے، اس نے پوے اور سارا کا سارا کالابریہ فتح کر لئے، صرف یہی نہیں بلکہ سمندر پار انگلستان کے سینٹ پیٹر تک سے خراج وصول کر لیا ہمارے ملک میں کیا دھرا ہے، اُدھر اس نے بیکار رُخ کیا ہے۔

گینلون۔ اسکی مرضی ہی ٹھہری، کوئی اسے روک تھوڑی سکتا ہے۔

بلانڈکندران۔ فرانسیسی تو بڑی شریف نسل کے لوگ ہیں، تمام کام نوابوں نے خراب کیا ہے، یہ ہر وقت بادشاہ کو مشورے دیتے رہتے ہیں اور اس طرح وہ تم لوگوں کو بڑا ہی نقصان پہنچا رہے ہیں۔

گینلون۔ جہانتک میں جانتا ہوں ایسا نہیں، اصل میں صرف رولان ہے جو ہم سب کو مصیبت میں ڈالکے چھوڑے گا۔ ہر روز وہ موت کے منہ تک جاتا ہے اور بچ جاتا ہے، اسکا گھمنڈ اسے تباہ کرکے چھوڑیگا مرے بھی وہ کسی طرح تو ہمیں چین ملے۔

---

[1] یہ بھاٹوں کی خودساختہ تاریخ ہے۔

بلاندکندان۔ دائمی رولان اس لایق ہے کہ ہر شخص اس سے نفرت کرے۔ وہ چاہتا ہے کہ دنیا کی ساری قوموں کو نیچا دکھائے اور انکی زمینوں پر قبضہ کرے۔

گینلون۔ یہ تو ہے لیکن فرانسیسی اس سے بڑی محبت کرتے ہیں، وہ کبھی اسے دغا نہ دیں گے۔ وہ ہمیشہ انہیں دولت، گھوڑے، خچر، ہتھیار اور ریشمی چادریں دیتا رہتا ہے، میری سمجھ میں تو اس طرح وہ مشرق تک سارے ملک فتح کر ڈالیگا۔

باتوں باتوں میں گینلون اور بلاندکندران میں یہ طے پاجاتا ہے کہ رولان کے ہلاک کرنے کی کوئی تدبیر سوچنی چاہیئے۔

گینلون ایلچیوں کے ساتھ مارسیل کے دربار میں پہنچتا ہے، بلاندکندران اسے بادشاہ کی خدمت میں پیش کرتا ہے اور اس طرح خطاب کرتا ہے "سلامتی ہو ساتھ نام محمدؐ اور اپولو[1] کے اور محفوظ رہیں ہمارے قوانین، ہم نے آپ کا پیغام شارل کو پہنچا دیا، اس نے ہماری باتیں سنکر اپنے دونوں ہاتھ آسمان کیطرف اٹھائے اور اپنے خدا کی تعریف کی اور کوئی قطعی جواب نہیں دیا۔ اس نے اپنے ایک مشہور مشیر کو آپ سے گفتگو کرنیکے لئے بھیجا ہے، اسکی گفتگو سے آپ کو صلح کی سب شرطیں معلوم ہو جائیں گی

مارسیل۔ اچھا گینلون کو جو کہنا ہے آئے اور کہے۔

گینلون پیش کیا جاتا ہے اور یوں مخاطب ہوتا ہے "سلامتی ساتھ نام خدا کے جس کی ہم سب کو پرستش کرنی چاہئے، شارلیمین آپ کے پاس یہ پیغام بھیجتا ہے کہ آپ فوراً مسیحی قانون اپنے یہاں نافذ کرلیں اور اپنی اسپین کی آدھی بادشاہت اس کے حوالے کریں اور اگر ان شرطوں پر آپ کو معاہدہ منظور نہیں تو اپنی گرفتاری اور اپنی موت کے لیے تیار رہیے۔ یہ ایک بے شرمی کی موت ہوگی۔"

بادشاہ مارسیل یہ سنکر غصہ سے کپکپا گیا، اپنی کمان پر تیر چڑھایا اور شست لگا ہی تھا کہ درباریو

---

[1] ان بھاٹوں کی سمجھ میں سارے غیر مسیحی اپولو کے پجاری ہوتے تھے، مسلمانوں کے لئے انہوں نے یہ تخصیص کی ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا نام اپولو کے ساتھ بڑھا دیتے ہیں تاکہ ان غیر مسیحیوں میں جو مسلمان نہیں ہیں اور انہیں جو مسلمان ہیں تمیز ہو سکے۔

نے روک دیا گینلون نے یہ دیکھکر اپنا ہاتھ اپنی تلوار پر رکھا اور میان سے دو انگل باہر نکال لیا سب چلا اُٹھے کہ اس گڑبڑ کو دور کرو، سب عرب سرداروں نے بادشاہ کی خوشامد کرکرا کے اسے تخت پر جا بٹھایا گینلون کا غصہ بھی ٹھنڈا پڑا۔ جب اس نے دیکھا کہ دربار میں خاموشی ہے تو بادشاہ کیطرف بڑھ کے یوں بولا "آپ بیکار غصہ ہوئے شارل بادشاہ فرانس نے یہی شرطیں آپ کے پاس بھجوائی ہیں، وہ آپ کیلئے آدھا اسپین چھوڑے دیتا ہے آدھا وہ اپنے بھانجے رولان کے لئے لینا چاہتا ہے آپ کا سابقہ ایک بڑے ہی مغرور رپڑوسی سے پڑے گا، اگر آپ اس معاہدہ پر رضامند نہیں ہوتے تو شارل خود ماراگوس کا محاصرہ کرنے آتا ہے، آپ گرفتار کر کے ایکس[1] بھیجدے جائیں گے، راستہ کی سواری کے لئے نہ آپ کو گھوڑا دیا جائیگا نہ خچر کسی باربرداری کے جانور پر آپ کو چڑھا دیا جائیگا اور پھر اسکے بعد آپ کے لیے موت کا حکم ہے، لیجئے یہ مہر شدہ کاغذات لیجئے، انیں یہی باتیں لکھی ہیں"

بادشاہ مارسیل اپنے غصہ پر نادم ہوا گینلون کے ہاتھ سے کاغذات لیکر انہیں کھولا، اپنے مشیروں کو بلایا اور اُن سے کہا کہ "شارل نے باسان اور بازیل کے قتل کی یاد دہانی کی ہے، ان دونوں کو میں نے پہاڑ آہتوا پر مروا ڈالا تھا، اگر مجھے اپنی جان پیاری ہے تو چاہئے کہ اپنے چچا الغالیف کو بطور کفالت کے اس کے پاس بھیجدوں سوائے اس کے ہمارے تعلقات قائم کرنیکی اور کوئی دوسری صورت نہیں"

اتنا سنکر مارسیل کا بیٹا کچھ عرض کرنے کی اجازت لیکر بادشاہ کی خدمت میں یوں مخاطب ہوتا ہے۔ "گینلون نے جو احمقانہ باتیں کیں ہیں انکے بعد اسے کوئی حق نہیں کہ وہ زندہ رہ سکے مجھے اجازت دیجئے کہ اسکے ساتھ انصاف کروں"

گینلون نے یہ سنا اور اپنی تلوار میان سے نکال لی اور ایک شاہ بلوط کے پیڑ کے نیچے جاکر کھڑا ہوگیا مارسیل نے جیسے کہ اس نوجوان کی باتوں کو سنا ہی نہیں، اپنے مشیروں کو تخلیہ میں بلایا اور ان سے مشورہ کیا کہ کیا کرنا چاہئے، بلاند کندران کو سارا حال معلوم تھا ہی اس نے سب باتیں بادشاہ کو بتائیں اور کہا کہ

---

[1] ایکس فرانس کے جنوب مشرق میں ایک شہر ہو عربوں نے [illegible]ء میں اسپر قبضہ کرلیا تھا۔ فرانس کی ازمنہ وسطی کی تاریخ میں اپنی علمی اور مذہبی خصوصیتوں کیوجہ سے اس شہر کو خاص اہمیت حاصل تھی۔

گینلون ہمارے مقصد کے لیے بڑے کام کا آدمی ہے اُس نے مجھسے اس بارہ میں عہد کیا ہے۔ بلامدکنندران

پھر دوسری مرتبہ گینلون کو بادشاہ کی حضوری میں پیش کرتا ہے

مارسیل: "میں نے تمہارے ساتھ بڑی بکی کا برتاؤ روا رکھا میں غصہ میں تمہیں مارنا چاہتا تھا۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ کل شام سے پہلے پہل اس حرکت کی تلافی کردوں گا۔ مجھے تم سے محبت ہے میری خواہش ہے کہ تم اپنے بادشاہ شارل کا احوال ذرا اپنی زبان سے سناؤ۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب وہ بہت ضعیف ہوگیا ہوگا، اس نے اپنی عمر بسر کرلی، بھلا اسکی عمر ۲۰۰ سے کم کیا ہوگی، دیس دیس اسکا جھانا پڑا ہے، اس کی ڈہال نے نہ جانے کتنی زدیں سہی ہیں۔ اس کا تو کچھ کہنا ہی نہیں کہ اس نے کتنی دولت حاصل کی اور کتنے تاج والوں کو فقیر کردیا۔"

گینلون۔ جی ہاں، جو کوئی اسے دیکھتا ہے کہتا ہے کہ واقعی شارل سے بڑھکر کوئی بہادر نہیں، باوجود بڑہاپے کے اس کی جوانمردی زبان زد عالم ہے۔ میں اسکے اوصاف بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ اتنی بڑائی اور نیکیوں کے لئے میرے پاس لفظ نہیں، اس کی ذات سے دنیا میں شرافت کا اظہار ہے، وہ اپنے باجگذار نوابوں سے اتنی محبت کرتا ہے کہ وہ موت کو اس بات پر ترجیح دیگا کہ انکے ساتھ بے عہدی یا بے وفائی کرے۔

سب درباری۔ بھلا کوئی بتاؤ تو کہ شارل کا جی ابتک لڑائیوں سے بھرا کیوں نہیں؟ کیا اس کی کبھی امید ہے؟

گینلون۔ کبھی نہیں جب تک اسکا جنگجو بھانجہ رولاں زندہ ہے اسوقت تک لڑائیاں جاری رہیں گی آسمان کے گنبد کے تلے رولان اور اولیوئے[۵۱] جیسا جنگجو شاید ہی کوئی اور ہو، ان دونوں سے شارل کو بے انتہا محبت ہے، یہ دونوں شارل کے ۲۰ ہزار ہراول کے افسر ہیں انکے بھروسہ پر شارل دنیا میں کسی سے نہیں ڈرتا

---

[۵۱] اولیوئے۔ رولان کے خاص دوستوں اور شارل کے مقربوں میں سے ہے، اس نوجوان کی موت اس گیت میں بڑے پُر درد طریقہ پر بیان کی گئی ہے، اولیوئے جرمن بہادری کا اعلیٰ نمونہ ہے، آخری معرکہ میں جب رولان بھی ہمت چھوڑ رہا تھا اسوقت اولیوئے نے رولان کو شرم دلائی ہے، رولان کی نسبت اولیوئے کی بہن آدہ سے ہو چکی تھی چنانچہ اولیوئے کہتا ہے کہ اگر رولان نے ذرا بھی بزدلی کی تو وہ اس لائق نہیں کہ میری بہن کیساتھ ہم بستر ہو۔ سکے گیت کا یہ حصہ جرمن شجاعت کی اعلیٰ مثالوں میں سے سمجھا جاتا ہے۔

مارسیل۔ میرے پاس ایسی فوج ہے جس کی مثال دنیا میں نہیں، میں چار لاکھ سپاہیوں کو ہر وقت تیار کر سکتا ہوں اور چاہوں تو شارل کی فرانسیسی افواج کو شکست دیدوں۔

گینلون۔ ذرا یہ آسان کام نہیں۔ آپ بے فائدہ اپنے بے گنتی آدمیوں کی جان ضائع کریں گے، اس حماقت کو چھوڑیے عقل کی باتیں کیجئے، شارل کو دھن دولت دیکر واپس کیجئے۔ کفالت کے لئے ۲۰ آدمی دربار سے بھیجدیجئے تو شاید شارل پیاری فرانس[1] کیطرف واپس چلا جائے، عقب کی فوج چھوڑ جائیگا، اس رولان اور اولیوئے پر سب سے زیادہ اعتماد ہے، یہ دونوں فوج کے ساتھ رہیں گے، اگر آپ میری سنیں تو ان دونو کو ہلاک کرنیکی تدبیریں نکل سکتی ہیں، شارل کا دل ان دونوں کی موت ناگہانی سے پاش پاش ہوجائے گا اور پھر ہمیشہ کے لئے وہ لڑائی کا خیال چھوڑ دے گا۔

مارسیل۔ بھلا ایسی کونسی تدبیر ہے

گینلون۔ مجھے معلوم ہے، تم اپنے ایک لاکھ آدمی رولان اور اولیوے کے خلاف بھیجدو، پہلے وار میں تمہارے آدمی مارے جائیں گے اور انکے بھی لیکن آخر شجاعت کہانتک کام کریگی۔ اُنکے تھکے ماندے آدمی تمہارے حملے کی تاب نہیں لاسکیں گے، رولان اور اولیوئے قتل ہوگئے تو گویا شارل کا سیدھا ہاتھ دھڑ سے کٹ گیا۔ پھر کیا ہے، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تمہیں چھٹی ہوجائیگی۔

مارسیل۔ اگر اسی تدبیر پر عمل کرنا ہے تو پھر معاہدہ سے کیا فائدہ؟

گینلون۔ میں اپنی تلوار مرغلیط کی قسم کھاکر کہتا ہوں جس کے قبضہ میں ولیوں کی نشانیاں[2] ہیں کہ میں تمہارے لئے ہر ممکن کوشش کروں گا۔

ان باتوں کے بعد مارسیل نے ایک کتاب منگوائی جو ہاتھی دانت کی چوکی پر رکھی رہتی تھی اس کتاب

---

[1] جرمنوں کو فرانس میں آباد ہوئے دو صدیاں بھی نہیں ہوئیں لیکن فرانس کی سرزمین سے انہیں اتنی محبت ہو کہ گویا اپنے آبائی وطن کو بالکل بھول گئے۔ وطن کا جب ذکر ہوتا ہے تو درباری اور سپاہی پیارا وطن کہکر اپنے جذبات حب الوطنی کا اظہار کرتے ہیں، یہ وہ زمانہ ہے جب وطنیت سے دنیا بیگانہ تھی، کلیسا زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی تھا لیکن شارل کی فوج میں پادری تک بھی مذہبیت کے ساتھ ساتھ وطنیت کا دیوانہ نظر آتا ہے

[2] ازمنہ وسطیٰ میں سردار لوگ اپنی تلوار کی موٹھ میں تعویذ وغیرہ رکھوا لیتے تھے تاکہ جنگ کے وقت انکی غیب سے مدد ہوتی رہے۔

میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا قانون لکھا ہوا تھا۔ ایک عرب نے اس پر ہاتھ رکھا اور قسم کھائی کہ اگر عقب میں رولان ہوا تو بچ کر نہیں جا سکیگا۔

گینلون۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔

ملکہ براسموند نے گینلون سے کہا کہ وہ اکی بیوی کے لئے دو ہار جواہر کی جنکی قیمت روما کے سب خزانوں سے زیادہ ہوگی۔ تمہارے بادشاہ نے ایسی چیز کبھی خواب و خیال میں بھی نہیں دیکھی ہوگی، ماریل نے گینلون کے کندھوں پر ہاتھ رکھکر کہا، تم بڑے دانا ہو میں تمہیں مالا مال کئے دیتا ہوں اگر تم رولان کو عقب میں رکھوا دو۔

گینلون۔ مجھے اب دیر ہو رہی ہے، مجھے روانہ ہو جانا چاہیئے۔

بادشاہ شارل شہر گالن کے قریب ڈیرے ڈالے پڑا ہے۔ گینلون کی واپسی کا اسے سخت انتظار ہے تڑکے ہی گینلون شہر میں پہنچ جاتا ہے، بادشاہ ڈیرے بستر سے اٹھا صبح کے بھجن سننے سنانے میں اور دیر ہوئی، دروازہ سے جب نکلا تو رولان، اولیوئے اور نواب نائم کے ساتھ گینلون بھی تھا

گینلون۔ حضور والا۔ سلامتی ہو آپ پر میں ساراگوس سے شہر کی کنجیاں لیکر آیا ہوں اور ساتھ ہی ماریل نے آپ کی خدمت میں ایک بہت بڑا خزانہ اور ۲۰ کفالتی جانیں بھیجی ہیں۔ اگر وہ اپنے چچا الغالیف کو نہ بھیج سکا تو اسمیں اسکا کوئی قصور نہیں، میں نے اپنی آنکھوں سے ۴ لاکھ مسلح سپاہیوں کو دیکھا جو الغالیف کیساتھ سمندر کی طرف بھاگ گئے ہیں کیونکہ یہ لوگ اس سچے قانون کے ماتحت نہیں رہنا چاہتے جسے ماریل نے قبول کرنے کا وعدہ کر لیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ بہت دور سمندر میں نہیں گئے ہوں گے کہ طوفان نے انہیں آ لیا ہوگا اور وہ سب ڈوب کر ختم ہو چکے ہونگے۔ آپ یقین کریں کہ ایک مہینہ نہیں گذرنے پائیگا کہ مارسیل خود آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر دونوں ہاتھ جوڑ کر اسی قانون کو قبول کریگا جو آپ اسے دیں گے۔

شارل۔ تم نے اپنا منصب بہت خوبی سے انجام دیا تمہیں اسکا بدلا ملیگا، اچھا اب سپاہ کو پیارے فرانس واپس ہونیکی خوشخبری دو۔

(بقیہ حصہ آئندہ)

غزل

(از جناب مولانا سید شرف الدین صاحب یاس مومن استاد جامعہ ملیہ)

نمودِ گل کی ہے کیا لالہ کس شمار میں ہے
یہ رنگ و بو سب اسی کی عیاں بہار میں ہے

جنوں کے فیض سے رونق عجب بہار میں ہے
کہ جوئے خون بھی رواں دشت و کوہسار میں ہے

مزہ تڑپ میں ہے تسکین اضطراب میں ہے
تری قسم ہے کہ تو بھی دلِ فگار میں ہے

سمائے جاتی ہیں آنکھوں میں تیرے دیوانے
عجیب حسن گریبان تار تار میں ہے

خوشا وہ زیست کہ گذری اسی کے در پہ سدا
خوشا یہ موت کہ اب قبر کوئے یار میں ہے

ہزار کچھ ہو مگر ایک دن ملو گے تم نہ
بندھی ہوئی میری امید انتظار میں ہے

نہ لب پہ شکر و شکایت نہ دل میں یاس و امید
عجیب حال مرا جلوہ گاہ یار میں ہے

برنگِ گل جسے دیکھو ہے آپ سے باہر
عجیب رنگ جہاں موسمِ بہار میں ہے

نہ مل نہ مل تجھے بدنام ہی کریں گے ہم
وہ تیری ضد ہے تو یہ اپنے اختیار میں ہے

ملا کے خاک میں دیتے ہیں دولت جاوید
یہ رسم و راہ عجب عشق کے دیار میں ہے

ہزار حشر اٹھا جی کبھی نہ چھوڑے گا ؎
امید ہے تو بہت دم امیدوار میں ہے

ٹھہرنے دیتی ہے مجھکو کہاں تیری شوخی
قرار ہے تو اسی قلب بیقرار میں ہے

لنہ وہ اضطراب وہ بیچینیاں نہیں اے یاس
خدا کے فضل سے دل اب تو اختیار میں ہے

لنہ عذاب ہجر بتاں سے ملی اماں مومن

تضمین

(از مولنا مومن ٹونکی)

تضمین میں مولنا کو خاص قدرت حاصل ہے جسے نقادان فن نے تسلیم کیا ہے۔ اس وقت حافظ کے دو شعروں پر آپکی تضمین ہدیۂ ناظرین ہے۔ انشاء اللہ ہم پھر کبھی مزید نمونے پیش کر سکینگے

(۱)

تُل گیا جور پہ تو میں نے بھی سر ٹیک دیا
چھوڑنا اب نہ خدا کے لئے تسمہ بھی لگا
قہر ڈھا حشر اٹھا خوب ستا خوب جلا
عہد کردی کہ بسوزی ز غم خویشں مرا
ہیچ غم نیست تو می سوز کہ من میسازم

(۲)

نشتر چبھوے دل میں کلیجہ میں برچھیاں
سینہ پہ چڑھ کے حلق پہ خنجر کیا رواں
اب خاک و خوں میں ہم کو ملا کر چلا کہاں
از دامن تو دست نہ دارند عاشقاں
پیراہن صبوری ایشاں دریدہ

آسمانی بجلی

ہر شخص نے بجلی کا طوفان دیکھا ہے جس میں چمک اور گرج دونوں ہوتی ہیں۔ کبھی یہ بارش سے قبل ہوتا ہے اور اکثر اس وقت ہوتا ہے کہ گرد و غبار آسمان پر زیادہ ہو یا آندھی آتی ہو۔ بارش سے قبل کا اکثر خطرناک ہوتا ہے اور بجلی گرنے کے حوادث اکثر ہوتے ہیں۔ جب بارش ہوتی ہو یا ہو چکی ہو تو بھی یہ طوفان دیکھنے میں آتا ہے۔ مگر بجلی گرنیکا حادثہ کم ہوتا ہے۔ ابتدائی قومیں یعنی جنکے دماغی قوا نشوونما اور تربیت یافتہ نہیں ہوتے۔ سر منظہر قدرت کو دیوتا سمجھتی ہیں اور اکثر بجلی کو پوجتے ہیں یہانتک کہ قرون وسطےٰ میں یورپ میں خیال پیدا ہو گیا تھا کہ گرجوں کے اگر گھنٹے بجائے جائیں تو طوفان ٹل جائیگا۔ اور جب طوفان آتا تھا تو گھنٹے بجائے جاتے تھے چنانچہ یورپ کے کسی گاؤں میں اسی طرح طوفان آیا اور تمام گاؤں کے لوگوں نے رسیاں پکڑ کر گرجے کے گھنٹے بجانا شروع کیے۔ اتفاق سے اسی وقت بجلی گرجا پر گری اور یہ سب فنا ہو گئے۔ یہ محض جہالت کا سبب ہے۔ ہندوستان میں بھی بعض لوگ بجلی کے متعلق عجب عجب توہمات رکھتے ہیں بعض کا خیال ہے کہ سیاہ یا سرخ کپڑے پر بجلی زیادہ گرتی ہے کالے سانپ پر یا دودھ والے جانور پر بجلی گرتی ہے۔ یا اُس شخص پر بجلی گرتی ہے جو اُلٹا پیدا ہوا ہو۔ یا اور اسی طرح کے خرافات خیالات عوام میں پھیلے ہوئے ہیں۔

مندرجہ ذیل مضمون میں ہم سائنٹفک وجہ بجلی کے طوفان کی سمجھائیں گے اور پھر یہ بھی بتائینگے کہ بجائے گھنٹے وغیرہ بجانیکے کیا طریقہ اختیار کرنا چاہئے جس سے مکان اور جان محفوظ رہ سکیں۔

سب سے پہلے امریکن طبیبی بنجمن فرینکلن نے یہ دریافت کیا کہ مصنوعی بجلی یعنی وہ جو رگڑ سے پیدا ہوتی ہے یا مشین وغیرہ سے تیار ہوتی ہے وہ اور آسمانی بجلی ایک ہی ہیں۔ صرف فرق یہ ہے کہ وہ مطیع ہے اور ہم اسے بنا سکتے ہیں اور قابو میں رکھ سکتے اور یہ آسمانی بجلی نہ ہمارے قابو کی ہے اور نہ اس پر ہم نے ابتک اپنا اثر جمایا ہے۔ بلکہ کبھی کبھی یہ ہم کو ہلاک بھی کر دیتی ہے۔ سب سے پہلے اس نے ایک پتنگ ریشمی کپڑے کی بنائی اور اُس پر ایک تانبے کا تار لگا دیا۔ ایک ڈوری باندھکر اس پتنگ کو آسمان پر چڑھا کر نیچے ایک ریشمی رومال سے اُسے پکڑا اور ڈوری میں ایک کنجی بھی باندھ دی اور جب کنجی کے پاس کوئی ہاتھ لے جاتا تھا تو چنگاریاں

کی تھی اسی زمانے سے اس نے بنایا LEYDEN JAR لیڈنی برتن بھر لیا جس سے ثابت ہوگیا اس بجلی میں جو زمین پر ہے اور اس میں جو آسمان پر ہے کچھ فرق نہیں ہے۔ یہ نظریہ فرینکلن نے انیسویں صدی کے اوائل میں معلوم کر لیا تھا اور اسی بنا پر اس نے برق ربا LIGHTNING CONDUCTOR بنایا جو مکانوں، برجیوں اور مناروں پر لگایا جاتا ہے۔ ایک روسی پروفیسر نے اسی قسم کا تجربہ کیا تھا جس میں بجلی بھر گیا گیا بجائے اس کے مٹی یعنی رسال کی جگہ انہیں لگی تھی جو فرینکلن نے اپنے ابتدائی تجربوں میں لگائی تھی۔

یہ اٹھارویں صدی میں معلوم ہوگیا تھا کہ بادلوں میں دو قسم کی بجلی ہوتی ہے۔ ایک کا نام مثبت اور دوسری کا منفی رکھا۔ یعنی حسب قیاس یہ کہ مثبت سے منفی کی طرف بجلی رواں ہوتی ہے۔ یعنی جس طرف سے بجلی آتی ہے اسکا نام مثبت رکھا ہے اور جدھر جاتی ہے اسکا نام منفی رکھا ہے۔ مقناطیس کے مانند غیر جنس بجلی ایک دوسرے سے ملنے کی کوشش کرتی ہے اور ہم جنس سے گریز کرتی ہے۔ یعنی دو تار مثبت کے برابر رکھ دیں تو یہ ایک دوسرے کو دھکیلینگے اور ان کی بجلیاں آپس میں نہیں ملینگی۔ مگر جب مثبت اور منفی برابر رکھ دیے جاویں تو بجلی کی کوشش ہوگی کہ بیچ میں ہوا کو توڑ کر ایک دوسرے سے مل جاویں اور اس میل کے وقت ایک قسم کا شعلہ پیدا ہوتا ہے اور سناٹے کی آواز آتی ہے۔ جس میں WIMSHURST مشین ایک عام چیز ہے۔ اس میں سے کئی کئی انچ لمبا شعلہ نکل سکتا ہے اور شاید ہی دنیا میں کوئی بجلی کا عالم ہو جس نے نادانستگی میں اس کے تار کا جھٹکا نہ کھایا ہو۔ اس مشین میں کئی ہزار وولٹ[1] پیدا ہوتے ہیں۔ مگر چونکہ ان میں مدد کم ہوتی ہے اس لئے آدمی نہیں مرتا۔ بادلوں میں بھی یہی دو قسم کی بجلی پائی جاتی ہے۔ جب ایک بادل دوسرے مختلف قسم کی بجلی کے بادل کے قریب آجاتا ہے تو ایک میں سے بجلی دوسرے میں بھر جاتی ہے اور چمک پیدا ہوتی ہے۔ بعض وقت ہم اسکے ساتھ سناٹا ہوتا ہے دوری کی وجہ سے اور اس سے گرج در

---

[1] وولٹ بجلی کا ایک پیمانہ ہے۔ جیسے لیمپ میں جو وولٹ کی قوت ہوتی ہے۔ پنکھوں اور بجلی کی روشنی میں ۱۱۰ سے ۲۳۰ یا شاذ ۲۵۰ وولٹ ہوتے ہیں۔ انہیں جھٹکا لگتا ہے۔ اور اگر دیر تک تار جسم سے متصل رہے تو خطرناک ہوتا ہے۔ امریکہ میں بجلی کے ذریعے قصاص لیا جاتا ہے۔ ایک ہزار وولٹ کا محض برائے نام چھو جانا ہی انسان کو عدم آباد پہنچانے کے لئے کافی ہے۔

ہونیکی وجہ سے نہیں بن سکتے۔ اور بعض وقت جب یہ سناٹا زور کا ہو تو گرج ہمکو سنائی دیتی ہے۔ ایسی بجلی جو ایک بادل سے دوسرے بادل میں سرایت کرے اُسے برق خرشف SHEET LIGTNING کہتے ہیں۔

بعض اوقات ایک بادل سے دوسرے بادل اور دوسرے سے تیسرے میں بجلی میں بھرتی چلی جاتی ہے یہانتک کہ اسمیں اسقدر زور ہوجاتا ہے کہ ہوا انہیں روک سکتی اور یہ زمین پر گرنا چاہتی ہے بجلی کی یہ چمک بعض اوقات سکنڈ کے کئی لاکھویں حصے کے وقفہ کی ہوتی ہے مگر اپنی شدت کی وجہ سے ہمکو معلوم ہوتا ہے کہ یہ زیادہ دیر تک چمکتی رہی۔ اسمیں کروڑوں گھوڑوں کی قوت ہوتی ہے مگر افسوس کہ ابتک یہ ہمکو دھوکے دے رہی ہے۔ اور انسان کے قابو میں نہیں آسکی۔ دنیا کی تمام قوتوں کی طرح یہ بھی کم سے کم مزاحمت کا راستہ ڈھونڈتی ہے چنانچہ بلند عمارتیں چمنی۔ منارے۔ برج۔ درخت وغیرہ جو اس کے قریب آگئے انکے ذریعہ سے یہ زمین میں پیوست ہونا چاہتی ہے۔ اور چونکہ ان چیزوں میں کچھ نہ کچھ مزاحمت ہوتی ہے لہذا ان دونو قوتوں میں یعنی بجلی اور شے مذکور میں ایک کشمکش ہوتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بجلی زیادہ زور اور گڑگڑاہٹ کے ساتھ گرتی ہے۔ ایسی بجلی کی شکل آپنے دیکھی ہوگی کہ آسمان پر ایک لہر سی بنی ہوتی ہے اسے FORKED LIGHTNING یا برق شاخدار کہتے ہیں۔ اس نظریہ کو معلوم کرکے فرینکلن نے تجویز کی کہ اگر عمارتوں پر ایسے تار جنمیں مزاحمت کم ہو بلند مقام پر لگا دیں تو وہ بآسانی بجلی کو گذر جانے دینگے اور نہ کشمکش ہوگی نہ گڑگڑا ہوگا اور نہ عمارت کا نقصان ہوگا۔ مگر یہاں اس بات کی انتہائی احتیاط کی ضرورت ہے کہ یہ تار زمین میں دور تک گہرا چلا جائے۔ خشک زمین بھی حاجز[1] ہے یعنی بجلی کو روک سکتی ہے۔ لہذا ایسے تار زمین میں اتنی گہرائی تک لے جاویں جہاں موسم گرما میں بھی نمی نکل آئے۔ اس تار کو جو اکثر ایک چوڑی پٹی کی شکل میں لگایا جاتا ہے

---

[1] حاجز۔ Insulator اس مضمون لکھتے وقت بخیہ انجمن ترقی اردو کی اصطلاحات پیش نظر رکھتا ہوں اور حتی الامکان وہی ترجمہ لیتا ہوں جو انجمن نے شائع کیا ہے جہاں انجمن کا ترجمہ ناکافی ہوتا ہے اُسے ترمیم کرلیتا ہوں اور جہاں ترجمہ نہیں ملتا وہاں خود مقرر کرلیتا ہوں چنانچہ برق خرشف۔ برق شاخدار۔ بقدر ضرورت میں نے وضع کئے ہیں۔ اگر کوئی صاحب بہتر اصطلاح پیش کریں تو میں خوشی سے قبول کرنیکو تیار رہوں بہتر ہو کہ انجمن خود ایسی اصطلاحات جمع کرتی رہے اور علاوہ موجودہ اصطلاحات کے جو لغات کی ضرورت ہے جب دوسری مرتبہ شائع کرے تو وہ سب ترمیمیں اور اضافے شائع کردے۔

تانبے کی چادر یا لوہے کے پائپ سے خوب وصل کرکے اور جھال دیکر دفن کریں۔ اگر باریک کوئیلے پیس کر اس گڑھے میں بھر دیں اور اسے پانی سے خوب تر کردیں تو نمی دیر پا رہتی ہے۔ اکثر اس تار کو کنویں میں آتار دیتے ہیں یا پانی کے نل سے ملا دیتے ہیں۔ اس طرح تار کو لگانے سے حفاظت مکمل ہو جاتی ہے۔ اسے اصطلاح میں TO EARTH یا "زمینانا" کہتے ہیں ایسے مکانات پر جو ایک دوسرے سے علیحدہ ہوں۔ یا پہاڑی پر ہوں برق ربا لگانا ضروری ہے۔ شہروں کی ایسی عمارتیں جو متصل چلی آتی ہیں ان پر بجلی گرنے کا اندیشہ اتنا نہیں ہوتا جتنا منتشر عمارتوں پر ہوتا ہے۔ شہر میں بھی ایسی عمارت پر جو دوسری عمارتوں میں سربرآوردہ ہو برق ربا لگا دینا چاہئے۔ ایسی عمارتیں جیسی مسجدیں جنمیں دو یا زیادہ منارہ ہوتے ہیں اگر سب مناروں پر تار لگا دئیے جاویں تو مناسب ہے۔ مکان میں دھات جہاں لگی ہو خصوصاً ٹین کے سائبان انہیں ضرور زمینانا چاہئے۔

جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ بجلی کم سے کم مزاحمت کے راستہ سے گزرنا چاہتی ہے یعنی وہ موصل میں سے گزرنا پسند کرتی ہے۔ بمقابلہ کسی غیر موصل یا حاجز چیز کے۔ تمام دھاتیں موصل ہوتی ہیں۔ اور اسی لیے دھات کے خصوصاً تانبے کے برق ربا بناتے ہیں[1]۔ مگر علاوہ دھاتوں کے اور بھی چیزیں ہیں جو موصل۔ مثلاً کاربن اور دھواں۔ جو دھواں چمنی میں سے نکلتا ہے وہ بھی موصل ہے اس لئے بجلی کا جس وقت طوفان آئے تو آتشدان کے پاس نہ بیٹھنا چاہیے۔ بلکہ وسط کمرہ میں ایسے قالین یا دری پر بیٹھنا چاہئے جو سوکھی ہو۔ کیونکہ خشک کپڑا جہاں حاجز ہے وہاں تر کپڑا نہایت عمدہ موصل بن جاتا ہے اور اگر آپ جنگل میں ہوں اور بجلی کا طوفان آجائے یعنی یہ معلوم ہو کہ بالکل سمت الراس پر ہے تو یہ خیال رکھنا چاہئے کہ بجلی کے گرنے کا امکان آپ پر زیادہ ہے۔ ایسے وقت میں کسی اونچے درخت[2] کے نیچے پناہ نہ لیں۔ کیونکہ بلند چیز پر بجلی کے گرنے کا احتمال زیادہ ہے۔ یہ ممکن ہے کہ بعض وقت درخت پر بجلی گرے اور اسکے نیچے جو آدمی ہے وہ بوجہ براہ راست اسکی زد میں نہ آئے مگر درخت کے گرنے یا اُس کی کسی بھاری شاخ کے گرنے سے آدمی مجروح ہو سکتا ہے۔ ایسے وقت پانی سے

---

[1] تمام دھاتوں میں سب سے کم مزاحمت چاندی میں پھر تانبے میں ہوتی ہے۔ مگر چاندی چونکہ بہت گراں ہے اور مزاحمت کا فرق کم ہے اس لئے عام طور پر تانبا استعمال ہوتا ہے۔

[2] حدیث میں بھی منع ہے۔

بھیگنے کی پرواہ نہ کرنی چاہئے۔ بلکہ درخت سے ہٹ کر کھلے میدان میں آجانا چاہئے۔ اگر گھنا جنگل ہے تو اونچے درختوں کی پناہ نہ لے۔ بلکہ کسی چھوٹے درخت یا جھاڑی کی آڑ پکڑنا چاہئے۔ اگر بالکل چٹیل میدان ہو تو سواری سے اتر کر اُس کے پاس تھوڑے فاصلہ پر لیٹ جانا چاہئے۔ کیونکہ سواری نسبتاً زیادہ بلند ہے اگر کوئی گڑھا مل جائے تو گڑھے میں لیٹنا زیادہ بہتر ہے۔ بیٹھے رہنے میں بھی نسبتاً زیادہ خدشہ ہے۔ گیلے کپڑے حفاظت کا باعث ہو سکتے ہیں کیونکہ سوکھے کپڑے کے مقابلہ میں گیلا کپڑا بہتر موصل ہے۔ اگر کسی پر بجلی گرنیوالی ہے تو زیادہ امکان یہ ہے کہ وہ گیلے کپڑوں میں سے یعنی انسان کی بالائی سطح پر سے گزر جائے۔ اور جسم میں سے ہو کر نہ گذرے۔ اگر کوئی لمبی لکڑی یا برچھا ہو تو اُسے گاڑ کر اس سے قدرے فاصلے پر لیٹنا چاہئے۔ اگر لکڑی بالکل خشک ہو تو گیلا کپڑا اُس پر لپیٹ دیں کہ زمین تک پہنچ جائے بھتری جس کے ہاتھ میں ہو اُسے اسکی احتیاط ضرور رکھنی چاہئے کہ بھتری اور زمین تک صرف وہی ایک واسطہ نہ ہو۔ اگر لوہے کی ڈنڈی ہے تو اسے زمین پر لگا کر اُس کے نیچے بیٹھ جانا چاہئے۔ تاکہ اگر بجلی گرے تو تاروں میں اور ڈنڈی میں ہو کر زمین میں چلی جائے۔ یہ سب احتیاطیں صرف چٹیل میدان میں اور اُسوقت کرنی ہیں جب یہ دیکھ لے کہ بالکل سر پر بجلی برق شاخسانہ کی صورت میں چمک رہی ہے۔ اگر سر پر برق شرشف چمک رہی ہے تو پھر ان احتیاطوں کی ضرورت نہیں۔ برق شاخسانہ کی علامت یہ ہے کہ اسمیں کڑک ہوتی ہے اور اسکی شکل لہریہ دار ہوتی ہے۔

برق رباکے پاس کھڑے ہونے میں تو کچھ اندیشہ نہیں کیونکہ بجلی گرے گی تو سیدھی زمین میں پیوست ہو جائیگی مگر جس وقت بجلی کا طوفان کہیں بھی آرہا ہو تو تار کے کھنبوں سے دور رہنا چاہئے بعض اوقات گائے بھینس ریل کے کنارہ کے تاروں کے پاس مری ہوئی ملی ہیں۔ حالانکہ انکے سر پر طوفان نہیں آیا۔ بلکہ کسی دور مقام پر طوفان آیا۔ تار پر بجلی گری اور چونکہ تار بعض وقت زمینا نہیں ہوتا۔ یعنی لکڑی یا پتھر پر لگا ہوتا ہے یا لوہے کے کھمبے بھی خشک زمین پر ہوتے ہیں اس لئے بجلی بجائے زمین میں جانیکے تار میں پہنچ کر دور دور تک جو اس کے قریب ہوا ہلاک کرتی چلی گئی۔

بعض کا خیال ہے کہ جہاں ایک دفعہ بجلی گر جاتی ہے وہاں بجلی پھر نہیں گرتی۔ حالانکہ تجربہ نے بتایا ہے

کہ جہاں ایک دفعہ بجلی گر چکی ہے وہاں بجلی کے گرنیکا احتمال زیادہ ہے۔ اول تو یہ کہ ضرور اس مقام میں بادل بجلی والا بادل میں مزاحمت کم تھی جب ہی بجلی گری۔ دوسرے پے در پے کئی کئی مرتبہ بھی اسوجہ سے گرنیکا امکان ہے کہ جب بجلی گرتی ہے تو آس پاس کی ہوا میں خلا پیدا ہوجاتا ہے اور ہوا کے خلا کی مزاحمت بہت کم ہوتی ہے۔ اسی لئے اسمیں سے بجلی کے گزرنیکا آسان راستہ بن جاتا ہے۔ جہاں بجلی گرتی ہے وہاں بعض وقت تھوڑی دیر تک گندھک کی سی بو آتی ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ جب بجلی کا شعلہ پیدا ہوتا ہے تو یہ آکسیجن کے اجزا میں تغیر پیدا کر کے تین جوہروں کا ایک سالمہ بنا دیتا ہے۔ اسے اوزون OZON کہتے ہیں۔ یہ دق۔ دمہ اور پھیپڑے کے مریضوں کے لیے مفید ہے۔ اس گیس اوزون کی بو گندھک کی بو سے مشابہ ہوتی ہے۔ ورنہ بجلی میں گندھک وغیرہ کچھ نہیں۔

بعض وقت لوگ براہ راست بجلی کے صدمہ سے تو نہیں مرتے بلکہ پاس کسی مقام پر بجلی گری اور ہوا میں خلا پیدا ہوا اس خلے میں چاروں طرف سے ہوا بڑی سرعت کیساتھ داخل ہوتی ہے۔ اُسکے جھونکے میں آدمی گر جاتا ہے اور اس خوف سے کہ وہ بجلی سے گرا ہے اُس کے قلب کی حرکت بند ہوجاتی ہے اور وہ مرجاتا ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ جس نے بجلی کا شعلہ یا چمک دیکھ لی وہ کم سے کم اُس خاص ضرب سے محفوظ ہے۔ کڑک ڈرنے کی چیز نہیں ہے۔ کیونکہ کڑک چمک کا نتیجہ ہے اور اگر کسی کے پاس روک گھڑی STOP WATCH ہو اور اُسے وہ چمک ہوتے ہی چلا دے اور جسوقت کڑک ہو اُسے بند کر کے دیکھ لے کہ کتنے سکنڈ میں آواز آئی اور ۱۱۲۰ فٹ فی سکنڈ کی رفتار سے حساب لگا سکتا ہے کہ بجلی کتنی دور گری ہے۔ جہازی جنگ میں یہ روک گھڑی بھی دشمن کی توپ کا فاصلہ بتاتی ہے یعنی چمک پیدا ہونیکے بعد توپ کی آواز کے وقفہ کو ناپ کر فاصلہ معلوم کر لیتے ہیں۔

اگر کسی بدنصیب پر بجلی گر جائے تو یہ دیکھنا چاہئے کہ پورے جسم پر گری ہے یعنی جسم کے اندر سے ہو کر گزری ہے تب تو اُس کے بچنے کی امید نہیں جسکی علامت یہ ہے کہ جسم کٹ جائیگا یا سیاہ پڑ جائیگا اور درجہ حرارت جسم کا تھوڑی دیر تک بخار کا سا رہے گا۔ مگر صرف قلب کی حرکت بند ہوگئی ہو تو مصنوعی تنفس سے آدمی کے بچنے کی امید ہے۔ مصنوعی طریقہ تنفس کا فوراً شروع کر دے اور ڈاکٹر کو فوراً بلالیں۔ مگر جبتک ڈاکٹر نہ آئے

یہ ترکیب[1] کریں۔ ایسے مریض کو پہلے زمین پر اوندھا لٹا دے۔ اُس کے پاس بھیڑ نہونے دے۔ ہوا کھلی ہوتی صاف ہو۔ اگر کپڑے بھیگے ہوں تو ایک آدمی گیلے کپڑے اتار کر سوکھے کپڑے پہنا دے۔ مگر تنفس کے علاج میں دیر نہ کرے بلکہ فوراً شروع ہو جانا چاہئے۔ اوندھا اس طرح لٹایا جائے کہ دونوں ہاتھ آگے کی طرف پھیلے ہوں۔ سر ایک جانب کو جھکا ہوا دونوں ہاتھوں کے بیچ میں رہے۔ ایک شخص اُس کی کمر پر اس طرح بیٹھے کہ وہ اُس کی دونوں رانوں کے بیچ میں آجائے مگر اس پر بوجھ نہ ہو۔ اور یہ بیٹھنے والا شخص اُس کی پیٹھ کو اس طرح دونوں ہاتھوں سے سونتے کہ اُس کے پھیپھڑوں پر ایک دھمہ بوجھ ہو کہ وہ دبیں اور اُنمیں کی ہوا خارج ہو۔ اور دوسری دفعہ میں یہ سب بوجھ نیچے کی طرف کمر تک آجائے تاکہ پھیپھڑوں میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے ان میں ہوا بھر جائے۔ یہ عمل منٹ میں پندرہ بیس کی رفتار سے ہوتا رہے۔ کیونکہ انسان اسی قدر سانس ایک منٹ میں لیتا ہے۔ اگر مضروب کی بتیسی بند نہیں ہوئی ہے تو اُس کی زبان کو باہر کھینچ لینا چاہئے۔ کوئی تیز چیز مثلاً برانڈی۔ قہوہ۔ یا چائے کوشش کر کے پلا دینا چاہئے۔ مگر یہ چیزیں بہت گرم نہوں۔ اُس کے تمام جسم کو گرم رکھنا چاہئے۔ اگر آکسیجن کے سلنڈر میسر ہوں تو اُن کے ذریعے کسی ڈاکٹر کی رائے سے تنفس پہنچانا بھی مفید ہے۔

ضمناً یہاں یہ بات کہنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر کسی کے بجلی کا تار لگ جائے اور اُسکا ہاتھ کھلتا ہو جو اعصاب کے مفلوج ہو جانیکی وجہ سے نہیں کھلتا۔ اور جسے عوام کہتے ہیں کہ بجلی نے پکڑ لیا تو ایسے وقت جو شخص اُس کے قریب ہو اور مدد دینا چاہتا ہے وہ اُس برق زدہ کو سوکھے کپڑے سے پکڑ کر کھینچے مگر جسم کو ہاتھ نہ لگائے۔ ورنہ خود بھی مبتلا ہو جائیگا۔ یا کسی لکڑی کی ڈنڈی کی چھتری یا لکڑی سے اُسے اپنی طرف کھینچے۔ اگر کچھ نہو تو لات مار کر اُسے دھکا دے کر بعد میں چاہے تو معافی مانگ لے) دوپٹہ یا رومال یا رسی ہو تو اُسے پھینک کر اُس کے ذریعے کھینچے۔ لات مارنے میں یہ مصلحت ہے کہ اگر بجلی شخص مذکور میں سے بچانے والے میں سرایت کریگی تو صرف ٹانگوں میں ہی سرایت کرے گی اور چونکہ ٹانگوں میں کوئی عضو رئیس

---

[1] یہ ترکیب تنفس کی پانی میں ڈوبے ہوئے گیس سے مسموم ہوئے، مار گزیدہ۔ یا مکان میں جو بجلی کے تار لگے ہوتے ہیں اُن سے چھو کر بیہوش ہونے والوں پر بھی استعمال کیجا سکتی ہے۔

نہیں ہے اس لئے سوائے ایک جھٹکے کے اندیشۂ جان کا نہیں ہے۔ اگر ہاتھ سے کھینچے گا تو اس
ہاتھ کے ذریعہ بجلی سرایت کرے گی اور قلب میں سے ہوکر زمین میں سرایت کرے گی جس کی وجہ سے ہلاکت
کا اندیشہ ہے۔ اگر کسی کے پاس سوکھی لکڑی کی کلہاڑی ہو تو تار پر ایک ضرب لگاکر کاٹ دے کہ برقی رو قطع
ہوجائے مگر یہ دیکھ لے کہ لکڑی سوکھی ہے گیلی لکڑی میں سے بجلی سرایت کرجائیگی۔ اس کے کپڑے پکڑ کر کھینچنے
میں صرف ایک ہاتھ استعمال کریں۔ یہ تو ہر برقی انجنیر کو چاہئے کہ ایک ہاتھ ہمیشہ جیب میں رکھے۔ تاکہ اگر بجلی گزرے
تو ایک ہاتھ کے ذریعہ سے ٹانگوں میں گزرے۔ مگر ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں گزرنے میں بیچ میں دل
ہوتا جس پر صدمہ کا پہنچنا مہلک ہے۔ ہندوستان میں بعض وقت ٹرام کے تار گرجاتے ہیں اور تار کی زد
میں دو دو تین تین آدمی ایک دوسرے کو بچانیکی کوشش میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ ایسے وقت میں یہ احتیاطیں
مفید ہونگی۔

ترکیۂ جدید میں تمدنی تحریک

انیسویں اور بیسویں صدی میں ایشیائی تاریخ کی امتیازی خصوصیت وہ تمدنی تحریک ہے جو مشرق
یدیں رونما ہوئی یعنی ترکی اور جاپان میں شروع شروع میں مقصد دونو جگہ ایک ہی تھا لیکن اپنے منازلِ ارتقا
ں اس تحریک نے دونو ملکوں میں بالکل مختلف حیثیت اختیار کر لی جاپان میں اسکا نتیجہ یورپ کی مادی
رصنعتی تہذیب کو قبول کرنیکی شکل میں نکلا۔ جاپانیوں کو تھوڑے زمانہ میں جو کامیابی نصیب ہوئی اُس کی
جہ اُنکے ذہنی اور اجتماعی حالات اُنکا جغرافی موقعہ اور اُن کی مضبوط اور دانشمندانہ سیاست تھی جس نے اس
نقلاب کی اندرونی کلفتوں کو نہایت کامیابی سے دفع کیا۔ جاپانی تجارت صنعت، فوج، بیڑہ جو اسکی وجہ
سے عالم وجود میں آئے اور وہ تجارتی اور صنعتی ذہنیت جو ان تمام چیزوں کے پیچھے موجود ہے، اُس نے
رپ سے خراج تحسین وصول کیا۔ جدید جاپان کی شکل میں مغرب نے خود اپنے چہرہ کا نظارہ کیا۔

ترکی میں اس تحریک نے بالکل دوسری راہ اختیار کی جاپان میں جن داخلی و خارجی اسباب نے
ہولتیں پیدا کی تھیں انہوں نے یہاں رکاوٹیں پیدا کیں، ملک کی قومی ترکیب، قوم کی ذہنی حالت کل تمدنی
ندگی پر حاوی اور ساری مذہب، بادشاہ کی غلط استعمال ہونے والی قوت اور جغرافی موقعہ کیوجہ سے
رپ کی سیاست یہ سب چیزیں تمدنی زندگی کی تجدید اور تشکیل نو کی راہ میں حائل ہیں اور نہایت صبر اور
ستقلال سے کام کرنیکے بعد مغلوب ہو سکتی ہیں۔ اسکی وجہ سے ترقی کی رفتار یہاں بہت دھیمی رہی اور تحریک
سارا زور جو در اصل خارجی مقاصد کے لیے تھا اندر کیطرف یعنی ذہنی زندگی پر جا پڑا۔ جاپان میں یورپ
ں مادی اور صنعتی تہذیب کو قبول کرنیکی وجہ سے ملک کی معاشی حالت میں ایک انقلاب پیدا ہو گیا تھا
خلاف اس کے ترکوں کے ہاں ایک ذہنی انقلاب رونما ہوا جس کا نتیجہ ایک نیا تصور کائنات اور

حیات، ایک جدید شاعری (جس نے اس تصور کو پیدا کیا اور آگے بڑھایا) اور ایک نیا ...... مذہب نکلا۔ ہر چند اس انقلاب کے جیسے مظاہر نشاۃ ثانیہ، تحریک انسانیت اور مذہبی سدھار کی تحریک میں پائے جاتے ہیں لیکن ہمارے صنعتی عہد میں جو قوموں کی قدر کا اندازہ زیادہ تر انکی مادی کامیابیوں سے کرتا ہے اس انقلاب کو کسی نے نہیں سمجھا چنانچہ مغربی ممالک کے دوست دشمن دونوں کے لیے جدید ترکی اک معمہ ہے اہل مغرب کو ترکی میں ایک ایسی دنیا دکھائی دیتی ہے جو ہنوز قرون وسطیٰ کی تاریکی میں مدفون ہے حالانکہ مدت سے یہاں ایک نئی ذہنیت اپنی اشاعت و نفوذ کے لئے مخالف قوتوں کے خلاف زور و شور سے برسر پیکار ہے۔

اس کتاب میں پہلی مرتبہ اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ اس انقلاب کے رجحانات اور مسائل انکے ارتقاء اور نتائج کو مربوط شکل میں پیش کیا جائے۔ اسمیں یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ ترکی میں مذکورۂ بالا تصور حیات و کائنات کس طرح پیدا ہوا۔ شاعری نے کس طرح اسکی تخلیق و تشکیل کی اور بالآخر نئی ذہنیت کس طرح پیدا ہوئی جو تمام جماعتی، معاشی اور سیاسی زندگی کو از سر نو ترتیب دینے اور اسلام کی بے شمار امکانات سے ایک نئے مذہب کی تشکیل کی آرزومند ہے۔

ترکیہ جدید کی اس تمدنی تحریک کا تفصیل کیساتھ بیان دینا گویا تمدنی زندگی کے تمام شعبوں یعنی فنون و علوم، سیاست و آئین، معیشت اور جماعتی و مذہبی زندگی میں اسوقت تک کے کل نتائج کی وضاحت کرنا ہوگا۔ لیکن یہ بات اس رسالہ کے مقصد اور حدود سے آگے بڑھ جائیگی اس لیے کہ اسمیں ہمارا مقصد انیسویں اور بیسویں صدیوں میں ترکوں کی تمدنی تاریخ لکھنا نہیں ہے بلکہ اس تحریک کے مجموعی رُخ، بنیادی رجحانات اُس کے ذہنی اور روحانی مواد و مسائل کا جستہ جستہ بیان کر دینا ہے جو ترکوں کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز کر رہی ہے، اسی مقصد کو پیش نظر رکھکر مواد کو استعمال کیا گیا ہے۔ زمانی اور تاریخی ترتیب کے بجائے مرتب شکل میں مسئلہ کو پیش کرنا مقصود ہے اسی وجہ سے واقعات کے صحیح تاریخی ربط کو با صراحت پیش نہیں کیا گیا ہے۔ کل مواد کی تقسیم اور اُسکے منفرد اجزاء کی توضیح بھی یکساں نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ اہم تمدنی عناصر اور کثیر العواقب واقعات میں زیادہ تفصیل سے کام لیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نصف کے قریب رسالہ مذہبی

مسئلہ کے لئے وقف کرنا پڑا ہے۔ مشرقی انسانوں کی تقدیر زیادہ تر انکے مذاہب کی تقدیر ہوتی ہے اور اسی وجہ سے مسئلہ تمدن یہاں ہمیشہ مذہبی مسئلہ بن جاتا ہے۔ مشرقی انسان جو اپنی ذات اور اسکی حدود کا بدرجۂ اتم شعور رکھتا ہے۔ اسی شعور حدود کی وجہ سے خراب جاتا ہے کہ یہ اس کی قوت او اد ی کو فنا کرنے کا باعث ہے اس کی تہذیب باطنی کا کمال اس کی شخصیت کی کمزوری بن جاتا ہے۔ مشرقی انسان کا سکون اس کے عمق کا نتیجہ ہے، خود اسکا ارادہ عمل کی شکل اختیار نہیں کرتا۔ مشرق کی سکون پسندی کا مفہوم یہی ہے، اگر کوئی تخلیقی کام بطور تمدنی عمل کے ہوتا بھی ہے تو ضروری ہے کہ یہ دیوتاؤں کی طرف سے ہو چنانچہ جب سے ترک ایشیا کے تمدنی حلقہ میں داخل ہوئے ہیں انکا بھی یہی حال ہے۔ لہذا وہ تمدنی تحریک جس سے ہم یہاں بحث کرنا چاہتے ہیں اپنے فیصلہ کن مدارج میں پہنچکر مذہبی تحریک ہو جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ اس رسالہ کے تمام توضیحات میں اسلام کو اس درجہ دخل ہے۔

ان توضیحات کی بنیاد کس مواد پر رکھی گئی ہے؟ اس موضوع پر مغرب میں جو تھوڑی بہت کتابیں ہیں ظاہر ہے کہ انکو پیش نظر رکھا گیا ہے لیکن ان کی اتباع کا امکان نہ تھا۔

ترکیۂ جدید پر تین قسم کے لوگوں نے کام کیا ہے:- (۱) اخباروں کے نامہ نگار، سیاح قنصل خانوں کے عہدہ دار سیاسین وغیرہ یعنی وہ لوگ جو اہل علم نہیں ہیں۔ (۲) مخصوص علوم کے حامل مثلاً مورخ، مقنن، معاشی (۳) مغربی مستشرقین۔ مصنف کتاب کا خیال ہے کہ یہ لوگ جس راہ پر چلے ہیں اس پر نہ چلنا اس کے لئے جائز ہی نہیں ضروری ہے۔ پہلے گروہ کے نمائندوں سے کوئی علمی بحث کرنا بیکار ہے۔ ہرچند کہ یورپ میں انکا غیر معمولی اثر ہوتا ہے۔ شاید مستثنیات کو چھوڑ کر انکے متعلق کہا جا سکتا ہو کہ یہ لوگ جو اطلاعات دیتے ہیں وہ خود ثابت کرتی ہیں کہ انہوں نے کچھ نہیں دیکھا ہے۔ دوسرے گروہ کے علما ممکن ہے کسی اور حیثیت سے مغرب کے لئے مفید کام انجام دیتے ہوں لیکن ترکیۂ جدید کے سمجھنے میں ان سے کوئی مدد نہیں ملی۔ یہ یا تو خالص علمی تحقیقات کرتے ہیں یا یورپی اقوام کے لئے نئے نئے میدان عمل معلوم کرنا چاہتے ہیں پہلی صورت میں یہ اپنے موضوع کو تمام و کمال موجودہ یورپ کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں، اپنے معیاروں کے مطابق اس پر کام کرتے ہیں اور تاریخی ہمدردی سے بالکل مبرا ہوتے

ہیں۔ اس کے علاوہ ترکی کی کل تمدنی زندگی سے ناواقف ہوتے ہیں۔ حالانکہ اس سے واقف ہونیکے بعد ہی اسکے مختلف شعبوں کو سمجھنا ممکن ہے۔ دوسری صورت میں انکا موضوع خود کوئی جداگانہ حیثیت نہیں رکھتا ہے بلکہ تمدن مغربی کے اصول و مقاصد کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے! اور اس طرح ان علما کی تحقیق کم و بیش تحقیق نوآبادیات کا رنگ اختیار کرلیتی ہے، اس سے ملک اور اُس کے باشندوں کے متعلق معلومات بہم پہنچتی ہے اور اس معلومات کو عملی طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے لیکن یہ ترکوں کی روح اور عہد حاضر کی ذہنیت سے بہت دور رہتے ہیں۔

مستشرق ظاہر ہے کہ زیادہ ترلسانی دلچسپی رکھتا ہے اور وہ بھی حال کی بہ نسبت ماضی سے زیادہ جہانتک عام تمدن کا تعلق ہے یہ ابھی تاریخ سے آگے نہیں بڑھے ہیں کہیں پچھلے چند سالوں میں اور جرمنی کے اندر خصوصًا دوران جنگ میں انکی توجہ دورحاضر کے ترکوں کیطرف منعطف ہوئی لیکن اس میدان میں ابھی صحیح سوال قائم کرنیکی ضرورت ظاہر ہوتی ہے۔ ایک حد تک یہ لوگ بھی دوسرے گروہ کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ مستشرقین میں جو لوگ اسلام کی تحقیق میں مصروف ہیں انہوں نے ترکیہ جدید کی مذہبی تحریک میں بہت کم دلچسپی ظاہر کی ہے (اس سلسلہ میں بس ایک مارتھ آن کی کتاب جدید عثمانی شاعری کا نام لیا جاسکتا ہے)

رائج الوقت مغربی تصنیفات سے علیحدہ رائے اختیار کرنیکی ایک اور وجہ بھی ہے، مذہب سب چیزوں سے علیحدہ اپنی نشوونما اور حرکت نہیں رکھتا۔ وہ مطلق خودمختاری جو پہلے اس سے منسوب کیجاتی تھی اب اُس سے چھین رہی ہے اس لئے ضروری ہے کہ مظاہر مذہبی کو بھی تمدنی زندگی اور تمدنی تحریک کی مجموعی حالت کی روشنی میں سمجھا جائے۔ اگر یہ نقطۂ نظر اختیار کرلیا جائے تو ماضی اور حال کے تاریخی مذہب اسلام پر بڑی حد تک وہ حکم نہ لگائے جائیں جو علمائے مغرب کیطرف سے لگائے گئے ہیں وہ تقدیر پرستی جس پر اس قدر طعنے دئے جاتے ہیں۔ اسناد پر یقین، در اجتہاد کا بند ہونا۔ یہ سب چیزیں دراصل ممالک اسلامی کے جماعتی، معاشی اور سیاسی حالات سے مشروط ہیں۔ ماضی اور حال دونوں کے مسائل اسلامی پر مغربی توضیحات میں ارتقاء اور نشوونما کے لزوم کو بالکل نظرانداز کیا ہے۔ ایک

حد تک ان سب میں اسلام پر غور کرنے کا وہی قدیم کلیسائی پادریوں والا نقطۂ نظر کارفرما ہے جس کو اصولاً دورِ حاضر نے رد کر دیا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ کلیسائی اور عیسائی معذرت و تنقید کی جگہ عیسائی اور یورپی قدروں نے لے لی ہے۔

ایسی حالت میں مصنف کتاب نے اپنے کو مجبور پایا کہ وہ براہ راست ترکی ماخذ استعمال کرے اور اس طرح انکو وسیع تر حلقوں کے علم میں لے آئے۔ یہ ترکی ماخذ آخر کیا ہیں؟ چونکہ یہ کتاب پوری تمدنی تحریک کو پیش کرنا چاہتی ہے اس لئے اُس کے لئے ضروری ہے کہ علوم و فنون، آئین، معیشت، جماعتی زندگی، فلسفہ، مذہب، ان تمام شعبوں کے مظاہر کو پیش نظر رکھے۔ لیکن ایک ایسی تمدنی تحریک کے متعلق جو ابھی نشو و نما کے عالم میں ہے اور جس میں تقریباً کوئی چیز بھی ختم اور مکمل نہیں ہوئی ہے یہ کام بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ پھر قدیم تمدن کی ساخت کی وجہ سے بھی بہت سی دشواریاں پیدا ہوتی ہیں۔ ترکی علوم کوئی چیز نہیں۔ اس نام سے جو چیز موسوم کیجاتی ہے وہ تقریباً سب کی سب مغربی درآمد ہے۔ آئینی زندگی میں بڑی مشکل درپیش ہے، جدید حکومت نے نیا قانون بنایا جس کے متعلق کہہ سکتے ہیں کہ مغربی قانون سے مستعار لیا گیا ہے۔ لیکن مختلف جانب سے اسکی مخالفت ہو رہی ہے۔ قانون اسلامی جو اپنی نئی منضبط صورت میں شہری قانون ہے وہ نئی زندگی کی ضروریات کے لئے کافی نہیں ہے اور اسمیں ترمیم ہونی چاہئے۔ معیشت جدید کو بھی نئے وجود میں آنے والے افادہ گاہوں، معاشی سیاست کی کارروائیوں اور جدید معاشی قوانین کی وجہ سے ایک آخری شکل اختیار کرنی ہے۔ جماعتی زندگی میں بھی سب کچھ غیر متعین ہے۔ وہ فلسفہ بھی موجود نہیں جو کل ذہنی زندگی کو پیش کر سکے۔ مذہب بھی اپنی شکلیں بدل رہا ہے۔ اس کتاب کا مقصد جیسا کہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں یہ نہیں ہے کہ اس تحریک کے تمام نتائج اور اسکی تاریخ بیان کیجائے بلکہ صرف یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ اس تحریک اور اس کی وجہ سے جو انقلاب ہوا ہے وہ ہے کیا یعنی اُس کی ذہنی اور روحانی حقیقت، اُسکا رجحان اور اُسکے موجودہ مسائل کیا ہیں، اپنے مقصد کو اس طرح محدود کرنے سے ہمارا کام ایک حد تک آسان ہو جاتا ہے۔ اس تمدنی تحریک کی وجہ سے جو انقلاب رونما ہوا ہے وہ ایک طرف تو ایک نئے تصور

حیات وکائنات کے وجود میں آنے سے عبارت ہے اور دوسری طرف ایک نئی سیاسی اور معاشی جماعت بندی سے ۔

ریاست کی نئی تشکیل کا اظہار تو حکمراں کے فرامین سے [illegible]ء کے قانون دستور سے اور ریاست کے دوسرے اعمال سے ہوتا ہے نئے نظام معاشی کے نشو ونما کو پہلے تو افراد کے اُس معاشی رویہ میں دیکھا جا سکتا ہے۔ جو نئے تصور کائنات نے پیدا کیا ہے یعنی جلب منفعت کی نہایت قوی آرزوئیں اور دوسرے نئی حکومت کی مالی اور معاشی سیاست میں ۔ پہلی چیز کے لیے تو مصنف نے خود اپنے ملاحظات پر بھروسہ کیا ہے اور شعرا کے کلام کو ماخذ قرار دیا ہے۔ اور دوسرے کیلئے حکومت کے مالی اور معاشی قوانین اور دوسری کارروائیوں کو ۔

نئے قانون کے متعلق جو ابھی معرض تدوین میں ہے کوئی جداگانہ بحث نہیں کی گئی ہے نظام جماعت کے متعلق بھی براہ راست ابھی تک کچھ نہیں لکھا گیا ہے لیکن مذہبی مسئلہ کے متعلق کافی کتابیں موجود تھیں اور اپنی اپنی جگہ پر انکا صحیح حوالہ بھی دیدیا گیا ہے ۔

جدید تصور حیات وکائنات کے لیے شاعری میں خاص ماخذ ہے اور کہا جا چکا ہے کہ شاعری ہی نے اس نئے تصور کو پیدا کیا اور آگے بڑھایا ، اس سے آگے بڑھ کر یہ دعوےٰ کیا جا سکتا ہے کہ درحقیقت یہ سارا تمدنی انقلاب جدید شاعری ہی کا کرشمہ ہے سب سے پہلے اس میں انقلاب ہوا اور پھر یہ انقلاب تمام تمدنی زندگی پر پھیل گیا۔

یاولزن کا قول ہے کہ قومی زندگی کے بڑے بڑے انقلابات اپنا اعلان احساس جمال ، اور ذوق نظر کے تغیر کی صورت میں کرتے ہیں یہ تغیر ترکی میں اٹھارہویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے شروع میں محسوس ہونے لگا تھا یعنی اُسوقت جبکہ مغربی تمدن کا اثر ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ عاکف پاشا (متوفی ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۵ء) کے ہاں جو جدید شاعری کا پہلا علم بردار ہے اس نئے طرز کی تشکیل ہو چلی تھی ۔عاکف پاشا کسی یورپی زبان سے واقف نہ تھا اور اپنی ساری تعلیم کے لئے خود اپنے وطن کا مرہون منت تھا، اُس نے ترکی ادب کے جمود اور تعطل کا خاتمہ کرنا چاہا ، اس نے ایک نئی زبان میں لکھنا شروع کیا اور ایک حد تک شاعری بھی کی اور اُسکے بعد آنے والے زمانہ میں اک نئی ذہنیت کی روشنی اپنا پرتو دکھانے لگی جہاں ابتک موت وآخرت کی قصیدہ خوانی تھی، وہاں اب یکایک تازہ وخوش آئند آوازیں قوم کو عمل اور تاثر کی حقیقت آشنا زندگی کی دعوت دینے

لگیں، اور یہ بات محض اتفاقی ہی نہ تھی۔

میں ابھی کہہ چکا ہوں کہ ترکی فلسفہ کا کوئی وجود نہیں۔ عربی اسلامی تمدن کا تاریخ میں جو حشر ہوا وہ تمام اسلامی اقوام کے لئے سخت مصیبت ثابت ہوا ہے۔ ان لوگوں نے یونانی فلسفہ کو لے لیا تھا اور اسلام کے اصولوں سے اسکی تطبیق کی کوشش کرتے تھے یا کہیں کہیں تھوڑا بہت خود اس فلسفہ سے بھی شغف رکھتے تھے جو چیز مذہب کے بالکل برسر ہوتی وہ مذہب کی دشمن تھی اور اس لئے اہل دین کے نزدیک اُسے وجود کا حق حاصل نہ تھا۔ جو چیزیں اسلام کے موافق ہوتیں وہ پھر فلسفہ نہ تھیں۔ اس کے بعد ایک زمانہ آیا جس میں وہ لامتناہی ذہنی جنگ شروع ہوئی جو کہیں اب جا کر ختم ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس زمانہ میں فلسفہ بے دینی کا مرادف تھا۔ مدرسوں کے نصاب میں منطق تک کو سمجھا جاتا اور شبہ کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا اور نہایت احتیاط سے اسکی تھوڑی تھوڑی خوراکیں پہنچائی جاتی تھیں لیکن خود اپنے فلسفہ کا نہ ہونا یہ معنی نہیں رکھتا کہ ہر قسم کی فلسفیانہ فکر معدوم تھی۔ تصوف نے شاعری کو آلۂ کار بنالیا تھا اور شعر کو علم و عرفان کا ذریعہ مقرر کیا اور یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ مشرق میں شاعری ہمیشہ سے ذہنی زندگی کی حامل رہی ہے یہی وجہ ہے کہ شاعر فلسفی ہوتے تھے اور فلسفی شاعری کیا کرتے تھے۔

اسی رجحان کا اثر عثمانی ترکی شاعری پر ہمیشہ رہا ہے اور اب بھی واقع ہے۔ ترکی عثمانی ادب کی تاریخ کے شروع میں ہمیں شاعری میں تعلیمی نظم ہی غالب صنف نظر آتی ہے۔ شروع کے شاعر جان بوجھکر اس لئے شعر کہتے ہیں کہ اپنی قوم کو کچھ سکھائیں۔ اسی تاریخی حیثیت میں ترکی شاعری کو دور جدید میں ایک تمدنی مشن سپرد کردیا۔ وہ شاعری جو پہلے رائج الوقت اور رفتہ رفتہ بے جان خیالات کی حامل تھی اُس کے ذمہ اب یہ کام ہوا کہ وہ کل تمدنی زندگی کو ایک نئی شکل دے۔ اُس نے اپنا یہ فرض نہایت کامیابی سے پورا بھی کیا۔ اس طرح ترکی شاعری ترکوں کی ذہنی زندگی کا صحیح آئینہ ہے اور اسی وجہ سے جدید تصور کائنات کی تحقیق کے لئے یہی ایک خاص ماخذ ہے۔ یہ بات جدید شاعری کی فرنگی پسند شاخ کے متعلق بھی کہی جاسکتی ہے۔ ہر چند کہ اُس میں ترکی شاعری کی تاریخی روایتی، تمدنی مقصد کو اصولاً ترک کردیا ہے۔

جدید عثمانی ترکی شاعری میں سے میں نے بالالتزام اِن لوگوں کے کلام کو پیش نظر رکھا ہے۔ اسماعیل

اور عبد الحق حامد ۲۔ توفیق فکرت ۳۔ ضیا گوک الپ اور محمد امین ۴۔ محمد عاکف۔ ان ناموں کے انتخاب کی وجوہ بیان کرنا ہمیں بہت دور پہنچا دے گا۔ اس لیے اگرچہ جی نہیں چاہتا تاہم میں اُس سے گریز کرتا ہوں۔ اس کے بجائے میں مختصر طور پر اُس حیثیت کو بیان کئے دیتا ہوں جو ان مصنفوں کو اس نئی تمدنی تحریک میں حاصل ہے جس کے یہ حامل ہیں۔

نامق کمال (۱۸۴۰ء - ۱۸۸۸ء) خود ایک حد ہے، یہ خالص اسلامی ترکی تمدن کے اساس پر قائم ہے اور اسے زندہ رہنے کے قابل اور قائم رکھنے کے لائق سمجھتا ہے یہ اسے خوب جانتا ہے اور اسلام کی تاریخی شکل کا منکر ہے۔ اس نئے احساس کی وجہ سے جو اُسکے اندر بیدار ہے وہ دورِ حاضر سے بیزار ہے اس لئے اس کی نظر ایک طرف تو قدیم اور اصلی اسلام پر لگی ہوئی ہے جس کی نئی تفسیر کرنیکی کوشش اُس نے متعدد کتابوں اور مضمونوں میں کی ہے اور دوسری طرف آلِ عثمان کی قدیم تاریخ پر جسے اُس نے خود کئی جلدوں کی ایک کتاب میں پیش کیا (عثمانی تاریخی غیر مطبوعہ) اپنی ان ادبی سرگرمیوں میں وہ اپنے جدید تصورِ کائنات کا بھی اعلان کرتا ہے اور اس طرح عہدِ قدیم کی حدود سے آگے بڑھ جاتا ہے، اسلام کا نام لیکر وہ دنیا سے بیزاری دنیا سے نفرت اور کاہلی کے خلاف جہاد کرتا ہے اور لوگوں کو عمل کی اور حیات و کائنات کو قبول کرنیکی دعوت دیتا ہے۔ وہ استبداد کا تباہ کن دشمن ہے اور حریتِ انسانی کا علمبردار ہے، عثمانی وطن کا تصور اسی سب سے بڑے ترک محبِ وطن کی تخلیق ہے۔ اُسکی ساری زندگی اور اُسکی ساری سرگرمی قوم کے لئے ہے، "سچی حکومت قوم کی خدمت کا نام ہے"[۱] یہ فنونِ لطیفہ، زبان سب کچھ اُس کے نزدیک بس اس عظیم الشان مقصد عظیم کے حصول کا ذریعہ ہیں جس کے حصول کی آرزو میں وہ بیتاب ہے "اگر میں اپنی قوم کی اُس بہار کو دیکھے بغیر مرجاؤں جس کی امید میں جیتا ہوں تو میرے لوحِ مزار پر لکھدینا، 'وطن سوگ میں ہے اور میں بھی سوگ میں ہوں'"[۲] یہ مغرب سے بھی واقف ہیں اور مغرب کی تمدنی ترقیاں یہی نہیں کہ کچھ کچھ اسلام سے مطابق ہوتی ہیں بلکہ جہاں تک اسلام اُنکی اجازت دیتا ہے یہ خود اسلام کی مطمحِ نظر ہیں یہی وجہ ہے کہ اپنی زوردار

---

[۱] منتخبات بدائع ادبیہ مرتبہ ابوالقرلوزادہ رضا صفحہ ۱۹

[۲] ایضاً . . . . صفحہ ۲۴۳

اشتعالی تحریروں میں وہ ہمیشہ صرف اسلامی خیالات اور عثمانی روایات کو بنیاد قرار دیتا ہے اور اپنے تمام خیالات کو اسلامی اصولوں سے اخذ کرتا ہے اور آگے بڑھتا ہے۔ اُسکا مذہب کا تصور خالص اسلامی ہے اور اُسکا تفکر و احساس بھی، اپنے قومی تمدن کے اصول اساسی کے سہارے ہے۔ اس انقلابی اور اشتعالی شخصیت نے جو غیر معمولی قوت اور مضبوط ارادے سے متصف تھی اپنی ادبی اور بعد میں آنیوالی نسل پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔ کمال کوئی بہت بڑا اہل فن نہ تھا لیکن اُسکا اثر اُس ذہنیت کی وجہ سے تھا جو اُس کے فن میں جاری و ساری تھی نظم میں یہ قدیم استادانہ طرز کا متبع تھا لیکن نثر میں اُس نے ایک نئی زبان پیدا کی اور اسے اپنے نئے خیالات کا حامل بنایا۔ وہ نئی ذہنیت جو انیسویں صدی کے آغاز سے اندر اندر تیار ہو رہی تھی اور جو نامق کمال کی ذات میں آکر ظاہر ہوئی، اُس نے نامق کے معاصر اور دوست عبدالحق حامد میں اپنا فنی کمال حاصل کیا، حامد ابتک زندہ ہے اور بعد میں آنیوالی تمام تبدیلیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہے

عبدالحق حامد (سال پیدائش ۱۸۵۲ء) مختلف عناصر کا ایک ترکیبی مجموعہ ہے۔ اس نے اپنے تجربہ زندگی میں اسلام اور ترکوں کے ماضی کو پھر زندہ کیا ہے مستقبل کی تشکیل کی ہے۔ اور ان دونوں کو اپنی ذات میں یکجا کر لیا ہے۔ قدامت اس کی ذات میں آکے اپنی زندگی گزارتی ہے لیکن قدیم نہیں معلوم ہوتی جدت نے اسمیں اپنی تکمیل حاصل کی ہے لیکن جدید نظر نہیں آتی۔ اپنی عظمت اور زور کے باوجود نامق کمال کا کام ایک جزوی کام ہے۔ یہ جزئیات میں بہت زیادہ پھنس جاتا ہے اور جھگڑوں میں اپنے کو کھو دیتا ہے اسکا فن اور اُس کی شاعری زندگی میں جاملی ہے۔ حامد بر خلاف اس کے سرتاپا اہل فن ہے۔ کمال کی بے چینی اور سیماب وشی کا اسمیں کہیں پتہ نہیں۔ وہ ایک پرسکون صاحب فکر اہل فن ہے۔ اسکی اصل زندگی فن اور شعر میں جاکر مل گئی ہے۔ اس کے لئے اپنا فن زندگی ہی کی ایک شکل ہے بلکہ خود زندگی ہے کمال نے ایک دفعہ اسپر اعتراض کیا کہ تم بزدل ہو تو اُس نے ذیل کے الفاظ میں جواب دیا "آپ مجھپر الزام لگاتے ہیں کہ میں بزدل ہوں۔ نہیں میں بزدل نہیں۔ میں کچھ پرسکون ہوں۔ لیکن میرا سکون مستقل نہیں وقت آئیگا تو آپ دیکھ لینگے کہ مجھ میں غصہ بھی ہے اور گرمی بھی۔ استبداد کے خلاف میں نے جو کچھ کہا ہے

اس میں تو بزدلی کا پتہ بھی نہیں۔ کہیں یہ نہ سمجھئے کہ جو راہ آپ نے کھولی ہے اس پر میں نہ چلونگا یہی میری راہ
بھی ہے[1]۔ یہ اپنی تصانیف میں دور حاضر سے آگے بڑھ گیا ہے اور انہیں استقلال کی تفسیر کرتا ہے۔ حال
کی سیاسی بے چینیوں۔ حماقتوں۔ اور ناکامیوں سے وہ اپنے سکون میں حرج واقع نہیں ہونے دیتا۔ اپنے فن و
شعر میں کسی چیز کو پورا کر لینا اس کے نزدیک اصلی حقیقت ہے۔ حامد کا ایک دوست یعنی مشہور شاعر اور نظری
عالم اس کے نام ایک خط لکھتا ہے جس میں اس بات کی شکایت ہے کہ قوم میں فن اور شعر کے سمجھنے کی صلاحیت
نہیں ہے۔ حامد اس بات سے افسردہ نہیں ہوتا اور جواب میں لکھتا ہے: "تم کہتے ہو کہ یہ قوم فن کی حقیقی
ماہیت کو نہیں سمجھے گی، یہ بڑے افسوس کی بات ہے لیکن اس سے ہوتا کیا ہے ہمیں چاہئے کہ قوم کا کچھ خیال
نہ کریں اور اپنی راہ چلیں۔ حقیقی فن اس بارہ میں وجود الٰہی کی طرح ہے کہ اس کے کام اور اثرات تو ظاہر
اور آنکھوں کے سامنے ہیں لیکن وہ خود چھپا ہوا ہے اور آنکھوں سے اوجھل ہے[2]۔" حامد ترکی اور اسلامی
عہد گزشتہ کی جیتی جاگتی تصویر ہے لیکن اسکی ذات سے نئے تصور کائنات وحیات کی شاعرانہ ترجمانی
بھی ہوتی ہے۔

حامد رومانی ہے یعنی انیسویں صدی کی مغربی رومانیت کا شاگرد ہے۔ یہ تعلق اس کے لئے بڑا
اہم تعلق ثابت ہوا ہے۔ یہ ترکی تمدنی زندگی کی تشکیل کرنیوالا اپنے فن میں بھی بڑا صناع ہے بلکہ اسکا
سب سے بڑا مجدد۔ قدیم ترکی شاعری کیطرف اسکا رویہ وہی رومانی ہے جس طرح مغربی رومانیت نے
عہد قدیم سے تعلق توڑا اور پرانے آئین صور کو چھوڑا اسی طرح حامد نے فارسی اور عربی اثر کو ختم کیا جسکی حیثیت
ترکی فنون لطیفہ کے لئے وہی تھی جو قدیم یونان و روما کی مغربی فنون کے لئے اس نے قدیم طرز بیان کی پابندیوں
کو چھوڑا اور اس طرح ترکی شاعری کو موت سے نجات دی۔ اسکی یہ کوشش مطالبہ وقت کی اتنی مطابق
تھی اور زمانہ نئی شکلوں کو اس طرح ڈھونڈ رہا تھا کہ حامد جلد کامیاب ہو گیا۔ حامد پر مغربی رومانیت ہی کا ایک
اثر نہیں ہے بلکہ اور بہت سی مشابہتیں بتائی جا سکتی ہیں۔ مغربی رومانیت میں جو حیثیت ایک کامل خیالی

---

[1] مکتوبلر۔ جلد ۱ صفحہ ۱۰
[2] مکتوبلر صفحہ ۱۳۹

یونانی عورت کی تھی وہ حامد کے ہاں اندلسی عرب خاتون کی ہے۔ وہاں جو حیثیت قرون وسطیٰ کی تھی وہ یہاں اسلام اور آلِ عثمان کے عہد قدیم کی ہے۔ رومانیوں میں قومی دلچسپی کے ساتھ جو دلچسپی تھی وہ اس کے ہاں یوں ظاہر ہوتی ہے کہ اس نے سب سے پہلے شاعری میں ترکی قومی بحر کا استعمال کیا۔ رومانیت کے تصور کائنات نے اس پر اپنا اثر ڈالا ہے اور رومانی ہجو ملیح بھی اسکی شاعری کا ایک جزو ہے۔ اس رومانی اثر نے شاعر پر اور بعد کے حالات پر کیسا ہی مفید اثر ڈالا ہو اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس سے نقصان بھی پہنچا ہے اور بعض دوسرے عناصر سے مل کر جن کا ذکر یہاں نہیں کیا جا سکتا اس کے جذبۂ حیات کو مکدر کر دیا ہے اور اس کے تصورِ حیات و کائنات میں الجھنیں پیدا کر دی ہیں۔

اس کے نزدیک بھی شاعری عظیم الشان قومی مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ یہ ضرور ہے کہ بجائے خود زندگی کی ایک شکل ہونیکی وجہ سے اس کو ایک گونہ خود مختاری حاصل ہوجاتی ہے لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کسی اعلیٰ تر مقصد کے لئے اسے بطور ذریعہ استعمال کرنا حامد خوب سمجھتا ہے۔ البتہ اس کے بعد آنیوالے فرنگی دوستوں نے اس معاملہ میں اس سے علیحدگی اختیار کی ہے اور یہ اصول اختیار کیا ہے کہ فن کو فن کی خاطر ہونا چاہیے۔

اس مغرب پسند جماعت کا خاص نمائندہ توفیق فکرت ہے (۱۸۶۸ - ۱۹۱۴ء) فکرت کی ذات ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیلی لینے کی منزل ہے، وہ قدیم بنیادیں جس پر حامد اور کمال مضبوطی کے ساتھ کھڑے تھے اس کے پیروں تلے متزلزل ہو چلی ہیں۔ قدامت ختم ہوگئی ہے اور فکرت کے ساتھی اس سے اپنا رشتہ کاٹ کر مغربی خیالات کے سیلاب میں آ پھنسے ہیں، کمال اسکا دشمن تھا اور حامد جنکے مقابلہ میں اپنی ہستی کو قائم رکھتا تھا فکرت کے ہاں دنیا سے نفرت اور یاس مشرقی پائی جاتی ہے یہ بدہ کی بڑی عظمت کرتا ہے مگر چہ اس نے آخر میں اسکو مغلوب کر لیا ہے، سطحی نظر سے دیکھو تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ نئی ذہنیت جس نے کمال اور حامد کی ذات میں ظہور کیا تھا فکرت اور اس کے دوستوں میں آکر ضائع ہوگئی لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا زمانہ بھی دراصل بحث و نزع کا زمانہ تھا کیونکہ انکے طرزِ خیال اور طریقہ احساس کے باوجود یہ جدید ذہنیت انکی نظموں میں برابر جھلکتی ہے اور ہم آگے چلکر کمال

اور حامد کے ساتھ اکثر فکرت کا نام بھی پائینگے۔

ضیا گوک الپ (سال ولادت ۱۸۷۵ء) مغرب پسندی کے خلاف ایک ردعمل ہے یہ ایک متلاشی حق ہے اور اہل نظر وہ عظیم الشان اتحاد ترکیبی جو حامد کی ذات میں ظاہر ہوا تھا مغرب پسندی کے عہد میں اسمیں انتشار پیدا ہو گیا۔ اس میں جو کچھ قدیم چیزیں تھیں انکو لوگوں نے غلط سمجھکر چھوڑ دیا تھا اور جو کچھ نئی تھیں انکی تکمیل اور انکا حصول ابھی باقی تھا۔ تاریخ کا رشتہ ٹوٹنے کی وجہ سے ایک عام ہیجان پیدا ہو گیا تھا۔ ضیا نے اس حقیقت کو پہچانا اور کوشش کی کہ ایک نیا اتحاد ترکیبی پیدا کر کے اس ہیجان کو رفع کرے۔ چنانچہ ترکی قومیت کا خیال وجود میں آیا۔ اسکے متعلق ہم آگے چلکر دیکھیں گے کہ عثمانی ترکی زمین پر پہلے سے اس کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ضیا نے صرف اس کی ترجمانی کی اور اس کا مطمح نظر قائم کیا۔

محمد امین (سال ولادت ۱۸۶۹ء) طبقہ عوام کا ایک مدرس ہے یہ ترکوں کے قدیم کارناموں، انکے دکھ درد اور مصیبتوں اور جس مستقبل کی یہ امید رکھتے ہیں اسکا گیت گاتا ہے۔ اس کا اصلی مقصد اپنی قوم کے تمام طبقوں میں روشنی پھیلانا ہے۔ نئے خیالات اس کے پاس نہیں ہیں لیکن یہ اپنے زمانہ کی سچی تصویر ہے اور اس کے خیالات و خواہشات کی ایک خاص شکل میں ترجمانی کرنا خوب جانتا ہے اس لئے ان خیالات او خواہشات کا اُس کے ہاں مطالعہ کرنا دلچسپی سے خالی نہیں۔

محمد عاکف (سال ولادت ۱۸۷۳ء) اُن تمام تغیرات کا بہت اچھا نمونہ ہے جو اس کتاب کا موضوع ہے۔ اسکا باپ ایک قدیم طرز کا عالم ہے یعنی عالم دین۔ باپ نے قدیم طرز پر لڑکے کو تعلیم دی ہے اور عاکف اُسی قدیم ذہنیت اور قدیم تصورات کی دنیا میں رہتا ہے ہرچند اُسکی فصل نئی ہے۔ لیکن اس کی ابتدائی نظموں میں بھی عہد قدیم کی فضا پائی جاتی ہے۔ یہ کمال اور حامد کی بڑی عزت کرتا ہے اور مغرب پسندی کا نہایت شدت کیساتھ مخالف ہے لیکن خود ان ابتدائی نظموں میں ایک اندرونی تغیر کے آثار پائے جاتے ہیں یہ تغیر تھوڑے ہی عرصہ میں پورا ہو جاتا ہے اور عاکف قدیم ترکی ایرانی شاعری اور خصوصاً متصوفانہ شاعری سے بالکل جدا ہو جاتا ہے، مغرب پسندی کیطرف چلا جانا اُس کی کیفیات دماغی کے

اعتبار سے بالکل ناممکن ہے، حامد اور کمال اور سب سے زیادہ مصری محمد عبدہ اور فرید وجدی کے زیر اثر یہ ایک نئی راہ نکالتا ہے اور جدید تصور کائنات وحیات سے آگر یوں ملتا ہے کہ دنیا کو عمل اور عمل کو فرض مانتا ہے۔ اسکی شخصی نشو و نما کے یہ منازل گویا کل ترکی قوم کے ارتقا کے منازل ہیں اس لئے کہا جا سکتا ہے یہ شخص ترکوں کی نئی دنیا کے لئے ایک کائنات عمل کی حیثیت رکھتا ہے۔

ضیا اور امیں میں آکر شاعری نے پھر اپنا تاریخی تمدنی فرض اختیار کر لیا ہے، عاکف کے ہاں تو یہ چیز خاص طور پر دکھائی دیتی ہے۔ وہ اس کے متعلق ایک جگہ لکھتا ہے " میں اب بھی صوفیوں مثلاً حافظ وغیرہ کے کلام کو نہایت لطف سے لے کر پڑھتا ہوں۔ لیکن یہ میں جان گیا ہوں کہ ان شاعروں کے خیالات انسان کو مادی زندگی سے دور کرتے ہیں اور اس کے احساس فرض کو تلف کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسے فن کا پھل ہیں جو جمود اور زوال کے بدنصیب عہد میں عالم وجود میں آیا یہ آدمیوں پر مخدر کی طرح، افیون کی طرح اثر کرتے ہیں لیکن اسکی تو ہمیں ضرورت نہیں۔ میری نظر تو مجھکو یقین دلاتی ہے کہ ہمیں ایک زندہ صحیح اور ذوق عمل پیدا کرنے والے ادب کی ضرورت[1] ہے " یہ ان مغرب پسندوں کی شاعری پر بھی ایسا ہی حکم لگاتا ہے جو فن کی خاطر فن کا خالی اصول دُھراتے ہیں۔ عاکف نو لکلث ہم خیال ہے کہ فنون لطیفہ کو اہم اغراض تمدنی کیلئے بطور ذریعہ کے استعمال کیا جا سکتا ہے اور تاریخ تمدن کے نقطۂ نظر سے یہ برکت ثابت ہوتی ہے اسمیں شک نہیں کہ وہ اس خیال میں ذرا مبالغہ سے کام لیتا ہے اور شاعری اُسکے منظوم وعظ کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور اُسکا شاعرانہ اثر زائل ہو جاتا ہے۔ یہ بھی مختلف عناصر کو ایک نئی ترکیب دینا چاہتا ہے جو ضیا کی ترکیب سے بہت مختلف ہے۔ یہ اُس تحریک کا شاعر ہے جسے ہم نے بعد کو تحریک اصلاح کے نام سے موسوم کیا ہے یہ ایک مصلح ہے اور اس قسم کا اخلاقی ناقد جیسے شونگلی۔ یہ شعراء جو اکثر ایک دوسرے کی ضد معلوم ہوتے ہیں دراصل ایک مسلسل ارتقا کی کڑیاں ہیں، انکی تصانیف نئی ذہنیت کے مختلف حصوں کی حامل ہیں جن سے آگے چلکر آخری ترکیب ہو گی۔

یہ تمدنی تحریک شروع کب ہوتی ہے؟ میں یہ سوال اس جگہ چھیڑ نہ کرتا اگر اس کا بہت قریبی تعلق

---

[1] یہ عبارت شاعر نے ۱۹۱۱ء میں خود لکھوائی تھی

ایک دوسرے سوال سے یعنی اس تحریک کے اسباب کے سوال سے نہ ہوتا۔ اس دوسرے سوال کا جواب لوگ نہایت تیقن کیساتھ یہ دیتے ہیں کہ ساری تحریک کا سبب مغربی تمدن کا اثر ہے اس جواب میں یقیناً کچھ حقیقت ہے لیکن جو شخص ترکوں کی سیاسی نہیں بلکہ ذہنی زندگی سے اچھی طرح واقف ہے اسکو اس جواب سے تشفی نہیں ہوسکتی۔ سلطنت عثمانی کی تاریخ ایک مخصوص تمدن کے پیدا ہوتے۔ پھلنے پھولنے اور زوال پذیر ہوجانیکی تاریخ ہے۔ یہ تیرہویں صدی میں شروع ہوتی ہے اور سولہویں صدی میں کمال کو پہنچتی ہے۔ سترہویں صدی میں زوال شروع ہوتا ہے۔ لیکن ذہنی اعتبار سے وہ زوال اٹھارہویں صدی میں ختم ہوجاتا ہے۔ سیاسی اور معاشی انحطاط تو آجتک جاری ہے لیکن ترک جب انیسویں صدی میں داخل ہوتے ہیں تو ایک نئی ذہنیت کے ابھرتے ہوئے عناصر ساتھ لیکر داخل ہوتے ہیں۔ قدیم ترکی شاعری جس کے لئے اٹھارہویں صدی سب سے زیادہ قحط کا زمانہ ہے اس کے تمام امکانات ختم ہوچکے تھے، انیسویں صدی کے شروع میں ایک جدید شاعری کے ابتدا کے شواہد ملتے ہیں (یعنی عاصم مترجم قاموس متوفی ۱۲۳۵ھ/۱۸۱۹ء اور عاکف پاشا متوفی ۱۲۶۴ھ/۱۸۴۸ء کے کلام میں) ذہنی تجدید کی خواہش یہاں پہلے سے موجود ہے پیٹر اعظم اور کاتھرینا ثانی کے زمانہ میں اُس کی ترقی اور مختلف جنگ کے میدانوں میں دول یورپ سے مقابلہ میں ترکوں کو مغربی قوموں کی قوت سے آگاہ کیا قبل اس کے کہ وہ اُنکے تمدن کے متعلق کچھ جانتے اس نئی دنیا کی ضروریات کے لائق ہونیکی خواہش نے ان میں، سیاسی تجدید کا عزم پیدا کیا جو اگرچہ موجود تو پہلے سے تھا لیکن جسے اپنا سب سے دانشمند اور مضبوط حامی سلیم ثالث (۱۷۸۹ – ۱۸۰۷ء) کی ذات میں نصیب ہوا۔ اب یہ بات بدیہی تھی کہ ترکوں کی نظر یورپین تمدن پر پڑتی۔ اس کے ساتھ ساتھ اور چیزیں بھی محرک ہوئیں۔ انپر تفصیل سے بحث کئے بغیر میں صرف ان کل اسباب کو میں ذیل میں درج کئے دیتا ہوں۔ ان اسباب کی دو تقسیمیں کی جاسکتی ہیں۔ (۲) داخلی (ب) خارجی۔ داخلی اسباب یہ تھے (۱) قدیم نظام فوجی کا ٹوٹنا اور سیاسی قوت کا زوال جو اٹھارہویں صدی میں لشکر کی ترتیب نو کا باعث ہوا۔ سلیم ثالث نے اس معاملہ میں بنیادی تغیر کرنا چاہا اور بالآخر اُسکی خاطر اپنی جان دی لیکن محمود ثانی نے ۱۸۲۵ء میں لشکر کے قدیم منصب داری نظام کو ختم کرکے قومی لشکر کی بنیاد ڈالی جس نے بعد میں

چلکر بہت اہم نظام حیثیت اختیار کی۔

(۲) بڑے بڑے علاقوں کا ہاتھ سے نکل جانا جو قدیم سلطنت کے لئے بمنزلہ نو آبادیوں کے تھے اور معاشی زوال۔ ان واقعات کیوجہ سے ایک قومی تجارتی سیاست معاشی کی بنیاد پڑی جس میں نئے لشکر کی ضروریات کو پورا کرنا ایک خاص مقصد تھا

(۳) قدیم نظام ریاست اور عملہ نظم ونسق کا حالات کے اعتبار سے ناموزوں ہونا۔ قدیم ریاست میں جذبۂ سیاسی، معاشی اور تمدنی کاموں کی صلاحیت نہ تھی۔ قدیم فوجی اور انتظامی نظم کو ہٹا دینے کے بعد ضروری تھا کہ سلطنت کو از سرِ نو منظم کیا جائے اور ایک مرکز پر لایا جائے۔ ان اسباب نے جدید نظام ریاست پیدا کیا۔

(۴) تمدن قدیم کی ان ذہنی بنیادوں کی تباہی جو قدیم معیشت اور سیاست پر قائم تھیں اسکا نتیجہ تعلیمی الجھنوں کی شکل میں نکلا جو روز بروز اور مشکل ہوتی گئیں۔ مدارس، کتب خانے، اوقاف سب پر زوال آیا۔ یا تو معاشی حالات اور پیہم جنگوں کے باعث انکا قائم رکھنا ناممکن ہوگیا یا انہیں وہ پہلی سی قوت جذب باقی نہ رہی۔ قدیم تعلیمی مطمح نظر کی قوت بھی جاتی رہی چنانچہ ریاست نے نئے مدارس کھولے، ایک نئی یونیورسٹی اور ایک اکادمی جنہیں علوم نو کو رواج دیا گیا۔ ؎۵

خارجی اسباب یہ تھے:۔

(۱) مغربی سرمایہ داری کی توسیع (۲) ترکی کے خلاف یورپ کی تباہ کن سیاست (۳) مغربی تمدن کا علم اور اسلام اور ترکوں پر یورپی نکتہ چینی۔

مذکورہ بالا دو قسم کے اسباب میں سے کسی ایک کو فیصلہ کن اہمیت دے دینا ٹھیک نہ ہوگا۔ پہلے اسباب کے بغیر دوسرے بے اثر رہتے اور دوسروں کے بغیر پہلوں کی تشریح کم و بیش نہ ہو سکتی۔ ہر جگہ دونوں ہی قسم کے اسباب برسرِ کار معلوم ہوتے ہیں لیکن یہ ضرور بتانا چاہئے کہ اولیت اندرونی اسباب ہی کو حاصل ہے۔

دوسرے واقعات بطور اسباب زوال پیش نظر آسکتے ہیں (مثلاً جنگیں مختلف اشخاص کا حشر وغیرہ) وہ دراصل مخصوص حالات ہیں جن سے مذکورہ اسباب کے عمل میں روک پیدا ہوئی یا مدد ملی خود انہیں کوئی فیصلہ کن اہمیت حاصل نہیں۔

آخر میں دو باتیں اور کہنا چاہتا ہوں۔ اول یہ کہ اس کتاب کا موضوع ترکیا اور وہ بھی جدید ترکیہ ہے

؎۵ عبدالرحمٰن شرف کی کتاب تاریخ دولت عثمانیہ جلد ۲ - تمہ۔

اسکو ایک تو قدیم عثمانیوں سے الگ کھنا چاہئے اور دوسرے اسلام من حیث الکل سے۔ اس معاملہ میں خود اہل علم کے یہاں ایسی گڑبڑ ہے کہ فہم اور علم میں حارج ہوتی اور انہیں مکدر کرتی ہے۔ ترکیہ جدید بہ حیثیت نئی چیز کے بجائے خود نظر کرنی چاہئے۔ قدیم ریاست اور قدیم تمدن تو اب ختم ہو چکا۔ جو چیز ہمارے سامنے ہے وہ بن رہی ہے، ابھی کوئی چیز تیار ہو کر ختم نہیں ہوئی۔ بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی چیز ابھی ابتدائی مراحل سے بھی آگے نہیں بڑھی ہے۔ اگر اس سب کو قدیم حالات ہی کا تسلسل سمجھا جائے تو غلطی ہوگی نیز یہی وہ نہیں کہ جدید ترکیہ یا خود ترکیہ کو کل اہل اسلام نقطہ نظر سے دیکھا جائے (اور پھر ظاہر ہے کہ کل مشرق کے نقطہ نظر سے تو اور بھی نہیں۔ لیکن افسوس کہ یہ غلطی ایسی بھی ہے کہ اکثر تو نہیں معلوم ہوتی) مسلم اقوام میں تو جتنی ترک، ایرانی، عرب جو ٹی پر ہیں جماعتی و معاشی ساخت فوجی تعلیم، عام تربیت، زمین پر بسنے کے طریقوں، وسائل آمد و رفت انتظام ریاست اور قانون کے اعتبار سے اتنی بھی یکسانیت نہیں ہے جتنی اقوام مغرب میں۔ دوسرے میں پھر ایک مرتبہ ترکوں پر مغربی تمدن کے اثر کا ذکر کرنا چاہتا ہوں یہ تاریخ تمدن کا ایک پیچیدہ مسئلہ ہے جو چند جملوں میں حل نہیں کیا جا سکتا جیسا اوپر کہا جا چکا کہ لوگ اس اثر کے اندازے میں مبالغہ سے کام لیتے ہیں۔ مغربی خیالات کا اثر ایک طرف تو تعلیم اور حرکت پیدا کرنے کا باعث ہوا لیکن دوسری طرف تباہ کن اور مضر اور یہ مسلم ہے کہ ترکوں میں آج جو ذہنی بےچینی عام ہے وہ بڑی حد تک اسی کا نتیجہ ہے۔ لیکن تحریک تمدن میں ترک بس اس حد تک آگے بڑھے ہیں جہاں تک انہوں نے خود تخلیقی کام کیا ہے۔ جن بڑے آدمیوں نے اس تحریک میں کچھ کام کیا ہے وہ یا تو مغرب سے بالکل متاثر نہیں ہوئے ہیں یا پھر انہوں نے جلدی اپنے کو مغربی اثر سے آزاد کر لیا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ مغرب پسندی ختم ہو چکی ہے جذبہ قومیت اور اصلاح اسی کا ردعمل ہیں۔ اب تک جو خیالات اور افادہ گاہیں یورپ سے مستعار لی گئی ہیں انہیں آخری چیز نہیں سمجھنا چاہئے۔ انکی حیثیت بس عارضی اور اکثر ناکام کوششوں کی سی ہے۔ اب تک ہر چیز غیر متعین ہے۔

دو گز زمین

(۱)

بڑی بہن اپنی چھوٹی بہن سے ملنے گاؤں آئی۔ بڑی بہن کی شادی شہر میں ایک دوکاندار سے ہوئی تھی چھوٹی کی گاؤں میں ایک کسان سے۔ دونوں بہنیں بیٹھی چاء پی رہی تھیں کہ بڑی نے شہری زندگی کی بڑائیاں شروع کیں۔ کیسے آرام سے رہتے ہیں۔ کیسے کیسے کپڑے پہنتے ہیں، اسکے بچوں کے پاس کتنے اچھے اچھے لباس ہیں، تھیٹر جاتے ہیں، سیر گشت رہتی ہے۔ طرح طرح کی تفریحیں ہیں۔

چھوٹی بہن کو برا لگا اور اس نے دوکانداروں کی زندگی کی برائی شروع کی اور کسانوں کی طرفداری کی "میں اپنی زندگی کو تمہاری سے نہ بدلوں گی" وہ بولی "ہم موٹے جھوٹے رہتے ہیں، پر فکر سے تو آزاد ہیں، تم لوگ ہم سے بہتر ڈھنگ سے رہتے ہو اور اکثر ضرورت سے زیادہ کما لیتے ہو لیکن یہ بھی تو اکثر ہوتا ہے کہ سب کچھ کھو بیٹھتے ہو۔ کہاوت سنی ہوگی "نفع نقصان جڑواں بھائی ہیں" اکثر ہوتا ہے کہ آج جو مالدار ہے کل بھیک کے ٹکڑوں کو لگ جاتا ہے، ہماری زندگی میں یہ اندیشے نہیں کسان کی زندگی بہت موٹی نہیں ہوتی مگر لمبی ہوتی ہے۔ ہم مالدار تو کبھی نہ ہونگے لیکن ہمارے پاس کھانے کو ہمیشہ کافی ہوگا۔

بڑی بہن طنزاً بولی "بس ؟ ٹھیک، اگر سوروں اور بچھڑوں کی زندگی چاہتی ہو! تم نفاست کے طور طریقوں کو کیا جانو! تمہارے میاں کیسی ہی محنت کریں تمہاری موت بھی ایسی ہی ہوگی جیسی زندگی ہے بس گوبر کے ڈھیر پر۔ اور تمہارے بچوں کی بھی۔

"اسکا کیا؟" چھوٹی بہن نے جواب دیا "ہاں ہاں ہمارا کام موٹا ہے بھدا ہے مگر یقینی تو ہے ہمیں کسی کے آگے جھکنا تو نہیں پڑتا، اور تمہارے ارد گرد شہروں میں طرح طرح کی رغبتیں ہیں۔ آج ممکن ہے سب ٹھیک ہو مگر کل ممکن ہے شیطان تمہارے میاں کو تاش، شراب عورتوں میں پھانس دے اور بس سب کچھ تباہ ہو جائے۔ کیوں کیا اکثر ایسا ہوتا نہیں ؟"

گھر کا مالک پہوم، آتش دان پر پڑا عورتوں کی باتیں سن رہا تھا "بات تو بالکل ٹھیک ہے" اس

نے سوچا بچپن سے دھرتی ماتا کو جوتنے میں ایسے لگے رہتے ہیں کہ ہم کسانوں کو وقت ہی نہیں ملتا کہ سر میں کوئی حماقت جگہ پکڑے۔ ساری دقت یہ ہے کہ کافی زمین نہیں۔ اگر بہت سی زمین ہوتی تو میں تو کمبخت شیطان سے بھی نہ ڈرتا۔"

عورتیں چاہ پی چکیں۔ تھوڑی دیر کپڑوں کی بابتہ باتیں ہوئیں۔ پھر چائے کے برتن دھو دھلا کر سونے کو پڑ گئیں لیکن شیطان آتش دان کے پیچھے بیٹھا سب باتیں سن رہا تھا۔ وہ خوش تھا کہ کسان کی بیوی نے اسمیں شیخی پیدا کر دی ہے۔ اور وہ کہتا ہے کہ اگر بہت سی زمین ہو تو شیطان سے بھی نہ ڈروں۔

اچھا اچھا شیطان نے خیال کیا "میرا تیرا مقابلہ ہوگا۔ میں تجھے زمین بھی دوں گا اور اس زمین کے ذریعہ تجھے اپنے قابو میں لونگا۔

(۲)

گانوں کے قریب ایک خاتون رہتی تھی۔ ایک چھوٹی سی زمیندارنی جس کی کوئی ۳۰۰ ایکڑ کی جائداد تھی۔ جب تک اس نے ایک بوڑھے سپاہی کو اپنا کارندہ نہیں بنایا تھا جو لوگوں پر آئے دن جرمانے کیا کرتا تھا اس خاتون سے اور کسانوں سے خوب بنتی تھی۔ پیوم لاکھ خیال رکھتا لیکن ہمیشہ کچھ نہ کچھ ہو جاتا کبھی کوئی گھوڑا مٹر کے کھیت میں جا نکلا کبھی کوئی گائے خاتون کے باغ میں جا پہنچتی کبھی بچھڑے اس کی چراگاہوں میں چلے جاتے اور اسے ہمیشہ جرمانہ دینا ہوتا۔

پیوم ادا تو کر دیتا لیکن گڑ گڑایا کرتا۔ اور غصہ میں گھر جاتا اور گھر والوں سے سختی کرتا۔ ساری گرمی پیوم کو اس سپاہی کیوجہ سے بڑی تکلیف رہی۔ اور جب جاڑا آیا اور مویشیوں کو اصطبل میں باندھنا پڑا تو پیوم کو خوشی ہوئی۔ چونکہ باہر نہ چر سکتے تھے اور اس لئے چارہ دینا پڑتا تھا جو اسے اچھا نہ لگتا تھا مگر پھر بھی روز کی فکر تو نہ تھی۔

جاڑے میں خبر اڑی کہ یہ خاتون اپنی زمین بیچتی ہے اور بڑی سڑک والی سرائے کا مالک اس کی بات چیت کر رہا ہے۔ کسانوں نے یہ سنا تو بہت ڈرے۔ انہوں نے سوچا، اگر سرائے والے نے زمین لے لی تو اس کارندہ سے زیادہ جرمانوں کی مصیبت ہوگی۔ اور ہمارا سارا سہارا تو اسی جائداد پر ہے،،

کسان گانوں کیطرف سے خاتون کے پاس گئے اور درخواست کی کہ سرائے والے کو زمین نہ بیچے

ہم لوگ اس سے بہتر قیمت ادا کرینگے۔ خاتون راضی ہو گئی۔ کسانوں نے کوشش کی کہ ساری جائداد گاؤں کے نام سے خرید لیں اور سب کے سب مشترک طور پر اس کے مالک ہوں۔ دو دفعہ اس کام کے لئے ملکر بات چیت ہوئی لیکن معاملہ طے نہ پا سکا۔ شیطان نے انمیں پھوٹ کا بیج بو دیا اور وہ یکرائے نہ ہو سکے۔ چنانچہ انہوں نے فیصلہ کیا کہ الگ الگ ہی زمین خرید لیں جتنی جس کو توفیق ہو۔ خاتون جیسے پہلی تجویز پر راضی ہو گئی تھی اس پر بھی راضی ہو گئی۔

ذرا ہی دیر میں پھوم کو خبر لگی کہ اسکا ایک پڑوسی ۵۰ ایکڑ خریدتا ہے اور خاتون نے کہدیا ہے کہ آدھے دام نقد اور آدھے سال بھر بعد۔ پھوم کے دل میں حسد پیدا ہوا۔

"بھلا دیکھو، اس نے سوچا" ساری زمین بکی جاتی ہے۔ اور مجھے کچھ نہ ملیگا" پھر اپنی بیوی سے بات شروع کی "دوسرے لوگ خرید رہے ہیں" اس نے کہا "اور ہمیں بھی کوئی بیس ایکڑ خریدنے چاہئیں۔ زندگی دوبھر ہوئی جاتی ہے۔ یہ کارندہ تو مارے جرمانوں کے ہمیں کچلے دیتا ہے۔

دونوں نے ملکر غور کیا اور تدبیریں سوچیں کہ کس طرح زمین خریدیں۔ بچا کر سو روپیہ ڈال رکھے تھے۔ ایک بچھیرا بیچا آدھی شہد کی مکھیاں بیچیں۔ ایک بیٹے کو مزدوری پر بھیجا اور پیشگی اجرت لے لی، کچھ ایک بہنوئی سے قرض لیا۔ تو اس طرح جیسے تیسے کرکے آدھی زمین کی قیمت اکٹھا کی۔

یہ کر چکا تو پھوم نے ۴۰ ایکڑ کا ایک کھیت چنا جس میں کچھ کچھ جنگل تھا اور خاتون کے پاس اسکا معاملہ کرنے گیا۔ معاہدہ ہو گیا۔ پھوم نے ہاتھ ملایا اور کچھ رقم پیشگی ادا کی۔ پھر دونوں شہر گئے اور دستاویزوں پر دستخط ہوگئے۔ آدھے دام نقد ادا کر دیئے اور باقی دو سال میں دینے کا اقرار کیا۔

اب پھوم کی اپنی زمین ہو گئی۔ اس نے بیج قرض لیا۔ اور جو زمین خریدی تھی اس میں بویا۔ فصل اچھی ہوئی اور سال کے اندر ہی اندر سے خاتون اور بہنوئی دونوں کا قرض ادا کر دیا۔ اب یہ زمیندار بن گیا۔ اپنی ہی زمین جوتتا بوتا۔ اپنی زمین پر گھاس رکھاتا، اپنی لکڑی کاٹتا، اور مویشیوں کو اپنی چراگاہوں پر چراتا۔ یہ اپنے کھیت جوتنے یا ہرے ہو سے غلہ یا گھاس کی رنگت دیکھنے جاتا تو اسکا دل خوشی سے پھولا نہ سماتا۔ اس کی زمین پر جو گھاس اُگتی تھی اور جو پھول کھلتے تھے وہ اسے اور سب سے کچھ ہی الگ نظر آتے تھے۔ پہلے جب وہ اس زمین کے پاس سے گذرتا تو یہ زمین بھی ایسی ہی معلوم ہوتی جیسے اور کوئی زمین۔ لیکن اب تو یہ کچھ اور ہی نظر آتی تھی۔

(۳)

چنانچہ پھوم مطمئن تھا اور خوب گذرتی اگر پڑوس کے کسان اس کے کھیت اور چراگاہوں میں بیجا دخل نہ دیتے اس نے پہلے نرمی سے سمجھایا بجھایا لیکن کسی نے نہ سنی۔ کبھی گانوں کا چرواہا گائیں اس کے کھیت میں چھوڑ دیتا کبھی رات کی چرائی میں گھوڑے اس کے غلے کے کھیت میں پہنچ جاتے۔ پھوم انہیں بار بار ہانک دیتا اور مالکوں کو معاف کر دیتا۔ چنانچہ عرصہ تک اس نے کوئی قانونی کارروائی نہیں کی۔ لیکن آخر نہ رہا گیا اور اس نے ضلع کی عدالت میں رپٹ لکھا ہی دی۔ وہ سمجھتا تھا کہ یہ سب اس لئے ہے کہ کسانوں کے پاس زمین نہیں اور وہ کوئی بری نیت سے اسے دکھ نہیں دیتے۔ لیکن پھر سوچتا "میں کہاں تک معاف کرتا رہوں؟ یہ تو جو کچھ ہے سب تباہ کر دینگے۔ انہیں سبق دینا چاہئے"

لہٰذا اب انہیں پھانس ہی دیا۔ ایک سبق دیا پھر دوسرا۔ اور دو تین کسانوں پر جرمانہ ہو گیا۔ تھوڑے دنوں میں پھوم کے پڑوسی اس وجہ سے اس سے جلنے لگے اور کبھی کبھی جان بوجھ کر اپنے مویشی اس کی زمین میں چھوڑ دیتے ایک کسان تو رات کو پھوم کے جنگل میں گھس گیا اور چھال کی خاطر پانچ لیموں کے درخت کاٹ ڈالے۔ ایک دن درختوں کے پاس سے گذرتے ہوئے پھوم نے کچھ سفید سفید پڑا دیکھا۔ قریب گیا تو چھلے ہوئے تنے زمین پر پڑے تھے اور درختوں کے بجائے انکے ٹھونٹ باقی تھے۔ پھوم کو بہت غصہ آیا

اگر ایک یہاں کاٹ دیا ہوتا ایک وہاں تو بھی برا تھا" پھوم نے سوچا "پر اس بدمعاش نے تو پورا گچھا کا گچھا کاٹ ڈالا۔ معلوم ہو جاتا کہ کون ہے تو بتلاتا"

پھوم بڑی الجھن میں پڑ گیا کہ آخر کون ہو سکتا ہے۔ آخر کو فیصلہ کیا "ہو نہ ہو سیمن ہوگا۔ کوئی دوسرا نہیں کر سکتا" وہ سیمن کے گھر گیا کہ ذرا دیکھے۔ لیکن کچھ نہ دکھائی دیا اور خواہ مخواہ کی تو تو میں میں ہوئی۔ لیکن اسے اور بھی یقین ہو گیا کہ یہ سیمن ہی کا کام ہے لہٰذا مقدمہ دائر کر دیا۔ سیمن کی طلبی ہوئی۔ مقدمہ کی سماعت ہوئی پھر ایک اور دفعہ سماعت ہوئی اور آخر میں سیمن رہا ہوا اس لئے کہ اسکے خلاف کوئی شہادت نہ تھی۔ پھوم کو اور بھی رنج ہوا اور اس نے اپنا غصہ پنچوں اور منصفوں پر نکالا۔

"تم چوروں سے اپنی ہتھیلیاں چکنی کراتے ہو" اس نے کہا "اگر تم لوگ ایماندار ہوتے تو ایک چور کو یوں

نہ چھوٹ جانے دیتے ،،

الغرض پہوم منصفوں سے بھی لڑا اور اپنے پڑوسیوں سے بھی۔ لوگ اس کے گھر میں آگ لگا دینے کی دھمکیاں دینے لگے۔ اور اگرچہ پہوم کے پاس زمین پہلے سے زیادہ تھی لیکن گانوں میں اسکی حالت بدتر ہوگئی۔

اسی زمانہ میں خبر اڑی کہ بہت سے لوگ دوسری جگہ جاکر آباد ہو رہے ہیں ،، میں کیوں اپنی زمین چھوڑوں ،، پہوم نے سوچا ،، کچھ اور گانوں والے چھوڑ جائینگے تو ہمارے لئے کافی جگہ ہوجائیگی۔ میں خود انکی زمین لے لوں گا اور اپنی جائداد ذرا بڑھا لوں گا۔ پھر ذرا آرام سے زندگی کٹیگی۔ ابھی تو اتنی تنگی ہے کہ آرام سے رہنا مشکل ہے ،،

ایک دن پہوم گھر پر بیٹھا تھا کہ ایک کسان گانوں میں سے گذرتے ہوئے اس کے پاس آنکلا۔ اسے اس نے رات کو ٹھرایا اور کھانا کھلایا۔ باتیں ہوئیں تو پہوم نے پوچھا کہ کہاں سے آتے ہو۔ اجنبی نے جواب دیا کہ وہ وولگا سے آتا ہے جہاں وہ کام کیا کرتا تھا۔ بات میں بات نکلی اور اجنبی نے بیان کیا کہ وہاں بہتیرے لوگ جاجا کر بس رہے ہیں۔ یہ بھی بتایا کہ اس گانوں کے کچھ لوگ وہاں جابسے ہیں۔ یہ لوگ وہاں کے گانوں میں جاکر شریک ہوگئے ہیں اور ہر ایک کو ۲۵ - ۲۵ ایکڑ زمین ملی ہے۔ زمین ایسی اچھی ہے کہ جو رائی بوئی جاتی ہے وہ گھوڑے کے برابر اونچی ہوتی ہے اور ایسی گھنی کہ ہانس کے پانچ ہاتھ چلاؤ اور گٹھا تیار رہے۔ ایک کسان بس اپنے دو ہاتھ لیکر آیا تھا اور اب اس کے پاس اپنے چھ گھوڑے ہیں اور دو گائیں۔

پہوم کے دل میں آرزو بھڑکی۔ اس نے سوچا ،، میں کیوں اس تنگ سوراخ میں پڑا تکلیف اٹھاؤں جب دوسری جگہ اتنی اچھی طرح رہنا ممکن ہے۔ میں اپنی زمین اور گھر بیچ کر دام کرلوں اور ان سے وہاں جاکر پھر کام شروع کردوں اور ہر چیز نئی لوں۔ یہاں کی بھیڑ بھاڑ میں ہمیشہ تکلیف ہی ہوتی ہے۔ لیکن پہلے خود جاکر سب کچھ معلوم کرآؤں ،،

گرمی کے آتے آتے یہ تیار ہوکر چلا۔ دریائے وولگا میں ایک بھاپ کی کشتی پر بیٹھکر یہ سمارا پہنچا پھر ۳۰۰ میل پیدل چلا اور اس جگہ پہنچا۔ اجنبی نے جو جو کہا تھا سب ٹھیک نکلا کسانوں کے پاس بہت سی زمین تھی ہر شخص کو گانوں کی طرف سے ۲۵ ایکڑ زمین دی گئی تھی اور جس کے پاس روپیہ ہو وہ ڈیڑھ روپیہ ایکڑ کے حساب سے جتنی زمین چاہتا خرید سکتا تھا۔

سب کچھ بیچ بچا کر حیران ہوتے ہوتے پھوم اپنے گھر آیا اور اپنی تمام چیزیں بیچنا شروع کیں۔ زمین اس نے منافع سے بیچی۔ گھر بیچا۔ مویشی بیچے اور گانوں کی کمیٹی سے علیحدہ ہوا۔ بس وہاں بہار تک ٹھہرا اور پھر اپنے گھر کے لوگوں کو لیکر نئی بستی کا رُخ کیا۔

(۴)

پھوم اور اس کے گھر کے لوگ جب اپنے نئے وطن میں پہنچے تو ایک بڑے سے گانوں میں شریک ہونے کی درخواست دی۔ پنچوں کی دعوت کی اور ضروری کاغذات حاصل کئے۔ پانچ حصے زمین اس کے اور اس کے بیٹے کے نام لکھی گئی یعنی گانوں کی چراگاہوں کے علاوہ ۱۲۰ ایکڑ زمین (سب ایک جگہ نہیں بلکہ ادھر اُدھر مختلف کھیتوں میں) پھوم نے ضروری عمارتیں بنائیں اور مویشی خریدے۔ گانوں کی دی ہوئی زمین ہی پہلے وطن کے مقابلہ میں تگنی تھی اور سب زمین اچھی بانگر۔ اب وہ پہلے سے دہ چند بہتر حال میں تھا۔ اس کے پاس وافر زمین تھی اور چراگاہیں اور اب یہ جتنے مویشی چاہتا رکھ سکتا تھا۔

پہلے تو مکان بنانے اور بسنے بسانے کے شغل میں خوب خوش رہا لیکن جب خوب رہ بس لیا تو سوچنے لگا کہ یہ زمین بھی کافی نہیں پہلے سال اس نے گانوں کی زمین پر گیہوں بوئے اور فصل اچھی ہوئی۔ چاہتا تھا کہ گیہوں ہی بوئے جائے لیکن اس کے لئے زمین کافی نہ تھی کیونکہ جس پر پہلے بویا تھا اس پر بو نہ سکتا تھا۔ اس علاقہ میں گیہوں یا تو نئی زمین پر بویا جاتا ہے یا ان کھیتوں پر جو کچھ عرصہ خالی پڑے رہے ہوں۔ دو ایک سال گیہوں بویا جاتا ہے۔ اور پھر اسے چھوڑ دیتے ہیں جب تک خوب لمبی لمبی گھاس کھڑی ہو جائے۔ بہت سے لوگ ایسی ہی زمین چاہتے تھے اور یہ کافی نہ تھی۔ اس لئے جھگڑتے تھے۔ جو لوگ اچھے حال میں تھے وہ تو یہ زمین گیہوں بونے کے لئے چاہتے تھے اور جو برے حالوں تھے وہ اس لئے کہ دوسروں کو اٹھا دیں اور لگان ادا کرنے کے لئے اس طرح روپیہ کرلیں۔ پھوم اور گیہوں بونا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک کاروباری سے سال بھر کے لئے زمین لی۔ بہت سا گیہوں بویا اور خوب فصل ہوئی۔ لیکن زمین گانوں سے دور بہت تھی اور غلہ کو دس میل گاڑیوں میں لاد کر لانا پڑا۔ تھوڑے دن بعد پھوم نے دیکھا کہ بہت سے کسان کاروباری علیحدہ علیحدہ قطعوں پر بسے ہوئے ہیں اور خوب مالدار ہوتے جاتے ہیں۔ اس نے سوچا۔ اگر میں بھی کوئی مافی

زمین خرید لوں اور اس پر گھر بنا لوں تو پھر اور ہی بات ہو جائیگی۔ پھر سب ٹھیک ہو جائے گا اور ایک جگہ۔"
معافی زمین خریدنے کا خیال اسے بار بار آیا۔ کہیں تین سال تک یہ وہی کرتے گیا۔ کرایہ پر زمین لیتا اور گیہوں بوتا۔ موسم اچھا رہا اور فصلیں عمدہ رہیں اور اس نے کچھ رقم بچا لی۔ یہ اسی طرح مزہ سے رہ سکتا تھا لیکن ہر سال دوسروں کی زمین لینے سے اور اس کے لئے جھک جھک کرنے سے اکتا گیا۔ جہاں کہیں اچھی زمین ہوتی کسان دوڑ پڑتے اور سب زمین اٹھ جاتی اور تیزی نہ کرو تو کچھ بھی ہاتھ نہ آتی۔ تیسرے سال ایسا ہوا کہ اس نے اور ایک کاروباری نے ملکر کسانوں سے کچھ زمین چراگاہ کے طور پر لی۔ اور انہوں نے اس پر ہل بھی چلا دیا تھا کہ کچھ جھگڑا ہوا۔ کسانوں نے عدالت میں کارروائی کی فیصلہ انکے خلاف ہوا اور اس طرح ساری محنت اکارت گئی۔

"اگر یہ میری اپنی زمین ہوتی" پہوم نے سوچا "تو میں خود مختار ہوتا اور یہ سب بدمزگی نہ ہوتی"
پہوم اب زمین خریدنے کی فکر کرنے لگا۔ ایک کسان طاحیں نے ۱۳۰۰ ایکڑ زمین خریدی تھی۔ لیکن اب کچھ پریشانی میں تھا۔ اس لئے سستے داموں اسے بیچتا تھا۔ پہوم نے بھاؤ تاؤ کیا اور معاملہ ۱۵۰۰ روبل پر چکا۔ کچھ نقد کچھ بعد کو۔ سارا معاملہ طے ہوا ہی چاہتا تھا کہ ایک دن ایک راہگیر کاروباری پہوم کے یہاں اپنے گھوڑوں کے لئے چارہ لینے ٹھہرا۔ پہوم کے ساتھ چا پی اور باتیں ہوئیں۔ کاروباری نے باتوں میں کہا کہ وہ ابھی بشکیروں کے علاقہ سے آ رہا ہے اور وہاں ۱۳۰۰ ایکڑ زمین ایکہزار روبل میں خرید کر آیا ہے۔ پہوم نے اور پوچھا گچھا تو تاجر نے جواب دیا: "بس ضرورت اس کی ہے کہ سرداروں سے دوستی پیدا کر لو میں نے کوئی سو روبل کے چوغے اور قالین دئے اور ایک بکس چائے کا۔ اور جو شراب پیتے تھے انہیں شراب پلائی۔ اور دو آنے ایکڑ سے بھی کم میں زمین لے لی۔" اس نے پہوم کو دستاویز دکھائی اور کہا کہ "زمین دریا کے کنارے کے قریب ہے اور ساری کی ساری نئی زمین ہے۔"
پہوم نے بار سوال کر ڈالے اور تاجر نے کہا "وہاں اتنی زمین ہے کہ سال بھر چلو تو نہ طے کر سکو اور سب کی سب بشکیروں کی ہے۔ یہ سب بھیڑوں کی طرح بھولے ہیں اور زمیں قریب قریب مفت ہی مل جاتی ہے"

"ٹھیک ہے" پھوم نے خیال کیا "اپنے ایک ہزار روبل سے میں صرف ۱۳۰۰ ایکڑ زمین کیوں خریدوں۔ اور قرضہ اپنے سر لوں۔ اگر یہی روپیہ لیکر وہاں چلا جاؤں تو اس سے دس گنی زمین ملجائے۔"

(۵)

پھوم نے وہاں کے راستہ کے متعلق سوالات کئے جب تاجر چلا گیا تو اس نے خود روانگی کی تیاری شروع کی۔ بیوی کو تو گھر بار دیکھنے کے لئے چھوڑا، ایک آدمی ساتھ لیا اور نکل کھڑا ہوا۔ راہ میں ایک شہر میں ٹھہرے، چاء کا ایک گٹھا خریدا، اور جیسا کہ تاجر نے کہا تھا، کچھ شراب اور دوسرے تحفے تحائف۔ چلتے چلتے ۳۰۰ میل سے زائد نکل گئے اور کہیں ساتویں دن اس جگہ پہنچے جہاں بشکیروں نے خیمے لگائے تھے تاجر نے جو جو کہا تھا سب ہو بہو سچ نکلا۔ یہ لوگ دریا کے کنارے میدان میں نمدے سے ڈھکے ہوئے خیموں میں رہتے تھے۔ نہ زمین جوتتے نہ روٹی کھاتے۔ انکے مویشی اور گھوڑے میدان میں چرتے بچھیرے خیموں کے پیچھے بندھ جاتے اور گھوڑیاں دن میں دو مرتبہ انکے پاس لیجائی جاتیں۔ گھوڑیوں کا دودھ دوہا جاتا اور اس سے پنیر بنتا۔ یہ پنیر عورتیں بنایا کرتی تھیں، مرد چھاچھ اور چائے پیتے، گوشت کھاتے اور بانسری بجاتے۔ اس کے علاوہ اور کوئی فکر نہ تھی۔ سب کے سب نہایت مضبوط تھے اور خوش و خرم اور گرمی بھر کاہلی ان میں بھی کسی کو نہ آتا تھا سب جاہل تھے۔ روسی کوئی نہیں جانتا تھا۔ لیکن سب طبیعت کے نہایت اچھے تھے۔

پھوم کو جو دیکھا تو سب خیموں سے نکل آئے اور اسکے چاروں طرف جمع ہوگئے۔ ایک ترجمان ڈھونڈا گیا۔ اور پھوم نے بتلایا کہ زمین کے لئے آیا ہے۔ بشکیر بہت خوش ہوئے۔ پھوم کو سب اچھے خیمہ میں لے گئے اور وہاں پر تکیوں پر ایک قالین پر بٹھایا گیا اور اس کے گرد خود بیٹھے۔ اسے چاء اور چھاچھ دی۔ ایک بھیڑ ذبح کرائی۔ اور اس کے لئے گوشت تیار کرایا۔ پھوم نے اپنی گاڑی میں سے تحائف نکالے اور بشکیروں کو دئے اور چاء بھی تقسیم کی۔ پھر کیا تھا بشکیر پھولے نہ سماتے تھے۔ آپس میں خوب باتیں کرنے لگے اور پھر ترجمان سے کہا کہ ترجمہ کرے۔

ترجمان نے کہا "یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ سے بہت خوش ہیں۔ ہماری رسم ہے کہ اپنے مہمان کو خوش کرنیکے لئے سب کچھ کرتے ہیں۔ اور اسکے تحائف کا بدل کرتے ہیں۔ تم نے ہمیں تحفے دئے اب کہو کہ ہماری

چیزوں میں تمہیں کونسی سب سے زیادہ پسند ہے تاکہ ہم وہ تمہیں دیں؟"

"مجھے تو یہاں جو چیز سب سے زیادہ پسند ہے" پھوم نے کہا "وہ تمہاری زمین ہے۔ ہمارے یہاں زمین پر بہت آبادی ہے اور زمین کا زور ختم ہو چکا ہے۔ لیکن تمہارے پاس بہت زمین ہے اور اچھی میں نے ایسی زمین کبھی نہیں دیکھی۔"

ترجمان نے ترجمہ کیا بشکیروں نے تھوڑی دیر آپس میں بات چیت کی۔ پھوم کچھ نہ سمجھا کہ کیا کہتے ہیں لیکن یہ ضرور دیکھتا تھا کہ سب بہت خوش ہیں۔ خوب ہنس رہے ہیں چلا رہے ہیں۔ پھر سب چپ ہو گئے اور پھوم کی طرف دیکھنے لگے۔ ترجمان نے کہا "یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپکے تحائف کے بدلے میں یہ جتنی زمین آپ چاہیں خوشی سے آپ کو دینگے تم بس انگلی سے بتا دو اور زمین تمہاری ہو جائیگی۔"

بشکیروں نے پھر گفتگو شروع کی اور کچھ جھگڑنے لگے۔ پھوم نے پوچھا کہ کا ہے پر جھگڑتے ہو تو ترجمان نے کہا کہ بعض کا خیال ہے کہ سردار سے پوچھ لینا چاہئے اور اسکی غیر حاضری میں زمین کے متعلق کچھ کرنا ٹھیک نہیں اور بعض کہتے ہیں کہ اسکی واپسی کا انتظار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

(۶)

بشکیر جھگڑ ہی رہے تھے کہ ایک آدمی بڑی سی لومڑی کی کھال کی ٹوپی پہنے پہنچا۔ سب چپ ہو گئے اور تعظیم کو کھڑے ہو گئے۔ ترجمان نے بتایا کہ یہی ہمارا سردار ہے۔

پھوم فوراً بہترین چوغہ اور ڈھائی سیر چاء نکالکر لایا اور سردار کی خدمت میں پیش کیں۔ سردار نے تحفہ قبول کیا اور جاکر مسند پر بیٹھ گیا۔ بشکیروں نے اس سے کچھ کہا سنا۔ تھوڑی دیر تک تو سردار سنتا رہا پھر سر سے اشارہ کیا کہ چپ ہو جاؤ اور خود پھوم سے روسی میں یوں مخاطب ہوا۔

"اچھا ٹھیک ہی جو زمین چاہو چن لو۔ ہمارے پاس بہت ہی"

"جتنی چاہوں اتنی کیسے مل سکتی ہے؟" پھوم نے سوچا "معاملہ پکا کرنیکے لئے دستاویز چاہئے نہیں تو آج کہدینگے کہ تمہاری ہے اور پھر ممکن ہے چھین لیں۔"

پھر اونچی آواز سے کہا "آپ کی عنایت کا شکریہ۔ آپکے پاس بہت زمین ہے اور مجھے تھوڑی سی

درکار ہے۔ لیکن میں ذرا یہ بات پکی کرلینی چاہتا ہوں کہ میرا انگوٹھا کوفا ہے۔ کیا یہ ناپ کر میرے حوالہ نہیں کیا جاسکتا۔ موت زیست خدا کے ہاتھ ہے۔ تم بھلے لوگ تو مجھے زمین دیتے ہو لیکن تمہاری اولاد کیا ٹھیک ہے مجھ سے چھین لے۔

" ٹھیک کہتے ہو سردار نے کہا" ہم زمین تمہارے حوالہ کردینگے "

" میں نے سنا ہے کہ ایک تاجر یہاں آیا تھا۔ اور آپ لوگوں نے اُسے کچھ زمین دی اور دستاویز لکھی۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں "

سردار سمجھ گیا " اچھا " اس نے جواب دیا " یہ تو بہت آسان بات ہے۔ ہمارا منشی ہے ہم تمہارے ساتھ شہر چلیں گے اور دستاویز پر باضابطہ مہر ہوجائے گی "

" اور قیمت کیا ہوگی ؟ " پھوم نے پوچھا۔

" ہمارے دام ہمیشہ ایک ہی ہوتے ہیں۔ دن بھر کے ایکہزار روبل "

پھوم کی سمجھ میں نہ آیا " دن بھر؟ یہ کونسا ناپ ہے۔ کتنے ایکڑ ہونگے ؟ "

" ہمیں اسکا حساب لگانا نہیں آتا۔ ہم تو دن کے حساب سے بیچتے ہیں۔ دن بھر میں جتنی زمین کے گرد چل لو وہ تمہاری اور دام ایکہزار روبل "

پھوم کو بڑی حیرت ہوئی۔ اس نے کہا " مگر دن بھر میں تو آدمی ایک بہت بڑے ٹکڑے کی چاروں طرف جاسکتا ہے "

سردار ہنسا " وہ سب تمہاری ہوگئی " اس نے کہا " لیکن ایک شرط ہے۔ اگر تم اسی دن اس جگہ نہ لوٹ آئے جہاں سے چلے تھے تو روپیہ ضبط "

" لیکن جہاں جہاں جاؤنگا اُسپر نشان کیسے کروں گا ؟ "

" کیوں۔ تم کو اُس جگہ چلیں۔ ہم ٹھہر جائینگے تم ایک پھاوڑا لیکر چل کھڑے ہونا۔ جہاں ضروری سمجھو نشان کردینا۔ ہر موڑ پر گڑھا کھود کر اور بیچ میں مٹی لوٹ دینا پھر بعد کو ہل لیکر ایک گڑھے سے دوسرے گڑھے تک جانا۔ جتنا بڑا چکر چاہو لگالو لیکن سورج ڈوبنے سے پہلے جہاں سے چلے تھے وہاں پہنچ جانا

جتنی زمین گھیر آؤگے سب تمہاری "۔

پھوم بہت ہی خوش ہوا طے ہوا کہ کل صبح ہی چلیں گے۔ تھوڑی بات چیت ہوئی۔ کچھ چاچھ پی تھوڑا سا گوشت کھلا۔ پھر چاء آئی۔ اتنے میں رات ہوگئی۔ پھوم کو سونے کے لئے پروں کا بستر ملا بشکیر اِدھر اُدھر چلدیے اور وعدہ کرگئے صبح ہوتے ہوتے جمع ہو جائیں گے۔ اور سورج نکلنے سے پہلے سوار ہوکر مقررہ جگہ کو چلیں گے۔

(۷)

پھوم پروں کے بستر پر لیٹا تو مگر نیند رات بھر نہ آئی۔ ساری رات وہی زمین کا دھیان رہا۔ کتنا بڑا قطعہ گھیروں گا "، اس نے سوچا " میں تو دن میں آسانی سے ۳۰ میل چل لیتا ہوں۔ دن تو آج کل بڑا ہوتا ہے۔ ۳۰ میل کے چکر میں کتنی کچھ زمین نہ آجائیگی۔ خراب خراب بیچ ڈالوں گا یا کسانوں کو اٹھا دوں گا۔ لیکن اچھی اچھی خود رکھوں گا اور اسپر اپنی کھیتی کروں گا۔ دو جوڑی بیل خرید وں گا۔ دو مزدور اور رکھوں گا کوئی ڈیڑھ سو ایکڑ جوتوں گا اور باقی پر مویشیوں کی چراگاہ بنا ؤں گا۔

پھوم رات بھر پڑا جاگا کیا اور بس صبح ہوتے ہوتے ذرا آنکھ لگ گئی۔ آنکھیں مندی ہی تھیں کہ ایک خواب دیکھا۔ ایسا معلوم ہوا کہ اسی خیمہ میں پڑا ہے اور باہر کوئی کھِل کھِل کر رہا ہے۔ سوچا کہ کون ہے۔ اٹھا، باہر گیا اور دیکھا کہ بشکیروں کا سردار خیمہ کے باہر بیٹھا ہے اور اپنی کوکھ پکڑے ہنسی کے مارے لوٹا جاتا ہے۔ سردار کے پاس جاکر پھوم نے پوچھا کاہے پر ہنستے ہو؟ تو دیکھتا کیا ہے کہ وہ سردار نہیں ہے بلکہ وہ تاجر ہے جو کچھ دن ہوئے اس کے یہاں ٹہرا تھا اور اس زمین کا قصہ سنا یا تھا۔ پھوم پوچھنا ہی چاہتا تھا کہ کیا بہت دن سے یہاں ہو؟ "، کہ دیکھتا کیا ہے کہ وہ تاجر نہیں بلکہ وہ کسان ہے جو بہت روز ہوئے وولگا سے پھوم کے پرانے وطن میں آیا تھا۔ پھر دیکھا کہ وہ کسان بھی نہیں بلکہ خود شیطان ہے جس کے کھُر ہیں اور سینگ۔ وہی بیٹھا کھِل کھِل کر رہا ہے اور اس کے سامنے ایک آدمی چت پڑا ہے، ننگے پانوں بس ایک کرتا اور پاجامہ بدن پر ہے۔ پھوم نے خواب ہی میں اس آدمی کو غور سے دیکھکر پہچاننا چاہا تو معلوم ہوا کہ یہ مردہ ہے اور خود وہی ہے! خوف سے گھبرا کر اسکی آنکھ کھل گئی۔

"آدمی بھی کیا کیا خواب دیکھتا ہے" اس نے سوچا۔ ادھر اُدھر دیکھا تو دروازہ میں سے دکھائی دیا کہ دن نکل رہا ہے "وقت ہو گیا ہے۔ انہیں اٹھانا چاہئے۔ اب تو روانگی کا وقت ہے"
وہ اٹھا، اپنے آدمی کو جو گاڑی میں پڑا سو رہا تھا۔ اٹھایا۔ اس سے کہا کہ زین کسے اور خود بشکیروں کو بلانے نکلا۔ "میدان میں چل کر زمین ناپنے کا وقت ہو گیا ہے" اس نے کہا۔
بشکیر اٹھے اور جمع ہو گئے۔ سردار بھی آیا۔ چھاچھ پینی شروع کی۔ پھوم کو چائے پیش کی لیکن یہ تو ٹھہرنا ہی نہ چاہتا تھا۔
"چلنا ہے تو بس چلو۔ وقت ہو گیا ہے" اس نے کہا۔

(۸)

بشکیر تیار ہو گئے اور سب چل کھڑے ہوئے۔ کچھ گھوڑوں پر کچھ گاڑیوں میں۔ پھوم خود اپنی گاڑی میں اپنے آدمی کو ساتھ لیکر اور ایک پھاوڑہ رکھکر چلا۔ میدان میں پہنچے تو صبح کی لالی دکھائی دینے لگی تھی۔ یہ سب ایک ٹیلے پر چڑھ گئے (جسے بشکیر شکھان کہتے ہیں) اور سب اپنے گھوڑوں اور گاڑیوں سے اتر کر ایک جگہ جمع ہو گئے۔ سردار پھوم کیطرف بڑھا اور اپنا ہاتھ میدان کی طرف اٹھا کر کہنے لگا۔
"دیکھو جہاں تک تمہاری نظر جاتی ہے سب ہمارا ہے۔ اسکا جونسا حصہ چاہو لے سکتے ہو۔
پھوم کی آنکھیں خوشی سے نم ہو گئیں۔ ساری نئی زمین تھی۔ سب چورس جیسے ہاتھ کی ہتھیلی۔ ایسی سیاہ جیسی کالی خشخاش اور جہاں کھڈ تھے انیں طرح طرح کی چھاتی چھاتی گھاس۔
سردار نے اپنی کھال کی ٹوپی اتار کر زمین پر رکھدی اور کہا "یہ نشان ہے یہاں سے چلو اور یہیں لوٹ آؤ جتنی زمین کے گرد چلو گے سب تمہاری ہے"
پھوم نے روپیہ نکالکر ٹوپی پر رکھا۔ پھر اپنا کوٹ اتارا اور بس بے آستینوں کی صدری پہنے رہا۔ اپنی پیٹی کھولکر پیٹ کے نیچے خوب کسی اور پانی کی ایک کپی پیٹی میں باندھی۔ ذرا بوٹ کسے اور آدمی سے پھاوڑا لیکر چلنے کے لئے تیار ہو گیا۔ ذرا دیر سوچا کہ کدھر جاوے، ہر طرف کو جی للچاتا تھا۔
"کیا پروا ہے" اس نے آخر میں فیصلہ کیا "میں نکلتے ہوئے سورج کیطرف جاؤں گا۔"
"وقت ہاتھ سے نہ دینا چاہئے" اس نے دل میں سوچا "اور ٹھنڈے ٹھنڈے میں چلنا بھی آسان ہے"
سورج کی کرنیں مشکل ہی سے اوپر نکلی تھیں کہ پھوم اپنا پھاوڑا کندھے پر رکھ میدان میں اتر پڑا۔ اور

[illegible]

چل کھڑا ہوا نہ بہت آہستہ نہ بہت تیز۔ کوئی ہزار گز جا کر رکا اور ایک گڈھا کر کے مٹی کے تودے ایک پر ایک رکھ دیئے تاکہ جگہ دکھائی دے سکے۔ پھر آگے بڑھا اور جب بدن ذرا کھل گیا تو اس نے قدم بڑھائے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک گڈھا اور کھودا۔

بھوم نے مڑ کر دیکھا۔ ٹیلہ سورج کی روشنی میں صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اسیر جو لوگ تھے وہ بھی اور گاڑی کے چمکتے ہوئے پہیئے بھی۔ اندازہ سے بھوم سمجھا کہ کوئی تین میل چلا ہوں گا۔ اب ذرا گرمی بڑھتی جاتی تھی۔ اس نے صدری اتار کر کندھے پر ڈال لی اور چلا۔ اب خوب گرمی ہوگئی تھی۔ اس نے سورج کی طرف دیکھا۔ ناشتہ کا وقت آچکا تھا۔

اس نے اپنے سے کہا، ''پہلا پہر ہو چکا۔ لیکن دن میں چار پہر ہوتے ہیں اور ابھی تو بہت سویرا ہے لوٹنا نہ چاہئے۔ لیکن ذرا جوتے اتار لوں''

اس نے بیٹھ کر جوتے کھولے، پیٹی میں کھونس لئے۔ اور آگے چلا۔ اب چلنے میں آسانی ہوگئی تھی ''تین میل اور چلوں گا''، اس نے سوچا اور پھر بائیں کو مڑ جاؤں گا۔ یہ جگہ تو اچھی ہے کہ اسے چھوڑتے جی دکھتا ہے۔ جتنے آگے بڑھو اچھی ہی اچھی زمین آتی جاتی ہے''۔

تھوڑی دیر تو سیدھا چلا اور مڑ کر دیکھا تو ٹیلا مشکل سے دکھائی دیتا تھا اور اسیر جو لوگ تھے وکالے چیونٹے لگتے تھے۔ اور سورج میں کچھ چیز چم چم کرتی دکھائی دیتی تھی''

''اوہو'' بھوم نے خیال کیا میں اس طرف تو کافی دور نکل آیا۔ اب مڑنا چاہئے اور پسینے پسینے بھی ہو رہا ہوں۔ پیاس بھی سخت لگی ہے''۔

وہ رکا۔ ایک بڑا سا گڈھا کھودا اور اسیر مٹی کا ایک ڈھیر بنایا۔ اپنی کپّی کھولی اور کچھ پیکر ٹھیک الٹے ہاتھ کو ہو لیا۔ چلتا گیا چلتا گیا۔ گھاس اونچی تھی اور گرمی سخت تھی۔ بھوم تھکنے لگا۔ سورج کی طرف دیکھا تو دوپہر ہو چکی تھی۔ اس نے سوچا، ''اب ذرا آرام کر لینا چاہئے''۔ بیٹھ کر اس نے تھوڑی روٹی کھائی، پانی پیا لیکن لیٹا نہیں کہ کہیں سو نہ جائے۔ تھوڑی دیر سستا کر پھر چلا۔ پہلے تو آسانی کے ساتھ کیونکہ کھانا کھا کر ذرا بدن میں دم آگیا تھا۔ لیکن گرمی بہت بڑھ گئی تھی اور اسے نیند آنے لگی لیکن وہ چلے ہی گیا۔ یہ سوچ کر کہ تکلیف گھنٹہ

بھرکی ہے ، زندگی ساری عمر گذارنی ہے ۔"

اس طرف بھی وہ خوب دور نکل گیا۔ اور بائیں کو مڑنے ہی کو تھا کہ ایک ترکھنڈ دکھائی دیا۔ "اسے چھوڑنا تو بہت برا ہے" اس نے سوچا، "اسمیں سن خوب ہوگا۔ اس لئے اس کھنڈ کے گرد ہی گیا اور اس کے دوسری طرف جاکر پہلے ایک گڈھا کھودا پھر بائیں کو مڑا۔ ٹیلہ کیطرف دیکھا لیکن گرمی سی ہوا کچھ مکدرسی ہوگئی تھی اور اسمیں تھرتھراہٹ سی معلوم ہوتی تھی۔ ٹیلہ کے آدمی اب مشکل سے دکھائی دیتے تھے۔

"اوہو" پھوم نے سوچا "میں ادہر دور دور نے لیا۔ اس طرف ذرا کم کرنا چاہئے" اور وہ تیسری طرف تیز تیز قدم اٹھا کر چلا۔ سورج کو دیکھا تو وہ کوئی آدہا راہ جھکا تھا اور اس نے اپنے مربع کی تیسری طرف دو میل بھی طے نہ کئے تھے۔ اور یہ منزل مقصود سے کوئی دس میل تھا۔

"نہیں" اس نے سوچا "اگرچہ زمین کا ایک کونا کٹ جائیگا لیکن مجھے اب سیدھا لوٹنا چاہئے۔ کہیں بہت دور نہ نکل جاؤں۔ اور یوں اب بہت سی زمین مل ہی چکی ہے"۔ چنانچہ پھوم نے جلدی جلدی ایک گڈھا کیا اور سیدھے ٹیلہ کا رُخ کیا

(۹)

پھوم سیدھا ٹیلہ کیطرف چلا۔ مگر اب پاؤں مشکل سے اٹھتے تھے۔ گرمی نے اسے بھگت لیا تھا۔ اس کے ننگے پاؤں سب کٹ کر زخمی ہوگئے تھے اور اب ساتھ نہ دیتے تھے۔ وہ آرام کرنا چاہتا تھا لیکن اگر سورج ڈوبتے ڈوبتے واپس پہنچنا تھا تو یہ ممکن نہ تھا۔ سورج تو کسی کا انتظار نہیں کرتا اور برابر اترا چلا جا رہا تھا۔

"یا اللہ" اس نے خیال کیا "کہیں بہت سا لینے میں غلطی تو نہیں کی؟ اگر دیر ہوگئی تو؟" اس نے ٹیلہ کی طرف دیکھا اور سورج کیطرف۔ ابھی منزل مقصود سے بہت دور تھا اور سورج کنارے سے آن لگا تھا۔ پھوم بڑھا چلا۔ چلنے میں بڑی مشکل تھی لیکن قدم بڑھا بڑھا کر ہی رکھتا گیا۔ بہت کوشش کی مگر منزل دور تھی۔ دوڑنا شروع کیا۔ کوٹ پھینکا۔ جوتے پھینکے۔ کی ٹوپی سب پھینکی اور صرف پھاوڑا رہنے دیا جس پر یہ سہارا لے لیتا تھا

اسنے سوچا اب کیا کروں" اس نے پھر سوچا "میں نے بہت کی ہوس کی اور سارا کام بگاڑ لیا۔ اب سورج ڈوبنے سے پہلے نہیں پہنچ سکتا"۔

اس خوف سے سانس اور بھی پھول گیا۔ وہ دوڑتے گیا۔ اسکا گیلا کرتہ اور پاجامہ بدن سے چپٹ گیا تھا اور زبان پر کانٹے تھے۔ سینہ ایسے چل رہا تھا جیسے لوہار کی دھونکنی۔ دل ایسے دھڑک رہا تھا جیسے ہتوڑا اور پاؤں ایسے ساتھ چھوڑے دیتے تھے جیسے اس کے ہوں ہی نہیں۔ پھوم کے دل پر یہ ڈر چھا گیا کہیں مر نہ جائے۔

موت کا ڈر تھا مگر یہ رکا نہیں۔ "اتنی دور دوڑ کر اگر اب رکا تو سب مجھے بیوقوف بنائیں گے" اس نے سوچا۔ وہ دوڑے گیا بشکیر اسکی طرف دیکھکر چلا رہے تھے انکی آوازیں سنیں اور ان سے ذرا اسکا دل بڑھا۔ اپنی آخری قوت جمع کر کے یہ دوڑتا رہا۔

سورج ڈوبنے کے قریب تھا۔ اور گرد کی چادر میں لپٹ کر بڑا اور خون کی طرح لال معلوم ہوتا تھا۔ ہاں بس اب ڈوبنا ہی چاہتا تھا۔ سورج بہت نیچے آگیا تھا لیکن یہ بھی اپنی منزل کے قریب ہی آن لگا تھا۔ پھوم کو ٹیلہ پر وہ ہاتھ جو اسکی ہمت بڑھانے کے لئے لوگ ہلا رہے تھے۔ اسے دکھائی دیتے تھے۔ اسے زمین پر چمڑے کی ٹوپی بھی نظر آتی تھی اور اسپر جو روپیہ رکھا تھا اور سردار جو زمین پر اپنی کوکھ پکڑے بیٹھا تھا پھوم کو اپنا خواب یاد آگیا۔

"زمین تو بہت ہی" اس نے خیال کیا، "لیکن خدا مجھے اس پر زندہ بھی رہنے دیگا! میں نے تو اپنی زندگی کھودی زندگی کھودی! میں کبھی اس جگہ نہ پہنچونگا"

پھوم نے سورج کی طرف دیکھا جو زمین تک پہنچ گیا تھا۔ اسکا ایک حصہ تو غائب ہو چکا تھا۔ جو کچھ سکت باقی تھی اس سے کام لیکر یہ پھر آگے کو جھپٹا۔ اوپر کا دھڑ اتنا آگے کو جھکا دیا کہ اس کے پاؤں اتنے آگے نہ بڑھ سکے اور یہ گر گیا۔ ٹیلہ تک پہنچا ہے کہ اندھیرا ہو گیا تھا اور نگاہ اٹھائی تو سورج چھپ چکا تھا۔ وہ چلایا "میری ساری محنت اکارت ہوئی، اور رکنا ہی چاہتا تھا کہ بشکیروں کے چلانے کی آوازیں سنی اور اسے خیال آیا کہ اسے نیچے سے سورج ڈوبا ہوا معلوم ہوتا ہے لیکن اوپر ٹیلہ والوں کو ابھی دکھائی دیتا ہوگا۔ خوب گہرا سانس لیکر یہ ٹیلہ کے اوپر چڑھا۔ وہاں ابھی روشنی دکھائی دیتی تھی۔ اوپر چڑھکر اس نے ٹوپی دیکھی۔ اس کے سامنے سردار بیٹھا کوکھ پکڑے ہنس رہا تھا۔ پھوم کو پھر اپنا خواب یاد آیا۔ اور اس نے ایک چیخ ماری۔ پیروں نے ساتھ چھوڑ دیا وہ آگے کو گرا اور ہاتھ سے ٹوپی کو چھو لیا۔

"خوب آدمی ہے" سردار بولا "اس نے بہت سی زمین حاصل کی"
پھوم کا نوکر دوڑ کر آگے آیا اور اسے اٹھانے لگا تو دیکھا کہ منہ سے خون بہہ رہا ہے۔ پھوم مر چکا تھا۔
بشکیروں نے اظہار افسوس کے طور پر زبان سے تہ تہ تہ تہ کیا۔
نوکر نے پھاوڑا اٹھا کر پھوم کے لئے قبر کھودی اور اسے دفن کر دیا۔ چوٹی سے ایڑی تک بس اسے دو گز زمین کی ضرورت تھی!

اقتباسات

انجمن اقوام اور مدارس برطانیہ | یہ خبر دلچسپی سے پڑھی جائیگی کہ انگلستان میں اساتذہ کی مختلف جماعتوں اور لیگ آف نیشنس یونین کی جانب سے ایک یادداشت بعنوان "مدارس برطانیہ دامن عالم" بورڈ آف ایجوکیشن میں برائے غور پیش کی گئی ہے۔ اس کے پیش کرنیکی غرض یہ ہے کہ جو سفارش کچھ عرصہ قبل انجمن اقوام کی سب کمیٹی نے برطانوی مدارس میں انجمن اور اسکے اغراض و مقاصد کی تعلیم کی بابتہ کی ہے اس کی تائید کیجائے۔ اس تعلیم کے لئے جو دلائل پیش کئے اور جو طریقے بتائے گئے وہ قابل ذکر ہیں۔

یادداشت میں خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ کام اس طرح ہونا چاہئے کہ تعلیم کے دوسرے مقاصد بھی اس سے پورے ہوں۔ چنانچہ یہ ممکن ہے کہ اس کے ذریعہ نصاب تعلیم کے مضامین میں زیادہ نظم و ربط پیدا کیا جا سکے۔ اور سب کے سب ایک ہی وسیع مقصد" (یعنی انسانیت) کے تحت میں آسکیں جس پر طلبہ کے کیرکٹر کی مضبوطی کا انحصار ہے۔ کیونکہ بین الاقوامی اشتراک عمل کے واقعات اگر ایک طرف تاریخ جدید کا تتمہ ہیں تو دوسری طرف جغرافیہ سے بھی تعلق رکھتے ہیں، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ان تمام مضامین سے تعلق رکھتے ہیں جو مدارس کے نصاب تعلیم میں داخل ہیں اور جن میں سے ہر ایک کوئی نہ کوئی عالمگیر پہلو بھی رکھتا ہے اور بتاتا ہے کہ بنی نوع انسان کی اصل ایک ہی ہے۔

پھر مذکور ہے "اس علم میں عملی فوائد بھی ہیں، کیونکہ بین الاقوامی رشتہ کا مستقبل دنیائے جدید کے ہر طالب علم سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ جب تک کہ قانون کا نظام (Rule of Law) جس کے ہم اپنے ملکوں میں عادی ہو گئے ہیں، سارے جہان میں نہ قائم ہو جائے۔ انسان کے بہترین کارنامے اور اس کی بلند ترین کوششیں رائگاں جا سکتی ہیں۔ اور اسکی زندگی پھر بے قدر اور بے مقصد ہو جائیگی لیکن سارے جہان میں قانون کا نظام حکومتیں تنہا قائم نہیں کر سکتیں۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب اس ملک اور دوسرے جمہوریت پسند ملکوں کی رائے عامہ سارے جہان میں قانون کے نظام قائم ہونیکی ضرورت کو سمجھے اور اپنی م

وہ علم جس سے یہ نتائج مترتب ہوں شہریوں، انکے ملکوں، اور ساری دنیا کے لئے عملی فوائد

رکھتا ہے۔ علاوہ بریں ملک کے کسی باشندے سے مسائل خارجیہ کی نسبت نہ تو کسی معقول غور وفکر کی توقع کی جاسکتی ہے نہ عمل کی۔ اگر وہ اس امر کی نسبت کچھ بھی علم نہیں رکھتا کہ گزشتہ ایک سو سال سے اقوام عالم کا مفاد کس طرح ایک دوسرے سے وابستہ رہا ہے۔ حالات کا صحیح اندازہ کئے بغیر کچھ کرنا یا سوچنا اکثر مشکلات کا باعث ہوتا ہے اور آجکل کے بچے خود تہذیب ہی سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ اگر دنیائے جدید کی نسبت اسی غلط فہمی میں رہ کر بڑے ہوئے کہ یا تو انکے آباؤ اجداد کی یا آزاد حکومتوں کے درمیان بین الاقوامی "نزاج" (بدنظمی) کی یا ان کتب تواریخ دنیا سے جنکا خاتمہ ۱۹۱۴ء پر ہوتا ہے۔

اس کے بعد یہ کام ایسے اساتذہ کے سپرد کرنے پر زور دیا گیا ہے جو انجمن اقوام اور اسکے اغراض و مقاصد سے دلچسپی رکھتے ہوں۔ تاریخ اور جغرافیہ کو خاص طور پر وہ مضمون قرار دیا گیا ہے جس کے ضمن میں یہ تعلیم دیجائے۔ کیونکہ "انگلستان اور اسکاٹلینڈ کی تاریخ کو دنیا کی تاریخ سے ربط دیکر پڑھنے ہی سے انگریزی بچے انجمن اقوام کی قدر جان سکیں گے۔ کہ یہ پھل نخل زمانہ میں لگ کر پک چکا ہے" اور "دنیا کے مختلف ممالک و قوموں کے حالات، انکے اقتصادی مفاد کی باہم وابستگی، مغربی یورپ کے غیر مسلح خطوں نیز افریقہ و شرق وسطےٰ کے ممالک محروسہ کے نقشوں" سے واقفیت ہی انکی نظروں میں وسعت پیدا کر سکتی ہے۔

"انجمن کے اغراض و مقاصد کی تعلیم کے لئے جن علوم کا جاننا ضروری ہے ان میں صرف تاریخ و جغرافیہ ہی نہیں بلکہ جیسا کہا جا چکا ہے، وہ تمام علوم ہیں جو مدارس کے نصاب میں داخل ہیں۔ ہماری نسل کی طرح زبان بھی غیر ملکی عناصر پر مشتمل ہے۔ سائنس اپنی اصل میں بین الاقوامی ہے۔ اور اسی طرح سے فنون لطیفہ و فن تعمیر وغیرہ بھی یورپین طرز کی مختلف انواع ہیں۔ یہ تمام باتیں طالب علموں کے ذہنوں میں ڈالی جائیں۔

یہ سب کچھ تعلیم کے ذہنی پہلو سے متعلق تھا۔ اسکول میں بچوں کے جذبات کو برانگیختہ کرنا عموماً ناپسند کیا جاتا ہے۔ تاہم یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ صرف نئے علم سے جب تک جذبات و مقاصد میں بھی تھوڑی بہت تبدیلی نہ پیدا ہو۔ بین الاقوامی اشتراک عمل کو دنیا کے کاروبار میں اصول کار نہیں بنایا جا سکتا۔ یہ احساس بھی پیدا کرنا چاہیئے کہ انسان سارے عالم کا شہری ہے۔ پریسیڈنٹ ولسن نے ایک بار کہا تھا کہ "وہ زمانہ ان کی نگاہوں کے سامنے ہے جب لوگ انسانیت سے غداری کرنا ایسا ہی شرمناک سمجھیں گے جیسا آج کل وطن

سی غداری کہا جاتا ہے۔" کسی انگریز، یا برطانوی، یا برطانوی دولت متحدہ اقوام (جو خود انجمن اقوام کا ایک نمونہ ہے) سے شہرے کے لئے کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ کیوں نہ مفاد انسانی کی روز افزوں وسعت پذیری کے ساتھ ساتھ موجودہ حب الوطنی بھی وسیع تر وفاداری کے جذبات میں تبدیل ہوتی جائے۔ یہاں تک کہ ہم دن بدن قریب آنے والی دنیا میں کل کے ساتھ غداری اجزا کے ساتھ (مشمول وطن خود) غداری جائے

"اس وسیع تر وفاداری کے پیدا ہونے سے موجودہ جذبات میں جو تبدیلی ہو اس کے ساتھ ساتھ مقصد میں بھی تبدیلی درکار ہے یعنی ایک ایسی خواہش کا پیدا ہونا، جو دنیا کا خیال سب سے اول رکھے۔"

دنیا کی اقتصادی کانفرنس جنگ عظیم کے بعد دنیا کی اقتصادی حالت بہت خراب ہوگئی تھی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ جنگ کے باعث ملکوں کو جو مالی نقصانات ہوئے اُن کی تلافی کے لئے انہیں ایسی صورتیں اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑا تھا جو خواہ وقتی اعتبار سے ضروری ہی ہوں آگے چلکر بہت مضر ثابت ہوئیں اور ان کے مجموعی اثر سے دنیا کی اقتصادی زندگی میں بہت ابتری پھیل گئی اس کے لئے انجمن اقوام کی طرف سے متعدد کانفرنسیں منعقد ہوئیں اور ان کی تجاویز سے تھوڑی بہت حالتوں کے سدھرنے میں امداد ہوئی لیکن پھر بھی اصلاح کی ضرورت بہت کچھ باقی ہے۔ چنانچہ اسی لئے امسال پھر جمعیت اقوام کے زیر اہتمام جنیوا میں ایک کانفرنس اسی غرض سے منعقد ہوئی ہے کہ بین الاقوامی اقتصادی مسائل پر غور کرنے۔ اس کانفرنس کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ یہ پچاس ملکوں کے بھیجے ہوئے اراکین پر مشتمل تھی اور ایک سال سے اس کے ایجنڈے کی تیاری اور اسمیں پیش ہونے والے مسائل پر غور و خوض و مطالعہ ہوتا رہا ظاہر ہے کہ اس بین الاقوامی کانفرنس کے محققانہ فیصلے دنیا کی آئندہ اقتصادی حالت پر کتنا اثر ڈالنے والے ثابت ہونگے۔

کانفرنس کی رپورٹ کا مرکزی بحث یہ ہے کہ ان موانعات کو کم کیا جائے جو ایک ملک دوسرے ملک سے آئی ہوئی اشیا کی فروخت پر (ٹیکسوں وغیرہ کی صورت میں) عائد کرتا ہے اسمیں شبہ نہیں کہ آزاد تجارت کا اصول کانفرنس میں خارج از بحث تھا، کیونکہ یہ کانفرنس مختلف ملکوں اور ہر نقطہ نظر کی نمائندہ تھی۔ مگر سب کے سب اس پر متفق تھے کہ زیادہ سے زیادہ تجارتی آزادی دیجائے۔

چنانچہ رپورٹ میں مذکور ہے کہ غیر ملکی اشیائے تجارت پر ٹیکس لگانے کا جو دستور جنگ کے بعد سے

قائم ہوگیا ہے۔ اس کی اگرچہ بعض نہایت ہی شدید صورتیں اب نسبتاً کم ہوگئی ہیں۔ تاہم اب بھی اصلاح کی ضرورت ہے۔ اسکے لئے چار خاص خاص وجوہ جو بتائے گئے ہیں یہ ہیں۔

۱۔ غیر ملکی اشیاء پر بڑے ٹیکس لگانا، جو آئے دن بدلتے بھی رہتے ہیں، پیدائش اور تجارت کو بہت نقصان پہنچائے گا۔

۲۔ تجارت میں آسانیاں بہم پہنچانے سے دنیا کی اقتصادی حالت بہت کچھ سدھر سکے گی۔

۳۔ اگرچہ غیر ملکی اشیاء پر ٹیکس لگانے کا حق ہر آزاد ملک کو ہے، مگر پھر بھی یہ کسی ملک کا خالص نجی معاملہ نہیں ہے

۴۔ جن وجوہ کی بنا پر غیر ملکی اشیاء کی تجارت میں رکاوٹیں پیدا کردی گئی ہیں، انمیں سے بہتیری اب باقی نہیں ہیں اور جو باقی ہیں وہ برابر کم ہو رہے ہیں۔

خاتمہ رپورٹ کا پانچ تجاویز پر ہوتا ہے۔ انمیں سے دو قابل ذکر ہیں، ایک میں تو بہت سے ملکوں کے بھیجے ہوئے نمائندوں کی شرکت کو بین الاقوامی اشتراک عمل کے لئے شگون نیک خیال کیا گیا ہے۔ اور دوسرے میں اس بات کی ضرورت بتائی گئی ہے کہ دنیا کے ممالک حتی الامکان ایسے طرز عمل سے احتراز کریں جن سے اقتصادی دشواریاں پیدا ہوں۔ کیونکہ یہی مشکلات جنگوں کی محرک ہوتی ہیں۔

(ع۔ق۔ج)

تنقید و تبصرہ

القاسم | دار العلوم دیوبند کا ماہوار دینی و علمی رسالہ۔ زیر ادارت مولنا حبیب الرحمن صاحب

یہ رسالہ دار العلوم دیوبند کے آرگن کی حیثیت رکھتا ہے، اور ایک عرصہ سے جاری ہے۔ مذہبی رنگ غالب ہے۔ اسکے مضامین اکثر قدیم "تذہبیت" اور جدید "عقلیت" کی رزم گاہ ہوتے ہیں جس میں آخر الذکر کو ہمیشہ "قلم درکف دشمن" ہونے کا گلہ رہتا ہے۔ تاہم مضامین بیشتر سنجیدہ ہوتے ہیں۔ اس رسالہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ استقلال کے ساتھ جاری ہے اور اپنا ایک مخصوص انداز و معیار رکھتا ہے۔ جو لوگ غور و خوض کے بعد لکھے ہوئے مذہبی مضامین، نئے خیالات کے غلبہ کے خلاف پرانے خیالات کی مضطربانہ جد و جہد، فقہی نکات و لطائف، اور دار العلوم دیوبند کے حالات سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ اس رسالہ کو مفید پائیں گے۔ کاغذ کتابت، طباعت عمدہ۔ حجم ۶۴ صفحے چندہ سالانہ دو روپے آٹھ آنے مع محصولڈاک قیمت فی پرچہ ۴ر دفتر القاسم دار العلوم دیوبند سے مل سکتا ہے۔

تجلی | سہ ماہی علمی و ادبی رسالہ۔ زیر ادارت محمد سردار علی صاحب

پیش نظر نمبر کاغذ کتابت اور طباعت کے لحاظ سے بہت اچھا ہے۔ لیکن حجم ایک سہ ماہی رسالہ ہونیکی حیثیت سے کم ہے یعنی صرف ۸۰ صفحے۔ شاید سہولت یا چندہ کم رکھنے کی غرض سے۔ مضامین دلچسپ اور پر از معلومات ہیں۔ مگر سہ ماہی رسالہ کے لئے جیسے بلند پایہ تحقیقی مضامین ہونے چاہئیں، نہیں ہیں لیکن ہندوستان کے عام رسالوں کے معیار، اور مضامین کی حیثیت کو دیکھتے ہوے اس سے زیادہ کی امید رکھنا بھی عبث ہے۔ اگر رسالہ کا موجودہ معیار ہی قایم رکھا گیا تو غنیمت ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ رسالہ ہمت افزائی کے قابل ہے۔

عام قیمت سالانہ (عا) ششماہی (عہ) فی پرچہ (۱۲ر) گورنمنٹ سے صر سالانہ
منیجر رسالہ "تجلی" کتب خانہ مسجد چوک۔ حیدرآباد سے طلب کیجئے۔

کیف | صحیفہ علمی و ادبی زیر ادارت جناب رفیعی اجمیری" سائز ۲۲×۲۰/۸

یہ ایک ماہانہ رسالہ ہے جو اجمیر سے نکلنا شروع ہوا ہے۔ اگر صرف حسن ظاہری و باطنی ہی کو رسالوں کے پنپنے کا ذریعہ سمجھا جائے تو پہلی ہی نظر میں خیال گزرتا ہے کہ اس رسالہ کی مدت حیات بہت کم ہے سرورق خاصہ خوشنما ہے۔ مگر اندر کا حصہ بلحاظ مضامین، کاغذ، کتابت، طباعت کے بہت ہی قابل اصلاح ہے اگر دوسرے نمبروں میں بھی یہی شان قایم رہی تو ہم سمجھیں گے کہ یا تو اس رسالہ کو اشاعت کی پروا نہیں ہے۔ یا عام مذاق سے سوءظن رکھتا ہے۔ امید ہے کہ آئندہ اس کی کمیوں کو پورا کر کے اس کو ایک بلند پایہ علمی و ادبی رسالہ بنا یا جائیگا۔ حجم ۸۰ صفحے چندہ سالانہ (للعہ) ششماہی (۶عہ) قیمت فی پرچہ (۱۳/۲) نمونہ مفت
ملنے کا پتہ: منیجر دفتر کیف حویلی پیرزادگان۔ اجمیر شریف (ع۔ ق۔ ج)

دنیائے افسانہ | مصنفہ محمد عبد القادر صاحب سروری تقطیع ۲۰×۲۶/۱۶ حجم ۱۰۲ صفحات قیمت ۱۲ ملنے کا پتہ مکتبہ ابراہیمیہ اتحادی حیدر آباد، دکن

اس کتاب میں ادب اردو کے اُس خاص شعبہ سے بحث کی گئی ہے جس کو افسانہ کے وسیع مفہوم سے موسوم کر سکتے ہیں۔

اُردو ادب کی کم مائگی کو دیکھتے ہوئے سروری صاحب کی یہ مفید کوشش یقیناً قابل داد ہے جو "دنیائے افسانہ" کی صورت میں پیش کی گئی ہے اور جو پہلی سائنٹفک تصنیف ہے جس میں افسانوی ادب کے تمام متعلقات پر تفصیلی اور محققانہ انداز کی بحث پائی جاتی ہے۔

افسانہ کی جملہ جزئیات، اُنکی اہمیت، ضرورت، ابتدا، ارتقا مختلف اقسام و فن پر ہر پہلو سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ ترتیب بھی خاصی ہے بعض ابواب مثلاً "ناول کا موضوع"، "ناول نگاروں کے فرائض" "فورٹ ولیم کالج کی کوششیں" وغیرہ مصنف کے ذوق اور التزام مطالعہ و کاوش کو ظاہر کرتے ہیں۔

ہم مصنف کی اس رائے سے متفق ہیں کہ آجکل اُردو زبان میں جو صد درجہ عریاں تحریریں "ادب لطیف" کے نام سے شائع ہو رہی ہیں وہ سخت نکتہ چینی کے قابل ہیں۔

کتاب بحیثیت مجموعی مفید اور دلچسپ ہے، زبان سلیس و شستہ ہے کہیں کہیں کتابت کی غلطیاں رہ گئی ہیں۔ جو زیادہ قابلِ اعتنا نہیں۔

کتابت و طباعت میں حیدرآباد کے اب عام مطابع نے بھی خاصی ترقی کرلی ہے۔ پہلی نظر میں یہ کتاب علیگڈھ کی مطبوعہ معلوم ہوتی ہے۔ بہرحال ہماری رائے میں مصنف، طابع و ناشر سب قابلِ داد اور مستحق حوصلہ افزائی ہیں۔

الہلال شائقین علم و ادب کے شدید و مسلسل انتظار کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد کا مشہور و معروف ہفتہ وار مصور رسالہ اب تیسری بار پھر جاری ہوا ہے۔ مسلمانان ہند کی تاریخ بیداری اور زبان اُردو کی تاریخ صحافت میں الہلال کے پہلے اور دوسرے دور کو نمایاں امتیاز حاصل ہے۔ اس عرصہ میں اُردو نے کافی ترقی کرلی ہے اور بے شمار رسالے و اخبارات نکلنے لگے ہیں لیکن سچ یہ ہے کہ الہلال اپنے اس تیسرے دور میں بھی سب سے بلندپایہ سب سے مفید اور اُردو میں بے نظیر رہا ہے۔ اب تک ۶ نمبر نکل چکے ہیں ہر ایک اپنی ظاہری و معنوی خوبیوں کے لحاظ سے اپنے سابقہ دوریوں کی مبارک یاد تازہ کرتا ہے۔ سرورق کی سادہ دلکشی لیتھو کے حصہ میں حسین کتابت اور پاکیزہ طباعت کا کلکتہ جیسی جگہ میں انتظام کرلینا مولانا ہی کا حصہ کہا جا سکتا ہے آپ کا حصہ علاوہ اپنی دیگر خصوصیات اور حسن آفرینیوں کے بہت سی تصاویر سے مزین ہوتا ہے، غرضکہ شروع سے آخر تک ہر صفحہ حسن اہتمام و صحت ذوق کا قابلِ قدر نمونہ ہے۔

الہلال کی ممتاز خصوصیات اُس کا حشو و زوائد سے پاک ہونا ہے۔ اپنے معنوی محاسن کے اعتبار سے بھی مروجہ رسائل و اخبارات کے لئے اب بھی پہلے دوروں کی طرح قابلِ تقلید نمونہ ہے۔

"آثار عتیقہ"، "مذاکرہ علمیہ"، "بصائر و حکم" وغیرہ عنوانات مستقل ہیں اور اُنکے تحت نہایت گراں پایہ اور بیحد مفید مضامین برابر آرہے ہیں۔ آخرالذکر میں "انسانیت موت کے دروازہ پر" اور "مشاہیر عالم اپنے اوقات وفات میں" کے زیر عنوان حضرت علی اور حضرت امام حسین علیہم السلام کا واقعہ شہادت پوری تفصیل کیساتھ بڑے ہی عبرت آموز طریقہ پر جاری ہے اور یہ عنوان خصوصیت سے نہایت مفید ہوگا جس کی ترتیب میں مخصوص کاوش و محنت کو دخل ہے۔ "بریدِ فرنگ" میں مغربی ممالک سے آنے ہوئے مقتدر

اور قیمتی معلومات سے پر مکاتیب کا سلسلہ بھی بہت مفید و کارآمد ہے۔

اتنک پڑوا فسانے بھی نکل چکے ہیں جن میں ایک کا مغربی اور دوسرے کا مشرقی اسلامی تاریخ سے تعلق ہے۔ دونوں اپنی اپنی جگہ بیحد مفید و بلند پایہ ہیں اور ضرورت ہے کہ اردو میں اس قسم کی چیزیں پیدا کیجائیں۔ کیا اردو میں "ادب لطیف" کا غلط مفہوم سمجھنے والا گروہ اس قسم کے فسانوں پر توجہ کریگا؟ ہم مولنا کے اس اصول کو بھی صحیح سمجھتے ہیں کہ۔

بزم میں اہل نظر بھی ہیں تماشائی بھی

بہرحال ادبیات اردو کے آشنا تفنن طبع و تفریحی مضامین کے شائق علمی و مذہبی بلند پایہ مقالات کے متلاشی اور عام پبلک سب کے لئے الہلال حقیقۃً نہایت مفید و قابل قدر ہے جسمیں بہت کافی مواد ہوتا ہے۔ منسلہ ۲۰×۳۰ سائز کے ۲۴ صفحات اور بہترین کاغذ وغیرہ کو دیکھتے ہوئے چندہ سالانہ عہ ۱۲ معہ محصولڈاک کچھ بھی زیادہ نہیں ہے۔ بلکہ کم ہے۔

ملنے کا پتہ منیجر الہلال ۱۱ بالی گنج سرکلر روڈ۔ کلکتہ (م۔ا۔ا)

شذرات

لیگ آف نیشنس (انجمن اقوام) کا قیام جنگ عظیم کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ اتحاد عالم کا تخیل شاید اس قدر جلد نہ فروغ پاتا۔ اگر جنگ کے تباہ کن نتائج اس سے ایک عام بیزاری نہ پیدا کر دیتے۔ اس میں شک نہیں کہ دنیا کی بڑی بڑی سلطنتوں کا طرز عمل ابھی تک نہیں بدلا ہے۔ کمزور ملکوں پر دراز دستیاں اسی طرح جاری ہیں، رنگ اور قوم کے امتیاز میں وہی شدت ہے، آپس کی چشمک اسی طرح قائم ہے۔ تخفیف سامان حرب کا مسئلہ اسی طرح ناقابل حل ہے لیکن اس سے انجمن پر کوئی الزام نہیں آتا۔ اسکے رفیع تخیل پر عمل کرنیکے لئے دنیا ابھی تیار نہیں ہے، اور عرصہ تک نہوگی تاہم اسکا وجود اس گری ہوئی حالت میں بھی کہ جب اس کی کارروائیوں میں قیام امن کی مخلصانہ کوششوں کے بلند آہنگ دعووں کے باوجود اس کے اراکین کی خودغرضیاں صاف جھلکتی ہیں فائدے سے خالی نہیں۔ کیونکہ یہ بلا واسطہ یا بالواسطہ انسانوں کا ذہن ان امکانات کیطرف منتقل کرتی رہیگی جو دنیا کے اتحاد اور اسکے نتائج میں مضمر ہیں۔ اور جو باتیں آج ناممکن ہیں انکے آئندہ ممکن بنانے کے لئے پیہم تبلیغ ہوتی رہے گی۔

چنانچہ یہ خبر دلچسپی سے پڑھی جائیگی کہ انگلستان میں انجمن اقوام ہی کی تحریک سے اساتذہ کی مختلف جماعتوں اور لیگ آف نیشنس یونین کی جانب سے ایک یادداشت اس تجویز کی تائید میں پیش کی گئی ہے کہ انجمن اقوام اور اسکے اغراض ومقاصد سے متعلق ضروری معلومات مدرسوں کے نصاب تعلیم میں داخل کرلیجائیں تاکہ مدرسہ چھوڑنے سے قبل طلبہ انجمن سے بخوبی آشنا ہوجائیں اور اس کے اغراض ومقاصد سے ہمدردی رکھیں۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان نہایت دلفریب تجویزوں سے نہیں ہے جو محض دلچسپی کے لئے پیش کیجاتی ہیں اور جن پر عمل نہ کرنے کے بہت سے وجوہ ہوتے ہیں۔ بلکہ اس میں ایک معقول اور قابل عمل اسکیم ہے جس پر بڑی حدتک عملدرآمد بھی ہوچکا ہے۔

اس تحریک کے پیش کرنیوالے مستحق تحسین ہیں۔ انہوں نے بہت صحیح طریقہ اختیار کیا ہے۔ انجمن اقوام کے مشن کی تبلیغ کا تعلیمگاہ ہی وہ مقام ہے جہاں خیالات و تصورات کی تشکیل ہوتی ہے۔ اور زندگی کا لائحہ عمل بنتا ہے۔ ملک کے نوجوان یہاں سے جو زندگی کی نظری تعلیم حاصل کرکے جاتے ہیں وہی انکے آئندہ طرز عمل کی رہنما بنتی ہے۔ اس صورت میں اگر انکی تعلیم کا ایک حصہ عام اخوت و اتحاد کے سبق پر مشتمل ہو جو انجمن کا مقصد وحید ہے، تو اس سے بہت ہی مفید نتائج مترتب ہونگے۔

اگرچہ ہمیں اسمیں کلام ہے کہ صرف نظری تعلیم کافی ہوگی کیونکہ دنیا نصیحتوں سے نہیں سیکھتی، تجربہ سے سیکھتی ہے۔ اور جب تک منفرد رہنے کے فوائد ہر ملک کے لئے متحد رہنے کے فوائد سے واقعتہً کم نہ ہوجائینگی اسوقت تک اتحاد عالم کی اسکیم محض ہوائیں رہے گی۔ تاہم تعلیم سے اتنا تو ضرور ممکن ہے کہ آنے والی نسلیں بنی نوع انسان کو زیادہ محبت کے ساتھ اور اُسکے مصائب و تکالیف کو زیادہ ہمدردی کے ساتھ دیکھنے کیطرف مائل ہونگی

ہندوستان کے لئے بھی ایک ایسی تعلیمی پالیسی درکار ہے جو، اتحاد عالم تو بعد کی چیز ہے، ملک میں وطنیت کے تخیل کو ترقی دے اور ان دو بڑے بڑے فرقوں میں اتحاد و اتفاق پیدا کرے جن کے تعلقات کی کشیدگی ملک کو ہر قسم کی ترقی سے روکتی ہے۔ اگر آپ غور کرینگے تو معلوم ہوگا کہ اس کشیدگی کا سبب ملک کی ناقص تعلیمی پالیسی کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ بدقسمت ملک جہاں جماعت سے لیکر سبھا اور لیگ تک "ہندو" اور "مسلم" ہے ایک بڑی تعداد تعلیمگاہوں کی بھی انہیں فرقہ دارانہ اوصاف سے متصف رکھتا ہے، جہاں "ہندو" اور "مسلم" نقطۂ نظر سے بچوں کی تربیت و تعلیم ہوتی ہے۔ اور مشترک مدارس میں بھی انکے دستور العمل میں وطنی خیال کے لئے کہیں جگہ نہیں ہے چنانچہ ان درسگاہوں کے سند یافتہ نوجوان کوئی مشترک نصب العین نہیں رکھتے، اور اپنے اپنے فرقوں کے مستقبل کو ایک دوسرے سے آزاد و غیر متعلق سمجھتے ہیں۔

تعجب ہے ان "ماہرین تعلیم" پر جو ملک کی تعلیم کو وطنی نقطۂ نظر سے دیناضروری نہیں سمجھتے اور خاموش ہیں اور افسوس ہے ان "رہنمایان قوم" پر جو تعلیمگاہوں کو چھوڑ کر محض اخباروں کو قومی پروپیگنڈے کا ذریعہ بناتے

ہیں، اور نہیں سمجھتے کہ عام پبلک انکے تخیلات کی قدر عمر کا بڑا حصہ غلامی اور غیر ذمہ داری کی حالت میں گزارنے کے بعد مشکل پہچان سکتی ہے، اور اگر یہ ہو بھی گیا تو انہیں عملی جامہ پہنانے کیلئے اپنے اندر کیرکٹر نہیں پیدا کر سکتی۔

اگر ملک میں صحیح وطنیت کا بیج بونا اور اس کے اندر آزادی و ذمہ داری کا جذبہ پیدا کرنا ہے تو تعلیمگاہوں کی اصلاح سب پر مقدم ہے، کہ یہاں تخیل اور کیرکٹر دونوں کی تعمیر ممکن ہے تعلیمگاہوں کی جگہ اخبارات کو ذریعہ بنانے والے چشمۂ آب کو چھوڑ کر سراب کے پیچھے دوڑتے اور قومیت کی بنیاد مضبوط چٹان کے بجائے ہوا پر قائم کرنا چاہتے ہیں۔

رائل کمیشن عنقریب اپنی تحقیقات شروع کرنے والا ہے۔ ضروری ہے کہ شہادتوں میں مسئلہ تعلیم کو غیر معمولی اہمیت دیجائے قانونی اصلاحات کے ذریعہ جو چند "نیشن بلڈنگ" (قومیت کی تعمیر کرنے والے) محکمے ہندوستانیوں کے ہاتھ میں آئے انمیں ایک محکمۂ تعلیم بھی ہے۔ اصلاحات کی دوسری قسط سے ہندوستانیوں کے عام اختیارات انتظامی میں خواہ جس حد تک بھی توسیع ہو۔ محکمۂ تعلیم پر زیادہ سے زیادہ اختیارات حاصل کرنے کے لئے متفقہ مطالبہ کرنا چاہئے، تاکہ ملک میں ایک ایسی تعلیمی پالیسی پر عمل کرنے کا موقع ملے جس سے واقعی طور پر "قومیت کی تعمیر" ہو۔ اگر حکومت اس مطالبہ کو نامنظور کرے، اور یہ بہت زیادہ خلاف توقع بھی نہیں ہے، تو ملک میں پرائیویٹ قومی اسکولوں اور کالجوں کے قائم کرنے کی زبردست تحریک پھیلانی چاہئے۔ یہ ایک ایسا نقطہ ہے جس پر موالاتی اور ترک موالاتی، سوراجی اور مشروط تعاونی، خلافتی اور ہندو سبھائی، کانگریسی اور مسلم لیگ والے سب کے سب متفق ہو سکتے ہیں، اگر انکے دل میں قوم کا سچا درد اور اس کی خدمت کا صحیح جذبہ موجود ہے ایسے چند تعلیمی اداروں کا کامیابی سے چلا لینا بھی ملک کے مستقبل پر عظیم الشان اثر ڈالے گا۔

کیا وہ لوگ جنہیں "اکابرین قوم" کے نام سے پکارا جاتا ہے، گئو رکھشا اور باجے کے انسداد کی کوششوں سے اتنا وقت بچا سکیں گے کہ انسان کی حفاظت اور اُسکی عزت نفس کے قائم رکھنے کے لئے بھی کچھ کر سکیں؟ - اگر ایسا ممکن ہوا تو جہاں انانیت، شہرت پسندی، تنگ نظری اور خدمت قوم کے

ضائع کردیئے جانے والے موقعوں کی داستانوں سے دفتر کے دفتر سیاہ ہونگے ۔ وہاں انکے نامہ اعمال کے چند صفحے اس عمل نیک کے بیان سے بھی روشن ہونگے ۔ اور شاید یہ انکی نجات کا سبب بنے ۔

دنیا کی اقتصادی کانفرنس کا منعقد کرانا جمعیت اقوام کے لئے باعث فخر و مباہات ثابت ہوگا ۔ کانفرنس کے مجمل حالات کا اقتباس پہلے صفحوں پر ہدیہ ناظرین کیا جا چکا ہے ۔ یہاں چند سطور میں اس پر مزید روشنی ڈالنی مناسب ہوگی ۔ اپنی نوعیت میں یہ پہلی کانفرنس نہیں ہے ۔ جنگ عظیم کے بعد سے دنیا کی اقتصادی حالت میں جو ابتری پھیلی ہے ، اس کی درستی کے لئے متعدد بین الاقوامی کانفرنسیں ہو چکی ہیں لیکن ابتداءً ان میں زیادہ تر ایسی تھیں جن کی غرض صرف وقتی مشکلات کو دور کرنے پر غور و خوض کرنا تھا ۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں پہلی بار برسلز میں ایک بین الاقوامی اجتماع اس لئے ہوا کہ مستقل اقتصادی دشواریوں پر غور کرے ۔ مگر اسمیں شریک ہونیوالی قوموں کے خیالات اور حکمت عملی کے اختلاف نے اس اجتماع کو زیادہ کامیاب ہونے نہیں دیا ۔ اور ایک دوسرے اجتماع کی ضرورت باقی رہی ۔

چنانچہ وہ ضرورت اس سال پوری کی گئی ۔ یہ کانفرنس ایسے اراکین پر مشتمل تھی جو دنیا کے بڑے بڑے ممالک سے آئے ہوئے تھے ۔ اور اگرچہ نمائندوں کی حیثیت نہ رکھتے تھے مگر اپنی ملکی حکومتوں کے نامزد کردہ ضرور تھے ۔ کانفرنس میں شریک ہونے والے سب کے سب اپنے وقت کے متبحر عالم ہیں اور اقتصادیات عالم پر نظری و عملی دونوں حیثیتوں سے کمال بصیرت رکھتے ہیں ۔ انکی تجاویز محققانہ ہونیکے علاوہ ملکوں کی حکومتوں کے نزدیک قابل اعتنا ہونیکا بھی امکان رکھتی ہیں ۔ کیونکہ کانفرنس کے تمام اراکین حکومت کے بااثر لوگ ہیں ۔

کانفرنس کی بین الاقوامی اور اس کے اراکین کی نیم سرکاری حیثیت ، انکا تبحر ، اور سب سے بڑھ کر ، اتفاق اور اشتراک عمل کیطرف رجحان ، جو کانفرنس کے متفقہ فیصلوں سے صاف ظاہر ہے ، امید افزا

چیزیں ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ کانفرنس نے دنیا کی اقتصادی حالات کے سدھارنے کے لئے جو کچھ کیا ہے وہ اپنے نتائج کے لحاظ سے بہت اہم اور قابل قدر ثابت ہوگا۔

ترکی جدید کے متعلق ہمارا مبلغ علم بیشتر وہ معلومات ہیں جو اخباروں کے ذریعہ ہمیں ملتی رہتی ہیں۔ یہ اطلاعات کبھی کبھی غلط صورت میں، اور عموماً غلط اہمیت کے ساتھ شائع ہوتی ہیں۔ پھر کسی مخصوص طرز عمل کے سمجھنے اور اس پر رائے زنی کرنے کے لئے صورت حالات سے بے خبری اس پر مستزاد۔ علاوہ برایں جن بظاہر غیر معمولی واقعات کی خبریں ہم تک پہنچتی ہیں، وہ بالکل منفرد اور ایک دوسرے سے مختلف و آزاد ہوتے ہیں، اور اس تحریک کا مکمل تصور نہیں پیش کرتے جو انکی تہ میں کام کر رہی ہے۔ اسی وجہ سے ترکی کی جدید تمدنی تحریک ہمارے لئے ایک راز سربستہ کی حیثیت رکھتی ہے، اور ہم اس کے موافق یا مخالف کوئی صحیح رائے قائم کرکے آئے دن رونما ہونے والی تبدعات شنیعہ کو اسی نقطہ نظر سے دیکھنے کے بجائے ہر ایک پر الگ الگ نظر ڈالکر کبھی حیرت کرتے ہیں کبھی غصہ۔

جب تک ہماری معلومات کا ماخذ ترکی تصانیف براہ راست نہ ہوں، ہماری ناواقفیت اور غلط فہمی کا ازالہ محال ہے۔ کیونکہ ترکوں کے خیالات و نقطہ نظر کے سمجھنے اور اس تمدنی تحریک کے رجحانات خصائص اور اسباب و علل کا صحیح حال جاننے کے لئے جو انہیں ایک زندگی کیطرف لیجا رہے ہیں بہترین ذریعہ خود ترک ہی ہو سکتے ہیں۔ ضروری ہے کہ اس مقصد کے لئے مفید اور پر از معلومات تصانیف ترکی زبان سے اردو میں منتقل کرائی جائیں۔ اگر ایسا نہ ہوا اور بالواسطہ ذرائع پر ہی قناعت کی گئی تو حقیقی ترکی ہمیشہ تاریکی میں رہیگی اور اس کے کارناموں کے اعتراف اور اس کی دشواریوں سے ہمدردی کی جگہ ہمارے دل میں اس سے بیجا عداوت و نفرت پیدا ہوگی

خوش قسمتی سے اس معاملہ میں سبقت کا موقع جامعہ کو حاصل ہوا ہے۔ امید ہے کہ ہم ناظرین

لی ضیافت طبع کے لئے ترکی کی جدید تمدنی تحریک پر مسلسل مضامین نکال سکیں گے۔ اس سلسلہ کی پہلی کڑی بعنوان "ترکیہ جدید میں تمدنی تحریک" اس نمبر میں ہدیہ ناظرین ہے۔ یہ ڈاکٹر احمد محی الدین کی کتاب "ترکیہ جدیدمیں تمدنی تحریک" کے دیباچہ کا ترجمہ ہے جو انہوں نے جرمن زبان میں تصنیف کی ہے۔ ڈاکٹر موصوف ایک ترک ہیں جو لائپزک یونیورسٹی میں ترکی زبان وادب کے پروفیسر ہیں اور جو مضامین آئندہ نکلیں گے وہ بھی اسی کتاب کے ابواب کا ملخص یا ترجمہ ہونگے ختم ہونے پر شاید انہیں علیحدہ ایک کتاب کی صورت میں بھی شائع کیا جاسکے مگر یہ موقوف ہے مساعدت حالات پر۔

آج کل اسکولوں اور کالجوں میں موسیقی کی تعلیم پر بڑا زور دیا جارہا ہے۔ ماہرین تعلیم کے نزدیک موسیقی نہ صرف جذبات سے تعلق رکھتی ہے بلکہ اسکا اثر جسم ودماغ دونوں پر پڑتا ہے۔ حال میں سلطنت برطانیہ کی تعلیمی کانفرنس نے بھی اس مسئلہ پر غور کیا۔ سر ایچ ہیڈو جنہوں نے کانفرنس میں اسے پیش کیا، بتایا کہ گزشتہ چند سال سے ماہرین تعلیم موسیقی کیطرف بہت متوجہ ہورہے ہیں، اور اسکو طالب علموں کی ذہنی تربیت کے لئے ضروری قرار دیتے ہیں۔ سر ہیڈو نے خود بھی اس سے اتفاق ظاہر کیا۔ کیونکہ ان کے خیال میں موسیقی کی زبان کیا بلحاظ حسن وکیا بلحاظ پیچیدگی عبارت ودقت معنی وہی مرتبہ رکھتی ہے جو شیکسپیر اور ملٹن کی زبانوں کا ہے، اور انہیں کی طرح سیکھی جانے کی مستحق ہے۔

یورپ کی دیکھا دیکھی ہندوستان کے مدارس میں بھی موسیقی کو رواج دینے کی تحریک عام ہورہی ہے۔ معلوم نہیں ہمارے علما کس حد تک اس کی تائید کرینگے۔ مخالفت تو شاید بہت ہوتی اور اب بھی ہوگی مگر یورپ سے اٹھی ہوئی دوسری نئی تحریکوں کے مقابلہ میں اس کے لئے آسانیاں زیادہ ہیں، کیونکہ ایک طبقہ نے موسیقی کو "روح" کے لئے مفید پاکر پہلے ہی سے سند جواز دے رکھی ہے!

یکم اگست سے جامعہ ملیہ اسلامیہ کا نیا تعلیمی سال شروع ہورہا ہے۔ ایکی چھٹیوں میں وفود منیں بھیجے

[illegible] اصل طلبہ کی تعداد روز بروز زیادہ ہوتی گئی ہے کیا باعث ہے جو ترقی [illegible]

تعداد میں ہے۔ لوگ سمجھنے لگے ہیں کہ یہ مدرسہ کسی انقلابی تحریک کے تحت نہیں قائم کی گئی ہے بلکہ

جامعہ تعلیمی نصب العین رکھتی ہے۔ اس کا مقصد صرف اس قدر ہے کہ علمی قابلیت کے ساتھ ساتھ نوجوانوں کو

[illegible] اور دینی و ملی فرض کا احساس بھی پیدا کرے۔ ادھر چل کے مدرسہ جامعہ نے دوسرے مدارس کے

مقابلہ میں جو امتیاز حاصل کر لیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اکثر مقامی حضرات نے اب اس کی طرف توجہ شروع کر دی

ہے۔ اور اپنے بچوں کو تعلیم کے لئے یہاں بھیج رہے ہیں۔ انشاء اللہ یہی خدمت ہی جامعہ کا اشتہار ثابت ہو گی

تاہم بیرونی حضرات کو جامعہ اور اس کے اغراض و مقاصد سے واقف کرنے کیلئے اخبارات و رسائل میں

مضامین لکھنے ضروری ہیں۔ اس غرض سے اہل قلم ہمدردان جامعہ نے پوری طرح سبکدوشی حاصل نہیں کی

ہے۔ تاہم چند روز سے ملک کے اکثر مقتدر اخبارات نے جامعہ پر ہمدردانہ مضامین لکھنے شروع کر دئے ہیں

جامعہ انکے اس احسان کی بیحد ممنون ہے۔

کاش اس کے ساتھ یہ بھی کہا جا سکتا کہ قوم نے جامعہ کی مالی امداد کیطرف بھی ہاتھ بڑھایا۔ مگر یہ راز ہمارا

افسوس اور شکایت کے لئے کیا رہ جاتا ہے؟ ہمارے شاعروں نے "عشاق" کی زندگی کا جو نقشہ پیش کیا ہے

وہ خواہ افراد کے حسب حال نہ ہو، اکثر "قومی" اداروں کے حسب حال ضرور ہے جنہیں ہمیشہ قوم کی بے [illegible]

کا گلہ رہتا ہے، اور جو بے شمار تمناؤں کے ساتھ صرف "وعدوں" کی آس پر گزارہ کرتے ہیں!

رسالہ جامعہ چار سال سے ملک و قوم کی خدمت انجام دے رہا ہے اور اپنے سنجیدہ و بلند پایہ علمی و ادبی

مضامین کی بدولت ملک کے بہترین صحائف میں جگہ پا چکا ہے۔ خوش قسمتی سے اُس کو ایسے مواقع بھی حاصل

ہیں کہ ادبیات حاضرہ و علوم جدیدہ سے متعلق بلند پایہ مضامین شائع کر سکے۔ ان سے فائدہ اٹھانے کی

پوری کوشش کی گئی ہے۔ مستقل [illegible] کی فہرست دیکھنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ [illegible]

[illegible] وقت کے [illegible] التزام کر دیا گیا ہے۔

[illegible] جامعہ [illegible] بہت بڑی تعلیمی خدمت کر رہا ہے کیونکہ ہندوستان کی [illegible]

فہرست مضمون نگاران رسالہ جامعہ

جلد ہشتم از جنوری تا جون ۱۹۲۷ء

فہرست مضامین

زنگی قلم
دس روپیہ خرچ کرکے بھی آپ زنگی سے زیادہ کارآمد فاونٹن
نہیں خرید سکتے کیونکہ زنگی قلم میں تازہ ترین ایجادیں موجود ہیں
اور پورے ایک ہفتہ استعمال کرنیکے بعد بلاقیمت واپس یا تبدیل
ہوسکتا ہے۔ تاکہ آپ نقصان اور تکلیف سے محفوظ رہیں لیکر دبیہ
یا سیفٹی یا سلف فلنگ سب کی قیمت یکساں چھ روپیہ چار آنے ہے اور
تینوں قسموں میں یہ خصوصیت ہے کہ ڈھکنا زیادہ چڑھانے سے نہیں
ٹوٹ سکتا اور بحالت استعمال خود بخود نکل سکتا ہے۔ سیاہی
دینے والا پرزہ کبھی ٹیڑھا نہیں ہوسکتا۔ اور نہ کبھی رفتار میں
خرابی پڑ سکتی ہے۔ زنگی نب پوائنٹ اصلی چودہ قیراط سونے کا نہایت
پائدار ہے تاکہ ہاتھ کا دباؤ بخوبی برداشت کرسکے اور نوک پر
ہمیشہ قائم رہنے والا ریڈیم لگا ہوا ہے جس سے نب کبھی خراب
نہیں ہوتا اور ہر قسم کے کاغذ پر بے تکان چلتا ہے ہر نب زنگی رجسٹرڈ
۱۴ کیرٹ خوب نمایاں لکھا ہوا ہے۔ زنگی قلم کبھی بیکار ہوکر ضائع
نہیں ہوتا۔ کیونکہ اسکا ہر ایک پرزہ مل سکتا ہے اور پرانے قلم کے بدلے مناسب قیمت پر نیا زنگی قلم ملتا ہے
بایں ہمہ قیمت صرف چھ روپیہ چار آنے ہے۔ بہتر ہے کہ قلم کے ساتھ ہی چھ آنے کا زنگی پوائنٹ اسپرنگ دار کلپ
اور آٹھ آنے کی چھ درجن زنگی ٹکلٹ پوڈر سیاہی بھی جو تقریباً ایک سال کو کافی ہوتی ہے اور نہ گرتی ہے اور نہ
خراب ہوتی ہے آج ہی بشرط پسند
وی پی منگائیں۔ جامعہ کا حوالہ ضرور دیں
ملنے کا پتہ۔ زنگی قلم کمپنی نئی سڑک دہلی
ALL AT SAME PRICE
ZANGI
-REGISTERED-
LATEST IMPROVED
FOUNTAIN PEN
RS. 6-4
COMPLETE
Free
18-12
ZANGI PEN & INK CO.
MANUFACTURING
NAI SARAK, DELHI
ACTUAL
SIZE WITHOUT CAP

جلد ۹ | ماہ ربیع الاول ۱۳۴۶ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۲۷ء | نمبر ۳

فہرست مضامین

فلسفۂ خودی

ترجمہ دیباچہ اسرارِ خودی انگریزی ایڈیشن

"یہ مسئلہ کہ علم (تجربہ) محدود مراکز سے حاصل ہوتا ہے اور ہمیشہ "نفس اور جسم" کے محدود جامہ میں ملبوس ہوتا ہے آخر میں جا کر ناقابلِ تشریح ہو جاتا ہے" یہ پروفیسر بریڈلے کے الفاظ ہیں۔ لیکن جب وہ ان ناقابلِ تشریح مراکزِ علم سے آگے بڑھتا ہے، تو اس کو ایک وحدت نظر آتی ہے، جس کا نام وہ "مطلق" رکھتا ہے، اور جس میں تمام محدود مراکزِ علم اپنی محدودیت کو کھو دیتے ہیں۔ اس بنا پر اس کی رائے میں محدود مرکز محض ایک ظاہری شکل ہے۔ اس کے نزدیک حقیقت کا ثبوت ہمہ گیری ہے (یعنی حقیقت وہی ہے جو کل کو محیط ہے[1]) اور چونکہ تمام محدودیت اضافی ہوتی ہے، لہٰذا اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ موخر الذکر محض فریبِ نظر ہے۔ میرے خیال میں (تجربہ) کا یہ ناقابلِ توجیہ محدود مرکز کائنات کی حقیقت اساسی ہے۔ تمام زندگی انفرادی ہے۔ حیاتِ کلی کا کہیں وجود نہیں۔ خدا خود ایک فرد ہے اور وہ سب افراد میں یکتا و بے مثل ہے[2]۔ کائنات بقول میکٹیگرٹ افراد کی ایک انجمن ہے۔ اس میں ہم اپنی طرف سے یہ اضافہ کرتے ہیں کہ جو نظم و ترتیب ہم اس میں پاتے ہیں وہ ازلی نہیں ہے۔ اور نہ بذاتِ خود مکمل ہے۔ بلکہ یہ ہماری جبلی اور شاعرانہ کوششوں کا نتیجہ ہے۔

ہم رفتہ رفتہ فساد سے کون کیطرف جا رہے ہیں اور اس کے حصول میں ہم خود ہی معین ہیں۔ اس انجمن کے ارکان معین نہیں۔ ہمیشہ نئے نئے رکن وجود میں آتے اور اس عظیم الشان کام میں تعاون کرتے ہیں۔ اس طرح کائنات کا فعل ابھی تکمیل تک نہیں پہنچا ہے۔ ابھی اس کی تکوین جاری ہے۔ لہٰذا کائنات کے متعلق کوئی کلی تصدیق نہیں قائم کی جا سکتی۔ کیونکہ یہ (کائنات) ابھی "کل" کی حیثیت نہیں رکھتی۔ عملِ تخلیق جاری ہے۔ اور انسان بھی اس میں بقدر اسکے حصہ لیتا ہے کہ وہ کم سے کم فساد کے ایک حصہ میں کون قائم کرنے

---

[1] بریڈلے غالباً ہیگل کے اثر سے فرد کی حقیقت کا قائل نہیں۔ اس کے نزدیک فرد کوئی مستقل ہستی نہیں رکھتا، بلکہ وجودِ مطلق کا ایک جزو ہے۔ علامہ اقبال اس خیال کے سختی سے مخالف ہیں۔

[2] امام احمد حنبل کا یہی خیال تھا لیکن انتہائی شدت کے ساتھ۔

میں پیدا ہو گیا ہے۔ قرآن کی اس آیت سے کہ تبارک اللہ احسن الخالقین ؑ خدا کے سوا اور خالقوں کا امکان ظاہر ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ کائنات اور انسان کا یہ تصور فلسفہ ہیگل سے کے جدید انگریز شارحین، تصوف وحدۃ الوجود کی تمام اقسام کی مخالف ہے۔ کیونکہ انکی تعلیم یہ ہے کہ انسان کا آخری نصب العین اور اس کی نجات اس میں ہے کہ اپنے آپکو کائنات کی زندگی میں فنا کر دے۔ ہمارے خیال میں انسان کا مذہبی اور اخلاقی نصب العین نفی خودی نہیں ہے بلکہ اثبات خودی ہے اور جوں جوں اسکی انفرادیت اور یکتائی بڑھتی جاتی ہے وہ اس نصب العین کے قریب تر ہوتا جاتا ہے نبی کریم صلعم نے فرمایا ہے تخلقوا باخلاق اللہ۔ یعنی اپنے اندر خدا کی صفات پیدا کرو۔ اس طرح انسان جس قدر اس یکتا ترین ذات (یعنی خدا) سے مماثلت حاصل کرتا ہے اسی قدر وہ بے مثل و یکتا ہوتا جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ حیات کیا ہے؟ حیات انفرادی ہے اور اُس کی اعلیٰ شکل "انا" (یعنی خودی) ہے جس کا فرد ایک واحد اور مستقل مرکز ہوتا ہے۔ انسان جسمانی نیز روحانی حیثیت سے غیر مشترک اور کافی بالذات مرکز ہے۔ لیکن وہ ابھی کامل فرد نہیں ہوا ہے جس قدر اس کو خدا سے بعد ہوتا ہے، اسی قدر اسکی انفرادیت کم ہوتی ہے۔ کامل ترین انسان وہی ہے جو اقرب الی اللہ ہو۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اقرب الی اللہ خدا میں فنا ہو جاتا ہے۔ برخلاف اس کے خود خدا کو وہ اپنے اندر جذب کر لیتا ہے[1] حقیقی انسان نہ صرف اس مادی دنیا کو اپنے میں جذب کر لیتا ہے بلکہ اس کو مسخر کر کے خود خدا کو اپنے "انا" میں جذب کر لیتا ہے۔ حیات ایک آگے بڑھنی والی جاذب حرکت ہے

---

[1] مولانا روم نے اس خیال کو بہت واضح کیا ہے۔ بچپن کے زمانہ میں ایک مرتبہ نبی صلعم جنگل میں غائب ہو گئے حضرت حلیمہ سعدیہ اس غم سے کہ آپ سے باہر ہو گئیں جب آپ جنگل میں ادھر اُدھر سرگرداں حضور صلعم کی تلاش میں پھر رہی تھیں۔ تو غیب سے ندا آئی "رنج مت کرو۔ وہ گم نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ساری دنیا اس میں گم ہو جائیگی" حقیقی انسان دنیا میں گم نہیں ہو سکتا۔ دنیا اس کے اندر گم ہو جاتی ہے۔ میں اس سے ایک قدم آگے جاتا ہوں اور خدا کو کہتا ہوں۔

در ہوائش مرغ حق گم شد ... [illegible] کے با وجود بود

اس مضمون کے متعلق سرمد کا شعر بھی خوب ہے۔ ع تا گوید کہ بر فلک شد احمد ... [illegible]

اس کو جو رکاوٹیں پیش آتی ہیں۔ ان کو جذب کر لیتی ہے اور اس طرح اپنا راستہ صاف رکھتی ہے۔ اس کی ماہیت یہ ہے کہ وہ مسلسل خیالات اور خواہشات کی تخلیق کرتی رہتی ہے۔ اپنی توسیع اور بقا کے لئے اس نے کچھ آلات مثل حواس و ذہن وغیرہ کے ایجاد، یا بذریعہ ارتقا پیدا، کر لئے ہیں جو اسکو رکاوٹوں کے جذب کرنے میں مدد دیتے ہیں[1]

زندگی کے راستہ میں سب سے بڑی رکاوٹ مادہ یعنی نیچر (فطرت) ہے لیکن نیچر شر نہیں ہے۔ کیونکہ وہ زندگی کو قوائے باطنی کے اظہار کے لائق بناتی ہے۔ "انا" کو آزادی اسوقت نصیب ہوتی ہے جب اس کے راستے سے تمام رکاوٹیں دور ہو جائیں۔ یہ کچھ تو مختار ہے اور کچھ مجبور۔ (حدیث: سچا ایمان جبر و اختیار کے بین بین ہے) اور کامل آزادی اس ذات واحد کی قربت سے حاصل ہوتی ہے، جو سب سے زیادہ آزاد ہے یعنی خدا۔ مختصر یہ کہ حیات عبارت ہے آزادی کی جدوجہد سے۔

خودی "انا" اور تسلسل شخصیت

انسان میں مرکز حیات "انا" یا خودی (شخص) ہے۔ شخصیت اضطراب[2] کی ایک حالت ہے اور اسکا تسلسل اس حالت کے قیام سے وابستہ ہے۔ اگر اضطراب کی حالت قائم نہ رہے تو استرخا[3] پیدا ہو جاتا ہے۔ چونکہ خودی (شخصیت) یا حالت اضطراب انسان کی سب سے گراں قدر کامیابی ہے، لہذا اس کو خبردار رہنا چاہئے کہ پھر استرخا کی کیفیت اس پر طاری نہ ہو جائے۔ جو چیز کشیدگی کی حالت کو قائم رکھنے میں معین ہوتی ہے، وہی ہمارے غیر فانی بنے کا موجب ہوتی ہے۔ اس طرح شخصیت کا تصور ہمارے سامنے قدر و قیمت کا ایک معیار پیش کرتا ہے۔ اس سے خیر و شر کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ جو چیزیں خودی کو مستحکم کرتی ہیں وہ خیر ہیں اور جو اس کو کمزور کرنے والی ہیں وہ شر۔ آرٹ[4]، مذہب، اور اخلاقیات[5] پر خودی ہی کے نقطہ نظر سے رائے قائم کرنی

---

[1] آرزو صید مقاصد را کمند + دفتر افعال را شیرازہ بند

[2] اضطراب (Tension) کا ترجمہ ہے اس سے مراد ہے نفس کی وہ حالت جب اسے خودی کا احساس قوی ہو

[3] استرخا (Relaxation) کا ترجمہ ہے۔ اس سے مراد ہے نفس کی وہ حالت جب اس میں یہ احساس کمزور ہو

[4] تو جہاں از سکر او مسموم گشت + خفت واز ذوق عمل محروم گشت

[5] آں شنیدستی کہ در عہد قدیم + گوسفندان در علف زارے مقیم

چاہیے۔[1] افلاطون پر جو میرے اعتراضات[2] ہیں، وہ در اصل ان تمام فلسفیانہ نظامات پر وارد ہوتے ہیں جو زندگی کو چھوڑ کر موت کو اپنا نصب العین قرار دیتے ہیں۔ جن میں زندگی کی سب سے بڑی رکاوٹ یعنی مادہ کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور بجائے اس کو مادے کو مسخر کرنے کے اس سے بھاگنے کی تعلیم دی جاتی ہے۔

جس طرح "انا" کی آزادی کے مسئلہ میں مادہ کا عقدہ پیش آتا ہے۔ اسی طرح غیر فانیت کے سلسلہ میں وقت کا سوال پیدا ہوتا ہے[3]۔ برگساں نے ہمیں بتلایا ہے کہ وقت کوئی غیر محدود خط (مفہوم مکانی) نہیں جس سے ہم سب کو خواستہ ناخواستہ گزرنا ضروری ہے۔ یہ تصور مخلوط و ممزوج وقت کا ہے (وقت کا ایک ناپاک تصور ہے) خالص وقت کوئی طول نہیں رکھتا۔ شخصی لافانیت ایک آرزو ہے۔ تم اگر کوشش کرو تو اسے حاصل کر سکتے ہو۔ یہ اس بات پر موقوف ہے کہ ہم اس زندگی میں خیال و عمل کے وہ طریقے اختیار کریں، جو انتصاب کی حالت کو قائم رکھنے میں معین ہوں۔ بودھ مذہب بھی تصوف اور اس قبیل کے دوسرے نظامات اخلاقی ہماری غرض پوری نہیں کر سکتے لیکن یہ کلیتاً بیکار بھی نہیں ہیں۔ کیونکہ ایک مدت دراز کی سعی و عمل کے بعد ہم کو کچھ دیر کے لئے خواب آور دواؤں کی حاجت پڑ ہی جاتی ہے۔ اس قسم کے اعمال و افکار گویا ایام زندگی کی راتیں ہیں۔ پس اگر ہمارے اعمال انتصاب کی حالت کو قائم رکھنے کے لئے ہوں تو اغلب ہے کہ مرگ کے صدمہ سے اس کو کچھ نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ مرنے کے بعد استرخا کا ایک زمانہ آتا ہے جیسا کہ قرآن میں برزخ یا درمیانی حالت کا ذکر آیا ہے۔ یہ زمانہ حشر تک رہے گا۔ اس سکون استرخا

---

[1] "عربی شاعری پر نبی صلعم کے اعتراضات" کے زیر عنوان ۱۹۱۷ء نیرنگ خیال میں صفحہ ۲ پر علامہ اقبال تحریر فرماتے ہیں: "انسانی جدوجہد کا آخری مقصد حیات ہے جس سے مراد ایک شاندار، طاقتور اور کثیر العمل زندگی ہے۔ تمام انسانی آرٹ اسی آخری مقصد کے ماتحت ہونے چاہئیں اور ہر شے کی قیمت اس کی حیات بخش قوت کے لحاظ سے متعین ہونی چاہئے۔ اعلیٰ ترین آرٹ وہ ہے جو ہماری خفتہ قوت عمل کو بیدار کر دے اور ہم کو زندگی کی مشکلات سے مردانہ وار مقابلہ کرنے کے لائق بنا دے۔ جو چیز خواب آور ہے اور ہم کو گرد و پیش کی اس حقیقت سے غافل کر دینے والی ہے جس کے مسخر کر لینے پر انحصار زندگی ہے، وہ زوال اور موت کا پیغام ہے۔ آرٹ میں افیون نوشی نہ ہونی چاہئے۔ "تحصیل فن بغرض فن" کا اصول دور انحطاط کی ایک ایجاد ہے، جو ہم کو فریب میں مبتلا کر کے قوت و حیات سے بے بہرہ کر دینا چاہتی ہے۔"

[2] باب اول "افلاطون حکیم" "از گروہ گوسفندان قدیم" الخ۔ [3] [illegible]

کی حالت کے بعد صرف وہی " انا " باقی رہیں گے جو موجودہ زندگی میں بہت محتاط رہی ہیں۔ اگرچہ انعقاد حیات میں تکرار واعادہ کا گزر نہیں تاہم بقول ولڈن کار برگسان کے اصول کے مطابق حشر اجساد بھی بالکل ممکن ہے۔ وقت کو لمحوں میں تقسیم کر کے ہم اسمیں مکان کا مفہوم پیدا کر دیتے ہیں اور تب اس کی تعبیر مشکل معلوم ہوتی ہے۔ وقت کی حقیقی نوعیت ہم کو اس وقت معلوم ہوتی ہے جب ہم اپنے عمیق تر خودی پر غائر نظر ڈالتے ہیں[1]۔ حقیقی وقت خود زندگی ہے جو بقاء دوام حاصل کر سکتی ہے، بشرطیکہ وہ اُس مخصوص حالت اضطراب کو قائم رکھے، جس کو اس نے تا این دم قائم رکھا ہے۔ ہم وقت کے محکوم اسوقت تک بنے ہیں، جبتک ہم وقت کو ایک مکانی چیز سمجھتے ہیں۔ مکانی وقت ایک زنجیر ہے جس کو زندگی نے اپنے واسطے اس غرض سے اختراع کر لیا ہے، کہ موجودہ ماحول کو جذب کر سکے۔ حقیقتہً ہم وقت کی پابندی سے آزاد ہیں۔ اور وقت سے بےقیدی کا احساس (علم) ہمکو اس زندگی میں بھی ہو سکتا ہے۔ البتہ یہ احساس بالمکاشفہ محض عارضی ہوگا۔

خودی کی تربیت

خودی عشق سے مستحکم ہوتی ہے[2]۔ یہ لفظ (عشق) بہت وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے، اور اس سے مراد خواہش جذب و تسخیر ہے۔ اسکی اعلیٰ ترین شکل تخلیق قدور و مقاصد اور اُنکے حصول کی سعی ہے عشق، عاشق و معشوق، دونوں کو منفرد کر دیتا ہے (خدا کی) بے مثل و یکتا ترین ذات کے وصل (حصول) کی کوشش، طاقت کو شخص (منفرد) بناتی ہے۔ اور ضمناً یہ مفہوم مطلوب کی فردیت پر ہی دلالت کرتا ہے کیونکہ کوئی اور چیز طالب کی فطرت کو تسکین نہیں دیسکتی۔

جس طرح عشق سے خودی مستحکم ہوتی ہے، اُس طرح سوال سے وہ ضعیف ہوتی ہے[3]۔ ہر وہ چیز جو بغیر ذاتی کوشش کے حاصل ہو سوال ہے۔ ایک دولتمند آدمی کا لڑکا جو اپنے والدین کی دولت ورثہ

---

[1] اے اسیر دوش و فردا در نگر ۔ در دل خود عالمے دیگر نگر

[2] نقطۂ نورے کہ نام او خودی ست ۔ زیر خاک ما شرار زندگی ست الخ

[3] اے فراہم کردہ از شیراں خراج ۔ گشتۂ روبہ مزاج از احتیاج الخ

میں حاصل کرتا ہے۔ وہ بھی سائل ہے۔ اسی طرح وہ شخص بھی جو دوسروں کے خیالات کو اپنے خیالات بنا لیتا ہے پس خودی کو مستحکم کرنے کے لئے ہم کو چاہئے کہ عشق (یا عمل جاذبہ کی قوت) پیدا کریں۔ اور ہر قسم کے سوال یا فقدان عمل سے بچیں۔ نبی صلعم کی حیات مبارک سے کم از کم ایک مسلم کو تو عمل جاذبہ کا سبق مل ہی سکتا ہے۔

مثنوی کے کسی دوسرے حصہ میں سنہ اشارتاً اسلامی اخلاقیات کے عام اصول بیان کئے ہیں۔ اور شخصیت کے تصور کے سلسلہ میں انکے معنی سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ خودی کو بے مثل دیکھا ہونیکے لئے تین مراحل طے کرنا پڑتے ہیں :-

(۱) اطاعت قانون۔

(۲) ضبط[۱] نفس، جو احساس نفس و خودی کا آخری مرتبہ ہے۔

(۳) نیابت الہی[۲]۔

نیابت الہی اس دنیا میں ارتقاء انسانی کی تیسری اور آخری منزل ہے۔ نائب حق خلیفۃ اللہ علی الارض ہے۔ یہ کامل ترین "انا" ہے جو بنی نوع انسان کا نصب العین، اور زندگی کی روحانی وجسمانی معراج[۳] ہے۔ اس کے اندر ہماری حیات نفسی کے تمام انتشارات ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ اعلیٰ ترین قوت اس میں اعلیٰ ترین علم سے متحد ہوتی ہے۔ اس کی زندگی میں خیال وعمل۔ اور عقل وجبلت ایک ہوتے ہیں۔ وہ نخل انسانیت کا ثمر آخریں ہے۔ اور بار ارتقاء حیات کی تمام صعوبتیں اور تلخیاں اس لئے گوارا ہو سکتی ہیں کہ انکا آخری انجام اسکی شکل میں ظاہر ہونیوالا ہے۔ بنی نوع انسان کا وہ حقیقی حکمراں ہے۔ اس کی حکومت، حکومت اللہ فی الارض ہے۔ وہ اپنی فطرت کے خزانے سے دوسروں کو زندگی کی دولت عطا کرتا ہے اور انکو اپنے قریب تر لاتا جا رہا ہے۔ جس قدر ہم منازل ارتقاء طے کرتے جاتے ہیں اسی قدر اسکے قریب تر ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کے تقرب سے میزان حیات میں اپنے آپ کو بلند تر

۱؎ نفس تو مثل شتر خود پرور است + خود پرست و خود سوار و خود سر است ۲؎ گر شتر بانی جہانبانی کنی + زیب سر تاج سلیمانی کنی
۳؎ انی جاعل فی الارض خلیفۃ اے فدائے کعبہ نواز ذرا + شرح انی جاعل ساز ذرا۔

کرتے جارہے ہیں۔ نوع انسانی کا ذہنی و جسمانی دونوں حیثیتوں سے ترقی یافتہ ہونا اس کی آمد کا ایک لازمی مقدمہ ہے۔ فی الحال وہ محض خیالی ہے لیکن ارتقائے انسانی ایک آئیڈیل قوم کے وجود میں آنے کی خبر دے رہا ہے جس کے افراد کم و بیش ایسے بے مثل و یکتا ہونگے جن میں اس نائب حق کے والدین ہونے کی صلاحیت ہوگی پس حکومت اللہ علی الارض سے مراد وہ جمہوریت ہے جس کے افراد کم و بیش یکتا ہونگے، اور جس کا صدر وہ یکتا ترین فرد ہوگا جس کا امکان اس دنیا میں ہو سکتا ہے نیٹشے کو اس آئیڈیل قوم کی ایک جھلک نظر آئی، مگر اس کی دہریت اور امارت پسندی نے اس کے سارے فلسفہ کو مسخ کر دیا۔

مترجمہ ارشاد الحق صاحب بی اے

عرب فرانسیسی ادبیات میں

رولان کا گیت

(۴)

پادری ترپان نے جب رولان اور اولیوئے کی تو تو میں میں سنی تو انکے پاس آیا اور خدا کا واسطہ دیکے کہنے لگا "خدا کے لئے رحم کرو، اب جھگڑا کرنے کا وقت نہیں، اگر تم اپنا نرسنگھا بجا بھی دوگے تو کیا اپنی جانیں بچا سکتے ہو، بس اتنا فائدہ ضرور ہوگا کہ شارل واپس آکے ہمارا بدلہ لے لیگا اور عرب خوش وخرم اپنے گھروں کو نہیں لوٹنے پائینگے ہمارے بھائی فرانسیسی ہماری تجہیز وتکفین کریں گے، ہمارے لئے روئیں گے اور ہماری لاشوں کو ماتم کرتے ہوئے فرانس واپس لے جائیں گے ہمیں کلیساؤں میں دفن کرینگے اس طرح ہمارے شہیدوں کو بھیڑئے اور سور نہیں کھا پائیں گے۔

یہ کہہ کر نرسنگھا ہونٹوں پر رکھا اور اس زور سے بجایا کہ اس کے منہ سے خون نکلنے لگا، پہاڑیوں اور آس پاس کی وادیوں میں آواز گونج اٹھی، یہانتک کہ شارل نے، ۳ کوس کے فاصلہ پر رولان کے نرسنگھے کی آواز سنی، شارل اور اس کے ساتھیوں میں یوں باتیں شروع ہوئیں۔

شارل - یہ آواز مجھے رولان کے نرسنگھے کی معلوم ہوتی ہے، شاید اس پر کچھ مصیبت پڑی ہے اور وہ ہمیں واپس بلانا چاہتا ہے۔

گینلون - نہیں یہ صرف آپ کا خیال ہی خیال ہے، آپ بوڑھے ہوئے لیکن بچپنے کی باتیں ابھی تک نہیں گئیں آپ رولان کو اچھی طرح جانتے ہیں، وہ بڑا مغرور آدمی ہے، آپ کے کہے بغیر اس نے عربوں کو شکستیں دیکر نوپل تک ہٹا دیا۔ کبھی وہ ایک خالی خرگوش کے لئے دن دن بھر نرسنگھا بجایا کرتا ہے، آج بھی میرے خیال میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ کوئی کھیل کھیل رہا ہے، بھلا عرب اس سے لڑنے کی کیا ہمت کرینگے؟ آسمان کے تلے اسکا کون مقابلہ کر سکتا ہے؟ آپ گھوڑے پر سوار ہو جئے، وہم میں نہ پڑئے، یہاں بیکار ٹھہرنے سے کیا فائدہ

اب ہم اپنے بزرگوں کے وطن کے بالکل قریب پہنچ گئے ہیں ،

رولان بڑی دیر تک نرنگھا بجاتا رہا ، یہانتک کہ وہ ٹوٹ گیا ، شارل نے پھر دوبارہ نواب نائم سے مخاطب ہوکر کہا ۔

شارل ۔ سنتے ہو کیسی لمبی سانس سے کوئی آدمی نرنگھا بجا رہا ہے ،

نائم ۔ معلوم ہوتا ہے ہمارا کوئی بہادر مصیبت میں ہے ، میں یقین سے کہتا ہوں کہ ضرور ہمارے آدمی ہیں وہ اپ مدد کے لئے بلا رہے ہیں ۔ جو آپ سے اس کام میں سستی کرنے کو کہے وہ آپ کو دغا دیتا ہے ، آپ فوج کو مسلح کرا کے جواب میں اپنے فوجی نرنگھے بجوائے ، آپ سنتے ہیں ، میں تو سمجھتا ہوں یہ رولان ہے جو ناامیدی میں دم توڑ رہا ہے ۔

شارل نے فوج کے سارے نرنگھے بجوانے کا حکم دے دیا ۔ آپس میں سب لوگ کہنے لگے نہ معلوم ہمارے آدمی کیسی مصیبت میں ہیں ، رولان زندہ ملیگا کہ نہیں ، اگر زندہ ملا تو اسی کے ساتھ ذرا عربوں پر تلواروں کے دو دو ہاتھ چلائینگے بعضوں کی آنکھیں رنج میں آنسوؤں سے ڈبڈبا رہی ہیں ، شارل نے دغاباز گینلون کو حراست میں قید کرا دیا ہے[1] ، بگون اس پر متعین ہے ۔ اس نے گینلون کو باورچی خانہ کے نوکروں کے ساتھ رکھا ہے جو ہر وقت اسے اس کی دغا بازی کی سزا میں چھیڑتے رہتے ہیں کبھی داڑھی نوچتے ہیں ، کبھی مونچھیں اکھیڑتے ہیں ، کبھی گھونسے مارتے ہیں اور کبھی ریچھ کی طرح اس کی گردن میں زنجیر ڈال کے ادھر اُدھر گھماتے ہیں ۔

---

[1] گینلون کی دغابازی اور اسے حراست میں دئے جانے کا مضمون ایکدم یہاں سے شروع کر دیا گیا ہے اس کی قصورواری کا کوئی ثبوت ہوا اور نہ کوئی تفصیل منطقیانہ تسلسل کا اسی لئے غالباً لحاظ نہیں رکھا گیا کہ مفصل واقعات سب کو معلوم ہوں گے ۔ ان گیتوں کا یہ مقصد نہیں کہ لوگوں کی معلومات میں اضافہ ہو بلکہ گیت انہیں روایتوں کو منظوم شکل میں قوم کے سامنے پیش کرتے ہیں جنہیں ہر ایک جانتا ہو اور جو بچہ بچہ کی زبان پر ہیں ان روایتوں کو پھیلانے والے کون تھے ؟ اس سوال کے جواب میں قطعیت کیساتھ صرف کلیسا کا نام پیش کیا جا سکتا ہے جس نے اپنی تمام قوتیں عربوں کے خلاف فرانسیسیوں کی نئی قوم کو ابھارنے میں صرف کیں ۔

شارل اپنے ساتھیوں کے ساتھ غصہ اور رنج میں بھرا ہوا رولان کی مدد کو واپس جا رہا ہے، پہاڑیاں اور وادیاں طے کر رہا ہے، ہر کوئی ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھر رہا ہے، ہر شخص دعائیں مانگ رہا ہے کہ اے یا رالہ! رولان کو اس وقت تک جیتا جاگتا رکھیو جب تک کہ وہ اس کی مدد کو اس کے پاس نہ پہنچ جائیں، ہر بہادر عربوں کو ہلاک کرنے کا عہد کر رہا ہے۔

رولان بیچارہ پہاڑوں اور میدانوں کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھ رہا ہے، جدھر دیکھتا ہے اپنے ساتھیوں کی لاشیں دکھائی پڑتی ہیں، لاشوں کو دیکھکر وہ یوں کہتا ہے۔

"پیارے ساتھیو! خدا تمہاری روحوں کو بہشت میں جگہ دے، پاک پھولوں میں تمہیں لٹائے بھلا تم جیسے وفادار ساتھی کہاں ملیں گے؟ تم نے ہمیشہ میری مدد کی اور تمہاری مدد ہی کے بھروسہ پر میں نے شارل کے لئے سیکڑوں ملک فتح کر ڈالے، واقعی تم سب کو فرانس کی پیاری زمین سے محبت تھی، میں تمہیں دم توڑتے دیکھتا ہوں اور کچھ نہیں کرسکتا، ہائے کیسی بے بسی ہے؛ پیارے بھائی اولیویئے! میں تمہیں کبھی دغا نہ دوں گا۔ اگر کسی نے مجھے جان سے مارا تو تمہارے غم میں جان دے دوں گا۔ دوستو! بڑھے چلو ایک دفعہ اور میرے کہنے پر دشمنوں کو نیزوں پہ دھر لو"

رولان ہر طرف اپنی تلوار دوڑ رہا ہے، ملادروں والی پونی اور عربوں کے چیدہ چیدہ چنے ہوئے بہادروں کو آن کی آن میں ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتا ہے۔ دنیا میں کبھی کوئی ایسا بھرپور بدلہ نہ لے گا جیسے شکاری کتے کے آگے جنگلی ہرن بھاگتے پھرتے ہیں، وہی حالت عربوں کے سورماؤں کی رولان کے سامنے ہے۔ بھلا کوئی بہادر ہو تو ایسا تو ہو، جو گھوڑے پر مسلح ہو کر چڑھے اور اتنا بھی نہ کر سکے تو اس کی قیمت چار دینار کے برابر بھی نہیں، بہتر ہے کہ وہ خانقاہ میں بیٹھکر ہمارے گناہوں کی معافی مانگا کرے اور عبادت کیا کرے [۱۵۰]

---

[۱۵۰] از منہ وسطیٰ کا بہادر اگرچہ کٹر مذہبی ہے لیکن اس کے نزدیک زہد و عبادت کا پیشہ نکمے اور بیکار لوگوں کے لئے ہی جو میدان جنگ میں بہادری کے جوہر دکھانے کے ناقابل ہو وہ خانقاہ میں بیٹھکر اللہ اللہ کرے خیال بہت خوب ہے مسلمانوں کی بہادری کا آئیڈیل بھی یہی ہے کسی مجاہد نے میدان جنگ سے فضیل ابن عیاض کو اسی قسم کی باتیں کہلوا بھیجی تھیں

بادشاہ مارسل اپنے گھوڑے گینگنون پر سوار ہے، مہمیز لگاتا ہوا اپنے گھوڑے کو فرانسیسیوں پر چڑھائے لا رہا ہے، بیدن والی دیجوں پر حملہ کرتا ہے اور اس کی ڈھال اپنی تلوار کے وار سے کاٹ کے اس کے دو ٹکڑے کر دیتا ہے، اس کے بعد یوں اور اوآر، جیرار اور روسلون اس کے ہاتھ سے شہید ہوتے ہیں۔ رولان نے جو یہ دیکھا تو اس طرح سیکڑوں لعنتیں بھیجتا ہوا مارسل کی طرف بڑھا۔

"خدا تجھے ذلیل کرے، تو نے میرے اتنے ساتھیوں کو شہید کر ڈالا، پیشتر اس کے کہ میں اور تو جدا ہوں تجھ سے ان مقتولوں کی قیمت لوں گا اور تجھے اپنی تلوار کا نام بتاؤں گا۔ یہ کہکر کڑک کے جو مارسل پہ وار کیا تو اس کا سیدھا ہاتھ شانے سے کٹ کر زمین پر جا پڑا، اس کے بیٹے جرفالو کو اس کے بعد رولان نے قتل کیا۔ یہ دیکھکر سارے عرب چلا اٹھے۔

اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہماری مدد کرو، اے ہمارے دیوتاؤ شارل سے ہمارا بدلہ لو اس نے ہمارے مقابلے کے لئے ایسے آدمی بھیجے ہیں کہ چاہے ان کی جانیں چلی جائیں لیکن میدان نہیں چھوڑتے۔"

انہیں سے ایک بولا، یارو بھاگ چلو، یہ سنتے ہی ساری فوج میں بھگدڑ مچ گئی، اب کوئی کتنا ہی بلائے وہ لوٹنے والے نہیں۔

لیکن عربوں کی اس پسپائی سے ہمارا بہت فائدہ نہیں ہوا، مارسل کے آدمی بھاگ گئے لیکن اس کا چچا مارگانیس والی کارتھیج و حبش ابھی میدان میں موجود ہے، اس کے ساتھ حبشیوں کی فوجیں ہیں انکی ناکیں چوڑی اور کان لمبے لمبے ہیں، وہ کم و بیش پچاس ہزار ہوں گے، وہ سب اپنے گھوڑے فرانسیسیوں کی طرف بڑھاتے ہیں اور پھر کچھ اپنی بولی میں چلا چلا کے کہتے ہیں، رولان نے انہیں آتے دیکھکر اپنی فوج سے یوں کہا۔

رولان۔ مجھے پورا یقین ہے کہ ہم سب آج یہاں شہید ہوں گے، ہم میں سے کوئی زندہ واپس نہ جائیگا۔ لعنت ہو اس پر جو اپنے کو مہنگا نہ بیچے، لڑو، مارو، آج موت اور زندگی کی کشمکش کا تماشہ ہو، دیکھو پیارے فرانس کے نام پر کہیں دھبہ نہ لگانا جب شارل یہاں پہنچکر دیکھے گا کہ ہم نے عربوں کے ساتھ خوب انصاف کیا ہے اور جب وہ دیکھے گا کہ ہماری ایک لاش کے پہلو میں دشمن کی پندرہ لاشیں ہیں، تو وہ ہم پر رحمتیں بھیجے گا۔

اولیوئے۔ اس پر لعنت ہو جو ذرا سی بھی سستی کرے۔

عربوں نے جب فرانسیسیوں کی تعداد بہت کم دیکھی تو بڑی گھمنڈ میں حملہ کے لئے بڑھے مارگانیس اپنے کیت گھوڑے پر سوار تھا، سونے کی مہمیزوں سے اسے آگے بڑھا رہا تھا، اولیوئے کو دیکھکر اس نے بڑی پھرتی سے اس پر وار کیا، اس کی تلوار اولیوے کے سینہ کے پار ہوگئی، اولیوے کو گرتا دیکھکر یوں کہنے لگا "تو نے بُرا زخم کھایا، تیری بدنصیبی میرے مقابلہ کے لئے تجھے لائی شارل نے بیکار تم لوگوں کو یہاں گھاٹیوں کی رکھوالی کے لئے یہاں چھوڑا۔"

اولیوئے زخم کھاکر گر پڑا لیکن اس نے ہمت کی اور کھڑا ہو کے مارگانیس کو یوں جواب دیا۔

اولیوئے۔ ارے بے دین! تجھ پہ لعنت، میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ شارل نے کچھ کھویا نہیں، لیکن تو بھی اپنی سلطنت کو صحیح سلامت نہیں واپس جا سکے گا، اور یہ نہ ہو گا کہ تو اپنے دیس میں پہنچکر ہر عورت کے سامنے شیخی بگھارے کہ تو نے مجھ جیسے بہادر کو مارا ہے۔ یہ کہکے وہ گھوڑے پر سوار ہو کر دشمنوں میں گھس جاتا ہے اور دوہتی تلوار چلانا شروع کرتا ہے، اگر کوئی اسوقت بے دینوں کی لاشوں پہ لاشیں گرتے دیکھے تو بول اُٹھے کہ ہاں اصلی بہادر اسکا نام ہے، پھر اولیوئے بالکل تھک کے رولان کو اپنے پاس بلاتا ہے اور کہتا ہے "دوست میرے قریب آؤ، میرا اب آخری وقت ہے، دو گھڑی میں ہم تم ہمیشہ کے لئے جدا ہو جائینگے۔"

رولان یہ سنکر گھبرا جاتا ہے اور کہتا ہے۔

"ہائے خدایا! اب کیا کروں، پیارے فرانس کے کیسے کیسے بہادر ہمیشہ کے لئے آج رخصت ہو رہے ہیں یہ کہہ کے اسے گھوڑے پر غش آگیا۔

رولان کا یہ حال ہے اُدہر اولیوئے زخموں سے چور چور ہو رہا ہے، اس کے بدن میں اب خون نام کو بھی باقی نہیں رہا، اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا آ رہا ہے، دور نزدیک کی کوئی چیز اسے صاف نہیں دکھائی دیتی اسی حالت میں اس نے رولان کے قریب جاکر اس زور سے اس کے خود پر ہاتھ مارا کہ وہ نیچے ناک کی ہڈی تک دھس گیا۔

رولان۔ کیوں بھائی، میں نے تمہارا کیا قصور کیا ہے؟

اولیوٹ۔ معاف کر دیں نے جان بوجھکر ایسا نہیں کیا، مجھے اچھی طرح دکھائی نہیں دیتا، بھلا میں نے اپنی تمام عمر میں کوئی بات تمہارے خلاف کی ہے ؟

رولان۔ مجھے چوٹ نہیں لگی، میں نے تمہیں یہاں اور خدا کے یہاں معاف کیا،

یہ کہلے دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے، اولیوٹ پر بالکل مردنی چھا چکی تھی، وہ گھوڑے سے اتر کر زمین پر لیٹ گیا اور دونوں ہاتھ آسمان کیطرف اُٹھائے یوں زور سے دعا مانگنے لگا،

"اے خدا! میں اپنے گناہوں کا اعتراف کرتا ہوں مجھے اپنی پاک روحوں کیساتھ جنت میں جگہ دے شامل اور رولان کو اپنی رحمت کے سایہ میں رکھ"

اولیوٹ نے یہ دعا ختم کی اور ساتھ ہی اپنی زندگی کی آخری سانس لی، رولان یہ دیکھکر رونے لگا اور اولیوٹ کی لاش کے پاس جاکر یوں کہنے لگا۔

"پیارے دوست! ہم تم بچپن سے ساتھ کھیلے۔ ہماری دونوں کی عمر بالکل ایک تھی، نہ کبھی تم نے مجھے تکلیف پہنچائی اور نہ کبھی میں نے تمہیں دکھ دیا، آج تم مر گئے، میری زندگی اب دنیا میں بے کار ہے" یہ کہکر اسے اپنے گھوڑے پر غش آگیا، سونے کی رکابوں نے اسے زین پر سیدھا رکھا ورنہ وہ قریب تھا کہ گر پڑے، جب ہوش آیا تو سارے فرانسیسیوں کو مرا ہوا پایا، اس کے سب ساتھیوں کو عربوں نے ختم کر دیا تھا بس ایک پادری تربان باقی رہ گیا تھا، وہ عربوں کا بڑی دیر سے مقابلہ کر رہا تھا اور برابر وادی کیطرف ہٹتا جا رہا تھا رولان کو دیکھکر یوں مخاطب ہوا

"اے شریف النفس سردار! اے ہمارے بہادر سورما! تو کہاں ہے؟ میں نے آج تک ڈر کو اپنے دل میں جگہ نہیں دی ہے کیونکہ تو میرے پاس رہتا تھا میں نے اپنی بہادری سے تیری محبت حاصل کر لی تھی، اب تیا میرا نیزہ بالکل ٹوٹ گیا، میری ڈھال چھلنی ہو چکی، زرہ کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے، اب میں کیا کروں، ہاں میں مر جاؤنگا لیکن اپنی جان دشمنوں کے ہاتھ بہت مہنگی بیچوں گا"

تربان یہ باتیں کرتا ہوا گھوڑا بڑھاکے رولان کے بالکل قریب پہنچ جاتا ہے، رولان رنج اور غصہ میں غرق ہے، ایکدم سے دشمن کیطرف جو گھوڑے کو غیر کرکے بڑھتا ہے تو اٹھائیس عربوں کا خاتمہ کر دیتا ہے اور بہادری

تریان نے اس گئی گذری حالت میں بھی چھ کو قتل کر ڈالا، عربوں نے یہ رنگ دیکھا تو سب مل کر کہنے لگے "دیکھنا کہیں یہ دونوں بچ کے نہ جانے پائیں، اب جو ان پر حملہ نہ کرے وہ دغا باز ہے اور جو انہیں جیتا جانے دے وہ بزدل ہے" ان دونوں کو ہر طرف سے عربوں نے گھیر لیا۔

رولان اور پادری تریان چالیس ہزار عربوں کا بہادری سے مقابلہ کر رہے ہیں[1] کوئی پشت دکھانے کا نام نہیں لیتا، عربوں کی ہمت نہیں پڑتی کہ انکے پاس پھٹک تو جائیں، دور ہی دور سے تیر، نیزے اور تلواریں پھینک پھینک کے مار رہے ہیں، تریان کی ڈھال میں چھید ہو گئے ہیں اور اس کے سر کی خود بالکل ٹوٹ گئی ہے، باوجود ہر طرف سے نیزوں اور تلواروں کے حملوں کے اس نے اب تک ہار نہیں مانی، اس کی آنکھیں رولان کو ڈھونڈھ رہی ہیں، اسے دیکھ کر اس کے دل کو ڈھارس بندھ جاتی ہے۔ لڑتے لڑتے اس کے پاس جا کر اس سے یوں کہتا ہے۔

"میں نے اپنی پیاری تلوار الماس سے ہزاروں کو ٹھنڈا کیا ہے، شارل اب اگر ہمیں مردہ دیکھیگا بھی تو یہ کہیگا کہ ہم نے عربوں کے ساتھ رو رعایت بالکل نہیں برتی۔ وہ دیکھے گا کہ ہزاروں عرب میدان جنگ میں مرے پڑے ہیں اور بہت سے زخمی پڑے ہیں جن کے بدن ہمارے نیزوں سے چھدے ہوئے ہیں ہماری قوم میں جو گیت جائیں گے ان میں یہ سب باتیں بیان کیجائیں گی"

رولان کی حالت لحظہ بہ لحظہ خراب ہوتی جا رہی ہے، جس وقت سے اس نے نرسنگھا بجایا ہے اس وقت سے اس کی کنپٹیاں پھٹی جا رہی ہیں، وہ ایک شارل کا انتظار کر رہا ہے پھر آخری دفعہ زور سے نرسنگھا بجاتا ہے لیکن اس کے بدن میں اب پہلی سی طاقت باقی نہیں۔

شارل نے نرسنگھے کی آواز سنی اور ساتھیوں سے کہا "ہائے ہماری بدنصیبی میرا پیارا بھتیجا رولان آج ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے، جس طرح کہ اس نے اس دفعہ نرسنگھا بجایا ہے اس سے

---

[1] فتوح شام میں حضرت خالد کے متعلق جو کہانیاں بیان کی گئی ہیں انہیں بھی اتنا مبالغہ نہیں، وہاں ایک آدمی دس ہزار کے لئے کبھی کبھی ہمت کر جاتا ہے، لیکن یہاں دو فرانسیسی چالیس ہزار عربوں کا بہادری سے مقابلہ کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اب بہت دیر زندہ نہیں رہے گا، چند لحوں کا اور مہمان معلوم ہوتا ہے، اچھا اب فوج کے سارے بگل اس کے جواب میں بجاؤ۔"

ان بگلوں کی آواز سے نزدیک کی سب پہاڑیاں اور وادیاں گونج اٹھیں عربوں نے جب یہ گونجتی ہوئی آواز سنی تو انہیں خیال ہوا کہ شاید شارل پھر دوسری دفعہ ان سے لڑنے واپس آرہا ہے، انہیں بڑی پریشانی ہوئی، انہوں نے سوچا کہ اگر رولان زندہ بچ گیا تو شارل سے ملکر بڑا نقصان پہنچائیگا۔ اس لئے بہتر ہے کہ بہت جلد رولان کا خاتمہ کر دیا جائے اس کے بعد جو کچھ ہو سو ہو یہ ارادہ کر کے چار سوچتے ہوئے عرب رولان کے مقابلہ کو نکلے، رولان نے انہیں اپنی طرف آتے دیکھا اور خوب تن کر گھوڑے پر بیٹھ گیا، جب تک وہ زندہ ہے اس وقت تک بھلا ان سب کی اس پر ہاتھ ڈالنے کی کب ہمت ہو سکے گی، اُس نے اپنے گھوڑے ویانسف کو مہمیز لگائی اور عربوں کی طرف بڑھایا، پادری تریان میں ابتک تھوڑی بہت جان باقی تھی ہمت کر کے کھڑا ہوا اور رولان کی مدد کو چلا اور رولان کے پاس جاکر کہنے لگا "شارل اب بالکل قریب معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس کے بگلوں کی آواز اس دفعہ پہاڑیوں میں بڑے زور سے گونجی ہے"

رولان۔ پادری کیطرف دیکھکر، ہم دونوں ملکر عربوں کا مقابلہ آخری وقت تک کرینگے، جو گذرے گی دونوں پر ساتھ گذرے گی، کسی عرب کی بھلا مجال ہے کہ اسوقت تک وہ ہمیں چھو بھی سکے جب تک کہ میں زندہ ہوں، دیکھو ایک دفعہ اور دورندال کے جوہر دکھاؤنگا۔

تریان۔ شارل اب آیا ہی چاہتا ہے، وہ ہمارے شہیدوں کا عربوں سے خوب دل کھول کر بدلا لیگا۔

عربوں میں آپس میں یوں باتیں ہو رہی ہیں "شارل اب نزدیک آن پہنچا نہ معلوم ہماری کیا گت بنائیگا، ہماری بدنصیبی نہ جانے کیا برے دن دکھائیگی، اسکے فوجی بگلوں کی آواز فضا میں ہر طرف زوروں سے گونج رہی ہے، رولان کا یہ حال ہے کہ وہ کسی کو اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیتا، کوئی آدمی جس کا بدن گوشت سے بنا ہے لڑنے کی تاب نہیں لاسکتا۔ لیکن ہمیں چاہئے کہ شارل کے آنے سے پہلے ہی پہلے کسی نہ کسی طرح اسے ختم کر ڈالیں اور پھر میدان چھوڑ چلیں"

[illegible] سب کے سب وہاں پر ٹوٹ پڑے، اُس کی ڈھال توڑ ڈالی اور اس کے خود میں برچھی
سے سوراخ کر دئے لیکن ابھی تک اس کے زخم پر کوئی وار نہیں کر سکا تاہم وہ تھوڑا بہت زخمی ضرور ہو گیا تھا
اس کا گھوڑا بھی زخم کھا کر گر پڑا ہے، گھوڑے کے گرتے ہی وہ طیش میں آ گئے اس نے تلوار چلائی تو عرب بھاگ
نکلے۔ اسے اپنے گھوڑے ویلنتف کے مرنے کا بہت رنج ہوا۔ افسوس کہ وہ عربوں کا پیچھا نہیں کر سکتا، وہ
تریان کو مدد دینے کو بڑھتا ہے۔

تریان نے دیکھا کہ رولاں اس کی طرف آ رہے تو کمزوری سے زمین پر گر پڑا۔ اُسکا ارادہ ہوا کہ
کسی پاس کے چشمہ سے جا کر پانی لائے اور اس پر چھڑکے شاید کسی طرح سے کچھ تسکین پہونچے، وہ یہ ارادہ
کر کے اٹھا لیکن چونکہ اس کے بدن سے بہت خون نکل چکا تھا وہ دو قدم بھی نہ چل سکا۔ اس نے پھر دوسری
دفعہ ہمت کی اور پھر زمین پر گر پڑا اور اس دفعہ ایسا گرا کہ پھر نہ اٹھا۔ یہ اس کی آخری کوشش تھی۔ رولاں کو ہوش
آیا تو اس نے تریان کو مرا پایا۔ اس کے قریب جا کر لاش سے یوں مخاطب ہوا۔

"اے پاک انسان! تو نے مسیحی دین کی حمایت میں اپنی جان تک کھپا دی، حواریوں کے بعد تو ہی
جس نے ہمارے مذہب کی تبلیغ میں ایسی ایسی تکلیفیں اٹھائیں تو شارل کے بہادروں میں فرد تھا، تو نے
ساری عمر عربوں کے خلاف جہاد کیا اور ان سے جنگ کی، اب خدا تیری روح کو بہشت میں جگہ دے"۔

رولاں بھی اس طرح مجبور تھا کہ وہ خود بھی بہت دیر زندہ نہ رہیگا۔ اس نے اپنے نرسنگھے اور اپنی تلوار
دورندال کو اپنے پہلو میں رکھ لیا تا کہ اس کے مرنے کے بعد کوئی اسے بزدلی کا الزام نہ دے کہ بھاگ

ملا مذہبی پیشوا کی سورما کی شجاعت بیان کرنے میں اس بات پر مصر ہے کہ کوئی عرب بہادر اس کا جسم نہیں چھید سکا، ہو ظاہر ہے
کہ دشمن جب اس کا بدن چھید ہی نہیں سکے تو اس کو مار کیوں کر سکتے تھے لیکن تھوڑی دیر کے بعد چونکہ اس کی موت کا حال بھی بیان
کرنا ہے اس لئے بادل نخواستہ بڑی سرسری طور پر یہ بات تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ ان دشمنوں نے اسے زخمی کر دیا اور
حالت بالکل ایسی ہی ہوئی کہ جیسے کوئی کہے کہ رولاں کے چند زخم ضرور لگ گئے ہیں لیکن بھلا کسی کی مجال ہے کہ اس کے
پاس پھٹک سکے۔ اسی قسم کی ہٹ دھرمی اور اپنی بڑائی کو مبالغہ سے بیان کرنا دنیا کے سارے قومی افسانوں میں
مشترک ہے۔

مترجم

وہ پڑا ہوا تھا اس کے قریب ایک جھاڑی میں ایک خوبصورت نوجوان عرب کی لاش تھی، یہ عرب اصل میں زندہ تھا، وہ مردہ بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے رولان کو اس حالت میں دیکھکر اس کی تلوار اٹھائی اور یوں کہا۔ "شارلمان کا شہرۂ آفاق بھتیجا ہار مان گیا، اس کی تلوار پر اب میں قابض ہوں، اسے اب میں اسپین لے جاؤں گا۔" یہ لفظ سنتے ہی رولان بے ہوشی سے چونک پڑا اور اس نے دوسرے آہن سے اپنا نرسنگھا اس عرب نوجوان کے سر پر مارا کہ اس کا بھیجا اور دونوں آنکھیں نکل پڑیں اور اس کی طرف یوں مخاطب ہوا:

"اے غلام زادے! تیری اور یہ ہمت کہ تو میری تلوار پر قبضہ کرنے کا ارادہ کرے، میری تلوار پر قبضہ کرنا آسان نہیں، چاہے وہ لڑکر ہو یا دھوکے سے ہو، میرے نرسنگھے کا سارا سونا بکھر گیا۔"

رولان میں اتنی طاقت باقی نہیں تھی کہ وہ زیادہ دیر تک اپنے پیروں پر کھڑا رہ سکے، اس کی آنکھوں کے تلے اندھیرا آ جاتا تھا، اس کے چہرے کا رنگ بالکل فق ہو گیا تھا غصے میں آکر سامنے کی چٹان پر تلوار کے دس وار کر ڈالے تاکہ تلوار کسی طرح سے ٹوٹ جائے، لیکن دوروندال ٹوٹنے کا نام نہیں لیتی جب اس نے دیکھا کہ وہ ٹوٹتی نہیں تو یوں کہنے لگا۔

"میری پیاری دوروندال! تو میری محبوبہ ہے، تیرے قبضہ میں متبرک تعویذ پیوستہ ہیں، بطرس کا ایک پاک دانت ہے، سینٹ باسل کا خون ہے، بی بی مریم کے لباس کا ایک ٹکڑا ہے اور سینٹ ڈینس کا بال ہے، یہ ٹھیک نہیں کہ کوئی عرب تجھ پر قبضہ کرے، یہ تو عیسائیوں کا حق ہے کہ وہ تیری خدمت گذاری کریں، خدا کرے ایسی نوبت کبھی نہ آئے کہ کوئی بزدل تجھے اپنے ہاتھ میں لے، تجھ ہی سے تو میں نے سیکڑوں ملک فتح کئے۔ تو کیسی خوبصورت چمکدار اور سفید ہے، تو سورج کی روشنی میں ایسی چمکتی ہے کہ دشمنوں کی آنکھیں چکاچوند ہو جاتی ہیں، شارلمان جب موریین کی وادیوں میں تھا اس وقت خدا نے اپنے فرشتے سے اسے کہلوا بھیجا تھا کہ وہ تجھے میرے حوالے کرے، تجھ سے میں نے انجو اور برٹانی، پوآتو اور مین، نارمنڈی اور پرووانس، لمباردی اور رومانیہ، باویریا اور فلانڈرز، بورگنڈی اور قسطنطنیہ، اکوس اور انگلستان فتح کئے، اب میرا اور تیرا ساتھ چھوٹتا ہے، صد افسوس

۱؎ بعض عقیدت مندوں کا خیال ہے کہ یہ چٹان جس پر رولان نے اپنی تلوار توڑنے کی کوشش کی تھی، آج بھی پیرنیز کے پہاڑی سلسلے میں رونسوس کے قریب موجود ہے۔ ذرا سی چٹان پر اس کی تلوار کے نشانات بھی ملتے ہیں۔

کو کبھی یہ ذلت نہ دکھائے کہ وہ کسی عرب کے ہاتھ میں جائے۔"

یہ کہکر رولان ایک سبز جھاڑی پر گر پڑا، اس کی تلوار اور نرسنگھا اس کے پاس رکھے ہوئے تھے وہ سمجھا تھا کہ اب اس کا آخری وقت ہے۔ اس نے اپنے گناہوں کی معافی مانگی اور اپنے سیدھے ہاتھ کا دستانہ آسمان کیطرف اٹھایا، اس آخری وقت میں اُسے بہت سی باتیں یاد آرہی ہیں، وہ سب ملک جو اس نے اپنی دو دو بذال سے فتح کئے، اپنے پیارے ساتھی، پیارا فرانس، بادشاہ شارل کی محبت جس نے بچپن سے اس کی پرورش کی، سب کے سب اس کی آنکھوں کے سامنے پھر رہے ہیں وہ سرد آہیں بھرتا ہے اور پھر اپنے گناہوں کی معافی ان لفظوں میں مانگتا ہے۔

"اے ہمارے سچے باپ! تو نے کبھی جھوٹی بات نہیں کہی، اے وہ جس نے مرنے کے چار دن بعد سینٹ لزار کو زندہ کیا[1] اور دانیال کو شیر کے منہ سے بچایا[2]۔ ان سب کے طفیل میں اے خدا میرے سب گناہ بخش دے۔

اسکا سر اسی کے بازوؤں پر گر پڑا، اس نے دم توڑ دیا، آسمان سے میکائیل اور دوسرے فرشتے اس کی روح کو جنت لے گئے۔

شارل رونسیو پہنچکر رولان کو ہر طرف ڈھونڈتا ہے، قدم قدم پر عربیوں اور فرانسیسیوں کی لاشوں کے ڈھیر لگے ہیں، جب کسی طرف اس نے رولان کو نہیں دیکھا تو یوں چلایا:

پیارے بھتیجے. تو کہاں ہے؟ ترپان اور اولیوئے کہاں ہیں؟ میرے اور سب ساتھی کہاں ہیں؟ افسوس میں اپنے ساتھیوں کی مدد کے لئے ذرا پہلے کیوں نہ پہنچ گیا،" وہ اپنی داڑھی اس آدمی کی طرح مروڑتا ہے جو بڑے ہی رنج اور سوچ میں ہو۔ اس کے سب ساتھی اسی کے ساتھ رونے لگے ہیں کوئی اپنے بھائی اور کوئی اپنے بیٹے کا ماتم کر رہا ہے، بہت سوں کو تو غش آگیا ہے، نواب نائم جو بڑا سمجھدار اور جہاندیدہ آدمی ہے شارل

---

[1] سینٹ لزار، مارتھا اور مریم کے بھائی ہیں جنہیں حضرت عیسیٰ نے مرنے کے چار دن بعد معجزہ سے زندہ کیا۔ انجیل یوحنا ۱۱ – ۱۲۔

[2] غالباً سیاحتی فسانہ کیطرف اشارہ ہے جس میں دانیال کو زنا کا مجرم قرار دیا گیا اور بعد میں وہ بےگناہ ثابت ہوئے

سے یوں کہتا ہے۔

"آسمان پر غبار چھا رہا ہے معلوم ہوتا ہے عربوں میں ہمارے آنے کی خبر سے کھلبلی مچ گئی ہے وہ اب ہم سے دو کوس سے زیادہ فاصلہ پر نہیں ہوں گے۔ اب ہمیں چاہئے کہ مسلح ہو کر اپنے گھوڑوں سے ان پر ٹوٹ پڑیں اور اپنے شہیدوں کا بدلہ لیں، اس کام میں اب دیر بالکل نہیں ہونی چاہئے۔

شارل۔ افسوس میرے فرانس کے سارے پھول پژمردہ ہو گئے، میرے دوستوں اور سرداروں میں سے کوئی باقی نہیں رہا، اچھا اب ان لاشوں کو جیسا کا تیسا چھوڑ کے عربوں پر حملہ کی تیاری کرنی چاہئے نزدیک کے ٹیلوں اور پہاڑیوں کو گھیر لینا چاہئے۔

اس نے حکم دیا کہ فوج کے سارے نرسنگھے بجائے جائیں اور سب فوج حملہ کے لئے تیار ہو جائے رات زیادہ جا چکی تھی وہ گھوڑے سے اتر کر ایک جھاڑی کے پاس عبادت میں مشغول ہو گیا اور دعا کی کہ سورج غروب نہ ہو اور دن باقی رہے تاکہ وہ روشنی میں دشمن پر حملہ کر سکیں، ایک فرشتہ آسمان سے اتر کر اس کے پاس آیا، یہ فرشتہ ہمیشہ اس کے پاس آیا کرتا ہے، اس نے شارل کو یوں مخاطب کیا:

"اے شارل گھوڑے پر سوار ہو جا، روشنی کی تجھے کمی نہیں ہوگی، تو نے فرانس کے سب پھول کھو دئے تو چاہے تو اس نقصان کا بدلہ لے سکتا ہے۔"

شارل کی خاطر سورج جہاں تھا وہیں ٹھہر گیا، عرب بری طرح فرانسیسیوں کے سامنے بھاگ رہے تھے، فرانسیسی انہیں دھکیل کے سارا گوس کی وادی تک لے گئے اور وہاں ان پر ہر طرف کا راستہ بند کر دیا، ایک طرف پہاڑ اور فرانسیسی فوجیں تھیں اور دوسری طرف دریائے ایبر جس کا کوئی پل موجود تھا اور نہ کوئی کشتی انہوں نے اپنے خداؤں [1] سے بہت التجائیں کیں لیکن کوئی دعا کارگر نہیں ہوئی اس وقت کوئی نہیں جو انہیں اس مصیبت سے بچا سکے، فرانسیسیوں نے چن چن کے سبھوں کو قتل کیا جو ان کی تلواروں سے بچے وہ دریائے ایبر میں ڈوب ڈوب کے مر گئے۔

---

[1] خداؤں کی ایک ہی رہی۔

جب شارل نے دیکھا کہ سب عرب دبک گئے تو اس نے گھوڑے سے اتر کر خدا کا شکر ادا کیا۔ گھوڑے تھکے ہوئے تھے سب نے زمین پر آ کے انہیں قریب کی چراگاہ میں چھوڑ دیا، پیدل نے وہیں ڈیرے ڈال دئے۔ رات اتنی بیت چکی تھی کہ وہ اپنے سیو واپس نہیں جا سکتے تھے۔ شارل کی ساری سپاہ گھوڑے چھوڑ چھوڑ کے سو گئی۔ شارل مسلح ایک چراگاہ کے پاس ایک سبز جھاڑی سے ٹیک لگا کے لیٹ رہا۔ اس نے دانستہ اپنے سر کے خود اور بدن کی زرہ کو اتارا نہیں، وہ رولاں کے غم میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کے دل پر اولیور اور تورپان کی موت کا بڑا صدمہ تھا، کبھی روتا تھا کبھی ٹھنڈی سانس لیتا تھا، کوئی آدمی یا گھوڑا نہیں جو تھکن کی وجہ سے زمین پر دراز نہ ہو گیا ہو اور خراٹے نہ لے رہا ہو۔ شارل کی ذرا دیر کو آنکھ لگی حضرت جبرئیل اس کے سرہانے اس کی حفاظت کو موجود تھے۔

شارل نے خواب میں دیکھا کہ بڑے زور کا طوفان آ رہا ہے۔ آندھی چل رہی ہے، ہر طرف فضا میں شعلے نکل رہے ہیں، پھر اس نے اپنے آدمیوں کو بڑی مصیبت میں دیکھا کبھی ریچھ بھیڑیے اور سانپ اور کبھی شیطانوں کے گروہ انہیں گھیرنے کی کوشش کر رہے ہیں، یہ حال دیکھ کے اس نے کوشش کی کہ وہ اپنے ساتھیوں کی مدد کو جائے لیکن وہ اس نے اپنے میں اتنی طاقت نہیں پائی کہ ایک قدم بھی اٹھا سکے اس کے بعد اس نے خواب میں ایک گھنا جنگل دیکھا جہاں شیر غصہ میں بھرے ہوئے اس کی طرف جھپٹتے ہیں اس سے اور ان شیروں سے کشتی ہوتی ہے، اسے یہ معلوم نہیں کون جیتتا ہے اور کون ہارتا ہے۔ پھر کیا دیکھتا ہے کہ ایکس میں محل کی سیڑھیوں پر ایک ریچھ زنجیروں میں بندھا ہوا بیٹھا ہے، اردین کی طرف سے تیس اور ریچھ کو آتے دیکھتا ہے، ہر ریچھ انسان کی بولی بولتا ہے، وہ سب شارل سے یوں مخاطب ہوتے ہیں۔

"حضور والا! اس ریچھ کو ہمیں حوالہ کر دیجئے، یہ کونسا انصاف ہے کہ آپ اسے قید میں رکھیں، وہ ہمارا عزیز ہے اس کے وجود سے ہم سبھوں کی تسلی ہوتی ہے۔ اسی اثنا میں اس نے ایک شکاری کتا دیکھا جو محل کی طرف سے دوڑ کر آتا ہے اور سب سے الگ ہری جھاڑی کے پاس سب سے بڑے ریچھ پر حملہ کرتا ہے، شارل ان دونوں کی لڑائی بہت دیر تک دیکھتا رہا اسے اسکا کچھ پتہ نہیں لگا کہ ان دونوں

لہ موڑ سے بچنے کی بجائے ان لوگوں نے گھوڑے چھوڑ دیے ہیں۔

میں کوئی غالب دیتا ہے؟ اصل میں یہ خواب حضرت جبرئیل نے شارل کو دکھایا ہے۔

بادشاہ مارسیل سارا گوس بھاگ کر چلا گیا تھا، ایک زیتون کے درخت کے سایہ میں وہ اپنے گھوڑے پر سے اترا، اپنے ملازموں کو اپنے سر کا خود، زرہ اور تلوار حوالے کی اور ایک جھاڑی کے پاس تھکا ماندہ لیٹ گیا، اس کا سیدھا ہاتھ جڑ سے کٹ گیا تھا، اس کے بدن سے اتنا خون نکل چکا تھا کہ کمزوری سے وہ بالکل بے ہوش تھا، اس کے سامنے اس کی بیوی برامیموند رو رہی تھی اور بڑے زور زور سے چیخیں مار رہی تھی، اس کی چیخوں سے عربوں کے دل ہل رہے تھے، وہ سب شارل اور اس کی فوج کو کوستے تھے، وہ کھسیانی بلی بنے ہوئے ابولو کے بت کی طرف گئے اور اس کی بے عزتی کی اور کہنے لگے

"اے منحوس خدا! تونے ہماری اس مصیبت میں کوئی مدد نہیں کی، تونے ہماری یہ ذلت کیوں کرائی؟ ہمارے بادشاہ کو کیوں تباہ کرایا؟ جو تیری خدمت کرتے ہیں انہیں کو تو خوار کرتا ہے"

یہ کہہ کر انہوں نے اس کے سر سے تاج اتار لیا اور اس کے ہاتھ سے عصا چھین لیا اور اسے الٹا اوندھے منہ زمین پر گرا دیا اور ڈنڈوں سے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ پھر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بت کو انہوں نے ایک گڑھے میں ڈال دیا جہاں کتے اور سور اسے کچلتے تھے۔

مارسیل کو جب ہوش آیا تو اُسے محل کے آراستہ کمرے میں لے گئے، رانی برامیموند دہاڑیں مار مار کر رو رہی تھی اور اپنے بال نوچتی تھی اور کہتی تھی کہ عربوں کے سارے خداؤں نے انہیں دھوکا دیا۔

عنفوانِ شباب کی مجموعی نفسی سیرت

(۲)

آہستہ آہستہ زندگی کا دستور العمل مرتب ہونا۔

اگر ہم یہ سمجھیں کہ عمل پیشے کے انتخاب تک محدود ہے تو بڑی غلطی کے مرتکب ہوں گے۔ یہ کوئی ضروری بات نہیں کہ ہمارا نوجوان ایسا دستور العمل بنائے جسے سوچ سمجھ کر زندگی کا کوئی مقصد معین کیا گیا ہو یہاں مراد صرف یہ ہے کہ اندرونی نفسی زندگی، فطری رجحانات اور بیرونی دنیا کے اثرات کے تعامل سے ایک خاص سمت اختیار کر لیتی ہے۔ اس طرح تہ کے نیچے نفس کی لاشعوری بھول بھلیاں میں انسان کی سیرت نشو و نما پاتی ہے۔

ان سب تغیرات کی بنیاد اس پر ہے کہ نوجوان زندگی سے نئے قسم کا تعلق قائم کرتا ہے۔ بچے کے نزدیک عموماً زندگی غیر مربوط لمحات کی توالی کا نام ہے وہ نت نئے لطف اٹھاتا اور نئی دلچسپیاں پیدا کرتا رہتا ہے اور زندگی کو ایک کُل سمجھ کر عمل کرنے کا اسے کبھی خیال تک نہیں آتا زمانہ اس کی نظر میں نامحدود ہے۔ داخلی احساس میں عمر کا کوئی حصہ اتنا طویل نہیں معلوم ہوتا جتنا بارہ برس سے تیرہ برس تک کا زمانہ۔ یہ بھی سب جانتے ہیں کہ بچے کو گزرے ہوئے جذبات و احساسات بہت کم یاد رہتے ہیں۔ وہ ابھی مرکزِ زندگی کے لیے اتنے اہم نہیں ہوتے جتنے آگے چل کر ہوتے ہیں جب بلوغ کا زمانہ قریب آتا ہے تو بہت ہی آہستہ آہستہ سال بسال یہ نیا احساس پیدا ہوتا جاتا ہے: "تیرے عمل کا موضوع ایک کُل ہے۔ تیرا عمل اس کُل کا جز ہو جاتا ہے اور کبھی اس سے جدا نہیں ہوتا۔ یہ خود تیری ذات کا ایک ٹکڑا بن جاتا ہے۔" خود اپنی زندگی میں تسلسل کو ڈھونڈھنے اور گزرے ہوئے زمانے کی یاد کو قائم رکھنے کی جو کوشش نوجوان کرتے ہیں اس کی ایک اہم علامت روزنامچہ ہے۔ اس میں اکثر بچپن کی یاد نمایاں حصہ رکھتی ہے لیکن قدرتی طور پر ان کے نقطۂ نظر زیادہ تر آئندہ زمانے پر ہوتا ہے نہایت خاموشی کے ساتھ خود بخود ایک نصب العین زندگی بن جاتا ہے مستقبل کی اس تصویر میں ابتدا میں وہ چیز جسے ہم واقعیت کہتے ہیں خال خال ہی نظر آتی ہے۔ واقعات کے نقطوں کے درمیان جگہ جگہ

غلو ہوتا ہے اسے خلاقِ تخیل پر کر دیتا ہے۔ یہ تخیل کا عنصر آئندہ زندگی میں بار بار نمودار ہوتا ہے۔ یہ رفتہ رفتہ واقعات کی صورت اختیار کر لیتا ہے جس طرح کھوپڑی میں کرتی رفتہ رفتہ سر کی ہڈی بن جاتی ہے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ جیسے جیسے تمدن میں پیچیدگی پیدا ہوتی جاتی ہے ویسے ویسے اس کے مختلف شعبے مستقل صورت اختیار کرتے جاتے ہیں۔ بلوغ کے قبل کا زمانہ طویل ہوتا جاتا ہے خارجی تمدن میں جو پہلے سے ایک صورت اختیار کر چکا ہے جوڑ کرنا، اس سے صحیح تعلقات قائم کرنا اس میں اپنی مناسب جگہ ڈھونڈ نکالنا روز بروز مشکل ہوتا جاتا ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ بہت سی زندگیوں میں سے جنہیں انسان اختیار کر سکتا ہے وہ ایک زندگی اختیار کرے لیکن اس مقصد کی خبر ہمارے نوجوان کو نہیں ہوتی۔ فطرت ہر اس کام کو جس کا تعلق توالد اور تخلیق سے ہو پردہ کے پیچھے کرتی ہے۔ الفرڈ آڈلر نے سچ کہا ہے "زندگی میں اور انسان کی نشو و نما میں جس قدر پوشیدگی نصب العین حیات کی تعمیر میں برتی جاتی ہے کسی چیز میں نہیں برتی جاتی۔ اس پوشیدہ نصب العین کو معلوم کرنے کے لئے جو اعداد و شمار مہیا کئے جاتے ہیں ان سے محض غلط نتائج نکلتے ہیں جن لوگوں کی زندگی کو بچے اپنے لئے مثال قرار دیتے ہیں وہ عموماً بڑے آدمی نہیں ہوتے بلکہ اکثر وہ معمولی آدمی ہوتے ہیں جن سے تعلق خاطر ہو جیسے اپنا چچا یا ہمسائی کا لڑکا جو سن میں تین برس بڑا ہے

ہم نوجوانوں کے تخلیقی نصب العین کی حقیقت پر آئندہ باب میں تفصیل سے بحث کریں گے۔ ریڈ کر کا مشہور قول بالکل سچ ہے کہ "اس عمر میں ہر شخص کے پیش نظر اس زندگی کی تصویر ہوتی ہے جسے وہ اختیار کرنا چاہتا ہے۔ یہ تصویر کائنات کے قطعی امر اخلاقی کی مجرد شکل میں نہیں ہوتی بلکہ خود اپنے نفس ہی کی مکمل صورت چشم تصور میں نظر آتی ہے اور یہ قانون صورت[1] جس کی تعمیل میں سب اعلیٰ اندرونی قوتیں صرف ہوتی ہیں۔ اندر اور باہر کی رکاوٹوں کے مقابلہ میں قانون عمل بن جاتا ہے۔

لیکن یہ رکاوٹیں اکثر انحراف، خرابی بلکہ دماغی اور نفسی امراض کا باعث بن جاتی ہیں۔ پیتالوزی کا یہ قول بالکل صحیح ہے "انسان اچھا ہے اور اچھائی کرنا چاہتا ہے۔ البتہ ممکن ہے کہ وہ اچھائی کے ساتھ

(۱) قانون صورت محض بیانی قانون ہے جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ کسی شے کا نشو و نما فطرتاً کیونکر ہوتا ہے۔
(۲) قانون عمل حکمی قانون ہے جو یہ بتاتا ہے کہ کسی شے کی نشو و نما میں کیونکر مدد کرنا چاہیے۔

خوشی کا بھی طالب ہو۔ اگر کوئی انسان برا ہے تو یقیناً اس کا سبب یہ ہے کہ لوگوں نے اُسے اُس طرح اچھا نہیں بننے دیا جس طرح وہ چاہتا تھا۔

طبی تحلیل نفس کے اُس مذہب نے جس کا بانی الفریڈ آڈلر ہے نفس کی ان گہرائیوں پر خوب روشنی ڈالی ہے۔ اگر کسی کو اُس کے نظریے کے کل حصوں سے اتفاق نہ بھی ہو تو بھی اُس کے بہت سے اہم اور صحیح مشاہدات کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ آڈلر نے اس بحث کا آغاز عضویاتی پہلو سے کیا ہے اگر کسی عضو میں پیدایشی نقص ہو تو ساری قوت حیات اسی عضو میں جمع ہو جاتی ہے اس طرح نہ صرف کافی بلکہ ضرورت سے زیادہ تلافی ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد آڈلر بہت تفصیل کے ساتھ نفسی زندگی کے مظاہر کا ذکر کرتا ہے نقص کا احساس انسان کو اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ (لوگوں کے طعن و تشنیع سے) بچاؤ کا راستہ ڈھونڈھے۔ کیونکہ انسان کی یہ جبلی خواہش کہ وہ نیچا نہ رہے بلکہ اونچا رہے جسے ہم اثبات خودی کی امنگ یا حصول قوت کا ارادہ[1] کہتے ہیں زندگی کی بنیادی جبلت ہے۔ اگر یہ جبلت سیدھے راستہ سے اپنی منزل پر پہنچ جائے تو شخصیت کی تعمیر صحیح بنیاد پر ہوتی ہے لیکن اگر اس میں کامیابی نہ ہو بلکہ یہ جبلت کسی وجہ سے دب جائے تو یہ لاشعوری حالت چپکے چپکے کام کرتی رہتی ہے اور اونچا رہنے کے لئے انسان من گھڑت تصورات سے کام لیتا ہے اور کسی دور دراز راستہ سے منزل پر پہنچنا چاہتا ہے۔ یہی من گھڑت تصورات عمل کے محرک ہوتے ہیں۔ اس سے ہماری سمجھ میں آ جائیگا کہ بعض لوگ کیوں زندگی کے بے سر و پا دستور العمل بنایا کرتے ہیں یا اس خبط میں مبتلا رہتے ہیں کہ ہر شخص اُنکا دشمن ہے اور اُن پر ظلم کرتا ہے یا اعصابی دوروں میں گرفتار رہتے ہیں (یہاں تک کہ اپنی تذلیل کرنے میں بھی انہیں قوت کا مزہ ملتا ہے) اس طرح کی صورتیں اپنی ابتدائی حالت میں روزمرہ زندگی میں بھی پیش آتی ہیں۔ عورتیں غش میں آ کر وہ کیفیت حاصل کرنا چاہتی ہیں جو انہیں تصورات سے نہیں حاصل ہوتی۔ وہ جان بوجھ کر غش نہیں کھاتیں لیکن اُنکے نفس کے تحت شعوری حصہ میں کوئی ایسی چیز ہے جو انہیں اس پر مجبور کرتی ہے کیونکہ وہ سیدھے راستہ سے بہ جبر ہٹا کر ٹیڑھے راستے پر لگا دی گئی ہے۔ بکتی کھانسی یا جھوٹ کا جھوٹ موٹ کھانسنا تاکہ مکتب جانے سے بچ جائیں اکو نفس بالارادہ حفاظت اور اندفاع کی غرض

---

[1] جرمن ترکیب WILLE ZUR MACHT کا ترجمہ ہے جسے انگریزی میں WILL TO POWER کہتے ہیں۔

سے پیدا کرتا ہے اور یہ ممکن ہے کہ آہستہ آہستہ یہ عارضہ ترقی کر کے پاگل پن بن جائے۔ مرض اختناق میں جو بندش طاری ہو کر اندھا بہرا پن ہو جاتا ہے اُس کی اصل تحت شعوری عالم میں یہ ہے کہ انسان خود سننا اور دیکھنا نہیں چاہتا۔

لیکن اس کتاب میں ہمیں مریضوں کا ذکر کرنے کا حق نہیں ہے۔ اس قسم کی بالواسطہ تحریکات اُس زندگی میں بھی پائی جاتی ہیں جسے ہم معمولی (یعنی صحت کی) زندگی کہتے ہیں اور خاص طور پر تعلق میں ظاہر ہوتی ہیں۔ نقص کا احساس خود اپنی تلافی کی صورت پیدا کر لیتا ہے۔ یہ تلافی کبھی کبھی اُسی شعبۂ ذہنی میں ظاہر ہوتی ہے جس میں نقص ہو لیکن اکثر دوسرے شعبوں میں۔ ردسو نے جس کے دل میں آرزوئے زندگی اور محبت کا طوفان موجزن تھا لیکن اس آرزو کے پورا کرنے کی قوت نہ تھی۔ اس کی شاعرانہ تلافی کے لئے لوح قلب پر E M i L کا نقشہ کھینچا۔ جو شخص خود زور وشور سے زندگی کا لطف اٹھاتا ہے وہ فلسفے نہیں لکھا کرتا۔ تحقیر کا احساس یعنی اپنے نفس میں نقص کا وہ احساس جو لوگوں کی ناقدری اور بے اعتنائی سے پیدا ہوتا ہے قوائے ذہنی کا رُخ اُس طرف پھیر دیتا ہے جدھر کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ دل میں جو امنگ اپنے آپ کو منوانے کی ہوتی ہے وہ یا تو سماج (سوسائٹی) کے کسی دوسرے طبقے کی طرف رجوع کرتی ہے یا اعتراض اور نفی کے جذبہ میں تبدیل ہو جاتی ہے یا انسان کو تنہائی کی زندگی کا لطف اٹھانے پر مائل کر دیتی ہے۔ اُس کی مثال نیٹشے کی زندگی میں ملتی ہے جس کا یہ حال تھا کہ ایک طرف واقعی زندگی کا پیمانہ اُس کے ہاتھ میں ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا۔ اور دوسری طرف وہ اپنی داخلی زندگی کی شراب عالم آشوب میں سرشار ہوا جاتا تھا۔[1] نوجوانوں کے نصب العین زندگی کی حیرت انگیز بے اعتدالیوں کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان اُس عمل کے نشیب و فراز سے خوب واقف ہو جس سے نفس میں فعل کی تحریک پیدا ہوتی ہے۔ اس عمر میں اخفا کا مادہ اس قدر ہوتا ہے کہ وہ ان تمام اعمال کو جو قلب کی گہرائی میں واقع ہوتے ہیں، چھپا لیتا ہے۔ بظاہر جو چیز نوجوانوں میں نظر آتی ہے وہ محض خودسری، مخالفت، ضد اور مردم بیزاری ہے۔ ان خصلتوں کا اُن میں موجود ہونا اس قدر تعجب خیز ہے کہ اس کی توجیہ کے لئے ہم یہ ماننے پر مجبور ہیں کہ زمانہ کا جبر و سختی اٹھانے سے رفتہ رفتہ

---

(۱) جس شخص کی سماج تحقیر کرتی ہو وہ ذہنی خلاقی کے اعلیٰ نمونے پیش کر کے عزت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ زیادہ غرور انسان کو ایسی زندگی اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے جس کے لئے وہ بالکل مناسب نہیں۔ بہت سی ناکامیاب زندگیوں کا یہی راز ہے۔

اپنے پرانے مقاصد، یا اپنے محبوب دوستوں سے جدا کر لئے جانے سے یا اونچے مقامات سے بچھڑ جانے
سے) ان میں نفی (ہر بات کی مخالفت کرنے کا) مرض پیدا ہو جاتا ہے۔ عالم بیزاری کے جتنے نظارے نظر آتے
ہیں ان سب کی تہہ میں وہی خیال ہوتا ہے جسے الفریڈ ایڈلر نے ان الفاظ میں خوب ادا کیا ہے "مجھے ایسا
رویہ اختیار کرنا چاہئے کہ آخر میں میدان میرے ہی ہاتھ رہے" کبھی کبھی یہ داخلی کشمکش نوجوانی ہی میں ایسی خراب
صورتیں اختیار کر لیتی ہے کہ انسان محض دوسروں کو اذیت پہنچانے کے خیال سے خودکشی تک کر گذرتا ہے
مجروح احساس خودی اپنی ذلت کی تلافی اور اپنی عزت کو کسی حد تک دوبارہ قائم کرنے کے لئے ہر تدبیر
اختیار کرتا ہے خواہ کچھ ہی انجام کیوں نہ ہو۔

جرمنی کی تحریک شباب میں ایسے لوگ بھی شامل ہیں جو کوئی مثبت نصب العین نہیں رکھتے۔
انہیں اسکا موقعہ نہیں دیا جاتا کہ وہ اپنے آپ کو بالغ سمجھیں۔ اس لئے انہوں نے وہ راہ اختیار کر لی
ہے جو انکے لئے کھلی تھی۔ "ہم اب بالغ بننے کی کوشش نہیں کریں گے ہم اپنے آپ کو نابالغ سمجھیں گے
اور ہمیشہ سمجھتے رہیں گے" یا دوسری صورت یہ ہے کہ موجودہ مغربی تمدن کے مطالبات اپنے نوجوانوں
سے روز بروز سخت ہوتے جاتے ہیں اس لئے انکے نفس نے حفظ ماتقدم شروع کر دیا ہے۔ وہ یہ اعتراف
نہیں کرتے کہ وہ اس تمدن میں حصہ لینے کی قوت نہیں رکھتے بلکہ وہ اپنا بچاؤ یہ کہہ کر کرتے ہیں "ہم اس تمدن
میں حصہ نہیں لیتے یہ کسی کام کا نہیں ہے"۔ تحریک شباب کا یہ پہلو یعنی زندگی کی کارزار سے منہ چھپانا ہمارے
تمدن کی بیماری کی علامت ہے لیکن جیسا ہم آگے چل کر بیان کریں گے اس تحریک میں دوسری
قوتیں بھی پنہاں ہیں۔

مختصر یہ کہ عہد شباب کی آرزوئیں جو دل میں جگہ کر لیتی ہیں۔ انہیں اگر زمانہ پورا ہونے کا
موقعہ نہیں دیتا تب بھی وہ بے اندازہ قوت کے ساتھ آئندہ زندگی میں باقی رہتی ہیں۔ یہ پوشیدہ حرکات
کی شکل میں انسان کے افعال پر اثر ڈالتی رہتی ہیں اور کبھی کبھی ساٹھ برس تک کی عمر میں (جس کی ایک
مثال خود مجھے معلوم ہے) زندگی میں دفعتہً انقلاب پیدا کر دیتی ہیں یہ خاص انقلاب نشاۃ ثانیہ (یعنی
بچپن میں جو کمی رہ گئی تھی اُسکا بہت دن کے بعد جا کر پورا ہونا جو ہمیشہ مفید ہوتا ہے) کی صورت میں

ہو یا کسی افسوسناک حادثہ کی صورت میں جس میں برسوں کے جبر کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے اور اس کے ساتھ خود انسان کا طلسم حیات بھی۔

تشکیل ذات کے عمل میں جو عنفوان شباب میں شروع ہوتا ہے۔ علاوہ نفس کے بیدار ہونے کو آہستہ آہستہ ایک مربوط تحریک زندگی پیدا ہونے کے ایک تیسرا عنصر بھی ہوتا ہے اور ان تینوں کے ملنے سے نئے ساز حیات کا زیر و بم بنتا ہے۔ تیسرا عنصر یہ ہے کہ جہاں مدرک اپنے نفس کا مشاہدہ شروع کرتا ہے وہاں معاً میں بھی اُسے نئی نئی چیزیں نظر آنے لگتی ہیں۔ خارجی حیثیت سے تو یہ چیزیں ہمیشہ اُس کے ماحول میں موجود تھیں لیکن اُنکی مخصوص ماہیت کے ادراک کے لئے اُس میں کوئی حس نہ تھی۔ اب یہ حس اس طرح پیدا ہو جاتی ہے گویا وہ پھول کا کٹورا جو اب غنچۂ نفس کو اپنے آغوش میں چھپائے تھا کھل گیا اور اس کی ایک ایک پتی الگ ہو گئی ہے

چیزوں میں انتشار پیدا کرنے یا انکا انتشار سمجھنے کی جو مختلف صلاحیتیں نوجوانوں میں ہیں وہ بچہ میں بھی ہوتی ہے۔ وہ جمالی قدر، علمی قدر، اور مذہبی قدر کا احساس رکھتا ہے اور فائدہ، انس اور حکومت کا انتشار سمجھتا ہے لیکن ان قدروں سے بچوں اور نوجوانوں کے تعلق میں کئی اعتبار سے فرق ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ بچہ یہ شعور نہیں رکھتا کہ یہ زندگی کے شعبے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اس نکتہ کو فروبل کی باریک بین نظر نے خوب سمجھا تھا۔ چنانچہ اس نے فطرتی ذرائع تعلیم کا تعین اسی حقیقت کی بنیاد پر کیا تھا کہ بچہ کے نفس کی خصوصیت زندگی کی وحدت ہے اُس نے بچوں کو مشغول رکھنے کے لئے ایسے کھیل نکالے جن کی بنا ادراک کے نقطہ وحدت پر ہے جہاں علم کی صورتیں[1] جمال کی صورتیں اور فائدہ کی صورتیں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتیں کیونکہ خود بچہ اب تک اُس ازلی وحدت سے خارج نہیں ہوا ہے جو وہ ماں کے ساتھ فطرت کے ساتھ اور صانع فطرت کے ساتھ رکھتا ہے۔ علاوہ اس کے نوجوان کو زندگی کے مختلف شعبوں

---

(۱) صورت سے مراد ہے وہ سانچہ جس میں ذہن انسانی حواس خمسہ کے ذریعہ پہونچنے والے حیات کو ڈھال کر علم بناتا ہے۔

کا احساس کسی اور ہی رنگ میں ہوتا ہے۔ اس احساس میں مدرک کی نفسی کیفیت کا عنصر غالب ہوتا ہے اور
مدرک کی واقعی حالت پر بہت کم توجہ ہوتی ہے۔ بڑی خصوصیت نوجوان کے ادراک و احساس میں یہ ہے کہ
یہ احساس اُسے بذاتِ خود اپنے مخصوص انداز میں ہوتا ہے۔ اب خارجی محسوس اشیا کو وہ بلاچون وچرا
جیسی وہ نظر آتی ہیں ویسی تسلیم نہیں کر لیتا بلکہ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اب ان میں وہ اپنے ذاتی احساس سے
رنگ آمیزی کرتا ہے۔ اب جا کر اُن پر غور کیا جاتا ہے، اُنکی قدر کا تعین ہوتا ہے اور وہ واردات نفس کی صورت
اختیار کرتی ہیں۔ ابتک (یعنی بچپن میں) زیادہ سے زیادہ صنعتی کاموں میں ایک خاص طرح کا انہماک تھا لیکن
تعین قدر کا وہم و گمان بھی نہ تھا کیونکہ صنعت و حرفت میں تو قدر کا تعین نہیں ہوا کرتا بلکہ انسان پہلے سے مقرر
کی ہوئی قدر کو بلا تنقید مان کر اُنکے حاصل کرنیکے ذرائع تلاش کرتا ہے۔ لیکن اب انسان خود قدر کا تعین کرنے
لگتا ہے کیونکہ اب وہ اپنا ذاتی ادراک اور اپنی ذاتی قوت حکم رکھتا ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ عنفوان
شباب سے پہلے انسان فاعلی حیثیت سے تمدن میں حصہ نہیں لے سکتا۔ بچہ کا تعلق تمدن سے محض انفعالی ہے اگر
وہ خود کچھ کرتا ہے تو اُس کی وقعت دوسروں کی نقالی سے زیادہ نہیں۔ وہ خود کسی شعبہ میں کوئی تخلیقی کام
نہیں کرتا بلکہ تمدن کو جس طرح وہ موجود ہے اُسی طرح قبول کر لیتا ہے اور اُس میں اپنی پابند فطرت لاشعوری
وحدت کی زندگی بسر کرتا ہے۔ جب اس کے اور کائنات کے درمیان یہ رشتہ وحدت قطع ہو جاتا ہے تو ایک طرف
تو اُسے شعبہ ہائے تمدن کی کثرت کا احساس ہونے لگتا ہے اور دوسری طرف وہ خود اس خزانہ میں اپنی حیثیت
کے مطابق اضافہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اب آغاز ہوتا ہے اپنی صناعی کا، اپنے غور و فکر کا اور اپنے مذہبی
احساس کا۔ علاوہ اس کے ہمارا نوجوان موجودہ تمدن کی دولت میں خود بھی کچھ اضافہ کرتا ہے خواہ وہ کتنا
ہی حقیر کیوں نہ ہو۔ اُس کا یہ بدلا ہوا رویہ سب سے زیادہ اقتصادی شعبہ میں نمایاں ہوتا ہے۔ بچے اگر کھاتے
پیتے خاندان کے ہوں تو انہیں کبھی اس کی فکر نہیں ہوتی کہ ضروریات زندگی کس طرح فراہم ہوتی ہیں۔ ایک لڑکا
جس کے والدین تھیٹر میں تماشہ کرتے تھے اپنے بچپن کے زمانہ میں ایک بار اس سوچ میں پڑ گیا۔ لیکن اُس نے
جلد اپنے دل کو یہ کہہ کر تسکین دے لی کہ روز شام کو تماشے کے بعد آسمان والے پردے سے ایک دوانی
گر پڑتی ہو۔ خود کمانے کی خواہش دل میں پیدا ہونا اور اس کی باضابطہ کوشش بھی اس بات کی علامت

بچے کا نفسی شباب شروع ہو گیا۔

لیکن جب شعبہ اپنے تمدن سے تعلقات پیدا ہونے لگتے ہیں تو ساتھ ہی زندگی کی دشواریاں اور
کشاکش بھی شروع ہو جاتی ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ابتدا ہی سے آدمی مختلف شعبہ ہائے زندگی کے متعلق
تفکر اور اس مسئلہ پر غور کرنے لگتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کو خود اس کی زندگی کی تشکیل میں کہاں تک موثر
ہونا چاہئے۔ یہ بات اگر ہوتی بھی ہے تو بہت دن کے بعد اور شاید ان لوگوں کے لئے مخصوص ہے جو جان
بوجھ کر اپنی تربیت آپ کرتے ہیں۔ ان لوگوں کی زندگی میں یہ عمل بلوغ کے بعد بھی سالہا سال تک جاری
رہتا ہے۔ نوجوانی کے ابتدائی زمانہ میں جو دشواریاں پیش آتی ہیں انکے محض ایک جز کا شعور ہوتا ہے۔
لیکن دشواریوں کا ہونا اسی سے ظاہر ہے کہ موجودہ حالت میں ہمارے تمدن کے مختلف شعبوں میں وحدت
موجود نہیں ہے بلکہ طرح طرح کا تضاد اور کشاکش پائی جاتی ہے چونکہ ذہن خارجی (تمدن) بہت سی شاخوں
میں تقسیم ہو گیا ہے اس لئے ہمارے نوجوان کی داخلی ذہنی زندگی کے مختلف شعبوں میں بھی ابتدا میں کوئی
ربط نہیں ہوتا بلکہ اس سن میں ایسے تناقض ہوتے ہیں (اس سے مراد منطقی تناقض نہیں ہے بلکہ اخلاقی تعین
قدر کا تناقض) جو ہمیشہ رہ نہیں سکتے اور جن کو پوشیدہ قوت تشکیل سیرت کبھی نہ کبھی ضرور رد کر دیتی ہے۔

آجکل مختلف ذہنی شعبوں کا غیر مربوط ہونا عنفوان شباب کی ایک اہم نفسی خصوصیت سمجھی جاتی ہے
اس لئے مناسب ہو کہ ہم نظام نفسی کے ان مختلف پہلوؤں پر جو کہیں ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں اور
کہیں مل جاتے ہیں ایک ایک کر کے غور کریں اور اپنی نفسیات شباب کی تقسیم انہیں کی بنا پر کریں۔ اس سے
خود بخود ظاہر ہو جائے گا کہ اس عمر میں کونسا شعبہ ذہنی غلبہ رکھتا ہے۔ آخر میں یہ بھی ظاہر ہو جائے گا
کہ اس غالب شعبہ کی پرورش ایک ایسی چیز ہے جو نفس کی گہرائیوں میں رہتی ہے اور جب یہ دیکھیں
تو معلوم ہوتا ہے کہ یہی وہ جوہر ہے جو سیرت کی تشکیل اور عہد شباب کی ذہنی زندگی کی تہذیب کا آخری

دُوربین

انسان کو عقل و ہوش آنے کے بعد جس چیز نے سب سے پہلے اپنی طرف متوجہ کیا وہ اجرام فلکی اور ان میں خصوصیت کے ساتھ آفتاب تھا۔ اس کی روشنی اور گرمی نے اسے وہ رتبہ دیا جو دیوتاؤں کے لئے مخصوص تھا۔ ایرانیوں نے اسے خدا سمجھا اور یونانیوں نے بھی اسے اپنا سب سے بڑا دیوتا مانا۔ مشرقی ممالک کی صاف آب و ہوا نے اور گرمی کے دنوں میں آسمان کے نیچے بسیرا لینے والوں نے جب نظر اٹھائی تو نیلی چھت پر تاروں کا کھیت دیکھا۔ فطرتی طور پرست فلسفی اور غور کرنے والے دماغوں نے مشاہدہ کرنا شروع کیا اور اجرام فلکی کے مختلف قوانین دریافت کئے۔ جو تارے روز نظر آتے تھے اور زیادہ نمایاں تھے جن کی چالیں آسانی سے دیکھی جاتی تھیں۔ اُنکے نام رکھے گئے۔ اُنکے دور معلوم کئے گئے۔ ان تمام واقعات کو قبل تاریخی واقعات کہہ سکتے ہیں۔ یہانتک کہ سبع سیارہ کس نے کس زمانہ میں اور کہاں دریافت کئے کوئی نہیں بتا سکتا۔ جہالت اور لاعلمی نے ان اقوام میں یہ خیال ضرور پیدا کر دیا کہ ان ستاروں کی چال کا انسان کی تقدیر اور کاموں پر اثر پڑتا ہے۔ موجودہ سائنس باوجود انتہائی علمی اور غیر مذہبی ہونیکے اس خیال کو اب تک یورپ کے دماغ سے نہ نکال سکا۔ ایشیا والوں کا تو کیا کہنا۔ ابتدا میں علم ہیئت اور علم نجوم تھا اور آسمان کی سیر صرف اس لئے کی جاتی تھی کہ امرا اور روسا کے زائچہ بنا کر انہیں ٹھگا جائے۔ ان کی تقدیر بتا کر اُنکے منحوس دنوں کا شمار کیا جائے اور اُس کی روک تھام کے ڈھکوسلے بتائے جاتے تھے۔

ان اجرام فلکی کی خدائی کو تو حضرت ابراہیم نے سب سے پہلے لا احب الآفلین کہکر توڑا۔ اور یہی سب سے پہلے بت تھے جو پیغمبر کے اس خدا پرست کے ہاتھ سے شکست ہوئے۔ مگر عرب میں صابی گروہ کے خیالات تک رہا۔ ہندوستان میں ان سیاروں کی پوجا ہوتی رہی اور آج تک ہوتی ہے۔ یونان کے فلسفیوں نے راز خداوندی کو نہ پہچانا۔ حضرت عمر کی تلوار نے آتشکدۂ ایران کی آتش پرستی کو سرد

کیا مگر دل سے آفتاب و آتش پرستی کو نہیں نکالا۔ جب ایرانی مسلمان ہونے لگے تو اگرچہ عقیدہ چھوڑ بیٹھے مگر دل سے کے اثرات کا کیا کرتے اسلامی ادبیات میں ایسا ہی اثر شامل ہوا جس کی جھلک بہتوں میں موجود ہے اور جب اسلامی قانون کے مطابق نجوم اور آئندہ کے واقعات کی پیشین گوئی ممنوع قرار پائی تو اب علم ہیئت کی طرف توجہ کی چنانچہ خلیفہ مامون کے زمانہ میں عرب کے ریگستانوں میں سب سے پہلے زمین کے نصف دائرہ کے ناپنے کی کوشش کی یا ایک درجہ کو میلوں میں[1] ناپنے کا سب سے پہلا کام مسلمانوں کے ہاتھ انجام پایا۔ اس وقت کے آلات کا قیاس اس وقت ہم کو نہیں لگتا۔ اصطرلاب نے علم ہیئت میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ یہی علوم اور یہی آلات تھے جن کی مدد سے عرب تمام دنیا کے سمندروں پر حکمرانی کرتے تھے۔ جس طرح آج "برطانیہ سمندروں پر حکومت کرتی ہے" ایک زمانہ مسلمانوں کی حکومت کا گزر چکا ہے۔ ریاضی اور ہیئت مسلمانوں کے مشاغل میں شاعری کے بعد سب سے زیادہ دلچسپ مشاغل تھے مگر جہاں تک حالات سے علم ہوتا ہے دوربین سولہویں صدی کی ایجاد ہے۔ جبکہ مسلمانوں کے اقبال کا آفتاب مغرب میں ڈوبنا شروع ہو گیا تھا۔

گلیلو پزا PISA میں ۱۵۶۴ء میں پیدا ہوا اور ۱۶۱۰ء میں پہلی دوربین ایجاد کی۔ جو نظام بطلیموسی کہ زمین کل فلکیات کا مرکز ہے۔ آج تک مسلم مانا جا رہا تھا وہ کوپرنیکس نے باطل ٹھہرا دیا۔ اس کے شاگرد ٹائیکوبریہ TYCHOBVQHG نے یورپ میں اس خیال کو پھیلایا۔ اس اصول کے مطابق نظام شمسی میں مرکز آفتاب کو ٹھہرایا۔ اور زمین کو جو صدر کی جگہ دی گئی تھی وہ چھین گئی بلکہ زہرہ مشتری وغیرہ کی طرح ایک سیارہ تسلیم ہوئی اور سیارہ بھی ایسا جو اکثر سیاروں سے چھوٹا۔ چاند کو سیارہ کے درجہ سے گرا کر قمر[2] کا درجہ ملا گلیلو نے جب ان قوانین کی تعلیم دی تو بھلا پادریوں کی جماعت کو کب برداشت ہو سکتی تھی انہوں نے اپنے محکمہ احتساب کی زد میں لا کر اسے سزا دی اور اس سے توبہ کرائی کہ وہ اس طرح کا کفر نہ بکے کہ زمین گردش

---

[1] موجودہ صحیح آلات سے پھر اس زاویہ کو ناپا ہے مگر مامون کے زمانہ کے ناپ سے بہت کم فرق نکلتا ہے۔

[2] سیارہ تو وہ ہے جو کسی قائم ستارہ کے گرد چکر لگائے۔ جسے انگریزی میں PLANET کہتے ہیں اور جو اجرام فلکی سیاروں کے گرد گھومیں انہیں SATELLITE کہتے ہیں۔ اور اب اصطلاح میں انہیں قمر کہتے ہیں جیسے اقمار مشتری یعنی وہ اجرام جو مشتری کے گرد گھومتے ہیں۔

کرتی ہے یہی جہالت کا نتیجہ ہے مذہبی پیشواؤں نے مذہب کی آڑ لیکر چھپایا ہے اور چونکہ عوام کا طبقہ انکے ساتھ ہوتا ہے اس لئے انہیں فی الجملہ اقتدار رہتا ہے اور جن حقائق کو یہ نہیں سمجھ سکتے اُسے کفر کہکر اپنے مریدوں میں مشہور کر دینے کی کوشش کرتے ہیں چنانچہ انکا یہ اثر تھا کہ گلیلیو نے توبہ کی مگر حق کا اثر ایسا نہ تھا جو زائل ہو جاتا اور اس نے دوربین کی ایجاد کی کہ اجرام فلکی کو بغور دیکھ سکے۔ اور اس کے نظریہ کو ثابت کر کے مسلم بنا دیں۔ اندلس کی فتح نے یورپ پر بڑا احسان کیا تھا۔ اور یورپ اُس احسان سے کبھی عہدہ برا نہیں ہو سکتا۔ موجودہ شان و شوکت اگرچہ یورپ کو بھلا دے کہ اُس پر علمی احسان کرنیوالے کون تھے اور اُس نو دولت احسان فراموش کی طرح ہو جائے جو اپنے اس بے مایہ محسن کو بھول جائے جس نے اپنی ثروت کے زمانہ میں اس شخص کو کس مپرسی کی حالت سے ہاتھ بڑھا کر گرنے سے بچایا تھا۔ مگر اہل انصاف جب کبھی تاریخ لکھیں گے یہ ناممکن ہے کہ مسلمانوں کا تذکرہ نہ کریں۔ چنانچہ آپ کسی علم المرایا (Optics) کی کتاب کو دیکھیں اندلسی مسلمان الہیثم کا نام ضرور ملے گا۔ گویا کتاب اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جبتک اس شخص لافانی کا نام نہ آجائے۔ مگر چونکہ ہمکو اس وقت مسلمانوں کی یا الہیثم کی تاریخ لکھنی نہیں ہے بلکہ دوربین کے متعلق لکھنا ہے اس لئے ہم یہاں صرف اس قدر لکھکر اکتفا کرتے ہیں کہ جو قوانین الہیثم نے دسویں صدی میں دریافت کر لئے تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے ہرٹز نے اصول لاسلکی [illegible] دریافت کر لئے تھے مگر عملی شکل میں مارکونی نے اُسے آلات کی شکل میں بنایا اسی طرح الہیثم کے اصول کو دوربین میں تبدیل کرنا گلیلیو کا کام تھا جو مارکونی کی طرح اطالوی ہے۔

قبل اس کے کہ ہم دوربین کی ساخت کو بیان کریں تھوڑا سا ذکر انسان کی آنکھ کی ساخت کا بتانا ضروری سمجھتے ہیں انسان کی آنکھ میں ایک تپلی یا قزحیہ ہے جو خود بخود روشنی کی کمی اور زیادتی کی وجہ سے کم زیادہ ہوتی رہتی ہے جب روشنی تیز ہوتی ہے تو یہ تپلی سکڑ جاتی ہے کہ زیادہ روشنی آنکھ میں نہ داخل ہو سکے۔ جب روشنی کم ہوتی ہے تو پھیل جاتی ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ یہ روشنی کو آنکھ میں داخل ہونے دے فوٹو کے کیمرہ میں اسی اصول پر شٹر Shutter بناتے ہیں اس کے علاوہ ایک عدسہ ہے جس کی شکل ایسی () ہوتی ہے۔ اس عدسہ میں یہی قابلیت ہے کہ دور و نزدیک کی چیز دیکھنے کے لئے

یہ خود بخود ہو جاتا ہے (جیسا ہوتا رہتا ہے کہ اس کا ذکر نہ کریں) قائم ہو جانے کیونکہ ہمیں اکثر آگے پیچھے کرنا پڑتا ہے۔ یہ خود بخود ہوتا جاتا ہے۔

یہی اصول دوربین میں ہے کہ اول تو زیادہ سے زیادہ روشنی دوربین میں داخل ہو کر ہماری آنکھ میں پہنچے۔ مگر ہماری آنکھ کا عدسہ تو زیادہ سے زیادہ ایک انچ کا ½ حصہ کھل سکتا ہے اور اسی قدر روشنی فراہم کر سکتا ہے۔ اس لئے ہم نے دوربین سے فائدہ اٹھایا۔ کیونکہ دوربین میں اس قدر روشنی داخل ہوگی جس قدر بڑا اس کا عدسہ منظر Objective Lense ہوگا۔

اب یہاں ہم دو قسم کے عدسوں کا ذکر کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اگر روشنی شیشے کی ایسی پلیٹ میں گذرے جس کی سطح بالکل ہموار ہو تو شعاعیں سب برابر سے گذر جائینگی دیکھو شکل نمبر ۱

سادہ شیشے کی پلیٹ

شکل ۱
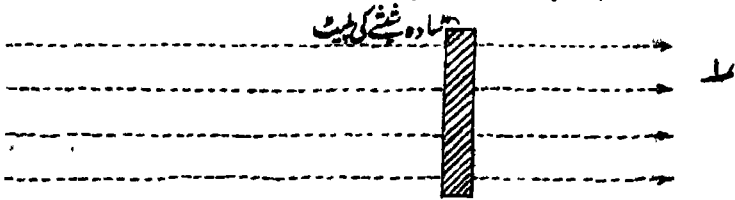
مگر جب آئینہ کی سطح محدب ہو یا مقعر ہو تو وہ کسی طرح سیدھی نہ جائینگی بلکہ ایک طرف سے تو متوازی آئینگی اور پھر سب مرکز پر جمع ہو کر دوسری طرف منحرف ہو کر نکلے گی۔ دیکھو ذیل کی اشکال

شمع — شعاعیں — محدب عدسہ — شکل ۲ — ف — چشمہ — عکس شمع — الف — ب
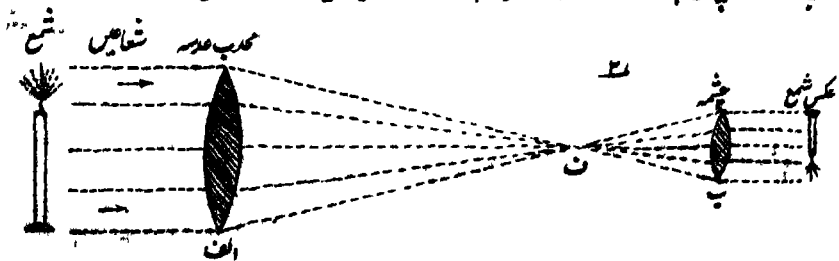
اگر شیشہ مقعر ہوگا تو پہلے مرکز پر جمع ہونگی پھر اپنی اپنی جانب کو منحرف ہو کر پھیلتی ہوئی چلی جائینگی۔

عدسہ مقعر — شکل ۳ — چشمہ — متوازی شعاعیں
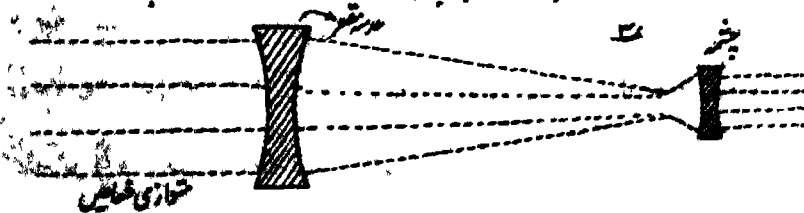
ان دونوں اصولوں کے سمجھنے کے بعد ہم دوربین کے اصول کو بیان کرتے ہیں۔

دوربین میں ایک لمبی پیتل کی نالی میں ایک شیشہ الف جو اصطلاح میں محدب عدسہ کہلاتا ہے رکھا جاتا ہے اس کے دائرہ پر دوربین کی طاقت منحصر ہے۔ ظاہر ہے کہ جس قدر بڑا شیشہ ہوگا اسی قدر بڑے رقبے پر روشنی پڑے گی۔ اور چونکہ یہ محدب ہے اس لئے وہ سب روشنی ایک مرکز پر جمع ہو کر دوسری جانب نکلے گی۔ جس فاصلہ پر یہ روشنی ایک نقطے کی شکل میں پڑتی ہے اسے مقام فوکس یا ماسکہ کہتے ہیں۔ آتشی شیشے سے لوگ کپڑا جلا لیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ روشنی اور حرارت جو پورے آتشی شیشہ پر پڑ کر ایک نقطہ پر جمع ہوتی وہ بحالت مجموعی اس قدر تیز ہو جاتی ہے کہ کپڑا ویسے دھوپ میں نہیں جلتا مگر جس وقت اس فوکس کے سامنے آتا ہے تو فوراً جل جاتا ہے۔ جب روشنی نقطہ ف یعنی فوکس تک آ گئی تو چونکہ وہ ایک نقطہ پر ہوتی ہے اس لئے ہم کسی جسم کا مشاہدہ ایک چھوٹے سے نقطے کے سوا نہیں کر سکتے۔ اب ہم چاہتے ہیں کہ اس نقطہ کو ذرا اور بڑھا لیں جس کے واسطے دوسرا شیشہ جسے چشمہ کہتے ہیں لگا کر ان شعاعوں کو جو اب تک منحرف تھیں اب پھر متوازی ہو گئیں اور اب ہم کو منظر نہایت واضح اور صاف نظر آنے لگا۔ محدب شیشہ کو آپ نے دیکھ لیا کہ کس طرح اس میں روشنی ایک طرف سے آتی ہے اور منحرف ہو کر شیشے کی دوسری جانب برآمد ہوتی ہے۔ اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ جو چیز دیکھی جاتی ہے وہ الٹی نظر آتی ہے (دیکھو شکل نمبر۲) دوربین کو ہاتھ سے گھٹا بڑھا کر ہم اس فوکس کو ٹھیک کر لیتے ہیں۔ تاکہ روشنی چشمہ پر متوازی اور ہموار پڑے۔

اب جب کسی ستارہ کو ہم دیکھتے ہیں تو الف شیشہ اپنی تمام روشنی کو جو ستارہ سے متوازی خطوط میں آ رہی ہے جمع کر دیتا ہے اور یہاں سے منظر الٹا نظر آئے گا یہاں تک کہ یہ ب شیشہ پر پہنچ کر پھر آنکھ پر پڑا اس کی وجہ یہ ہے کہ جس قدر روشنی الف پر پڑی تھی وہ اگر منتشر ہوتی تو ہم کو ایک چھوٹی سی چیز ہی نظر آتی کیونکہ اس کا ایک چھوٹا سا جزو ہی ہماری آنکھ پر پڑتا۔ مگر اب یہ سب جمع ہو کر ب کے رقبہ پر تقسیم ہو گئی۔ اور اس کا نتیجہ ایسا ہے جس کی تمام شعاعوں کو ہم بخوبی دیکھ سکتے ہیں۔ سب سے پہلی دوربین جو گیلیلیو نے بنائی وہ صرف تین گنا طاقت کی تھی پھر آٹھ گنا طاقت کی بنی۔ اس کے بعد ترقی ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ [illegible]

ماؤنٹ ولسن رصدگاہ میں موجود دوربین ہے اُسکا شیشہ تقریباً پونے تین گز کے قطر کا ہے۔ صرف شیشہ کی قیمت
کئی لاکھ روپیہ آئی ہے۔ دوربین کا وزن ۶۰ من کا ہے۔ مگر ایسی بڑی جسیم اسقدر وزنی چیز کو ہلانے اور ٹھیک
کسی ستارہ کی سمت جمانیکے آلات اسقدر نازک اور صحیح ہیں کہ ایک آدمی اسے باسانی ہر ستارہ کی
طرف جلدی لگا سکتا ہے۔ اُس کے زاویہ ثانیہ اور ثالثہ تک کے معلوم کرسکتا ہے۔ جب ضرورت تمام
فرش کو مع دوربین اونچا نیچا کرسکتا ہے۔ چاند جسکا فاصلہ زمین سے دو لاکھ ۴۰ ہزار میل کے قریب ہے
وہ صرف ایک میل کے فاصلہ پر نظر آتا ہے۔

شکل نمبر۱ میں ہم دیکھ چکے ہیں دوربین میں روشنی منحرف بالمقابل ہوجاتی ہے یعنی منظر الٹا نظر آتا ہے
اس کے ذریعہ سے ہم کسی چیز کو دیکھیں تو سر نیچا اور ٹانگیں اوپر نظر آتی ہیں۔ مگر ستاروں کے دیکھنے کے لئے
اسمیں کوئی حرج نہیں ہوتا۔ صرف یہ فرق رکھتے ہیں کہ اگر ہم شمال اوپر کی جانب رکھیں تو بجائے بائیں ہاتھ کے
کے مغرب رکھنے کے مشرق رکھیں گے اور مشرق کو بائیں ہاتھ پر رکھیں گے۔ زمین پر اسکا بالکل برعکس
ہوگا جو شکل نمبر سے ظاہر ہوگا۔
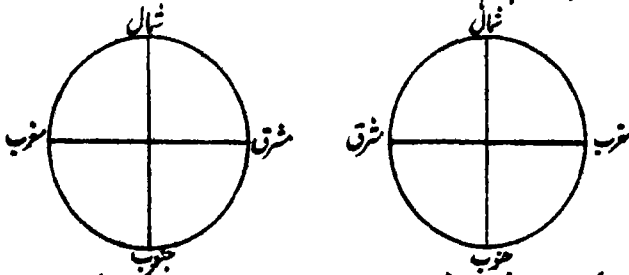
اس قسم کی دوربین میں روشنی براہ راست آتی ہے اور اسے معطفہ کہتے ہیں Rafractor
جن لوگوں نے دوربینوں سے دیکھا ہے انہیں معلوم ہوگا دوربین کو دیکھنا کس قدر تھکانے والا
کام ہے۔ بالخصوص جبکہ رات رات بھر نظر جمائے گردن اونچی کئے کسی ستارہ کو دیکھنا منظور ہو۔ اس لئے
فکر ہوئی کہ کسی طرح نیچے کی طرف دیکھکر ہم کو ستارہ نظر آنے لگے۔ چنانچہ دوسری قسم کی دوربین جسے منعکسہ
کہتے ہیں۔ سر ولیم ہرشل نے ایجاد کی۔

معطفہ میں ایک خرابی یہ بھی تھی کہ عدسہ
بہت بڑا ہونا چاہئے تھا اور بڑا شیشہ بنانیکی قیمت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ اس کی ادائیگی تقریباً ناممکن ہوگئی تھی
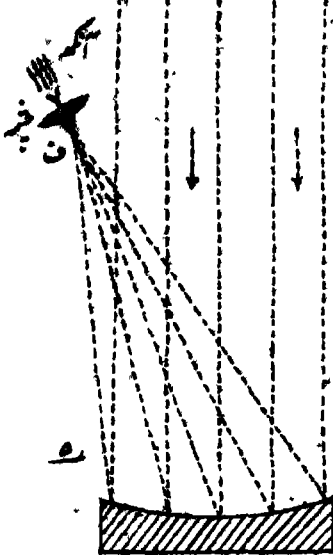
چنانچہ سر ولیم ہرشل نے اس اصول پر یہ دوربین انعکسہ بنائی جو اس نقشہ سے ظاہر ہو جائیں گے۔ اس
اس اصول سے بڑے شیشے کی ضرورت بھی جاتی رہی روشنی
ایک بڑی لمبی نلکی کے ذریعہ رصدگاہ میں داخل ہوتی اسی نلکی
کے آخر میں مقعر عکسی آئینہ لگا ہے جو روشنی کی شعاعوں کو جمع
کرکے ترچھا کرکے اور اپنا فوکس ایک نقطہ پر جا دیتا ہے یہاں سے
دوسرے شیشے کے ذریعہ یہ پھر متوازی شکل میں شعاعیں
چلتی ہیں اور آنکھ پر اثر کرتی ہیں۔

گلیلیو کے زمانہ سے اس وقت تک کئی شکلیں بدلیں۔
سب سے ابتدائی اور پہلی شکل تو نمبر ۲ ہے اور اب بھی بڑی دوربین
اسی اصول پر مبنی ہیں۔ دوسری دوربین جو زیادہ تر مروج ہے
دوربین انعکسہ ہے جس کا اصول شکل نمبر ۳ سے ہوگا

ایک مقعر عکسی آئینہ

ایک تو نیوٹن کے نام سے مشہور ہے۔ جسے نیوٹن نے بنایا تھا۔ اسمیں ایک عکسی آئینہ اور ایک سہ گوشہ
شیشہ کے ذریعہ روشنی کو جمع کیا تھا۔ اس کا اصول ذیل کی شکل سے واضح ہوگا۔
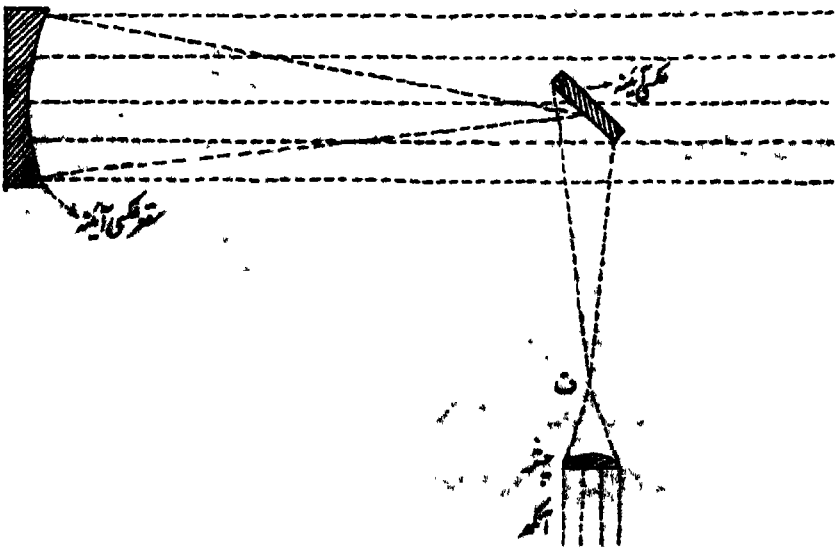
ان دونوں شکلوں سے واضح ہوگا۔ انہیں صرف کچھ زیادہ فرق نہیں ہے نیوٹن کی دوربین اور
ہرشل کی دوربین کا تقریباً اصول ایک ہی ہے۔

یہاں تک تو خاص خاص اصول دوربینوں کی ساخت کے ہم نے بیان کئے۔ اب رصدگاہ میں ان کے طریقہ استعمال کی بنا پر مختلف نام ہیں۔ مثلاً ہم چاہتے ہیں کہ جرم فلکی کو اس طرح دیکھیں کہ کم سے کم پانچ گھنٹے تک مسلسل دیکھتے رہیں تاکہ اس کی مختلف کیفیات اور اس پر جو کچھ مناظر ہیں وہ ہمیں نظر آتے رہیں۔ اس دوربین کو اس طرح اس جرم پر جماتے ہیں کہ وہ نظر آئے اور رصدگاہ میں بجلی کی موٹروں سے اس دوربین کی رفتار کو بالکل اس طرح صحت کیساتھ متحرک کرتے ہیں کہ زمین کی گردش کا کچھ اثر نہیں ہوتا جیسے جیسے زمین گردش کرتی ہے دوربین بھی زمین کی حرکت کے خلاف سمت حرکت کرتی ہے اور اس جرم فلکی کو اپنے حد نگاہ سے باہر نہیں جانے دیتی۔ اس دوربین کو اصطلاح میں Equatorial یا استوائی کہتے ہیں۔ بڑی دوربینوں میں منعطفہ قسم الی سے یہ کام لیا جاتا ہے۔ اور اس کی مدد سے چاند وغیرہ کے تو ایسے صحیح نقشے بنائے گئے ہیں جیسے خود زمین کے اور دیگر ستاروں و سیاروں کے حالات بھی بہت سے معلوم ہوگئے ہیں۔

طریقہ استعمال کی اصول پر دوسری دوربین مرصد Transit کہلاتی ہے۔ یہ دوربین اکثر چھوٹی ہوتی ہے۔ اسکا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ کسی جرم کے کسی خاص مقام پر پہنچنے کا صحیح وقت بتا دے۔ مثلاً گہن کے وقت ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ کس وقت گہن لگنا شروع ہوا ہے اور کتنی دیر میں گہن ختم ہوگیا۔ اس وقت استوائی کے برخلاف اس دوربین کو ایک جگہ جما دینگے اور اس جرم کو دیکھینگے کہ وہ دوربین کی زد میں کس وقت آیا اور کس وقت نکل گیا۔

اس دوربین میں سب سے زیادہ قیمتی چیز شیشہ نہیں ہے بلکہ ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہوتا ہے اور جس جگہ دو لکیریں صلیب کی ملتی ہیں وہاں ایک نہایت باریک نقطہ ہوتا ہے۔ یہ نقطہ نہایت صحت کے ساتھ بیچ میں جمایا جاتا ہے اور اس سے مختلف ستاروں اور سیاروں کے زاویہ ناپ کر ایک جدول کی شکل میں مرتب کر لیتے ہیں چنانچہ جو وقت ہر ایک گہن جو کئی سو سال کے بعد ہوتا ہے اور ایک دفعہ ہونے کے آٹھ برس بعد ہو کر پھر کئی سو برس کے بعد

فاصلہ بھی دوربین سے ناپا گیا اور اس سے بعض اہم نتائج مرتب کئے گئے ہیں۔

دوربین سے بیشک انسان کی نظر کو بڑی حد تک مدد ملی کہ اس نے فضائے عالم کے سب پوشیدہ اجسام کو دیکھ لیا۔ مگر پھر بھی انسان میں تھکنے اور غلطی کرنے کا مادہ موجود ہے۔ کوئی شخص رات رات بھر بیٹھکر آسمان سے نظر بازی نہیں کرسکتا۔ اس لئے فوٹو کے کیمرہ نے خاص مدد دی۔ اگرچہ آسمانی فوٹو کا کیمرہ خاص ساخت کا بڑا قیمتی ہوتا ہے مگر جب سے یہ بنا ہے اور اسکا استعمال دوربین کے ساتھ ہوا ہے اُس وقت سے بہت سے ستاروں اور اقمار کا انکشاف ہوا کیونکہ بعض وقت بہت خفیف روشنی تو نظر سے بچ سکتی تھی مگر فوٹو کی پلیٹ نے اُس کے عکس کو فوراً قبول کرلیا اور بتا دیا کہ یہاں ایک لامعلوم ستارہ بھی موجود ہے۔ یہ کیمرہ اکثر استوائی کے ہمراہ لگایا جاتا ہے تاکہ وہ کسی خاص سیارہ یا ستارہ کی پوری حالات بتا دے۔ چنانچہ پچھلے ہفتہ امریکہ کے ایک فلکی نے ایک ستارہ فوٹو کے عکس سے معلوم کیا جسکا فاصلہ آٹھ ہانگ میل ہے جس کی روشنی کو زمین تک آنے میں ایک کروڑ تینتیس لاکھ برس لگتے ہیں جبکہ روشنی کی رفتار ایک سکنڈ میں ایک لاکھ ۸۶ ہزار میل یا ایک سال میں ۶ کھرب میل ہے

اس آلے کے علاوہ طیف پیما Spectroscope نے بھی بڑی مدد دی یہ آلہ خود بذاتہ ایک علیحدہ مضمون کا محتاج ہے مگر مختصراً ہم یہاں یہ بتانا ضروری سمجھتے ہیں کہ اس سے تحلیل شعاع ہوجاتی ہے اور سفید رنگ کو تحلیل کرکے یہ اُس کے سات رنگ نمایاں کردیتی ہے۔ یہ مختلف دھاتوں اور گیسوں کے رنگ بناکر ہمکو یہ بتا سکتی ہے کہ سورج میں کون کون سے عناصر موجود ہیں۔ اور کون کون سے عناصر اس میں نہیں ہے۔ چنانچہ بعید ترین اجرام کے تمام عناصر اسکے ذریعہ ہمکو معلوم ہوجاتے ہیں۔ اور ہم زمین پر بیٹھے بیٹھے آسمان کے اُن اجرام کا تجزیہ کرسکتے ہیں جنکی روشنی کو یہاں تک آنے میں لاکھوں اور کروڑوں برس لگ جاتے ہیں۔

ایک جھلک

ہر کسے از ظن خود شد یار من　　　وز درون من نجست اسرار من

شباب کا زمانہ جستجو کا ہوتا ہے۔ نوجوان چاہتے ہیں کہ اپنی فطرت کے بھید دریافت کریں، اور ایسے
لوگوں سے اُنکی دوستی ہو جو اُنکی طبیعت کو سمجھ سکتے ہوں اور اُن سے محبت اور ہمدردی کریں۔ یوسف محمود
ایک تعلقہ دار کا بیٹا جب کالج پہنچا تو تعلیم سے زیادہ اُسے دوستوں کی تلاش تھی۔ اُس کے باپ کو اپنی دلچسپیوں
سے کبھی فرصت نہیں ملتی تھی، ماں کا انتقال ہو گیا تھا، ورنہ وہ بھی اپنے باپ دادا کے راستہ پر چلتا اور تعلیم کا
اُسے خیال بھی نہ ہوتا۔ لیکن اُس کے چچا کو باپ کی بے پروائی اور ماں کی موت کی وجہ سے اُسے تعلیم دلانے
کا موقع مل گیا۔ اور جب وہ سکول سے نکلا تو اُسے کالج بھی بھیج دیا، اور یوسف محمود بڑی خوشی سے گیا، اس لئے
کہ اُسے اپنے ہم عمر لوگوں سے ملنے کا اور اُنکی صحبت سے فائدہ اٹھانے کا اور کوئی ذریعہ نہ تھا۔ بورڈنگ میں
پہونچنے کے کچھ روز بعد ہی اُس نے معلوم کر لیا کہ وہاں کس کس قسم کے لوگ ہیں۔ ایک خاص حلقہ تھا جو دوسروں
سے الگ الگ رہتا تھا، اور اپنے آپ کو کسی وجہ سے دوسروں سے برتر بھی سمجھتا تھا۔ یوسف محمود نے دیکھا
کہ یہ لوگ دبی آواز میں کسی عورت کا نام لیکر آپس میں پھپھانے لگتے ہیں، اور اگر کوئی اُنکی طرف غور سے دیکھتا
تو کچھ جھینپ کر اپنا منہ پھیر لیتے ہیں۔ اس رویہ نے خواہ مخواہ یوسف محمود میں ان لوگوں سے ملنے کی خواہش
پیدا کر دی، انسان کی خاصیت ہے کہ جو چیز اُس سے چھپائی جاتی ہے اُسے دیکھنے اور سننے کا شوق دگنا
ہو جاتا ہے، اور وہ ہر راز کو اسی وجہ سے ایک غلط اور غیر ضروری اہمیت دیدیتا ہے۔ اس لئے جب
یوسف محمود نے دیکھا کہ کچھ طالب علم پان زیادہ کھاتے ہیں، آپس میں بہت آزاد اور خوش رہتے ہیں، دوسروں
کی موجودگی اُنکے چہروں کو ترش رو کرکے، اُنکی گفتگو سہمی کر دیتی ہے تو اُس نے طے کر لیا کہ ان لوگوں کا بھید کسی
نہ کسی طرح سے ضرور معلوم کرے گا اور اُنکے گروہ میں شامل ہو جائے گا۔ اُسے ابھی تک اپنی طبیعت کے
اصل رجحان کی خبر نہ تھی، اور اُسے امید تھی کہ اگر وہ کسی حلقہ میں شامل ہو گیا تو اُسے دوست مل جائیں گے

اور ایک چھوٹی سی دنیا جس میں وہ خوشی اور بےفکری سے اپنا وقت کاٹ سکے گا، اور اُس کی طبیعت میں جو بےچینی تھی وہ جاتی رہے گی۔ مگر اس دنیا میں داخل ہونے سے پہلے اُسے بہت دقتیں پیش آئیں۔ پہلے تو وہ لوگ جن سے وہ بےتکلفی پیدا کرنا چاہتا تھا اُس سے الگ رہنے کی کوشش کرتے رہے، اور جب انہیں یقین ہو گیا کہ وہ دراصل ان کی صحبت چاہتا ہے تو اُس کے ساتھ اُسی طرح پیش آنے جیسے شہری گنوار کے ساتھ، یا ماہرِ فن نوسکھئے کے ساتھ۔ مگر رفتہ رفتہ اُسے اُنکی خاص گفتگو سننے کی اجازت مل گئی، اور اُنکے بھید اُسے معلوم ہونے لگے۔ جن عورتوں کے نام اُنکی زبان پر رہا کرتے تھے اُن سے بھی اُس کی ملاقات ہو گئی یوسف محمود کا خیال تھا کہ جب وہ اُنکے فن میں ماہر ہو جائے گا تو اُسے وہی تسکین ہو گی جو کاریگر کو ایک اعلیٰ کام ختم کرنے پر ہوتی ہے۔ مگر اُسے ہر طرح سے مایوسی ہوئی۔ اُس کے ساتھی اپنی معشوقوں کے حسن میں غرق ہونے کا دعویٰ کرتے تھے۔ اُنہیں اپنی ادا شناسی پر فخر تھا۔ لیکن اُن کی آشنائی صرف ایسی عورتوں سے تھی جو پیٹ پالنے کے لئے اُنکی خاطر کرتی تھیں۔ یوسف محمود نے سوائے لاچاری اور بیزاری کے اُنکے چہروں پر کبھی کوئی ادا نہیں پائی، اور یہ ادا بجائے دلربا ہونے کے تکلیف دہ تھی لیکن اُس نے اپنے دوستوں کو خوش رکھنے کے لئے اپنی رائے کبھی اُنکے سامنے ظاہر نہیں کی اور اُنکا جیسا رہنے کے لئے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اُن کی آنکھوں سے دیکھنے لگا۔ کبھی کبھی جب اُسے اس کا احساس ہوتا تھا کہ وہ اپنے آپ کو اور دوسروں کو جان بوجھ کر دھوکا دے رہا ہے تو وہ شرمندہ ہو جاتا ایک دو دن الگ الگ رہتا، لیکن پھر گھبرا کر انہیں لوگوں کی صحبت میں پہنچ جاتا۔ اُس کی طبیعت میں آپ ہی آپ ایک بےچینی سی پیدا ہوا کرتی تھی اور اس بےچینی کو اُس کے خیال میں صرف عورت دور کر سکتی تھی۔ فطرت نے اپنے نظام کو قائم رکھنے کے لئے جو طریقے نکالے ہیں اُن میں سے یہ بھی ایک ہے مگر اس میں معصوم نوجوان مردوں اور عورتوں کو ایک بےرحم دنیا کے پھندوں سے بچانے کا کوئی خیال نہیں رکھا ہے۔ شباب کے ساتھ ہی نوجوانوں پر کوئی جادو سا کر دیا جاتا ہے، اور فطرت کو اس سے کوئی مطلب نہیں رہتا کہ اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے اور کتنی زندگیاں اس کی وجہ سے تلخ ہو جاتی ہیں، لیکن جو نوجوان اس پھندے میں پھنسے ہوتے ہیں ان کو اس کی کوئی خبر نہیں ہوتی، اور جب وہ اس راستہ پر ایک مرتبہ

قدم اٹھا لیتے ہیں تو پھر انکار، رکنا یا رکنا مشکل ہوتا ہے۔ یوسف محمود پر جب کبھی افسردگی یا مایوسی طاری ہوتی تھی تو اُسے یقین ہو جاتا تھا کہ جن عورتوں کی صحبت میں وہ اپنی طبیعت کی ڈگمگاتی کشتی کے لئے سہارا ڈھونڈھتا ہے وہ اُس کی کوئی مدد نہیں کر سکتی ہیں اور اُسے صرف ایک وہم اُکی صحبت میں خوش اور مطمئن رکھتا ہے۔ اُس کی بےچینی صرف وہی دور کر سکتی تھی جو خود بےچین ہو۔ ان بیچاروں کو نہ چین کی خبر تھی اور نہ بےچینی کی۔ ان کے دلوں میں آرزو رکھنے کی جرات نہیں رہی تھی۔ زندگی کی ساری تمناؤں سے وہ ہاتھ دھو چکی تھیں صرف اپنی بھوک پیاس کے مٹانے کی فکر باقی رہ گئی تھی۔

ابھی تک یوسف محمود کا کہنا چاہئے صرف پہیلا تھا، وہ گرا نہیں تھا۔ اس کے ساتھی اکثر اُسے چھیڑا کرتے، کہیں نہ کہیں اُس کے لئے وقت مقرر کرتے، لیکن وہ کسی بہانہ سے اُسے ٹال دیتا۔ اُس کی طبیعت میں ایک جھجھک سی پیدا ہو گئی تھی جسے دور کرنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ اس کی وجہ سے اُسے اکثر فقرے اور پھبتیاں سننا پڑتی تھیں، لیکن انہوں نے اُس کی جھجھک مٹانے کی بجائے اور بڑھا دی۔ جب کبھی وہ ملاقات کے لئے جاتا تو ہمیشہ کسی کے ساتھ، اور تھوڑی دیر میں اُس پر ایسا خوف طاری ہوتا تھا کہ وہ کسی بہانے سے نکل بھاگتا۔ اس کے ساتھی اس عشق پر تعجب کرتے تھے جو دیدار کے شوق میں معشوق کے دروازہ تک پہنچا کر وصل کے ڈر سے پھر واپس بھگا لیتا تھا، مگر کچھ دنوں کے بعد وہ اس کے عادی ہو گئے، اور دوستانہ چھیڑ چھاڑ سے زیادہ کبھی کچھ نہیں کیا۔

کالج اور تعلیم سے فارغ ہو کر یوسف محمود مکان واپس آیا۔ اسکا باپ اپنی عیش کی زندگی میں بدستور مبتلا تھا، اور سوائے "اخاہ یوسف کہو کیسے ہو؟" دونوں میں اور کوئی گفتگو نہیں ہوتی تھی۔ یوسف محمود کے بلوغ کا زمانہ گذر چکا تھا۔ اُسکے دل میں وہ بےتابی اور بےچینی نہیں رہی تھی۔ وہ خوش مذاقی کی حد سے کبھی نہیں گذرا تھا اور اس وجہ سے اُس کے مزاج میں ابھی نرمی باقی تھی۔ مظلوموں پر اُس نے ظلم نہیں کیا تھا، نہ بیوفاؤں کے ساتھ بےرحمی، اس لئے اُسے تلخ تجربہ کی چھوٹی شکایت بھی نہیں تھی اور عورتیں اُس کی نگاہ میں اُن پھولوں میں نہیں شامل ہو گئی تھیں جنہیں ہم خوشبودار سمجھ کر شوق سے توڑتے ہیں اور جب ہمیں اپنی غلطی معلوم ہوتی ہے تو بےپروائی سے جیسے نہ چاہیں ہاتھ اٹھا کر پھینک دیتے ہیں۔ لیکن جن لوگوں میں

وہ رہتا تھا اُنکے اثر سے بچے رہنا ناممکن تھا، اور اس کے علاوہ خود اُس کے دل میں اکثر عورتوں کی صحبت میں بیٹھنے اور اُنکی باتیں سننے کی خواہش پیدا ہوتی تھی۔ اس خواہش کو پورا کرنے کا صرف ایک طریقہ تھا، اور وہ یہ کہ انہیں عورتوں کے پاس جائے جہاں اُس کے جان پہچان کے لوگ جایا کرتے تھے۔ وہ بہت دنوں تک ہچکچاتا رہا، کیونکہ اُسے اسکا یقین نہیں تھا کہ اُس کی جھجک دور ہو گئی ہے، اور وہ اس پر نہیں تیار تھا کہ لوگوں کی ہنسی اور اُن کی پھبتیاں دوبارہ سنے۔

آخر کار یوسف محمود، ایک مرتبہ حسن پرستی کا ارادہ کر کے اپنے گھر سے نکل پڑا۔ کسی دوست نے اسے صلاح دی تھی کہ اُسے معمولی ناچ گانے کی مجلسوں میں شریک ہو کر رفتہ رفتہ ان عورتوں سے پہلے واقفیت پیدا کرنا چاہئے، اس کے بعد بے تکلفی۔ جب ایک مرتبہ بے تکلفی ہو گئی تو اُسے زیادہ انتظار نہ کرنا ہوگا۔ اُس طرف سے خود ہی اشارہ ہوگا۔ یوسف محمود کو یہ ترکیب پسند آئی، اور وہ ایک رات کو چند دوستوں کے ہمراہ واقفیت پیدا کرنے کا قصد کر کے چلا۔

موٹر پر بیٹھ کر سب اُس سڑک کی طرف گئے جو عیاشی کے لئے مخصوص تھی، اور ایک مکان کے سامنے ٹھہر گئے جہاں غالباً پہلے سے اُنکے آنے کی اطلاع کر دی گئی تھی۔ یوسف محمود موٹر پر سے اُتر کر دوسروں کے پیچھے پیچھے زینہ پر چڑھ گیا۔ اوپر کی منزل سے ایسی آوازیں آ رہی تھیں کہ معلوم ہوتا تھا وہاں شہد کی مکھیوں کے کئی چھتے ہیں اور کسی نے انہیں چھیڑ دیا ہے۔ جب وہ کمرہ کے اندر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ اُس کے جان پہچان کے لوگوں کا بہت بڑا مجمع دو عورتوں کو گھیرے ہوئے بیٹھا ہے۔ اس مجمع میں ہر شخص چاہتا تھا کہ کم از کم ایک عورت کو اپنی طرف متوجہ کرلے، اس لئے ہمیشہ کئی آدمی ایک ساتھ بول اٹھتے تھے اور اکثر ایک ہی مرتبہ گھبرا کر خاموش بھی ہو جاتے تھے۔ صرف چند لوگ جو علم مجلس سے واقف تھے۔ وہ بلند آوازیں بولتے تھے اور وہ عورتیں جواب میں مسکراتی تھیں۔ اکثر لوگ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ مگر اُنکے خیالات ایسے اُلجھے تھے اور ایسی دبی آوازیں اور اُنکے خیال رہے تھے کہ کوئی کسی کی بات نہیں سمجھ پاتا تھا اور سب صرف ادھر ادھر دیکھتے اور ہنسے جاتے تھے۔ بہت سے ایسے بھی تھے جو بالکل خاموش دوسروں کی گفتگو سن رہے تھے، اور خود کبھی کچھ کہنے کی ہمت نہیں کرتے تھے۔

جن دو عورتوں کو مجمع گھیرے ہوا تھا اُن میں سے ایک نوجوان تھی، اُسکا رنگ تو ذرا کالا تھا مگر چہرہ کی نمکینی اور آنکھوں کی شوخی نے اُسے کافی خوبصورت بنا دیا تھا۔ دوسری کی عمر قریب تیس سال کے تھی ، رنگ صاف تھا اور صحت بھی بہت اچھی تھی مگر اس کے چہرہ پر عیاشی اور شراب خواری نے اپنی مہر لگادی تھی ، یعنی اُسے دیکھتے ہی ہر شخص یہ معلوم کرسکتا تھا کہ اس کی زندگی کا ڈھنگ کیا ہے ، اور اسی لئے ان لوگوں کو جو ویسی ہی زندگی بسر کرنا چاہتے تھے اُس کی صورت بہت پسند تھی۔ موٹے ہونٹ ، اندر کو گھسی ہوئی آنکھیں تیس برس کی عمر۔ اس سب کا خیال کسی کو نہیں ہوتا تھا۔ جس نے اُس کی باتیں سنیں اُسکی نگاہوں کے نشہ سے مست ہو چلا۔ اور اس سے مطمئن رہا کہ اُسے کسی بے موقع بات کی حیا سے سابقہ نہیں ہوگا۔

نوجوان عورت غالباً اس مجمع میں پہلی مرتبہ آئی تھی ، کیونکہ وہ سہمی ہوئی ادھر اُدھر دیکھ رہی تھی اور اُس کی کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کہے اور کیا کرے ۔ جب کوئی اُس سے خاص طور سے مخاطب ہوتا تو وہ گھبرا کر مسکرا دیتی ۔ مگر زبان سے کچھ نہ کہتی ۔ برخلاف اس کے دوسری عورت بہت اطمینان سے گفتگو کر رہی تھی تجربہ نے اُسے سکھا دیا تھا کہ ایسے مجمع کو کیسے سنبھالنا چاہئے اور غور کرنے سے اس وقت یہ صاف ظاہر ہو جاتا کہ جو کچھ ہوتا تھا وہ اُسی کے حکم سے اور جو باتیں ہوتی تھیں وہ اُسی کی فرمائش پر ، اُس کی نظر ہر شخص پر تھی ، ہر ایک کو یہی خیال ہوتا تھا کہ وہ اُس پر فدا ہے ، اور جو خاموش دیوار کے پاس بیٹھے تھے ، اُن کو بھی یہ معلوم ہوتا تھا کہ کبھی کبھی اُن کے منہ پر ایک بہت ٹھنڈی فرحت بخش ہوا آکر لگ جاتی ہے ۔

جب یوسف محمود اپنے چند ساتھیوں کے پیچھے کمرہ میں داخل ہوا تو مجمع میں ایک صاحب جو ہر بات میں بہت آگے آگے رہتے تھے کھڑے ہوے اور بڑے تپاک سے یوسف محمود کو دونوں عورتوں سے ملایا ۔

" یہ ہمارے تعلقدار صاحب کے فرزند ارجمند ہیں ، ابھی کالج سے فارغ ہوکر نکلے ہیں ۔ کتابیں ، پڑھتے پڑھتے آدمی کا مزاج خشک ہو جاتا ہے ، انکے مزاج کو پھر ذرا تر و تازہ کر دیجئے " وغیرہ وغیرہ ۔

نوجوان عورت مسکرا کر رہ گئی ، دوسری نے بغیر اُٹھے ہاتھ ملایا ، اشارہ سے یوسف محمود کو اپنے پاس بٹھایا اور باتیں شروع کر دیں ۔ کالج کا نام پوچھا تعلیم کی حالت پر اپنی رائے ظاہر کی کتابی علم کا اُس علم سے مقابلہ کیا جو تجربہ سے حاصل ہوتا ہے ، اور اس کے ساتھ ہی ایسی طرح ہنستی مسکراتی شرماتی رہی کہ جو

دور سے دیکھتا وہ ضرور سمجھتا کہ دونوں میں خاص طور سے رسیلی باتیں ہو رہی ہیں۔ یوسف محمود پر اس انداز کا بہت اثر ہوا، اس نے بہت دل کھول کر بغیر ہچکچائے یا شرمائے اُس کے سوالوں کا جواب دیا اور اپنی طرف سے نئے نئے مضمونوں پر گفتگو چھیڑی، اُسکے آنے کے کچھ دیر بعد ہی کسی نے گانے کی فرمائش کی طبلچی سارنگی ستار والے آئے، نوجوان عورت جو شاید اسی لئے بلائی گئی تھی سر ملانے لگی، مگر یوسف محمود کو اس کی کوئی خبر نہیں ہوئی، وہ اپنے ہمکلام کی صورت تک رہا تھا، اور اُس کی زبان چل رہی تھی۔ اور اُس کے ہمکلام نے کسی طرح سے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ کمرہ میں کوئی اور بھی ہے اور کچھ اور بھی ہو رہا ہے

جب مجلس گرم ہوئی تو لوگ شراب بھی پینے لگے۔ یوسف محمود نے کبھی شراب چکھی تک نہیں تھی لیکن جب اس کے ہمکلام نے مسکرا کر گلاس پیش کیا تو وہ اُسے ایسی طرح پی گیا جیسے کوئی پرانا شرابی جس کے رگ و ریشہ میں آسانشہ سرایت کر گیا ہے کہ اُسے مست ہونیکا کوئی اندیشہ نہیں۔ اور لوگوں نے اس کی حالت کو محسوس کیا اور آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے، بلکہ ایک نے کافی بلند آواز میں کہا۔

"ہماری آرزو تھی کہ کسی کو عاشق ہوتے ہوئے دیکھیں، سو وہ بھی آج پوری ہوگئی" لیکن یوسف محمود نے کچھ نہ سُنا . . .

جب رات کے دو پہر گزر چکے تو سب اپنے اپنے گھر جانے لگے۔ یوسف محمود کو اتنا ہوش نہ تھا کہ وہ بھی گھر جانیکا خیال کرے، اور نہ اپنے اوپر اتنا قابو کہ خود اُٹھ سکے۔ جس نشست پر بیٹھا تھا بیٹھا رہا نگاہ جہاں پر اٹک گئی تھی اٹکی رہی، نہ پہلو بدلا۔ نہ نگاہ ہٹی۔ آخر کار اُس کے دوستوں نے اسے پکڑ کر اٹھایا، اور آخری آواز جو اُس کے کان میں آئی یہ تھی۔

"اگر کوئی گستاخی ہوگئی ہو تو معاف کردیجئے گا۔ ہم جیسوں کی روزی آپ ہی کے ہاتھ میں ہے"
اور یہ کہکر کسی نے بہت خلوص کے ساتھ اُس سے ہاتھ ملایا۔ یوسف محمود پر اس آخری التجا کا بہت گہرا اثر ہوا لیکن بیہوشی میں وہ صرف اتنا کر سکا کہ اُس کے ہاتھ میں جو ہاتھ تھا۔ اُسے زور سے دبایا . . .

جب وہ اپنے سونے کے کمرہ میں پہنچا تو اچکن ایک طرف پھینکی، ٹوپی ایک طرف اور بڑی مشکل

سے جھکا اور منہ کے بل کر پلنگ پر گر پڑا۔

شراب میٹھی ہوتی ہے نشہ کی پہلی منزلوں میں برسوں کی بندھی ہوئی گرہیں کھل جاتی ہیں یعنی جو جھجک عام طور سے انسان کو خاموش رکھتی ہے یا پوری بات نہیں کہنے دیتی، جو شک و شبہ اس کے خیالات کو اسی کے دل میں بند رکھتا ہے، یہ سب دو گلاس شراب میں دھل جاتی ہیں۔ انسان کو اپنی لیاقت اور اپنے ذہن پر بھروسا ہو جاتا ہے۔ دوسروں کی موجودگی کی پروا نہیں رہتی، اس حالت میں دراصل انسان کی لیاقت کا بہتر اظہار ہو سکتا ہے بہ نسبت اس وقت کے جب اس نے اپنی پیاس صرف ٹھنڈے پانی سے بجھائی ہو۔ یہ تو سب صحیح ہے، لیکن جس کسی نے رات کو شراب کا مزا چکھا ہے وہ دوسرے دن اپنے سر کو بھاری اور اپنے دماغ کو خالی پاتا ہے۔ یوسف محمود جب اپنی پہلی بے ہوشی کی نیند سے کوئی چار بجے کے قریب جاگا تو اس کے سر میں بہت سخت درد ہو رہا تھا، گدی جھنجھنا رہی تھی، گردن اکڑ گئی تھی، آنکھیں باہر نکلی پڑتی تھیں۔ لیکن اس حالت میں بھی جو بات اُسے سب سے پہلے یاد آئی وہ اس عورت کی پر درد الوداع تھی۔

"ہم جیسوں کی روزی آپ ہی کے ہاتھ میں ہے۔"

یوسف محمود ان الفاظ پر غور کرتا رہا۔ ان میں کوئی خاص بات نہیں تھی، لیکن جس لہجہ میں وہ کہے گئے تھے اس نے ان کے معنی اور مطلب کو بالکل بدل دیا اور وہ بجائے طوائفوں کے ایک عام فقرے کے ایک انسان کی فریاد بن گئے۔ کون جانتا ہے، اُس نے سوچا، شاید ایک شریف طبیعت کی عورت ایک ذلیل پیشہ میں پھنسی ہوئی ہے۔ اس سے صرف کمینہ لوگ ملنے جاتے ہیں، اُسے فطرتاً بداخلاق سمجھ کر علاوہ بیہودہ باتوں کے نہ اس سے کچھ کہتے ہیں اور نہ سننا چاہتے ہیں۔ اسے وہ برداشت کرتی رہتی ہے۔ اپنی عزت کا اسے خیال نہیں ہوتا۔ لیکن جب کبھی ایک اچھی خصلت کا آدمی اسے مل جاتا ہے تو وہ بے چین ہو جاتی ہے۔ یوسف محمود کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، وہ ایک درد کے دریا میں غوطہ کھانے لگا، اور درد کی شدت بھی اس خیالی دنیا کی آفتوں سے اس کی توجہ نہ ہٹا سکی۔ اُس کے دماغ میں بہت دیر تک غمگین چہروں کی تصویریں پھرتی رہیں جن کے آنسو پونچھنے کے لئے کبھی کسی نے اپنا ہاتھ اٹھانے کی تکلیف گوارا نہیں کی تھی۔

دوسرا دن اُس کا بہت مشکل سے کٹا۔ لوگ اس سے ہنس ہنس کر رات کے واقعات پوچھتے تھے۔ اور

اس کے سر میں درد تھا اور دل میں غم۔ لیکن خدا خدا کر کے رات آ گئی، اُسے اپنی کالی کملی میں لپیٹ کر دنیا سے چھپا لیا۔ اور اُس کی دن بھر کی آرزو کہ کہیں جلد اکیلا چادر اوڑھ کر پڑ رہے اور اپنے غمگین چہرہ کو دیکھ کر پھر روئے پوری ہو گئی۔ نیند کی اُسے نہ خواہش تھی نہ امید، مگر وقت سے بہت پہلے ہی اُس پر ایک خمار سا چھا گیا۔ اُس کی تصویریں دھندلی ہو گئیں، اور نیند نے آ کر اسے اپنا اور پرایا غم بھلا دیا۔

اُس کی آنکھ پھر سویرے کھل گئی، اور وہ ایک نیم بیداری کی حالت میں دیر تک لیٹا رہا۔ لیکن نیند نے ایک اور حملہ کیا اور اپنے ساتھ ایک خواب بھی لے آئی۔ جب وہ اٹھا تھا تو اُس نے ہر طرف اندھیرا پایا تھا۔ مگر اب ایکبارگی اُس کے سامنے سے ایک پردہ سا اُٹھ گیا، کمرہ میں روشنی سی ہو گئی اور اُسے آپ ہی آپ اس کا خیال ہوا کہ یہ روشنی کسی کے ساتھ آئی ہے۔ روشنی تو کیا تھی، شوخ رنگوں کی لہریں تھیں جن میں سُرخ سب سے زیادہ نمایاں تھا۔ یوسف محمود نے جب غور سے دیکھا تو اُنکے بیچ میں اُسے ایک صورت نظر آئی جو ان رنگوں سے بنی تھی لیکن اُن سے بالکل بے تعلق تھی، ایک کوئی اٹھارہ برس کی لڑکی کی صورت جس کے نقشہ کو زندگی کی مایوسیوں نے نہیں بگاڑا تھا، مگر جس سے ہوشیاری، تجربہ کاری اور دانشمندی برستی تھی۔ ایک عجیب سا چہرہ، جو کبھی اپنی ناک کے نازک بانسے کے پیچھے چھپ جاتا، کبھی اپنی لمبی پلکوں کے پردہ میں غائب ہو جاتا، کبھی پیچھے ہٹ کر رنگوں میں ایک دھندلا دھبا بن جاتا، کبھی یوسف محمود کے سر کے بالکل پاس آ جاتا۔ وہ بڑی دیر تک اس صورت کو گھومتے پھرتے، آگے بڑھتے پیچھے ہٹتے دیکھتا رہا۔ پھر ایکبارگی کسی کے زور سے ہنسنے کی آواز آئی، وہ صورت جو ابھی تک کچھ بیجان تھی سوتی سی معلوم ہوتی تھی، جاگ پڑی، ہونٹ مسکرانے لگے، آنکھیں شوخی سے چمکنے لگیں۔

"نہیں پہچانا!"

یوسف محمود نے دیکھا کہ وہ چہرہ جو ہوا میں اُڑتا ہوا نظر آ رہا تھا دراصل ایک نوجوان لڑکی کا سر ہے، اور وہ ایک ہاتھ سے ٹیک لگائے اُس کے سرہانے جھکی ہوئی اُسے تک رہی ہے اور مسکراتی جاتی ہے۔

"ارے یوسف، تو نے مجھے نہیں پہچانا؟"

یوسف محمود نے کچھ جواب دینے کی کوشش کی لیکن نہ آن شوخ شریر آنکھوں سے وہ نظر ہٹا سکا نہ وہ سریلی پُرجوش آواز سن کر اس کی زبان میں ہلنے کی قوت باقی رہی۔

"میں تو یہیں کی رہنے والی ہوں!.."

"کہاں کی؟" یوسف محمود نے دبی آواز سے پوچھا اور پھر آپ ہی آپ ڈر گیا اور آنکھیں نیچی کر لیں

"یہیں کی، تیرے ملک کی، تیرے شہر کی، تیرے مکان کی، کمرہ کی۔ اب اور پوچھ کہاں کی رہنے والی ہوں"

یوسف محمود خاموش رہا۔

برسوں سے تو تو مجھے تلاش کر رہا ہے۔ میرے انتظار میں بے چین ہے، اب جو میں خود آگئی تو تو پوچھتا ہے کہ کہاں کی ہو اور کون ہو؟ یوسف، یہ بھی کیا اندھیر ہے . . . "

لڑکی کی آواز سے سارا کمرہ گونج رہا تھا، یہاں تک کہ اگر کوئی اُس کے ہونٹوں کو ہلتے نہ دیکھتا تو وہ نہ بتا سکتا۔ آواز کس طرف سے آرہی ہے۔ آخری جملے کے بعد یوسف محمود نے دیکھا کہ اُس لڑکی کا چہرہ پیلا پڑ گیا، آنکھوں کی چمک کم ہوگئی اور وہ صورت بالکل ایک معمولی لڑکی کی سی ہوگئی، لیکن اس سے اس کی کشش بڑھ گئی اور حسن دو گونہ ہوگیا۔

"یوسف اگر میری بیعزتی مقصود تھی تو دوسروں کی طرح مجھے یاد ہی نہ کیا ہوتا میں اپنے درو کو لئے بیٹھی رہتی تجھے کچھ معلوم نہ ہوتا مجھے کوئی امید ہوتی لیکن تو مدت سے میرا نور دوسری عورتوں کے چہروں پر، میری محبت اُنکے برتاؤ میں، میری غمگساری اُن کی توجہ میں تلاش کرتا رہا ہے، جب کبھی میری جھلک تو نے کہیں دیکھی تو تیرا دل اچھل پڑا جب کبھی تجھے میرے دیدار سے مایوسی ہوئی تو ساری رات سر پٹکتا رہا۔ سچ بتا، تو ان بازار کی عورتوں سے کیوں ملنے جاتا ہے تیرے دل میں یہ بے چینی کیسی تھی کل کے خمار میں تیری آنکھیں آنسوؤں سے کیوں بھر گئیں، ہر جگہ تو مجھے ڈھونڈھتا پھرتا رہا ہے، اب انکار کرنے سے کیا مطلب ہے؟ مجھے پھر سے دیکھ اور پہچان لے . . . "

لڑکی پلنگ سے ہٹ کر بیچ کمرہ میں کھڑی ہوگئی۔ یوسف محمود نے اُسے بہت غور سے دیکھا۔ ایک تسریہ

معصوم لڑکی جس کی ہر ادا میں شوخی تھی محبت اور خلوص، سیدھی طبیعت، سادے خوشنما کپڑے۔ آبی دوپٹہ گلابی پائجامہ، اُس پر کالی آنکھیں اور سانولا رنگ۔ یوسف محمود ایک پاک دلی محبت کے جوش میں پلنگ پر بیٹھ گیا، کچھ دیر اُس مسکراتے چمکتے چہرہ کو تکتا رہا، پھر چلا اُٹھا۔

"ہاں میں پہچان گیا!"

"یوسف، تو کیسے نہ پہچانتا"، لڑکی پھر اُس کے پلنگ کے پاس آگئی، اُس نے بہت گھور کے دیکھا اور مسکرائی، یوسف کے ہر رگ و ریشہ میں ایک نئی جان سی آگئی، اُس کا جی چاہتا تھا کہ فوراً پلنگ سے کود پڑے اور ساری دنیا میں اعلان کردے کہ ۔ ۔ ۔ ۔

"ٹھہر یوسف ٹھہر، تو نے مجھے پہچان تو لیا، مگر تیری زبان میں ابھی بولنے کی طاقت نہیں ہے، آبی دوپٹہ گلابی پائجامہ اُس پر کالی آنکھیں اور سانولا رنگ۔ اس سے کوئی کیا سمجھے گا؟ میری تعریف زبان سے نہیں ہوسکتی، اور مجھے تو صرف دیکھ سکتا ہے، دکھلا نہیں سکتا ۔ ۔ ۔ مگر دیکھ، یہ یاد رکھنا۔ میری آنکھیں ویسی ہی ہیں جیسی تو پسند کرتا ہے، رنگ دیسی کپڑے دیسی۔ تو نے برسوں جو اپنے دل میں ایک عورت کی تصویر بنا کر رکھی تھی، وہ میری ہی تھی ۔ ۔ ۔ آبی دوپٹہ گلابی پائجامہ، اس پر کالی آنکھیں اور سانولا رنگ مسکراتا ہوا چہرہ، شوخ باتیں، دل میں صرف تیری محبت، زندگی کا مقصد صرف تیرا ساتھ، تیری غمگساری۔ ایسی ہی عورت کی تجھے جستجو تھی کہ نہیں؟ مگر تو کسی کو کیا سمجھائیگا۔ میری مورت تو ہر شخص نے بنائی ہے، اور ہر شخص نے بنا کر اپنے دل میں رکھ لی ہے ۔ ۔ لیکن میرے بچاری، میری آرزوؤں کو پورا کرنے والے میرے سچے عاشق بہت کم ہیں، سب مجھے سجاتے سنوارتے ہیں اور پھر مجھ پر کیچڑ پھینکتے ہیں، مجھے بدنام اور ذلیل کرتے ہیں ۔ ۔ ۔ یوسف مجھے دنیا نے بہت ذلیل کیا ہے!"

یوسف نے شرمندگی سے سر جھکا لیا اور اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے جب کچھ دیر بعد اُس نے پھر نظر اُٹھائی تو وہ لڑکی کمرہ میں نہیں تھی، ہر طرف اندھیرا تھا، جو باہر کے پردوں سے چھن ذرا سی روشنی آرہی تھی اس میں ہر طرف بے ترتیبی سے اِدھر اُدھر پڑی ہوئی کرسیاں، زمین پر بکھرے ہوئے کپڑے دیکھ سکتا تھا۔ خواب کے منظر کے بعد دنیا کی یہ پریشان تصویر اُسے بہت تکلیف دہ معلوم ہوئی، باہر کوئی مرغ

بولا، اور اُس کے کانوں میں اُس لڑکی کی پردرد سریلی آواز گونج رہی تھی۔ یوسف محمود نے کانٹھ کر کروٹ بدل لی اور دل میں یہ فریاد کی کہ اُسے پھر اس صورت کے دیکھنے کی عزت بخشی جائے، پھر وہ آبی دوپٹہ گلابی پائجامہ، کالی آنکھیں، سانولا رنگ اُسے اپنے نشہ میں مست کردیں . . .

اس خواب کے بعد یوسف محمود پر جو گذری اُسے بیان کرنا مشکل ہے، اُس کے جیسے خواب بہتیرے دل نے دیکھے ہیں، اور کسی نے شاعری کی ہے، کسی نے انسان کی خدمت میں اپنی جان دیدی ہے، کسی نے انسان کو خدا کی شان دکھائی ہے۔ زیادہ تر یوسف محمود کی طرح صرف عاشق ہوئے اور اس عشق کا اُن پر اتنا اثر ہوا کہ وہ سوا اپنی ہستی کو کھو دینے کے اپنی معشوقہ کے سامنے اور کوئی تحفہ نہ لاسکے۔ لوگوں کا بیان ہے کہ یوسف محمود ایک رات کو چند دوستوں کے ساتھ ایک رنگیلی مجلس میں شریک ہوا، ایک طوائف پر عاشق ہوگیا اور اُس کے چند روز بعد ہی باوجود بہت مضبوط اور تندرست ہونے کے اس کو ایک عجیب سا بخار آنے لگا جس کو حکیم ڈاکٹر کسی طرح سے دور نہ کرسکے۔ کبھی کبھی رات کو اُس کے تیماردار اُسے کسی لڑکی سے باتیں کرتے ہوئے سنتے تھے، مگر اُس کی گفتگو بالکل اُن کی سمجھ میں نہیں آتی۔

ہندوستان کا قدیم تمدن

(جدید معلومات کی بنا پر)

ابتک بالعموم یہ تسلیم کیا جاتا تھا کہ ہندوستان کے قدیم ترین باشندے جو تہذیب و تمدن سے کسی قدر آشنا تھے، وہ آرین تھے لیکن جدید اکتشافات اور تحقیقات نے یہ ثابت کیا ہے کہ ان سے پیشتر بھی یہاں جو لوگ آباد تھے، وہ اپنا ایک مخصوص اور مستقل تمدن رکھتے تھے۔ لیکن اس جدید نظریے کے ذرایع معلومات ابھی اس درجہ نامکمل اور غیر مستقل ہیں کہ ان پر کسی خیال اور اعتقاد کی بنیاد قائم کرنا ریتیلی زمین پر ایک عالیشان عمارت بنانا ہے۔ اس کے متعلق کم و بیش جو معلومات ان ذرائع سے حاصل ہوئے ہیں وہ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہیں کہ یہاں کے لوگ جو آریوں سے پیشتر اس ملک میں آباد تھے، ایک مہذب اور متمدن حالت میں رہتے تھے۔ مرتب اور باضابطہ صورت میں انکی کسی نظام زندگی کا ہمیں پتہ نہیں چلتا۔

برعکس اس کے آریوں اور انکی زندگی کے ایک ایک صیغہ کے متعلق اس قدر مرتب اور باضابطہ معلومات ہمارے پاس موجود ہیں کہ اگر انہی کے تہذیب و تمدن کو ہم ہندوستان کا قدیم تہذیب و تمدن قرار دیں تو یہ صحت سے کچھ زیادہ بعید نہوگا انکے ذرائع معلومات قدیم کتبات یا آثار نہیں ہیں جن سے ہم محض قیاسی نتائج اخذ کرسکیں، بلکہ ان کے تاریخ و تمدن کا دارومدار ان صحائف اور کتب پر ہے جو اگر ایک طرف الہامی اور آسمانی مانی جاتی ہیں تو دوسری طرف وہ دنیا کی قدیم ترین کتب میں شمار کیجاتی ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ابتک یہ وید بھی اسی طرح صرف زیر لب تھے جس طرح آثار و کتبات مدفونہ ہوا کرتے ہیں۔ وید ہندوؤں کی مقدس آسمانی کتاب مانی جاتی ہے لیکن کتنے ہندو ہیں جو اپنی اس کتاب آسمانی کا ایک حرف بھی پڑھ سکتے ہیں؟ سیکڑوں ہزاروں پنڈت ہیں جو اپنے ہم مذہبوں کے لیے عبادات اور دیگر رسوم مذہبی ادا کرتے ہیں لیکن کیا انہوں نے کبھی ان کتب مقدسہ کی شروع سے آخر تک ورق گردانی کی بھی زحمت گوارا کی ہے؟ ایسے لوگ جو سنسکرت زبان سے کسی حد تک واقف بھی ہیں، انہوں نے کیا کبھی اس کے مطالب پر غور و فکر کرنے اور اس سے تاریخی نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ سنسکرت زبان و ادب

کا مطالعہ علمی نقطہ نظر سے اٹھارویں صدی سے قبل بالکل مفقود تھا خدا بھلا کرے کلکتہ ہائیکورٹ کے
اس چیف جسٹس کا جس نے سب سے پہلی بار اس زبان و ادب کے مطالعہ کیطرف لوگوں کو توجہ دلائی۔ میری
مراد سر ولیم جونس سے ہے جس نے ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے فرمایا تھا کہ
"سنسکرت ایک عجیب و غریب ساخت کی زبان ہے۔ یہ یونانی سے زیادہ مکمل ہے۔ لاطینی سے
زیادہ وسیع ہے اور ان دونوں سے زیادہ شستہ و رفتہ ہے"
ان الفاظ نے علمی دنیا میں ایک ہلچل مچا دی جس کے بعد سے سنسکرت زبان و ادب کا مطالعہ روز بروز ترقی
کرنے لگا اور تھوڑے ہی عرصہ میں یورپین مستشرقین کی ایک ایسی بڑی جماعت پیدا ہوگئی جنہوں نے اس زبان و
ادب کے مطالعہ میں اپنی زندگی ختم کردی۔ انہی کا طفیل ہے کہ آج ہندوؤں میں بھی دو چار نفوس ایسے نظر
آتے ہیں جو اپنے اس کلام ربانی اور کتب آسمانی سے علمی نقطہ نظر سے بھی واقف ہیں۔
زمانہ حال کے انہی مستشرقین میں ایک ذات ای۔ جے ریپسن کی ہے جو آج کل کیمبرج یونیورسٹی
میں سنسکرت کے پروفیسر ہیں۔ اس شخص کو سنسکرت کے عالم ہونیکی بنا پر ہندوستان کے قدیم تاریخ و تمدن سے
جو دلچسپی ہے، اس کا ثبوت اس سے پیشتر وہ ایک چھوٹی سی کتاب "ہند قدیم" کے نام سے لکھکر دے چکا ہے
لیکن ابھی حال میں کیمبرج یونیورسٹی نے قدیم ہندوستان پر ایک نہایت ضخیم کتاب شائع کی ہے جو انہی کی
ادارت میں مرتب ہوئی ہے۔ یہ تقریباً آٹھ سو صفحوں کی کتاب بڑی تقطیع پر صرف اشوک کے حالات پر آکر ختم
ہو جاتی ہے۔ لیکن اسوقت کتاب پر کوئی تبصرہ کرنا منظور نہیں ہے بلکہ اس کے ذریعہ صرف یہ دکھانا مقصود
ہے کہ اب سے تقریباً ۴ ہزار برس پیشتر ہندوستان میں کس قسم کا تہذیب و تمدن رائج تھا۔ آریوں کو ابھی ہندوستان
میں آئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا اور وہ دریائے سرسوتی سے آگے نہیں بڑھے تھے کہ انہوں نے اس محدود
زمان و مکان کے اندر تہذیب و تمدن کی ایک نہایت عظیم الشان عمارت کھڑی کردی جو آج اپنے تو اپنے غیروں
کی آنکھوں کو بھی خیرہ کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ آئیے ذرا دیکھیں کہ اس واقعہ کی کہاں تک حقیقت ہے اور اس عمارت
کے مختلف حصے اور ٹکڑے کس حیثیت کے تھے۔ سب سے پہلے خانگی زندگی کو لیجئے۔
خانگی زندگی | گھر میں بڑا بوڑھا باپ سمجھا جاتا تھا۔ وہی گھر کا مالک ہوتا تھا۔ گھر کے اندر کی مالکہ ماں ہوتی جو اپنے

شوہر کی حد درجہ مطیع اور فرمانبردار ہوتی تھی۔ باپ کو اولاد کی تنبیہ کا ہر طرح سے حق ہوتا تھا، اولاد بھی اپنے والدین
کی نہایت اطاعت گزار ہوتی۔ شادی وغیرہ کے معاملہ میں اگرچہ اولاد کو بہت کچھ آزادی حاصل تھی لیکن ان
معاملات میں والدین کا بھی بڑی حد تک دخل ہوتا تھا۔ شادی کے بعد بیٹا اکثر باپ ہی کے ساتھ رہتا تھا
بہو اپنے سسر کا بہت لحاظ رکھتی تھی لیکن جوں جوں والدین کبر سنی کو پہونچتے، بیٹے اور بہو کے اختیارات
وسیع ہوتے جاتے تھے یہاں تک کہ اخیر عمر میں بیٹا اور بہو گھر کے اندر اور باہر دونوں کے پورے پورے مالک ہوجاتے
کنبہ کا بڑا بوڑھا ساری جائداد کا مالک ہوتا۔ منقولہ جائداد مثلاً مویشیوں کے گلے، فصلوں کی پیداوار وغیرہ
میں ہر رکن خاندان شریک ہوتا، کھیت عموماً ہر بالغ اور ہوشیار رکن کے علیحدہ علیحدہ ہوتے، اس لئے کہ
ملک خدا، ان توانا اور تندرست آریوں کے لئے تنگ نہ تھا۔ تقریباً تین پشت تک یہ اسی طرح یکجائی زندگی بسر
کرتے لیکن اس کے بعد ایک کنبہ میں اتنے افراد ہوجاتے کہ قدرتاً ان سب کے لئے گنجائش کافی نہ ہوتی اور وہ
تقسیم خاندان کے لئے مجبور ہوتے، پھر بھی وہ سب کے سب پاس ہی پاس رہتے اس طرح ایک کنبہ بڑھتے بڑھتے
ایک گاؤں یا قریہ ہوجاتا۔

معاشرتی زندگی | اس خانگی زندگی کے علاوہ ان کی معاشرتی زندگی بھی نہایت باضابطہ اور منظم تھی اور اس
سے بھی ایک اعلیٰ تہذیب و معاشرت کا ثبوت ملتا ہے۔ بہت سے عادات و رسوم جو آجکل ہندو سوسائٹی
کے پیشانی پر بدنما دھبے ہیں، اس زمانہ کے آریوں میں ان کا کہیں نام و نشان بھی نہیں تھا۔ مثلاً بچپن کی شادی
کا ان میں کوئی دستور نہ تھا۔ لڑکا جب سن شعور کو پہنچتا تو اپنی شادی کا انتخاب آپ کر لیتا لیکن والدین کو بھی
ان معاملات میں بڑی حد تک دخل ہوتا تھا۔ طلاق کی نوبت بہت مشکل سے آتی تھی۔ شادی پر لڑکی کی طرف سے
کافی جہیز دیا جاتا تھا اور دلہن باقاعدہ رخصت ہو کر اپنے نئے گھر آتی تھی۔ آریوں میں عموماً ایک شادی ہوتی
تھی، ایک سے زیادہ شادیاں یا تو راجہ کرتا یا اس کی تقلید میں وہ لوگ جو صاحب دولت ہوتے۔ مردوں
کے لباس میں عموماً دو یا تین کپڑے ہوتے جو روئی کے علاوہ بھیڑ کے اون سے بھی بنتے تھے۔ اکثر چمڑے
کی پوستین بھی بطور پوشاک کے استعمال کی جاتی۔ وہ اپنی امارت اور تعیش کا اظہار زری کے کپڑوں سے
کرتے۔ مرد اکثر زیورات بھی پہنتے تھے مثلاً بالے، جوشن اور کوئی چیز گلے میں تیوہاروں کے موقعہ پر

وہ ہار پہنتے تھے۔ مرد بالوں میں تیل ڈالتے اور کنگھیاں کرتے تھے۔ وہ اکثر اپنے بالوں کا جوڑا بنا کر سر کے دائیں جانب باندھ لیتے۔ وہ عموماً داڑھیاں بھی رکھتے تھے۔ ان کی غذا میں زیادہ تر دودھ، گھی اور مکھن ہوتا تھا۔ وہ غلہ سے آٹا بنا جانتے تھے اور اسے گھی، دودھ میں ملا کر طرح طرح کی مٹھائیاں تیار کرتے تھے۔ انکے کھانوں میں سبزی اور پھل بھی ہوتے تھے۔ لیکن یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ گوشت نہیں ہوتا تھا۔ قربانی کے موقع پر تو وہ ذبیحہ کرتے ہی تھے لیکن احباب کی ضیافتوں میں بھی وہ بلا تکلف فربہ بچھڑوں کو ذبح کرتے تھے۔ انکے نزدیک اس بے گائے کے احترام میں کوئی فرق نہ آتا تھا بھیڑ، بکری کا گوشت بھی پکتا تھا، علاوہ اس کے انکے ہاں گھوڑے کی قربانی بھی ہوتی اور اس کا گوشت کھایا بھی جاتا۔ گوشت کے پکانیکے دو طریقے تھے ایک تو اسے ابال کر پکاتے دوسرے انکے کباب بناتے تھے۔ مشروبات میں دو چیزیں داخل تھیں جو شراب کی قائمقام تھیں، ایک کا نام 'سوم' تھا جو کسی پودے کے عرق سے بنتا تھا، اور دوسرے کا نام 'سورا' تھا جو غلہ سے تیار کیا جاتا اور اسمیں پہلے کی بہ نسبت زیادہ نشہ ہوتا تھا۔

تفریحی مشاغل | کسی قوم میں معمولات زندگی کے علاوہ تفریحی مشاغل کا پایا جانا تمدن کی ایک بہت بڑی علامت سمجھا جاتا ہے۔ بلاشبہ اس سے کم سے کم تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ روزمرہ کے کاموں کے علاوہ جو بقائے زندگی کے لئے لازم ہیں، کچھ ایسے مشاغل بھی رکھتے ہیں جو زندگی کو خوشگوار بنانے کے لئے ضروری ہیں چنانچہ آریوں کے اس دور تمدن میں بھی بہت سے ایسے مشاغل پائے جاتے ہیں جو محض حظ نفس اور سرور قلب کے لئے کئے جاتے تھے۔ مثلاً رتھوں کا دوڑانا۔ یہ انکے ہاں کی ویسی ہی اعلیٰ سواری تھی جیسے آج کل ہمارے ہاں گھوڑے کی سواری ہے اور جس طرح اس زمانہ میں گھوڑدوڑ ایک بہت بڑا تفریحی شغلہ سمجھا جاتا ہے اسی طرح انکے ہاں رتھوں کا مقابلہ بھی اسی دلچسپی اور شوق کے ساتھ دیکھا جاتا تھا۔ علاوہ اس کے قماربازی کا رواج بھی پایا جاتا تھا۔ ایک حد اعتدال تک ممکن ہے یہ کسی قدر دلچسپی اور تفریح کا باعث ہو لیکن جب اپنے پورے سرمایہ حیات کے ساتھ بازی کھیلی جائے تو یہی شے مذموم ہو جاتی ہے۔ آریوں کے اس ابتدائی عہد میں کہیں حد اعتدال سے گزرنے کا ذکر نہیں پایا جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ رقص و سرود کا بھی رواج ہو چلا تھا۔ آج ابتدائی سے ابتدائی تمدن رکھنے والی جماعتوں میں بھی یہ شے کسی نہ کسی حالت میں پائی جاتی ہے۔ لیکن آریوں کے ہاں اس فن

میں کافی ترقی ہوگئی تھی۔ ناچنے میں عموماً کنواری لڑکیاں ہوتی تھیں لیکن عجیب بات ہے کہ اس زمانہ میں مرد بھی ناچتے تھے۔ موسیقی میں تو انہوں نے بہت خاصی ترقی کر لی تھی، باجہ کی ہر سہ اقسام پائی جاتی تھیں۔ مثلاً منڈھی ہوئی شکل کے جیسے طبلہ وغیرہ، تار سے بنے ہوئے جیسے سارنگی، ستار وغیرہ، اور پھونک کر بجائے جانے والے جیسے بانسری وغیرہ۔ نغمہ و سرود انکے ہاں مستحسن سمجھا جاتا تھا حتیٰ کہ ان کی عبادت میں بھی داخل تھا۔

معاشی زندگی | جب کچھ لوگ یکجا رہتے بستے ہیں تو انمیں باہم داد و ستد کے مخصوص طریقے رائج ہو جاتے ہیں اور وہ پیدائش دولت اور افزائش مال کے اپنی خاص طور طریقے بھی پیدا کر لیتے ہیں۔ زندگی کا یہ پہلو معاشی پہلو کہلاتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ آریوں میں یہ پہلو کہاں تک نمایاں تھا۔ ان میں آپس میں لین دین کا طریقہ یا تو دان پن کے ذریعہ تھا یا خرید و فروخت کے ذریعہ۔ مستطیع اشخاص خیرات و زکوٰۃ کے طور پر مویشی، غلہ یا کھیت بہت کچھ دے ڈالتے تھے اور برہمنوں کو اس طریقہ پر بہت کچھ مل جاتا تھا۔ خرید و فروخت میں سکوں کا رواج نہ تھا۔ تمام لین دین اجناس میں ہوتا تھا۔ گائے ایک بہت بڑی جنس مبادلہ بھی جاتی تھی۔ عموماً، گایوں کے بدلے ایک اندر کی مورتی آتی تھی۔ "نشکہ" ایک قسم کا زیور ہوتا تھا جو بطور سکہ کے چلتا تھا۔ بعد میں یہی آگے ایک طلائی سکہ کا نام ہو گیا۔ ان میں وراثت کا بھی دستور تھا اور ایک رکن خاندان کے مرنے پر ورثاء کو جائداد وراثتہً ملتی تھی لیکن بیشتر وہ اپنی قوت بازو سے حاصل کرتے۔ انکے ہاں قرض کے لین دین کا بھی دستور تھا جسے وہ "رنیشر" کہتے تھے۔ بصورت عدم استطاعت مقروض کو بذات خود اپنے قرضخواہ کے ہاتھ بک جانا پڑتا تھا۔

انہوں نے صنعت و حرفت میں بھی کافی ترقی کر لی تھی اور انکے یہاں مختلف قسم کی مصنوعات کا ذکر ملتا ہے۔ رتھوں اور گاڑیوں کی مرمت اور انکو بنانے کے لئے بڑھئی کا کام نہایت خوب ہوتا تھا۔ اسکے علاوہ کرسی کی اور دوسری چیزیں بھی بنتی تھیں۔ پہلے کہیں آچکا ہے کہ وہ چمڑے کا لباس بھی پہنتے تھے۔ اس لحاظ سے چرم سازی کا کام بھی ہوتا تھا اور اس سلسلہ میں چمڑے کی مختلف چیزیں بنتی تھیں۔ پھر کپڑے بننے کا کام تو لازمی ہے اور جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے، ریاست و امارت کے اظہار کے لئے زری کے کپڑے

استعمال کئے جاتے تھے۔ ایسی صورت میں یہ پیشہ بہت کافی ترقی پر تھا۔ ساتھ ہی اسکے خیاطت کا ہونا بھی ضروری ہے اور زری کے کام کے ساتھ اس فن کا ترقی پذیر نہ ہونا ناممکن ہے۔ علاوہ اس کے چھوٹے چھوٹے کام مثلاً چٹائیاں وغیرہ بنانے کا دستور بھی تھا۔ طرح طرح کے مٹی کے برتن بھی بنتے تھے اور اس فن نے کچھ عرصہ بعد جو ترقی کر لی تھی، وہ آجکل کے اکتشافات سے ظاہر ہے اور جس سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس زمانہ میں یہ فن کچھ بہت زیادہ پیچھے نہ رہا ہوگا۔ ان سب باتوں میں ایک بات جو سب سے زیادہ عجیب و غریب پائی جاتی ہے وہ یہ کہ ابھی تک کسی پیشہ کو ذلیل او حقیر نہیں سمجھا جاتا تھا۔ بات یہ ہے کہ جس طرح بعض دوسری ابتدائی قومیں مثلاً یونانیوں اور رومیوں میں غلامی کا رواج تھا اور غلاموں ہی سے تمام کام لئے جاتے تھے آریوں میں اس قسم کا کوئی دستور نہ تھا۔ سارا کام آرین خود اپنے ہاتھ سے کرتے تھے، زراعت و کاشتکاری صنعت و حرفت غرض تمام کام وہ خود اپنے ہاتھ سے انجام دیتے۔ کوئی غیر قوم یا غیر قبیلہ کا شخص مزدور یا نوکر نہ ہوتا، جو انکے بجائے ان کے سارے کام کرتا، پھر وہ ذلیل یا حقیر سمجھتے تو کسے ؟

سیاسی نظام اس سے یہ مفہوم ہرگز نہ لینا چاہیے کہ تمدن کے اس دور میں انکے ہاں کوئی بہت بڑا سیاسی و ملکی نظام ہوگا۔ لے دے کے صرف ایک بادشاہ ہوتا تھا جو جنگ میں فوج کا سردار ہوتا اور امن کے زمانہ میں انکے تمام امور کا نگراں رہتا۔ چھوٹی چھوٹی مہموں پر راجہ خود نہ جاتا بلکہ کسی دوسرے کو فوج کا سردار بنا کر بھیجتا۔ امن وامان کے زمانہ میں اُسے کچھ بہت زیادہ کام نہ ہوتا، اکثر عبادت و قربانی کے موقعوں پر وہ انکا امام ہوتا۔ اس کے علاوہ مال اور فوجداری کے تمام معاملات اسی کو طے کرنے ہوتے۔ قانون وراثت و مال کا جھگڑا نہ تھا جو مقدمات میں پیچیدگی ہوتی ہر شخص بالعموم اپنی قوت بازو کی کمائی کا مالک ہوتا۔ چوری وغیرہ کے معاملہ میں چور کو پکڑ کر باندھ رکھتے تاوقتیکہ وہ اپنے جرم کا اقرار نہ کر لے اور اس کے اعزا آکر مال مسروقہ کی تلافی نہ کر دیں۔ پولیس کا بھی کم و بیش انتظام تھا اور بالعموم ان سے سراغرسانی کا کام لیا جاتا تھا۔ پنجاب میں "کھوجی" کے نام سے آجتک ایک ذات ہے جو اس کام میں بڑی مہارت رکھتی ہے۔ "سبھا" یا "سمیتی" کے نام سے ایک مجلس بھی تھی جس کا کام بادشاہ کو مشورہ دینا ہوتا۔ یہی جماعت آگے چلکر بہت بااختیار ہو گئی اور سنگین مقدمات کے فیصلہ کرنے میں اس سے "جوری" کا کام لیا جاتا تھا۔

جنگ میں قبیلہ کا قبیلہ شریک ہوتا۔ پروہت، اس کے لئے لوگوں کو آمادہ کرتا تھا۔ لڑائی عمومًا رتھوں پر سوار ہو کر ہوتی تھی جنگ کے دوران میں کوئی خاص نظام و ترتیب نہ ہوتی۔ تیر انداز راجہ کے بائیں جانب کھڑا ہو جاتا اور وہاں سے تیر چلاتا۔ اسلحہ میں تیر و کمان کا خاص طور پر استعمال تھا۔ تیر کا اصل حصہ ہڈی یا کسی دھات کا ہوتا تھا جو کسی پتلی لکڑی میں لگا ہوتا بعض وقت تیر زہر میں بجھائے ہوئے استعمال ہوتے تھے اس کے علاوہ نیزے، بلم، تلواریں، تیغے بھی استعمال ہوتے تھے۔ مدافعانہ اسلحوں میں زرہ اور بکتر پہنے جاتے۔ جنگ میں سواری کے لئے گھوڑوں کا استعمال نہ تھا۔ میدان جنگ عمومًا دریا کا ساحل منتخب کیا جاتا تاکہ پانی وغیرہ کی آسانی ہو اور کم سے کم ایک جانب تو دشمن کے حملہ کا خوف نہ رہے

مذہب و فلسفہ آرین تہذیب کے مختلف شعبے اگرچہ ایک بلند معیار پر پہونچ چکے تھے، پھر بھی ان میں ایک طرح کی سادگی اور بے تکلفی باقی تھی لیکن انکے مذہب و عقائد میں بہت زیادہ پیچیدگی اور طوالت نظر آتی ہے اسکا سب سے بڑا سبب غالبًا مذہبی جماعت کا وجود ہے جس کا کام مذہب کے معاملات پر غور و فکر کرنا اور مذہبی عبادات کا انجام دینا ہوتا تھا۔ ان کا مذہب ایک بالکل فطری مذہب تھا۔ کائنات فطرت مثلاً سورج، چاند، تارے، آسمان، ہوا، زمین، دریا، پہاڑ ان سب سے انکا روزانہ کا سابقہ پڑتا تھا اور یہی انکے معبود تھے، وہ سورج سے روشنی اور گرمی پاتے تھے، وہی زمین سے غلہ اگاتا اور ان کی فصلوں کو پکاتا تھا، زندگی کے نفع و بقا کا اس پر بہت حد تک دار و مدار تھا، لامحالہ اسکا ایک احترام و وقار دل میں پیدا ہو گیا اور وہ معبود بن گیا چاند اور تاروں سے رات کی تاریکی دور ہوتی، ان کی ٹھنڈی اور دھیمی روشنی انکے قلوب پر ایک اثر اور کیفیت پیدا کرتی، اس لحاظ سے انکے ساتھ انہیں ایک طرح کا تعلق خاطر اور لگاؤ پیدا ہو گیا اور یہ بھی انکے معبودوں میں داخل ہو گئے۔ اسی طرح زمین جس پر وہ دن رات چلتے پھرتے اور اپنے مکانات بناتے اور جو انہیں اپنی چھاتی سے غلہ اگا کر دیتی، ان کے ادب و احترام کی ایک شے ہو گئی۔ اس طرح کائنات عالم کی وہ تمام چیزیں جو انکے نفع و سود کا باعث ہوتیں ان کی معبود بن گئیں چنانچہ رگ وید کے اندر ان کے دیوتاؤں میں ہم ورن (آسمان) پرتھوی (زمین) سوریہ (سورج) وایو (ہوا) اندر (رعد) اشنز (سحر) اسوین (صبح و شام کے دو تارے) اگنی (آگ) کے نام پاتے ہیں

جن کی وہ عبادت کیا کرتے تھے۔

انکے علاوہ ان میں بعض غیر مرئی معبودوں کا تخیل بھی پایا جاتا ہے مثلاً وہ اعتقاد (شردھ) اور غصہ (منیو) کے متعلق بھی ایک طرح کا ادب اور خوف اپنے دل میں رکھتے تھے۔ انہوں نے بعض دیوتاؤں کو اپنے خیال کے مطابق بعض جانوروں کی شکلوں پر ڈھال لیا تھا۔ مثلاً اندر (رعد) اور دیاؤس (آسمان) بیل کی شکل کے بنائے گئے تھے۔ سوریہ (سورج) ایک گھوڑے کی شکل میں پیش کیا جاتا تھا۔ لیکن یہ جانور بذات خود انکے مسجود نہ تھے اور اسی کی وجہ سے انمیں بت پرستی نہیں پائی جاتی تھی

'خیر' کی ان قوتوں کے ساتھ انکے ہاں بعض 'شر' کی قوتوں کا مظہر بھی پایا جاتا ہے جن کے متعلق ان کا خیال تھا کہ وہ عبادت و قربانی کے راستے سے انہیں روکتے ہیں مثلاً 'اسور' اور 'رکشش' ان کے ہاں بمنزلہ شیطان کے مانے جاتے تھے۔

دیوتاؤں کے ساتھ ان کا تمام تر رویہ امید و توقع کا تھا۔ وہ ان کا ادب و احترام اس بنا پر کرتے ان کے ساتھ محبت و عقیدت اسی وجہ سے رکھتے تھے کہ ان سے انہیں نفع و سود کی توقع ہوتی تھی۔ قربانی بھی وہ اسی امید پر کرتے کہ اس سے ان کے دیوتا خوش ہونگے انکا عقیدہ تھا کہ قربانی کی چیزوں میں ان کے دیوتا بذات خود شریک ہوتے ہیں۔ اسی لئے ان کے ہاں قربانی میں دودھ، گھی، غلہ گوشت اور سوم، شامل تھے جو از قسم ماکولات و مشروبات انکے ہاں کی بہترین چیزیں ہیں۔ ان کے قربانی کا طریقہ نہایت باضابطہ اور بہت طویل ہوتا تھا بسا اوقات سات سات برہمن شریک قربانی ہوتے تھے کچھ منتر پڑھتے بعض کام میں لگے رہتے اور کچھ گانے بجانے میں مصروف رہتے

کائنات فطرت سے محبت و تعلق ہونے کے ساتھ ان میں ایک صانع کل، (وشوکرمن) کا تخیل بھی موجود تھا۔ جہاں ان کے متعدد دیوی اور دیوتا تھے، وہاں انہیں ایک معبود حقیقی کی تلاش بھی تھی اور وہ ان الہیاتی مسائل پر برابر غور و فکر کرتے رہتے تھے۔ تخلیق عالم کے متعلق ان کا عقیدہ تھا کہ دنیا عدم سے وجود میں آئی۔ اس عالم کی تخلیق پہلے پانی کی شکل میں ہوئی۔ پھر گرمی کی۔ لیکن حیات بعد الممات کا ان کے ہاں کوئی خاص تخیل نہیں پایا جاتا، ان کا عقیدہ تھا کہ مرنے کے بعد روح یا تو پانی پر چلی

جاتی ہے یا پودوں پر رہتی ہے۔ وہ ایک دوسری زندگی کے قائل ضرور تھے اور اس کے متعلق وہ صرف اتنا یقین رکھتے تھے کہ اُس عالم کی زندگی پر اِس عالم دنیا کے افعال و اعمال کا اثر ہوتا ہے۔

فرقہ وارانہ تعلیم

بطرز اسٹیفن لی کاک

اسمبلی - ۱۵ جنوری ۱۹۳۰ء - آج عام جلسہ میں مسودہ قانون تعلیم کی دفعہ ۴۳۲ پر بحث ہوئی - آنریبل ممبر تعلیم نے تحریک کی کہ "اسمبلی کی رائے میں جب مثلث کے دو اضلاع مساوی ہوں اس میں ان اضلاع کے مقابل زاویے مساوی ہوتے ہیں اور اگر یہ اضلاع آگے کو بڑھائے جائیں تو دونوں بیرونی زاویے بھی مساوی ہوں گے۔" آنریبل ممبر نے اپنی تقریر میں حکومت کے انصاف پسندی اور معدلت گستری پر زور دیا آپ نے فرمایا کہ اگر کا لفظ اس تحریک میں محض احتیاط کی غرض سے ہے ورنہ اصل میں حکومت تمام اضلاع کو ایک نظر سے دیکھتی ہے اور سب کو مساوی سمجھتی ہے اسی طرح سب زاویے بھی حکومت کے زاویۂ نگاہ سے برابر ہیں۔ دوسرے حصہ کی بابت آپ نے فرمایا کہ حکومت کو معلوم ہے کہ اضلاع کا بڑھانا قدامت پسندوں اور ترقی کے مخالفوں کو ناگوار ہے لیکن ایسی حالت میں کہ زمانہ آگے بڑھ رہا ہے اور ترقی کی راہیں سرعت کھلی ہوئی ہیں یہ کیونکر ممکن ہے کہ حکومت جو ترقی کی علمبردار ہے اضلاع کو آگے نہ بڑھائے اور بیرونی زاویے نہ بنائے۔ آپ نے کہا کہ بیرونی زاویوں کی برابری کی انجمن اقوام ذمہ دار ہے اس لئے اسمبلی کو ان کی طرف سے بالکل مطمئن رہنا چاہئے۔ مخالف بنچوں سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے یقین دلایا کہ حکومت اضلاع کو بڑھانے کے معاملے میں نہایت حزم و احتیاط سے کام لے گی اور اسمبلی سے مشورہ کر کے آہستہ آہستہ بااقساط اس مہم کو سرانجام دے گی۔

جب آنریبل ممبر اپنی تقریر ختم کر چکے تو ہوم رول پارٹی کے لیڈر اٹھے اور آپ نے بہت زور شور سے اس تحریک کی مخالفت کی پچھلے ڈیڑھ سو سال کی سیاسی تاریخ پر مفصل تبصرہ کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ حکومت نے کسی زمانے میں بھی اضلاع کو مساوی نہیں سمجھا بلکہ کبھی ایک کو بڑھا رکھا کبھی دوسرے کو اور زاویوں کو جب موقعہ ملا دو میں تقسیم کر دیا یہاں تک کہ موجودہ تحریک میں بھی صرف دو ضلعوں اور زاویوں کی برابری کا ذکر ہے اور تیسرے ضلع اور زاویے کی طرف سے جان بوجھ کر چشم پوشی کی جا رہی ہے۔ آپ نے کہا کہ اس سے صاف بدنیتی اور خیانت نہیں بلکہ ظلم و استبداد ثابت ہوتا ہے اضلاع کو بڑھانے کی بابت آپ نے کہا کہ

ملک اور قوم کے لئے نہایت مہلک تجویز ہے جب اضلاع بڑھائے جائیں گے تو ظاہر ہے کہ وہ ایک دوسرے سے اور تیسرے ضلع سے دور ہوتے جائینگے۔ علاوہ اس کے مثلث سے باہر نکلنے کے بعد اضلاع پر بیرونی رنگ غالب آجائے گا اور اُن سے جو زاویے بنیں گے وہ بھی بالکل بیرونی ہوں گے۔ آپ نے فرمایا کہ مجموعی حیثیت سے یہ تحریک "مساوات، حریت، اخوت" کا گلا گھونٹنے کے لئے پیش کی گئی ہے اس لئے اسمبلی کو چاہئے کہ خود اس تحریک کا گلا گھونٹ دے۔

اس کے بعد مولانا مظہر الاسلام کھڑے ہوئے اور آپنے آنرایبل ممبر تعلیم کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے یہ ضروری تحریک ایسے پرآشوب زمانے میں بلاخوف وخطر پیش کر دی آپ نے فرمایا میں خوشامدی نہیں، لیکن میرے خیال میں یہ کارنما آنرایبل مسٹر رستم اور آنرایبل مسٹر اسفندیار کی شجاعت کی یاد ہمارے دلوں میں تازہ کرتا ہے۔ اس کے بعد آپ نے آبدیدہ ہو کر کہا کہ افسوس ہے کہ مجھے اس تحریک میں ایک ترمیم پیش کرنیکی ضرورت ہوئی۔ مجھ سے زیادہ اتفاق واتحاد کا حامی کوئی نہیں لیکن موجودہ فضا کو دیکھتے ہوئے میں صرف اپنے ضلع کی مساوات کا ذمہ دار ہوں اور اسی کو بڑھانے کی رائے دیتا ہوں۔ مساوات میرے ضلع کی بلا شرکت غیرے ملک ہے اس میں کسی کو حصہ دینا مجھے کسی طرح گوارا نہیں۔ اسی طرح بڑھنے کا مستحق صرف میرا ضلع ہے۔ دوسرے ضلع رجعت پسندی جس سے وہ میرے ضلع کو پیچھے چھوڑ کر خود آگے بڑھا جاتا ہے اُس کی بزدلی جس سے وہ میرے ضلع کو ہر قدم پر شکست دیتا ہے۔ اُسکا آپس کا نفاق جس سے وہ میرے ضلع کی مخالفت میں یکدل اور یک زبان ہوگیا ہے اظہر من الشمس ہے اس لئے اس کے مقابل زاویہ کبھی میرے مقابل زاویہ کے برابر نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح دوسرا ضلع اگر بڑھایا جائے گا تو بیرونی زاویہ کے بنے گا اور اس سے اسے وحشت ہوگی اس لئے اسے ہرگز بڑھانا نہ چاہئے۔ دوسری ترمیم آپ نے یہ پیش کی کہ بیرونی زاویے اور اندرونی زاویے کی تفریق میرے ضلع کے لئے نہیں کیجا سکتی۔ میرے یہاں مساوات کی روح اس طرح سرایت کرگئی ہے کہ بیرونی اور اندرونی زاویے آپس میں بالکل برابر ہیں بشرطیکہ وہ میرے ضلع سے تعلق رکھتے ہوں۔ اس لئے میں اس تحریک کو مندرجہ ذیل الفاظ میں پیش کرتا ہوں "اس اسمبلی کی رائے میں چونکہ میرا ضلع اپنے شاندار ماضی اور قابل فخر روایات کی بنا پر مساوی ہے اس لئے اس کو مقابل

زاویہ بھی مساوی ہے اور اگر نہیں بلکہ ضرور اس زاویے کو بڑھانا چاہئے تاکہ بیرونی زاویہ بذات خود مساوی ہو اور اپنے بھائی اندرونی زاویے کے برابر ہو۔"

مولانا کی تقریر ابھی طرح ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ پنڈت برج لال اُٹھے اور آپ نے حکومت اکوزایل ممبر تعلیم کا تہ دل سے شکریہ ادا کیا۔ آپ نے کہا کہ چاپلوسی میری عادت نہیں لیکن اس نازک وقت میں ایسی دلیرانہ تحریک پیش کرنا آنی بڑی شجاعت کا کام ہے کہ مجھے بے اختیار آزایل جہاشے ارجن یاد آگئے۔ آپ نے تحریک سے اصولی اتفاق ظاہر کیا لیکن اس کے بعض الفاظ سے اختلاف کیا۔ آپ نے فرمایا کہ اتحاد و اتفاق میرا دھرم ہے لیکن آج کل ہوا ایسی بگڑی ہوئی ہے اور دوسرے ضلع والے ایسے قوی اور خوفناک ہیں کہ میرے خیال میں اس تحریک میں صرف میرے ضلع کا ذکر ہونا چاہئے۔ اگر تاریخ پر گہری نظر ڈالی جائے تو ظاہر ہوگا کہ یہ مثلث پہلے میرے ہی ضلع سے گھرا ہوا تھا۔ باقی دو ضلعے خدا جانے کہاں سے آن کودے۔ ان میں سے ایک ضلع اس قدر شورہ پشت اور ظالم ہے کہ اس کے نام سے میرا دل کانپتا ہے جب کبھی مقابلہ ہوتا ہے خواہ پہل اس کی طرف سے ہو یا نہ ہو خواہ اُسے شکست ہو یا فتح لیکن ظلم اور زیادتی ہمیشہ اسی کی ہوتی ہے اس لئے یہ ضلع اصل میں مثلث میں رہنے کے قابل نہیں چہ جائیکہ اس کے مقابل کا زاویہ میرے مقابل کے زاویے کے برابر ہو۔ اب رہا اضلاع کو بڑھا کر بیرونی زاویے بنانا تو خدا کے لئے کہیں ایسا غضب بھی نہ کیجئے گا ورنہ دوسرے ضلع کا بیرونی زاویہ میرے زاویہ کو فوراً مسل ڈالے گا لہذا میں تحریک کو ذرا سے تغیر کے ساتھ ان الفاظ میں پیش کرتا ہوں۔

"مثلث کے ایک ضلع سے کچھ بحث نہیں دوسرا ظالم ہے البتہ میرے ضلع کے مقابل کا زاویہ مساوی ہے ضلع کے بڑھانے کا میں مخالف نہیں بڑھاتے مگر اس کا خیال رہے کہ بیرونی زاویہ ہرگز نہ بننے پائے۔" پنڈت جی بیٹھے ہی تھے کہ خانساماں داخل ہوا اور اُس نے جناب صدر کی اجازت سے تحریک کی کہ جلسہ چائے کے لئے ملتوی ہو۔ یہ تحریک باتفاق رائے منظور ہوئی۔

غزل

مصورِ جذبات حضرت ثاقب لکھنوی مدظلہ العالی

نالہ و فریاد و آہ و کاہشِ جاں دیکھنا — مجھ فقیرِ بے نوا کا ساز و ساماں دیکھنا

قلبِ صد پارہ مرا اب تک ہے تصویرِ وفا — ٹوٹنے پر بھی نہ ٹوٹا دل کا پیماں دیکھنا

خون کا قطرہ نہ ہو دیکھیں تو پھر اک حشر ہے — لاکھوں ارمانوں کو اپنے گھر میں مہماں دیکھنا

خیر دل تو پھر بھی دل ہے کیوں نہ ہو مجروحِ حسن — ہوش اڑا دیتا ہے آئینہ کا حیراں دیکھنا

تنگیِ دل بعد وسعت آ نہیں سکتی کبھی — دشت والوں کی قضا ہے بابِ زنداں دیکھنا

حسرتوں کو آگ دے کر تم نے مشکل سہل کی — ورنہ کیا آسان تھا دل میں بیاباں دیکھنا

بیس ڈالا خواہش بچانے کوہ طور کو — دل کی قوت دیکھ لے پھر روئے جاناں دیکھنا

بخیہ گر حس کا نہیں وہ چاک زن ہے دستِ حسن — دل نہ یوسف کا نظر آئے تو داماں دیکھنا

تم جو بچ جاؤ تو اچھی ہے مجھے شامِ فراق — دور ہی سے میری ان اشکوں کا طوفاں دیکھنا

کھل گیا داغِ جگر یا کچھ کسر باقی رہی — اک ذرا جھک کر مرا چاکِ گریباں دیکھنا

موت کی خواہش سوا میرے کسی کو بھی نہیں — کارِ اہلِ دل ہے مشکل کو آساں دیکھنا

ایک خنجر ہو گیا دل کے لئے انکارِ وصل — اس نہیں نے کیا اثر پیدا کیا ہاں دیکھنا

کائنات موت ہے ان میں لئے ہیں دل کے زخم — درد اگر کم ہو تو تم سوئے نمکداں دیکھنا

ہم نہ مرجاتے تو کیوں سنتا کوئی فریادِ ہو — اک قیامت ہے کسی بستی کو ویراں دیکھنا

ہستیِ فانی پہ اک اصرار تھا تقدیر کو — ورنہ کب منظور تھا خوابِ پریشاں دیکھنا

بیتی بیتی سے نہ خوں اُبلے تو مجرم جاننا — ذبح میں ہو لوں تو پھر رنگِ گلستاں دیکھنا

سو جہانوں کو مٹا کر ایک زمیں آباد ہے — تم کسی دن عالمِ گورِ غریباں دیکھنا

گر یہی پہلو یہی دل اور یہی تم ہے تو پھر — عمر بھر آسان ہے ثاقب کو پریشاں دیکھنا

شب ماہ کشمیر میں

مژدہ ہو آرزو کے بسمل کو / مژدہ ہو درد آشنا دل کو
مژدہ ہو حسرت تماشا کو / مژدہ ہو چشم حسن پیما کو
جلوۂ طور ہے مقابل آج / زیب گردوں ہے ماہ کامل آج
بے نقاب آج ماہ انور ہے / کس قدر دلفریب منظر ہے
یہ سہانا سماں یہ پیاری زمیں / کیوں نہ کہئے اسے بہشت بریں
حسن فطرت کی دلربا تصویر / جانِ نظارہ خطۂ کشمیر
سبز و شاداب وادیٔ جہلم / آج کی شب ہے رشک باغ ارم
دونوں جانب پہاڑ کی دیوار / سر بہ افلاک چوٹیوں کی قطار
ہے مجسم وقار شوکت حسن / پیکر احتشام و عظمت حسن
بہہ رہا ہے نشیب میں دریا / گونجتی ہے فضا میں جس کی صدا
نالۂ بیقرار ہے ہر موج / ساز ہستی کا تار ہے ہر موج
نغمہ پیدا ہے آبشاروں سے / راگ جھڑتا ہے کوہساروں سے
آج اس بزم میں ہے صدر نشیں / شاہد مہ کا عارض سیمیں
دل کو بھاتی ہے سطح جہلم پر / صاف شفاف نور کی چادر
موجیں آپس میں لڑتی جاتی ہیں / شکنیں اس میں پڑتی جاتی ہیں
کچھ عجب دلکشی ہے پانی میں / چاندنی بہہ رہی ہے پانی میں
ماہ کامل کے روئے روشن سے / حسن فطرت کو چار چاند لگے
رات کو اس نے دن بنایا ہے / سوتے سنسار کو جگایا ہے
دیکھو اعجاز لذت دیدار / ذرہ ذرہ زمیں کا ہے بیدار
ہاں مگر محو خواب ہے سبزہ / کیا مست شباب ہے سبزہ

اقتباسات

فاشستی حرب

جنگ عظیم نے دنیا کے نظام میں بہت کچھ تغیر و تبدل کر دیا ہے۔ وہ اصول جو جنگ سے قبل قطعی ناقابل تردید سمجھے جاتے تھے آج مشکوک نگاہوں سے دیکھے جا رہے ہیں۔ مغربی نظام سیاست میں جمہوریت ایک ضروری عنصر تھا لیکن آج روس، اسپین، ترکی اور اطالیہ کے سیاسی حالات کسی اور سمت کا اشارہ کر رہے ہیں۔ اطالیہ میں فاشستی تحریک جس کا لیڈر مسولینی ہے۔ اس نئی تحریک کا سب سے عجیب مظہر ہے لیکن بعض اہل فکر اس تحریک سے بالکل خائف نہیں ہیں بلکہ سمجھتے ہیں کہ یہ ایک عارضی شے ہے جو فی الحال کتنی ہی مرعوب کن کیوں نہ ہو لیکن آخر کار فنا ہو جائے گی۔

مسٹر اسٹوارٹ ہاسن جو ابھی اپنے سفر اطالیہ سے واپس آئے ہیں اپنے اخبار ڈیلی نیوز میں رقمطراز ہیں کہ مجھے اس بات کا قطعی یقین ہے کہ فاشستی تحریک کبھی قائم نہیں رہ سکتی۔ آخر میں یہ ان جرائم کے سبب جو اس کے نام سے کئے جاتے ہیں اور نہ ان جذبات کے سبب جن کا اظہار اس کے مدہوش پیرو کیا کرتے ہیں تباہ ہوگی بلکہ اس کی تباہی اس لئے قطعی ہے کہ یہ ذہنی اور روحانی بنیادوں پر استوار نہیں ہے۔ اس کی محرک صرف ناعاقبت اندیشانہ قومیت ہے۔ میں نے فلورنس میں ایسلو بوڈریو کے تصنیف کردہ چند پمفلٹ دیکھے جنہیں اطالیہ کے نوجوان بہت ذوق سے پڑھا کرتے ہیں۔ ایسلو بوڈریو میرا خیال ہے کہ نائب وزیر تعلیمات ہیں بعد بذاتہ ایک نہایت ایماندار اور سنجیدہ آدمی ہیں۔ میں ان کی کتابوں سے چند اقتباسات درج کرتا ہوں جنہیں میں اس تحریک کی روح سمجھتا ہوں۔ وہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ اخوت ایک ناممکن الحصول نصب العین ہے۔

وہ فرماتے ہیں کہ اگر یہ نصب العین ممکن الحصول ہو تو ہمارے لئے سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہیں ہے کہ ہم پھوڑے ہلاک ہو جائیں چونکہ حقیقۃً انسانی خوشی کا انحصار اس کی جدوجہد اور حس کی

جنون ہی پر ہے۔

تمام طلبہ اپنے دلوں میں انہیں خیالات کو لئے ہوئے ہیں۔ ایک اس قدر معمر اور سنجیدہ شخص کا اپنے نظریہ کو پیش کرنا اس تحریک کے طفلانہ پہلو پر کافی روشنی ڈالتا ہے۔ انسانیت کے متعلق آپ فرماتے ہیں کہ انسانیت وہ ہے جس میں ہم فاشستی یقین رکھتے ہیں . . . ہمارے لئے انسانیت صرف اطالین کی قوم ہے۔ اطالین باہر رہنے والے اطالین پر مشتمل ہے باقی دنیا کی ہمیں کوئی پروا نہیں ہے۔

سن تھیون نے بھی اپنے انتہائی جنون کے زمانہ میں ایسی کوئی بات نہیں کہی۔ اس کی خیال طرز متعصب یہودیت ہے۔ مگر متعصب یہودیت کی داستان کو چراغ ہدایت نہ سمجھنا چاہئے بلکہ شمع محدود جانا چاہئے۔"

جمہوریت کا مستقبل

موجودہ جمہوری نظام حکومت کے خلاف جو شورش برپا ہے اسے پروفیسر رشبرڈک ویس نسبتاً دیگر معاصرین کے زیادہ سمجھتے ہیں وہ اس کو جمہوریت کے منافی نہیں بلکہ معاون سمجھتے ہیں۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ "واقعہ یہ ہے کہ لوگ پارلیمنٹری طرز حکومت سے عاجز آگئے ہیں اور اس کی بجائے ایک نئی طرز حکومت کے خواہشمند ہیں جہاں تک اس زمانہ کی تحریک کو میں سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے کہ کوئی ایسا نظام حکومت بنایا جائے جس کی باگ ماہران حکومت کے ہاتھوں میں ہو جسے وہ کامیابی سے چلا سکیں مگر وہ بذات خود عوام الناس کے سامنے جواب دہ ہوں۔ کابینہ اور سکریٹریٹ باوجود اجتماعی سیاست کے تذبذب وفراز کے ایک عرصہ تک برقرار رہتی ہیں اس لئے زیادہ مقبول ہو رہی ہیں۔ یہ رجحان زیادہ نمایاں ہے کہ حکومت کے لئے ماہران فن پیدا کئے جائیں اور انہیں روزمرہ کے کاموں میں زیادہ سے زیادہ اختیارات دیئے جائیں۔

یہ بات ضرور قابل غور ہے کہ پارلیمنٹری حکومت سے بیزاری اور جمہوری خیالات سے اختلاف ہم مفہوم الفاظ نہیں ہیں کوئی شخص گذشتہ زمانہ کے استبداد کو اب دیکھنا نہیں چاہتا یہ ایک تاریخی اتفاق ہے کہ اس وقت پارلیمنٹری ادارے اور جمہوریت ہم معنی سمجھی جا رہی ہے۔

اضطراب کا عام جذبہ جمہوریت کے خلاف نہیں ہے بلکہ اس نظام حکومت کے خلاف ہے جو بجائے خود

کی صحیح ترجمانی نہیں کرتا۔ ممکن ہے کہ سیاسی مدبرین پارلیمنٹری نظام حکومت میں تبدیلیاں کر لیں یا بعض [illegible] کے قائل ہو جائیں ممکن ہے کہ [illegible] نظام حکومت کے خلاف [illegible] نظام حکومت اختیار کر لیا جائے [illegible] قطعی تعین نہیں کر سکتا تاہم [illegible] کو یقین ہے کہ رائے عامہ کا اثر [illegible] کے سبب خطرہ میں نہیں ہے۔ لوگ جو چاہتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ اس کو اور زیادہ موثر بنایا جائے"

زوال مغرب

اس خیال کا اکثر اعادہ کیا جاتا ہے کہ یورپ کا موجودہ تمدن تباہ ہو جائیگا چونکہ اس کی بنیادیں مادیت پر قائم ہیں اور اسکا غیر روحانی اجزاء سے بالکل خالی ہے۔ اور یہ قطعی ہے کہ حیات اجتماعیہ میں یہ عدم توازن ہمیشہ تباہی کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ لیکن یورپ کے موجودہ نظام میں ایک جدید عنصر کا اضافہ شروع ہو گیا ہے اور یہ اخلاقی اور روحانی عنصر ہے جس نے جنگ عظیم کے بعد کافی اہمیت حاصل کر لی ہے۔ اگر یہ عنصر موجودہ طمع اور خود غرضی پر غالب آ گیا تو یورپ کے زوال کی پیشین گوئیاں محض خواب ثابت ہونگی لیکن یہ طے کرنا کہ یورپ ان اصولوں کو تسلیم کر کے خود کو تباہی سے بچائے گا یا نہیں اسکا بہتر جواب صرف مستقبل دے سکتا ہے۔

مسٹر ولفرڈ لاک یورپ میں اس روحانی تحریک کے وجود کے قائل ہیں چنانچہ CURRENT THOUGHT میں آپ اس کے متعلق تحریر فرماتے ہیں کہ اس وقت مغرب تباہی سے صرف اس لئے بچ سکتا ہے کہ وہاں ایک زبردست روحانی تحریک جاری ہے۔ تمام خارجی انقلابات ضرور رونما ہونے چاہئیں لیکن اگر ہم کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو انکا اصلی محرک اس خواہش کو ہونا چاہئے کہ ہم انسان کو آزادی اور ترقی کے زیادہ مواقع دیں۔

یورپ کی جدید روح صنعت اور حرفت میں تعاون چاہتی ہے تاکہ کام میں خوشی حاصل ہو۔ وہ مساویانہ تقسیم دولت چاہتی ہے تاکہ لوگ غربت اور بے روزگاری کی تکلیفات سے آزاد ہو جائیں۔ وہ پیدائش دولت کا ایک معقول نظام چاہتی ہے تاکہ لوگوں کو علوم و فنون کے لئے وقت حاصل ہو جسے موجودہ تجارتی نظام نے تباہ کر دیا ہے۔ وہ خارجی تعلقات میں ایک انقلاب چاہتی ہے تاکہ خود غرضانہ قومیت کا جسے اس وقت حب الوطنی کہا جاتا ہے خاتمہ ہو جائے اور تمام دنیا کے لوگ قریب تر ہو جائیں۔

مختصر یہ کہ یہ روح تخریبی اصول لالچ کی جگہ تعمیری اصول محبت کو دینا چاہتی ہے۔ یہ اس انقلاب کو اسی وقت شروع کر دینا چاہتی ہے چونکہ اس وقت حرص و آز نے دنیا کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔ جنگ دشمنی غربت اور نفرت کا دور دورہ ہے۔ سائنس کے تمام انکشافات تباہی کے لئے اکارت بنائے گئے ہیں۔ یہ بالکل نمایاں ہے کہ محبت یا شوق خدمت ایک کلی اصول ہے چونکہ تعمیری اصول انسان میں سب سے قوی محرک ہے۔ وہاں کون کام کے لئے آمادہ ہوگا جہاں تعلقات خوشگوار ہوں جہاں انصاف کا دور دورہ ہو اور جہاں محنت کا مقصد انسان کی فلاح و بہبود ہو۔ جبکہ خوف و طمع نے پیدائش دولت میں اس قدر اضافہ کر دیا ہے تو محبت اور آزادانہ خدمت کس قدر حیرت انگیز اضافہ نہ کریگی؟

تعاون اور محبت کی روح اور خدمت کی خوشی موجودہ تمدن میں جاگزیں ہو کر تاریخ انسانیت کا سب سے بڑا انقلاب کر سکتی ہے۔ یہ انقلاب یقیناً ایک جدید تمدن کا پیش خیمہ ہوگا جس میں ذاتی خود غرضی اور انفرادی ملک کی بجائے فلاح عامہ اور مشترکہ ملک کا خیال غالب ہوگا۔ یہ ہر ایک اہل فکر پر واضح ہوگا کہ قلیل مشترکہ کوشش سے تمام انسانوں کی احتیاجات پوری ہو سکتی ہیں۔ اس سے نجات حاصل کئے بغیر انہیں اپنے جذبات اور خیالات کو فنون کے ذریعہ اظہار کا کافی موقعہ مل سکتا ہے۔ سوسائٹی کے اس روحانی نظام میں انسان اپنی ضائع شدہ قوتوں کو اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لئے استعمال کریگا اور ایک قرن کے اندر ہی دنیا حیرت انگیز ترقی کرلے گی۔

ہندوستان کی زراعت

ہندوستان کی ترقی کا انحصار زراعت کی ترقی اور کسانوں کی فلاح و بہبود پر ہے لیکن جو بدتر حالت ہمارے ہاں کی زراعت اور کسانوں کی ہے وہ ناقابل بیان ہے۔ زراعت کے متعلق تمام حالات کی تفتیش کے لئے حال ہی میں رائل کمیشن زراعت کا تقرر ہوا تھا۔ اس کمیشن کی رپورٹ کے پہلے حصہ کی دوسری جلد میں سے جس میں گورنمنٹ ماہران زراعت کی آراء درج ہیں۔ ہم مندرجہ ذیل اقتباس درج کرتے ہیں۔

تمام حالات کے مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے کاشتکار کی تباہی کا باعث یہ ہے

اس کی جہالت اور توہم پرستی ہے۔

ایک شہادت سے جو پٹنہ میں لی گئی یہ پتہ چلتا ہے کہ غریب کاشتکاروں کو اپنی جہالت کے سبب دلالوں سے کاروبار کرنے میں بہت نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے۔ رعیت کو جعلی پیمانوں اور وزنوں سے دھوکا دیا جاتا ہے۔

مسٹر ڈبلیو اسمتھ نے جو امپیریل ڈائری بنگلور کے ماہر فن ہیں فرمایا کہ ہندوستان میں مویشیوں کی پرورش جاہل قبائل کے ہاتھوں میں ہے جو مویشیوں کی بندش اور پرورش کے اصولوں سے محض ناواقف ہیں۔ اسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر سال ہزاروں کمزور بچے پیدا ہوتے ہیں جن میں نہ تو کھیتوں میں کام کر سکتے ہیں اور نہ مادہ دودھ دے سکتی ہیں لیکن چونکہ ایک بار وہ پیدا ہو جاتے ہیں اس لئے مذہبی جذبات کے سبب انہیں قتل نہیں کیا جاتا اور ہندوستان کو انکی موت تک انکے بیجا اخراجات اٹھانے پڑتے ہیں بغیر کسی فائدہ کے وہ اس غذا کو ہضم کر جاتے ہیں جسے مفید مویشیوں کو کھانا چاہیے تھا کسی دوسرے ملک میں یہ مویشی غذا کا کام دیتے۔ ہندوستان میں فصل کے زمانہ میں انہیں کافی غذا ملتی ہے مگر اس کے بعد آٹھ نو مہینہ تک یہ بھوکے مرتے ہیں حتی کہ ان میں سے بہت سے مر جاتے ہیں۔

مسٹر اسمتھ نے کہا کہ ایسی موثر تدبیریں اختیار کرنی چاہئیں جن سے مویشیوں کی پیدائش پرورش اور غذا کے اصولوں کی ترویج ہو سکے۔ نیز انکے لئے غذا کا کافی انتظام کرنا چاہئے۔ انہوں نے کہا کہ انکو جادو کی لالٹین اور لکچروں کے ذریعہ نہایت باضابطہ تبلیغ کی ضرورت ہے لیکن سب سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ کھیتوں میں عملاً مفید مویشیوں سے کام لیا جائے اور بتایا جائے کہ کاشت کے ہمراہ کس طرح مویشیوں کی بھی پرورش کیجا سکتی ہے۔

تنقید و تبصرہ

تاریخ فلسفۂ اسلام | مصنفہ ٹ۔ ج۔ دی بوئر مترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین پروفیسر فلسفہ و تعلیمات و ناظم اردو اکادمی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی۔

اس موضوع پر اردو کا تو ذکر ہی کیا اور کسی زبان میں بھی تھوڑا عرصہ پہلے کوئی مستقل تصنیف نہ تھی۔ چنانچہ انیسویں صدی کے اواخر میں مشہور مستشرق دی بوئر نے متفرق کوششوں سے مستفید ہو کر یہ کتاب لکھی۔ یہ کتاب اس موضوع پر پہلی تصنیف ہونیکی وجہ سے بہت مفید ہے اگرچہ بہت سی خامیاں بھی رہ گئی ہیں۔ اس موضوع پر فاضل مترجم کے ان الفاظ کا جو انہوں نے دیباچہ میں لکھے ہیں اعادہ مناسب ہوگا "فاضل مصنف خود اعتراف کرتا ہے کہ جس قدر تحقیقات فلسفۂ اسلام کے متعلق ہو چکی ہے اس میں سے بعض چیزیں اس کی نظر سے نہیں گزریں۔ وہ اپنی کتاب کا مقصد محض اس بحث کا چھیڑنا قرار دیتا ہے نہ کہ اس عظیم الشان کام کی تکمیل۔ اس پر لحاظ رکھتے ہوئے کہ یورپ کے مستشرقین کے لئے عربی غیر زبان ہے اور وہ مشرقی طرز خیال سے بیگانہ ہیں۔ اگر اس کتاب میں کوئی اغلاط پائی جائیں تو تعجب نہیں لیکن مجموعی حیثیت سے یہ کتاب اسلامی فلسفہ پر ان چند کتابوں میں سب سے زیادہ مستند ہے جو اس عہد میں لکھی گئی ہیں اور یوں تو اصل میں یہ کام خود مسلمانوں کا ہے کہ اپنے تمدن کے متعلق خود اپنی قوم کے لئے اور ساری دنیا کے لئے صحیح معلومات بہم پہنچائیں لیکن جو کوئی اس سلسلہ کو شروع کریگا اُسے دی بوئر کی کتاب سے یقیناً معقول مدد ملیگی۔"

ہمیں مصنف کے بعض خیالات سے اختلاف ہے مثلاً صفحہ ۲ پر تحریر ہے کہ "اُسے (یعنی مدینہ کو) اس پر اکتفا کرنا پڑا کہ ایک حد تک یہودیت اور عیسائیت کے زیر اثر فقہ اور حدیث کی تدوین کرے" فقہ اور حدیث کی تدوین میں یہودیت اور عیسائیت سے کیا کیا اثرات قبول کئے گئے۔ اس کی تشریح کی ضرورت تھی بغیر دلیل کے یہ دعویٰ مسموع نہیں ہو سکتا۔ بظاہر تو یہودیت اور عیسائیت کا کوئی

[illegible] درست پر تعرض نہیں آتا۔

اسی طرح صفحہ پر ہے کہ منصور ہی کے عہد سے یونانی ادب کا ترجمہ عربی میں زیادہ تر شامی زبان کے واسطے سے شروع ہو گیا تھا۔ حالانکہ عربوں نے یونانی ادبیات کا ترجمہ بالکل نہیں کیا اس لئے کہ انہیں اس کی ضرورت ہی محسوس نہ کی نظم و نثر کا خود انکا ذخیرہ اتنا وافر اور بے پایاں تھا کہ وہ دوسروں کے محتاج نہیں تھے ہاں فلسفہ اور دیگر علوم میں انکے پاس کچھ زیادہ نہیں تھا اس لئے انکا ترجمہ انہوں نے کیا اور یہ منصور سے پہلے یعنی بنی امیہ کے عہد میں ہی شروع ہو گیا تھا۔

صفحہ ۱۰۔ صرف شام کے شہر حیرہ میں قدیم عہد اسلامی تک وثنیت عیسائیت سے غیر متاثر رہی اول تو یہ کہ حیرہ عراق میں واقع ہے شام میں نہیں دوم یہ کہ حیرہ کا عیسائیت سے غیر متاثر ہونا محل بحث ہے عباد کا خاندان جو ملوک حیرہ کا میر منشی اور خاص مصاحب تھا عیسائی تھا اس کے علاوہ نعمان بن منذر اور اس کے بعد قبیصہ جو کسریٰ کی طرف سے وہاں کا والی ہوا عیسائی کہے جاتے ہیں۔

صفحہ ۱۱۔ زرروانی نظام (زروان عربی میں زمانہ کو کہتے ہیں) لفظ زروان عربی کی کسی لغت میں نہیں ملتا معلوم نہیں مصنف نے کہاں سے یہ تحقیق کی ہے حوالہ بھی نہیں ہو یا کہ کچھ پتہ چلتا۔

صفحہ ۱۲۔ سب سے پہلے ضرب الامثال حکیمانہ اقوال خطوط۔ وصیت نامے اور عموماً تاریخ فلسفے کے متعلق کتابیں جمع کی گئیں اور انکا ترجمہ ہوا" یہ صحیح نہیں سب سے پہلے جن چیزوں کا ترجمہ کیا گیا وہ آئین جنگ اور سیر ابطال ہیں یہ تراجم اکثر زبانی قصوں کی صورت میں تھے مگر کچھ کتابیں بھی موجود تھیں اس کے بعد طب کا ترجمہ ہوا کیونکہ یہی زیادہ ضروری چیز سمجھی گئی پھر اور چیزوں کا۔

صفحہ ۱۴۔ کفار کو یقین تھا کہ وہ کتاب مقدس میں زبان کی اغلاط دکھا سکتے ہیں یہ غلط خیال ہے کفار نے قرآن کی زبان یا اس کے محاورے پر کبھی اعتراض نہیں کیا بلکہ اکثر شہادتیں ایسی ملتی ہیں کہ انہوں نے دل سے اس کے معجز نما طرز ادا کا اعتراف کیا۔ اسی سلسلے میں مصنف لکھتا ہے کہ اس [illegible] اشعار اور بدویوں کے روزمرہ سے مثالیں جمع کی گئیں تاکہ قرآنی عبارات کی صحت ثابت کی جائے یہ بھی صحیح نہیں اشعار جاہلیت سے تفاسیر وغیرہ میں جو استشہاد کیا گیا ہے [illegible] قرآن کی

صحت زبان کی دلیل بہم پہنچائی جائے بلکہ مراد یہ ہے کہ کسی لفظ یا محاورے کے معنی اور مفہوم کا تعین کیا جا

صفحہ ۲۰ "کہا جاتا ہے کہ پرانے رومی صوبوں یعنی شام اور عراق میں بہت دن تک زیادہ تر رومی قانون چلتا رہا" یہ دعویٰ بے دلیل ہے اسکا بالکل پتہ نہیں چلتا کہ مسلمانوں کے قبضے کے بعد ان صوبوں میں پرانا قانون باقی رہا ہو۔ بخلاف اس کے مسلمان جہاں جاتے تھے فوراً قرآن اور سنت رسول پر عمل شروع کر دیتے تھے اور حسب ضرورت اجتہاد بھی کرتے تھے۔

صفحہ "ان کی (حدیثوں کی) صحت کے جانچنے کے اصول مدون کئے گئے لیکن ان اصولوں کی ترتیب میں روایات کی خارجی صحت اور سود مندی پر بہ نسبت منطقی استقامت اور تاریخی صحت کے زیادہ زور دیا گیا" یہ صحیح نہیں تاریخی صحت کا تو احادیث کی جانچ میں خاص طور پر لحاظ رکھا گیا ہے۔ اور فن اسماء الرجال کی بنیاد اسی طرح پڑی۔

اس صفحہ پر علم الفقہ سے بحث کرتے ہوئے قیاس کی جو دو صورتیں بیان کی گئی ہیں وہ واضح نہیں ہیں عموماً قیاس کی وہی صورت ہے جسے منطقی قیاس (قیاس العلة) کہتے ہیں یعنی کسی ایک یا چند چیزوں سے علت تلاش کر کے اس کی بنیاد پر حکم عام کیا جائے۔ دوسری صورت قیاس الشبہ، یا تمثیل کی ہے یعنی علت عام نہیں نکالی جاتی بلکہ محض شابہت کی بنا پر حکم لگایا جاتا ہے۔

یہانتک تو خود مصنف کے بعض خیالات کا ذکر کیا گیا ہے لیکن ترجمے اور کتابت کی بھی بعض غلطیاں رہ گئی ہیں جن کی تفصیل یہ ہے۔

صفحہ ۲... "آخر کار ۲۰۱۵ء میں شیعوں کی سلطنت ایران میں قائم ہونے کے بعد سنیوں کی اور ان کی دائمی کشمکش کا خاتمہ ہوا،، صحیح غالباً ۱۵۰۲ء ہے ایک ہندسہ کتابت میں چھوٹ گیا ہے۔

صفحہ "(حکا ترجمہ منصور کے زمانہ میں فرازی نے ہندی علماء کی مدد سے کیا)" غالباً صحیح فزاری ہے۔

صفحہ ۱" برس اعظم کی کتاب الحینہ،، غالباً کتاب الخیر صحیح ہے۔

صفحہ ۱۴ "فیز طبیعات ،، صحیح طبیعیات ہے اسی طرح طبیعی ہ کے بجائے طبعی ہونا چاہیئے۔

صفحہ ۱۴ "دینی تحریم جو محمد صلعم اپنے زمانے میں یہودیوں اور عیسائیوں کی کتب مقدسہ کی کیا
تے مسلمان علما یونانی علمی تصنیف کی کرتے تھے" یہاں لفظ تحریم کے بجائے لفظ احترام ہونا چاہئے
اگر سیاق و سباق کا لحاظ رکھا جائے تو یہ غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ رسول پاک ان کتب مقدسہ کا بچشم احترام
دیکھتے تھے اگر مصنف کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان کی تحریف کرتے تھے۔

صفحہ ۱۵ "لیکن یہ بھی اس کے ساتھ ہے کہ مترادف الفاظ کی کثرت کے سبب سے عربی زبان،
ان علوم کے اصول کی کہ علوم صحیحہ میں مترادف الفاظ کا استعمال جائز نہیں ہے۔ خلاف ورزی کرتی
ہے" مرادف کے بجائے مترادف کا لفظ استعمال کرنا چاہئے تھا اس کے علاوہ سمجھ میں نہیں آتا کہ
علوم صحیحہ میں مترادف الفاظ کے استعمال سے کیا نقص واقع ہو سکتا ہے۔ غالباً مصنف کا مطلب مشترک
الفاظ سے ہے جو متوالی بھی کہلاتے ہیں۔ مترادف الفاظ تو وہ ہیں جو ایک ہی معنی کے لئے مستعمل ہوں
بخلاف اس کے مشترک یا متوالی وہ الفاظ ہیں جو ایک سے زیادہ معانی اپنے اندر رکھتے ہوں ان کا
استعمال البتہ علوم صحیحہ میں التباس کا باعث ہو سکتا ہے لیکن یہ عربی زبان ہی میں کوئی خاص بات نہیں
ہے دوسری زبانوں میں بھی یہ صورت موجود ہے اور سیاق و سباق یا مخصوص ترکیب سے ان کے
معنی کا تعین ہو جاتا ہے۔

صفحہ ۲۴ تفرہ صحیح طغرہ۔ صفحہ ۲۴ سطر ۹

صفحہ ۲۸ ابو العلا المری صحیح المعری۔ صفحہ ۴۹ و ۵۰ "حریری کا بیشتر ذخیرہ ادب سیاح ابوزید
سروقی" صحیح السروجی۔

صفحہ ۵۰ تعلیم الناس علی قدر عقولہم" صحیح کلموا الناس۔

صفحہ ۵۱ ابا لبشر متی صحیح ابو بشر متی بن یونس۔ صفحہ ۵۲ بہکاری صحیح ابہری۔

صفحہ ۵۵ [illegible] صحیح [illegible]۔ صفحہ ۵۶ [illegible] صحیح [illegible] بن علی [illegible] شہر کا نام
ہے جسے انگریزی میں Fez کہتے ہیں۔

صفحہ ۵۸ [illegible] الاٹن [illegible] کے آخر میں [illegible] ہوتا ہے [illegible]

برحوالہ اطلاعت مستقرانہ

صفحہ ۱۲۸ ابن سبین صحیح ابن سبین۔

المحمود | یہ ماہوار رسالہ مدینۃ العلوم دیوبند سے بیادگار شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ زیر سیادت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی مولوی محمد یحییٰ صاحب صدیقی تھانوی کی ادارت میں ماہ گزشتہ سے شائع ہونا شروع ہوا ہے اسکا پہلا نمبر ریویو کے لئے موصول ہوا۔ حجم دو جز لکھائی چھپائی اچھی اور کاغذ اوسط درجہ کا ہے۔ قیمت سالانہ عہ مع محصولڈاک۔ مقام اشاعت کتب خانہ عثمانیہ دیوبند۔ اور مقصد علم۔ دین اور اصلاح ہے۔

دیوبند تقریباً نصف صدی سے جب سے وہاں کا مدرسہ قائم ہوا ہے اچھے اچھے علما و فضلاء کا مرکز رہا ہے اور ہے۔ ایسے علمی مقام سے مسلمانوں کی صحیح دینی رہنمائی کے لئے ایک اچھا رسالہ نکالا جا سکتا تھا۔ مگر ملک کی بدقسمتی سے وہاں سے جو رسالہ نکالا گیا یعنی القاسم اس نے اہل علم کے نزدیک کوئی خاص وقعت نہ پیدا کی۔ اور طالب علمانہ حد سے آگے نہ بڑھ سکا۔

اب اسی مرکز یعنی دیوبند سے یہ دوسرا رسالہ شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ سابق تجربہ کی بنیاد پر اس سے بھی کچھ زیادہ توقعات قائم کرنا مشکل ہے لیکن مولانا شبیر احمد صاحب کی سرپرستی بیشک کچھ امید دلاتی ہے کہ یہ کوئی کام کریگا اور کچھ نفوذ و اثر دلوں میں پیدا کر سکے گا۔ چنانچہ اس پہلے نمبر میں مولانا کا لکھا ہوا ایک مضمون ارہاصات کے عنوان سے اچھا خاصا درج ہوا ہے۔

لیکن مضمون نگاری اور مفید مضمون نگاری جس سے امت اسلامیہ کو صحیح علمی فوائد پہنچیں آسان کام نہیں ہے۔ بلکہ اسمیں بہت تعمق و تفکر کی ضرورت ہے اور کتابوں سے صرف روایات کا درج کر دینا کافی نہیں چنانچہ مضمون مذکورہ بالا میں مولٰنا موصوف نے قریش عرب کی تفضیل پر ایک حدیث کتب سیر سے درج کی ہے کہ بنی نوع انسان کی جبریل نے تقسیم کرتے کرتے قریش کو چن لیا۔ اسمیں سے اللہ تعالیٰ نے مجھکو (نبی صلی اللہ علیہ وسلم) کو پیدا کیا۔

مولانا کا فرض تھا کہ لکھنے سے پہلے وہ اس حدیث کی صحت کو جانچ لیتے۔ اس کے ابتدائی روایت

کو بھی دیکھیے جن سے تمام انسانی برادری یکساں ثابت ہوتی ہے اور قرآن کریم کی تعلیم بھی پیش نظر رکھیے کہ محض نسب دنسل پر کسی قبیلہ یا انسان کے شرف کا مدار رکھا گیا ہے یا تقوے پر جن کتب سیر سے انہوں نے یہ روایت نقل کی ہے انہیں سرور عالم کا وہ خطبہ بھی درج ہے جو حجۃ الوداع میں فرمایا تھا کہ

لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی الناس کلھم من آدم وآدم من التراب	نہ کسی عربی کو عجمی پر فضیلت ہے نہ عجمی کو عربی پر سارے آدمی آدم سے پیدا ہوئے ہیں اور آدم خاک سے۔

در اصل آنحضرت کی بدولت قریش کو شرف حاصل ہوا ہے نہ کہ قریش کی بدولت آنحضرت کو۔ پھر کسی آیت یا روایت سے جبریل کا یہ شیوہ بھی نہیں ثابت ہوتا کہ وہ انسانی اقوام اور قبائل کی جانچ کرکے منتخب قبیلہ کی تعین کریں کہ اس میں سے رسول پیدا کیا جائے۔ الغرض اس روایت میں بہت کچھ تامل کی ضرورت ہے۔

شذرات

آئندہ مہینہ کا جامعہ "آئیس نمبر" کے نام سے خاص اہتمام سے نکالا جائے گا۔ انشاء اللہ قارئین کرام مضامین نظم و نثر کے لحاظ سے اور ظاہری خوبیوں کے لحاظ سے اسے بہت پسند کریں گے۔ حجم ۶ جز کے قریب ہوگا۔ اور چھپائی ٹائپ میں ہوگی تاکہ ٹائپ کی عمدہ چھپائی کا ایک نمونہ نظر کے سامنے ہو اور یہ فیصلہ کرنے میں آسانی ہو کہ رسالہ آئندہ ٹائپ میں چھپے گا یا لیتھو میں۔ بعض مضامین کے ساتھ نقشے وغیرہ بھی ہوں گے جن کا بلاک بنوایا جائیگا۔ ہمارے قارئین کے علاوہ جو حضرات اسے خریدنا چاہیں گے۔ ان کے لئے قیمت ایک روپیہ ہوگی۔

جناب مدیر سچ اپنے ۲۴ ستمبر کے پرچہ میں شکایت کرتے ہیں کہ ہم نے ان کی خیر خواہی کو نکتہ چینی سمجھا اور جواب تعریض کی صورت میں دیا۔ ہم پر منحصر نہیں جامعہ کے اندر اور جامعہ کے باہر اکثر حضرات کا خیال ہے کہ جناب مدیر کے پچھلے مضامین سے جامعہ پر نکتہ چینی اور تعریض ہی نہیں بلکہ اس کی کھلی ہوئی مخالفت ظاہر ہوتی ہے اسی لئے "جواب" کی ضرورت ہوئی اور جواب میں تعریض کا پہلو بھی رہا لیکن چونکہ جناب مدیر فرماتے ہیں کہ آپ جامعہ کے مخالف نہیں اور بعض ذرائع سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ آپ کے مورد عتاب فقط جامعہ کے دو ایک اساتذہ اور طلبہ ہیں اس لئے ہمارے رسالہ کو اس بحث میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ اگر جناب مدیر جامعہ ملیہ کی نسبت وہی خیالات رکھتے ہیں جو آپ نے ۲۴ر کے پرچہ میں ظاہر فرمائے ہیں تو ہمیں باوجود اختلاف خیال کے یہ کہنے میں ذرا تامل نہیں۔

بیا کہ نوبت صبح است و آشتی و صفا
کہ با توئیت مرا جنگ و ماجرا حافظ

جناب مولانا سید سلیمان ندوی مدیر معارف ہمارے دلی شکریہ کے مستحق ہیں کہ آپ نے قوم سے جامعہ کی سفارش کی ہے اور اُس کی مدد کیطرف توجہ دلائی ہے۔ مولانا کو صرف یہ "اندیشہ" ہے کہ جامعہ کے عام طلبہ میں جنہیں عربی اور علوم اسلامی کی محض ابتدائی تعلیم دیجاتی ہے مجتہدی کا شوق نہ پیدا ہو جائے۔ ہم مولانا کو اطمینان دلاتے ہیں کہ اس جہل مرکب کی مثال اگر تلاش کیجائے گی تو جامعہ کے اندر نہیں بلکہ جامعہ کے باہر ملیگی۔ "انگریزی خوانوں کا جو نیا "اب" پچھلے دس سال میں پیدا ہوا ہے جسے مذہبی تعلیم کا شوق ہے مگر اس کے بوجھ اپنے ذہن کا مرکز تعلق قائم نہیں رکھ سکتا بلکہ سطحی معلومات کی بنا پر مذہبی مسائل میں علمائے دین سے کج بحثی کیا کرتا ہے وہ جامعہ میں معدوم ہے۔

اب رہا ہندویت سے متاثر ہونیکا اندیشہ اُس کی اصلی صورت یہ ہے کہ جامعہ کے مخالف جس چیز کو "ہندویت" کہتے ہیں وہ اصل میں "ہندیت" ہے، ملکی آزادی کی خواہش ملکی ہمدردی ملکی لباس کا شوق یہ جامعہ کا طرہ امتیاز ہے مگر "ہندویت" کا اثر جامعہ پر آج کیا اس وقت بھی نہیں تھا جب بادۂ سیاست کے نشے میں مدہوش حضرات ہندوؤں سے اتحاد رکھنے کے زبانی دعوے اس انداز سے کیا کرتے تھے جو سراسر خودداری کے منافی تھا۔ جامعہ والے جس نقطۂ اعتدال پر اُس زمانے میں قائم تھے آج بھی ہیں۔

ہم مولانا سے اس معاملہ میں بالکل متفق ہیں کہ مغرب کا ذہنی استیلا اس کے سیاسی استیلا سے زیادہ مہلک ہے۔ شکر ہے کہ مولانا نے اس فتنہ کے زیر اثر بہیئت مجموعی جامعہ کو نہیں پایا بلکہ جامعہ کے ایک طالبعلم کو جو یورپ میں مقیم ہے ہم مولانا کو یقین دلاتے ہیں اس معاملہ میں جامعہ کے طلبہ جو یورپ میں مقیم ہیں کسی نصیحت کے مستحق ہوں مگر شبہ کے نہیں کیونکہ انکے دل میں اپنے مذہب کی سچی وقعت اور محبت موجود ہے اس لئے باوجود غیر ملک میں رہنے کے وہ انشاءاللہ اپنے رہیں گے۔

ہمیں امید ہے کہ مولانا باوجود اپنے کثیر مشاغل کے کبھی کبھی جامعہ میں تشریف لاکر یہاں کے حالات خود ملاحظہ فرمایا کریں گے۔ مولانا کا دہلی کے قریب کے شہروں میں بعض تعلیمگاہوں میں آنا اور ہمارے یہاں نہ آنا ہمارے لئے سخت شکایت کا باعث ہے۔ مانا کہ مولانا کو دوسروں سے بھی تعلق ہے لیکن جامعہ سے جو رشتہ ہے اُس کی کچھ اور ہی شان ہے۔

آسام میں ایک انجمن علمی تحقیقات خصوصاً تاریخی تحقیقات کے لئے کامروپ انوسندھن سمیتی کے نام سے قائم ہوئی ہے اس کے سکرٹری پروفیسر ک۔ ک۔ بھوین صاحب ایم۔ اے۔ بی۔ ایل ہیں۔ یہ انجمن ۱۹۱۲ء میں بمقام گوہاٹی قائم ہوئی تھی۔ پہلے کامروپ کے ضلع میں پرانی پوتھیاں پتھروں کے کتبے ایسی سندیں اور تو ہیں جن پر عبارت کندہ ہے جمع کرتی رہی اور اب دوسرے ضلعوں میں اسی طرح کی قدیم چیزیں جمع کر رہی ہے۔ یہ تمام چیزیں ایک عارضی عمارت میں رکھ دی گئی ہیں اور کوشش کیجا رہی ہے کہ ایک مستقل کتب خانہ اور عجائب خانہ کی بنیاد پڑ جائے۔

کولمبیا یونیورسٹی کے پروفیسر اڈون۔ ر۔ الف سیلگمان کی زیر نگرانی "علوم اجتماعی" کی ایک معلم تیار ہو رہی ہے۔ اس میں تاریخ اقتصادیات، سیاست مدن، اجتماعیات، علم الانسان، نفسیات، علم الاخلاق، علم حیات، تعلیمات، جمالیات، فلسفہ مذہب اور فلسفہ قانون کے تقریباً اسی لاکھ الفاظ کی تشریح کی جائے گی اور خیال کیا جاتا ہے کہ دس سال میں یہ کام ختم ہو جائیگا۔

اس میں شک نہیں کہ ایک ایسی قاموس کی بہت سخت ضرورت ہے جس میں "علوم اجتماعی" پر جنہیں علوم ذہنی کہنا زیادہ مناسب ہوگا تبصرہ کیا جائے اور ان علوم پر ارباب فکر نے جو خیالات ظاہر کئے ہیں انہیں یکجا کر دیا جائے اس لئے پروفیسر سلگیان کی یہ کوشش لائق تحسین ہے لیکن معاملہ کا یہ پہلو بھی قابل غور ہے کہ علوم ذہنی کے مسائل ایسے قطعی اور معینہ قوانین کے ماتحت نہیں جن پر کل ارباب فکر

مسائل کے بیچیدہ ہیں محض عقل سے تعلق نہیں رکھتیں بلکہ اکثر صورتوں میں ان کا دارومدار جذباتی اور روحانی احساس پر ہے اس لئے انہیں مختلف قومیں اپنی ذہنی خصوصیات اور تاریخی روایات کی بنا پر مختلف طریقوں سے حل کرتی ہیں۔ خود یورپ میں جس کا تمدن ایک لحاظ سے ہم رنگ ہے اس قدر اختلاف خیال ہے کہ کوئی ایک کتاب علوم ذہنی کے مسائل پر جامع اور مانع بحث نہیں کر سکتی اب رہیں ایشیائی قومیں اگر وہ اپنی آزادی فکر اپنے سیاسی حاکموں کے ہاتھ بیچ نہ چکی ہوں تو ایسی کتابیں اُن کے لئے محرک خیال ہونے کی حیثیت سے ضرور قیمت رکھتی ہیں۔ لیکن اُن کی ذہنی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ہرگز کافی نہیں۔ یہ سائنس کا میدان نہیں جس میں دوسروں کی زلہ خواری سے ہمارا کام چل جائے ان مسائل کو اگر حل کرنا ہے تو سوائے اس کے چارہ نہیں کہ ہم خود غور و فکر کی زحمت گوارا کریں۔

علاوہ ازیں یوں بھی قاموس اور معلم صرف ان لوگوں کے لئے مفید ہیں جو انہیں محض وسعت معلومات کے لئے استعمال کرتے ہیں اپنا ہادی اور رہنما نہیں بناتے۔ جو لوگ علم کے راستہ کو تقلید کے سہارے طے کرنا چاہتے ہیں۔ اُن میں یہ کتابیں ذہنی کاہلی اور جمود پیدا کرتی ہیں اور آکی کثرت ترقی کی علامت نہیں بلکہ تنزل کا پیش خیمہ ہے۔

ماڈرن ریویو میں بہ حوالہ رسالہ "بودھ مذہب انگلستان میں" اُس عام جہالت کی ایک عجیب مثال نقل کی گئی ہے جو ایشیا کی بابتہ یورپ میں پائی جاتی ہے۔ لندن میں بودھ مذہب والے ایک جلسہ کرانا چاہتے تھے جس کے لئے انہیں ایک ہال کی تلاش تھی انہوں نے "غیر مقلد عیسائی فرقہ" کی ایک عمارت اس مقصد کے لئے مانگی۔ پادری صاحب نے جو اس عمارت [illegible] تھے دریافت کیا کہ یہ بودھ لوگ عیسائیوں کے کس فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں جب کہا [illegible] [illegible] تو انہوں نے ان کے دینے سے انکار کیا اور [illegible] یا کہ ہم [illegible]

ملک کو اپنے یہاں جلسے نہیں کرنے دیتے۔ اسی طرح لندن کے ایک دوکان میں ایک چینی دیوتا کا بت تھا جس پر لکھا ہے "چین کا لڑائی کا دیوتا بودہ"۔ بودہ کو لڑائی کا دیوتا قرار دینا یہ ستم ظریفی قابل داد ہے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

سے

باہتمام محمد مجیب بی۔ اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر شائع ہوا

تاریخ فلسفۂ اسلام از ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی

ہالینڈ کے مشہور فلسفی اور مستشرق ٹ۔ ج۔ دی بور کی گرانقدر تصنیف کا براہ راست جرمن سے سلیس اردو ترجمہ جو ابھی حال ہی میں شائع ہوئی ہے مگر نہایت تیزی سے نکل رہی ہے۔ قیمت صرف ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۲ ؎

تاریخ الدولتین خلافت بنی امیہ و بنی عباس کے حالات پر دلچسپ تبصرہ از علامہ جارج زیدان مترجمہ مولنا نیاز فتحپوری ۔ ۔ ۔ عہ

تاریخ ہند قدیم قدیم ہندوستان کی تاریخ کا یہ ایک مختصر لیکن نہایت جامع خاکہ ہے اور قابل قدر ولائق مطالعہ از ایم پانیکار (اردو ترجمہ) قیمت ۔ ۔ عہ

تاریخ نجد۔ مولنا اسلم صاحب جیراجپوری کی تازہ تصنیف عہ

قواعد عربی (کتاب الصرف) اردو زبان میں عربی صرف پر نہایت مستند اور مکمل کتاب ہے از علامہ سورتی استاذ جامعہ قیمت ۔ ۔ عار

مبادی معاشیات علم المعیشت (اکنامکس) پر مبتدیوں کے لئے نہایت مفید و مستند کتاب از ایڈورڈ کینن ترجمہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں ایم۔ اے پی ایچ ڈی۔ عہ

دیوان حالی۔ خواجہ مرحوم کا مکمل دیوان۔ مع فوٹو۔ خوبصورت مضبوط جلد۔ عمدہ طباعت سائز ۲۰×۳۰/۱۶ (زیر تیاری) قیمت عہ

انتخاب میر حضرت میر تقی میر کے کلام کا دلکش انتخاب مع حالات و مقدمہ جس میں آپ کی خصوصیات و امتیازات شاعری پر دلچسپ بحث ہے۔ از مولانا نورالرحمن صاحب بی۔ اے (علیگ) خوبصورت و مضبوط جلد عمدہ طباعت عہ

مقدمۂ شعر و شاعری خواجہ حالی مرحوم کے دیوان کا مقدمہ۔ شاعری پر فلسفیانہ و محققانہ بحث اور اردو شاعری کی اصناف پر نہایت دلچسپ و لطیف تبصرہ۔ مع فوٹو عمدہ طباعت خوبصورت جلد (زیر تیاری) قیمت عہ

دنیا کے بسنے والے جغرافیہ بچوں کے لئے نہایت غیر دلچسپ مضمون ہے لیکن اس میں جناب بشیر حسین صاحب زیدی بی۔ اے (کینٹب) بار ایٹ لا ہیڈ ماسٹر مسلم یونیورسٹی اسکول علی گڑھ نے ایسے دلچسپ و دلنشیں انداز میں دنیا اور اس کے باشندوں کے حالات لکھے ہیں کہ شروع کرنے کے بعد بغیر ختم کئے جی نہیں چاہتا چھوٹا سائز تقریباً ۱۰۰ تصاویر نہایت اعلیٰ طباعت بہترین کاغذ دلکش ٹائٹل ۸ر

بدائع سعدی حضرت شیخ سعدی کی غزلیات کا نہایت مستند اور پاکیزہ نسخہ مطبوعہ جرمنی قیمت ۔ ۔ ۔ للعہ

ترکوں کی کہانیاں بچوں کے لئے نہایت اچھی کتاب ہے قیمت ۔ ۔ ۴ر

ہمارے نبی سردار دو جہاں صلعم کی سیرۃ پر بچوں کیلئے اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں۔ قیمت ۸ر رعایتی ۔ ۴ر

یہ اور دوسری عمدہ عمدہ کتابیں ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ دہلی قرولباغ

زیرِ ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری   ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔ اے۔ پی، ایچ۔ ڈی

نمبر ۶	بابتہ ماہ رجب ۱۳۴۶ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۲۷ء	جلد ۹

فہرست مضامین

وائے، برون!

(۲)

'جامعہ' کے جون نمبر میں پروفیسر برون مرحوم کے متعلق جو مضمون شائع ہوا ہے اسمیں یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ مرحوم کی زندگی، علمی خدمات، اور ذاتی خصوصیات پر حتی الامکان پوری طرح روشنی ڈالی جائیگی لیکن وقت کی تنگی کتابوں کی عدم موجودگی اور معلومات کی کمی کیوجہ سے، مرحوم کی زندگی کا خاکہ تک مکمل نہو سکا اور اسکا ایک حصہ تو ایسا دھندلا پڑگیا کہ اس میں چند نقطوں کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا، لہذا اس نمبر میں کوشش کیجاتی ہے کہ اسی نقطہ سے دوبارہ صاف اور نمایاں خطوط کھینچے جائیں جہاں سے پہلے حصہ میں دھندلا پن شروع ہوا تھا۔

۱۸۸۷ء میں جب برون، پمبروک کالج کے فیلو منتخب کئے جانیکے بعد فارس گئے اور وہاں کے مختلف شہروں کی سیاحت، مختلف طبقے، مذاق، اور مذہب کے لوگوں سے ملنے نے اُنکے حالات زندگی خیالات دماغی، اور ذہنیت کے غائر مطالعہ میں مشغول تھے تو یکایک، قیام کرمان کے زمانہ میں، ۱۱ر جولائی کو انکو ایک تار ملا اسمیں کیمبرج یونیورسٹی میں فارسی کے لکچرار مقرر کئے جانیکی اطلاع دی گئی تھی۔ اگست میں دوسرا تار ملا جس میں انکو حکم دیا گیا تھا کہ ابتداء اکتوبر میں کیمبرج پہونچ جائیں۔ اس تار نے اگر ایک طرف انکی آئندہ زندگی کی نوعیت کی تعین و تخصیص کر دی تو دوسری طرف موجودہ سفر کے آئندہ حصہ کے متعلق انکے خیالات کی جڑ کاٹ دی۔ انکا خیال تھا کہ بندر عباس خلیج فارس، بغداد اور ایکر (شام کا ایک شہر جہاں بہائی فرقہ کے شیخ مرزا علی حسین بہاء اللہ محبوس تھے) سے ہوتے ہوئے انگلستان واپس جائیں، لیکن اس تار کے بعد نہ اسکا موقع باقی رہا، نہ وقت مجبور ہو کر انہوں نے اپنے خیالات بدل دئے اور ۲۷ر ستمبر کو بادل ناخواستہ

سرزمین فارس کو خیرباد کہا۔

اس سفر نے برون کے خیالات میں زبردست تغیر پیدا کیا۔ ایرانیوں کے اخلاق و انداز نے برون کے دل سے ترکوں کی محبت نکال پھینکی، اور خود فارس پر ایسا مستحکم قبضہ جمایا کہ وہ مرتے دم تک انکے دلدادہ رہے اس سفر میں انکو بہتیری تکلیفیں ہوئیں، لیکن علم کا شوق دیکھو تو اپنے سفرنامہ میں لکھتے ہیں کہ جو فوائد حاصل ہوئے اُنکے مقابلہ میں اس سے بہت زیادہ تکلیفیں بھی قابل خیال نہیں۔

اکتوبر ۱۸۸۸ء میں برون کیمبرج گئے، اس دفعہ کسی بزرگ کے کہنے سننے سے کیمبرج نہ گئے تھے اب یہ کیمبرج یونیورسٹی اور پیمبروک کالج کے اندر گریجویٹ نہ تھے، اپنے ذاتی رجحان کے خلاف صرف "حکم حاکم" کے سبب سے کسی شعبے میں انکو اپنے عزیز وقت کا کثیر حصہ صرف کرنیکی ضرورت نہ تھی، اپنے چہیتے مضامین عربی و فارسی کی تحصیل کے لئے طلبہ کی خوشامد، گھنٹوں شکایت سننے، اور "تاروں کی ٹن ٹن" سننے کی حاجت نہ تھی، اب یہ کیمبرج یونیورسٹی کے لکچرر اور پیمبروک کالج کے فیلو تھے، اپنے وقت کے خود مختار مالک تھے، اپنے افعال و اعمال میں بالکل آزاد تھے، فارسی عربی ترکی زبانوں کے ماہر تھے، اور اہل فارس کے متعلق ایک مستند فاضل کی حیثیت رکھتے تھے۔

کیمبرج کے علمی فضاء میں، برون کی ماسبق زندگی، انکے علوم مشرقیہ کے ذوق و شوق، اور آخری حلاف امید امداد غیبی نے انکی ابتدائی دلشکن اور مایوس کن ناکامیوں کا مہیب دیو، مقید و پابہ زنجیر انکے سامنے پیش کیا، قضا و قدر کا حامل انکا پیشوا تھا، اور علوم مشرقیہ کی دیوی اپنے ساتھ لایا تھا اس نے آگے بڑھ کر برون سے کہا، برون! تیری ہمت و عزیمت، استقلال و پامردی محنت و فداکاری نے فتح پائی تیری ناکامیوں اور نامرادیوں کے مہیب دیو شکست کھا کر قید ہوئے، تیری دلی محبوبہ علوم مشرقیہ کی دیوی تیرے سامنے ہے تو اسے اپنے آغوش میں لے اس دلکش سادہ صورت موہنی مورت کے دلربا چہرے سے جہل و لاعلمی کا ایک پردہ اٹھا اپنی علمی و دستکاری سے کام لے، اور تحقیق و تنقید کے مرصع زیوروں سے اسے آراستہ کر یہ کسی خاص قوم و ملک کی ملک نہیں ان عربوں اور فارسیوں نے کچھ مدت ہوئی اس پر جلا دیا، اسے بہترین لباس پہنائے، اس کے لئے بڑی بڑی قربانیاں کیں لیکن جب ان لوگوں کی خصلتیں بدل گئیں،

فرقہ بندیوں، خانہ جنگیوں اور خون خرابوں نے مجھے صدمہ پہنچایا تو میں نے اپنی سب سے پیاری شے یعنی علم کی دیوی اُن سے چھین لی، اور کچھ دنوں تک اسے ایسا چھپا رکھا، کہ دنیا اسے گویا بھول گئی۔ یورپ والوں کے ذہن میں اس کے کچھ نقش و نگار باقی رہ گئے تھے انہیں نقش و نگار کے مطابق ان لوگوں نے میری ہی مدد سے ایک نئی مورت بنا ڈالی۔

دنیا آج اس پر فریفتہ ہو رہی ہے۔ اس کی جدت طرازی عشوہ و کرشمہ سازی، اور دلکشی پر مشرق و مغرب جان و دل سے قربان ہو رہے ہیں، اس نئی دیوی کو بھی تو نے اچھی طرح دیکھا ہے ایک مدت تک اس کی پوجا کی ہے لیکن تجھے اسکی صورت نہ بھائی، کیونکہ اسمیں انسانیت کے عنصر کی ایک بہت کمی ہے تو قدیم ہی دیوی کا دلدادہ رہ۔ اب وہ تیرے قبضہ میں ہے۔ اس نعمت غیر مترقبہ کی قدر کر، اسکی خدمت میں اپنی پوری زندگی صرف کر۔

نوجوان برون نے حال قضا و قدر کا فرمان گوش دل سے سنا اس کے سامنے سر تسلیم خم کیا اس کی دعوت کو لبیک کہا، اپنی آئندہ زندگی اسی دیوی کی خدمت کے لئے وقف کر دی، اپنی دولت اپنا آرام و آسایش، اپنا وقت بلکہ اپنی زندگی تک اس پر نثار کر دی۔

تعمیل فرمان کے خیال سے برون ۱۰ر فروری ۱۸۸۹ء کو رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے ممبر ہو گئے ۱۵ر اپریل کو انہوں نے سوسائٹی کے جلسہ میں فرقہ بابیہ" کی تاریخ پر ایک مضمون پڑھا۔ اسی مضمون کا دوسرا حصہ انہوں نے ۱۲ر جون کے جلسہ میں پڑھا۔ گرچہ یہ برون کا پہلا علمی کارنامہ تھا لیکن اس کی ہمہ گیری، جدت، جچہ انداز، تنقیدی اور دلچسپ طرز ادا نے مستشرقین کی دنیا میں برون کی قابلیت کا لوہا منوا دیا۔ اس زمانہ سے ۱۹۲۵ء تک علی سبیل التسلسل علوم مشرقیہ اور خاصکر علوم فارسیہ کی خدمت میں مشغول رہے دنیا میں زبردست تغیرات ہوئے۔ عالمگیر جنگ ہوئی بڑی بڑی سلطنتوں کے تخت الٹ گئے اس عدم آباد ہستی نے کئی کروٹیں لیں، خود برون کی زندگی میں اہم تغیرات ہوئے خود شادی کی (انکی بیوی ایلس کیرولائن بلیکبرن مشہور مورخ آف اے۔ بلیکبرن کی صاحبزادی تھیں۔ برون نے [illegible] میں ان سے شادی کی) باپ کا انتقال ہوا (۱۹۱۷ء) مختلف قسم کا بار انکی ذات پر پڑا، لیکن علمی خدمت کے متعلق انکے

مرحوم کے استقلال میں ذرا لغزش تک نہوئی، ہاں فارس کی سیاسی حالت کے تغیرات کے ساتھ ساتھ انکے علمی دلچسپی کا موضوع بھی بدلتا رہا۔ لیکن جو دل فارس کو دیچکے تھے وہ اسی کے قبضہ میں رہا۔ ۱۹۲۵ء کے وسط میں بھی جب یہ مرض الموت میں مبتلا بستر مرگ پر پڑے ہوے تھے تو انہوں نے مثنوی جلال الدین رومی کی ایک حکایت پر فاضلانہ مضمون لکھا، جو اسلامیکا[1] میں شائع ہوگیا ہے۔ جہانتک مجھے علم ہے برون کا یہ آخری مضمون تھا۔

۱۸۸۵ء سے ۱۹۲۶ء تک گذشتہ اوّل و آخر مضامین کے درمیان، برون نے تصنیفات، تالیفات، متن کتب فارسیہ، مضامین وغیرہ کے دریا بہادئے انمیں سے اہم تصنیفات کی معمولی فہرست پروفیسر بانگرنے در اسلام[2] میں مرزا محمد قزوینی نے، ایران شہر[3] میں اور مسٹر طاہر نے معارف[4] میں، برون کی زندگی پر معمولی تبصرہ کرتے ہوے شائع کردی ہے لیکن ان سبھوں میں ایک بھی مکمل نہیں، ان سب سے زیادہ مکمل تو وہ فہرست ہے جو مرحوم نے خود شائع کی تھی، پروفیسر نکلسن جو برون کی غیر شائع شدہ فہرست کتب ذاتی، کے تصحیح و ترتیب میں مشغول ہیں اس کے تمہید و تبصرہ میں مرحوم کی تصانیف کی فہرست بھی شائع کرنیوالے ہیں[4] ممکن ہے کہ یہ مکمل ہو لیکن متفرق مضامین کے لئے تو رسائل کی جلدوں ہی کی ورق گردانی پڑے گی۔ مرحوم کے مضامین اگر کل نہیں تو تقریباً کل روائل ایشیاٹک سوسائٹی کے رسالوں میں شائع ہوئے ہیں۔ میں نے انکی تصفح کی ہے، اور لکھنؤ میں جہانتک دوسرے یورپی رسائل مل سکتے ہیں انکی ورق گردانی میں بھی کوتاہی نہیں کی۔ ممکن ہی نہیں بلکہ یہ بات یقینی ہے کہ اس تصفح و تجسس کے باوجود بہتیرے مضامین پر نظر نہ پڑی ہو۔ بہرحال اس تبصرہ کو مکمل بنانیکی پوری کوشش کی گئی ہے،

---

(۱) جلد ۲ - فلک ۱

(۲) مئی ۱۹۲۷

(۳) اپریل ۱۹۲۶ء [illegible]

(۴) مئی ۱۹۲۶ء

براؤن کی تصانیف و مضامین جہانتک میری نظر سے گذری ہیں، انہیں حسب ذیل اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے :-

(۱) تصانیف و مضامین متعلق فرق اسلامیہ۔

(۲) متن و تراجم کتب قدیمہ۔

(۳) رسائل سیاسیہ۔

(۴) تاریخ ادبیات و مضامین متعلقہ۔

(۵) فہرست کتب۔

(۶) متفرقات۔

(۱)

جہانتک مجھے علم ہے، براؤن نے فرق اسلامیہ میں سے صرف دو فرقوں کے متعلق قلم اٹھایا ہے (الف) فرقہ بابیہ (ب) فرقہ حروفیہ۔ فرقہ اسماعیلیہ کے خیالات، و تواریخ سے بھی انکو ابتدا ہی سے دلچسپی تھی لیکن اس فرقہ کے متعلق انہوں نے نہ کوئی کتاب لکھی نہ کوئی مضمون شائع کیا، ہاں اس فرقہ کے ایک اہم داعی، حکیم ناصر خسرو کے متعلق انہوں نے بہت کچھ لکھا ہے، اور اس کی متعدد کتابیں اپنے ذاتی خرچ سے شائع کرائی ہیں۔ انکے متعلق آئندہ تبصرہ کیا جائیگا۔ اس نمبر میں صرف فرقہ بابیہ کے عقائد و تواریخ مختصراً بیان کئے جائیں گے اور انکے متعلق براؤن کی تصنیفات پر بحث کیجائیگی۔

(الف)

فرقہ بابیہ

گرچہ بابی فرقہ اور اس کے عقائد کے متعلق اردو زبان میں اچھا خاصہ ذخیرہ موجود ہے لیکن ایک تو عام طور پر لوگ اس سے ناواقف ہیں دوسرے یہ سارا ذخیرہ یا تو خود بابی داعیوں کی دعوت و تبلیغ

---

(۵) یہ فہرست اب شائع ہوگئی ہے۔ (دیکھو (A Persian Anthology) لیکن ابتک میری نظر سے نہیں گزری۔

کے سلسلہ میں جمع ہوگیا ہے، یا اُس کے مخالفین کے قوت تردید اور زورِ تحریر کا نتیجہ ہے۔ اس فرقہ کے متعلق کوئی غیر جانبدارانہ منصفانہ تحریر، میرے علم میں، اردو زبان میں موجود نہیں لہٰذا میں پہلے اس فرقہ کی تاریخ علی سبیل الاختصار بیان کرتا ہوں[1]۔

گرچہ بابی فرقہ کے اولین راہنما مرزا محمد علی محمد باب، تھے لیکن اگر ان سے کچھ قبل زمانہ کے ہیرالڈ اور ایرانی علماء کے خیالات کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کے جراثیم ایران کی فضا میں پہلے سے موجود تھے۔ باب نے اپنے آخری دعوے مہدیت، دنبوت وغیرہ سے ان مردہ جراثیم میں روح پھونک دی، اور باب اور اُنکے متبعین کی علماء، مجتہدین نے جو زبردست مخالفت کی اور حکومت نے اس پر جبر ظلم انتہا کو پہنچا دی تو اس فرقہ کے صبر علی الظلم شکر علی الجبر، حق پرستی، ایثار نفسی اور جہاد فی سبیل اللہ کی شہرت تقریباً تمام عالم میں پھیل گئی

لیکن یہ ابتدائی جراثیم کیا تھے، اور کہاں تھے؟

اُٹھارہویں صدی کے آخر میں شیخ احمد احسی[2] ایک آزاد خیال ایرانی فاضل طلبہ کو پڑھایا کرتے تھے۔ انہوں نے بہتیرے قدیم متکلمین، اور ہندوستان کے گذشتہ اور موجودہ صدی کے آزاد خیالوں کی طرح عقل ونقل مذہب وفلسفہ، احکام اسلامی اور اقتضاء عقلی میں تطبیق کی کوشش کی، انکا خیال تھا کہ کل علوم وفنون قرآن مجید میں موجود ہیں اور اسکے اصلی باطنی مفہوم کے سمجھنے کے لئے کل علوم کا جاننا ضروری ہے۔ ائمہ علیہم السلام کے متعلق اُنکو حد سے زیادہ غلو تھا۔ اُنکو مظہر اللہ اُس کے صفات میں شریک اور خالق سمجھتے تھے اُنکا عقیدہ تھا کہ ایاک نعبد وایاک نستعین پڑھتے ہوئے حضرت امام جعفر صادق کا تصور کرنا چاہیے۔ اسی غلو کے ساتھ ساتھ اُنکو اس بات کا بھی یقین تھا کہ امام غائب علیہ السلام کے

(۱) یہ کل معلومات زیادہ تر خود برون کی تصنیفات سے ماخوذ ہیں بعض امور کے متعلق خود بابیوں کے تصانیف سے بھی مدد لی گئی ہے۔

(۲) شیخ احمد احسی کے حالات زندگی، اُنکے خیالات اور تصانیف کے متعلق ایم اے نکولاس نے بہتر مضمون لکھا ہے (Essai sur Cheikhisme) لکھا ہے۔ یہ رسالہ پیرس سے ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا ہے۔ لیکن میری نظر سے نہیں گزرا

[illegible]

ساتھ انکو ایک خاص تعلق ہے انہیں یہ اکثر خواب میں دیکھتے ہیں اور اسی حالت میں انکے پاس خاص احکام و ہدایات آیا کرتے ہیں۔ ظاہری جسم انسانی کو فانی، اور نا قابل جزا و سزا [illegible] تھے۔ معراج کے متعلق بھی انکا خیال تھا کہ حضرت نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے جسم ظاہری کو اس سے کچھ تعلق نہ تھا لیکن ایک غیر فانی جسم کے قائل تھے، جسے جسم ہورکلیہ کہا کرتے تھے، اسی کو قابل جزا و سزا ماتے تھے۔

ان خیالات کی وجہ سے شیخ احمد احسائی پر عام راسخ الاعتقاد علماء نے کفر والحاد کا فتویٰ دیدیا اور ایک حد تک انکی مخالفت کی لیکن علم و فضل کیوجہ سے انکی وقعت کیجاتی تھی، چنانچہ محمد شاہ قاچار، خود انکا قدردان تھا۔ انکے متبعین کی تعداد بھی گرچہ بہت بڑی نہ تھی لیکن پھر بھی اچھی خاصی تھی۔ یہ لوگ شیخی کہلاتے تھے۔

جب شیخ احمد احسائی کا انتقال ہو گیا تو انکے شاگرد حاجی سید کاظم انکے جانشین، اور فرقہ شیخیہ کے مقتدائے مقرر ہوئے۔ یہ بھی کربلا میں درس دیا کرتے تھے اور اپنے استاد کے خیالات کی تلقین کیا کرتے تھے۔ ائمہ کے متعلق بھی اکثر تذکرہ کیا کرتے تھے اور انیں خاصکر امام غائب کے آمد آمد کی اکثر خبر دیا کرتے تھے۔

اسی زمانہ میں شیراز کے ایک معمولی تاجر سید محمد مرزا کا انتقال ہو گیا۔ یہ تاجر کون تھا؟ یہ مرزا علی محمد کے، جو کچھ دنوں کے بعد باب کے لقب سے مشہور ہوئے اور بابی فرقہ کے بانی ہوئے، والد ماجد تھے۔ مرزا علی محمد اس زمانہ میں کمسن تھے۔ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا تو آبائی پیشہ کے متعلق پھرتے پھراتے کربلا پہنچے۔ یہاں حاجی سید کاظم کے حلقہ درس میں شریک ہونے لگے۔ طبیعت پیدائشی اور فطری طور پر گیان و دھیان اور مذہبی تخیل کیطرف مائل تھی۔ سو یہ بچارا انکے خمیر میں داخل تھا۔ انکے طریقے اور انداز اسی وقت سے دنیا سے نرالے تھے۔ حاجی سید کاظم کے لکچروں نے انکے خیالات میں ایک ہیجان پیدا کر دیا۔ انہوں نے اپنے قوت متخیلہ سے اور بھی زیادہ کام لیا اپنے خیالات میں غلطاں و پیچاں [illegible] بیت اللہ کے لئے چلے گئے۔ واپس آئے تو بھی اسی ادھیڑبن میں تھے [illegible] میں انہوں نے اپنے

خیالات کا اعلان کیا۔ اور اپنی پہلی کتاب زیارت نامہ شائع کی۔ اس سے انکے ابتدائی خیالات کا تھوڑی حد تک پتہ چلتا ہے۔

"زیارت نامہ عربی زبان میں ہے۔ اسکی عربی نہایت معمولی ہے بلکہ اس میں نحوی صرفی غلطیاں تک پائی جاتی ہیں طرز تحریر بھی کچھ اچھا نہیں۔ خیالات کے اعتبار سے صرف شیخ احمد احسائی کا غلو فی الائمہ ان کی اس کتاب میں جھلکتا دکھائی دیتا ہے، ائمہ کو شفیع مذنبین، اور رضا کا اوتار مانا ہے۔ امام غائب کیساتھ خاص تعلقات کا اظہار کیا ہے اور ان سے احکام و ہدایات پانیکی خبر دی ہے۔ باب کے خاص خیالات دعوے مہدیت وغیرہ کا اسمیں کوئی اثر نہیں پایا جاتا ہے۔

باب کے ذاتی خیالات انکی مابعد کی کتابوں تفسیر سورہ یوسف، ایقان، بیان (فارسی) اور بیان عربی(۱) میں پائے جاتے ہیں۔ ان کتابوں میں انہوں نے پہلے تو مہدیت کا دعویٰ کیا۔ اسکے بعد نبوت اختیار کی، دیگر انبیاء کے آنیکی خبر دی، انبیاء کو وجود ازلی حقیقی کا مظہر قرار دیا، بابی مذہبی سلطنت کا تقریباً مکمل قانون شائع کیا۔ کل علوم و فنون کی ترقی ضروری ظاہر کی، فضول اور بیکار علوم کے (جس میں فقہ منطق مردہ زبانیں داخل ہیں) پڑھنے پڑھانیکی ممانعت کی، عورتوں کی آزادی کی طرفداری کی جس میں انسداد پردہ بھی داخل ہے، قمری مہینوں کی جگہ شمسی مہینے داخل کئے، نماز جماعت بالکل موقوف کر دی صرف جنازہ کی جماعت کے ساتھ ضروری قرار دی۔ کرسیوں کا استعمال فرش سے بہتر قرار دیا۔

باب کے قتل کے بعد مرزا یحییٰ صبح ازل انکے جانشین منتخب کئے گئے۔ کچھ دنوں تک تو یہ لوگ بغداد میں محبوس رہے، پھر قسطنطنیہ بھیجدئے گئے، وہاں سے ایڈریانوپل بھیجے گئے۔ ایڈریانوپل میں مرزا یحییٰ کے سوتیلے بھائی مرزا حسین علی بہاء اللہ نے جو صبح ازل کے زمانہ خلافت میں بابی تحریک کے متعلق کل کام کیا کرتے تھے، یہ دعوے کیا کہ جس شخصیت کے آنیکی خبر باب نے دی تھی وہ یہ خود ہیں اور جناب [illegible] منتخب کیا۔ اس دعوے کا نتیجہ ہوا کہ بابیوں میں زبردست اختلافات ہوگئے۔ [illegible] بہائی اور ازلی پیدا ہوگئے اور انکے آپس میں سر پھٹول شروع ہوگئی۔ اسکے بعد بہاء اللہ ایڈریانوپل سے

---

(۱) بیان عربی کا فرانسیسی ترجمہ اے۔ ایل۔ ایم۔ نکولاس نے [illegible] میں پیرس سے شائع کیا ہے۔

شام بھیج دئے گئے۔ وہیں حالت قید میں انکا انتقال ہوگیا۔ انکے بعد انکے بیٹے عبدالبہا انکے جانشین مقرر ہوئے۔ یہ بھی ۱۹۰۸ء تک شام میں محبوس رہے ۱۹۰۸ء میں انکو آزادی مل گئی اور مختلف ملکوں میں اپنے والد بزرگوار کے مذہب کی تبلیغ کے لئے پھرنے لگے۔

مرزا بہاءاللہ زبردست قابلیت کے آدمی تھے۔ انہوں نے جو کتابیں لکھی ہیں انکی تعداد بھی خاصی ہے۔ ان کتابوں سے انکا فضل و کمال اور قوت تحریر پوری طرح ظاہر ہوتی ہے انہوں نے باب کے احکام میں بہت کچھ ترمیمیں کیں اور انکو بہت کچھ ترقی بھی دی انہوں نے اپنی کتاب لوح اقدس میں اپنے مذہب کے احکام جمع کر دئے ہیں۔ باب کے احکام میں جو اہم ترمیمیں انہوں نے کیں وہ حسب ذیل ہیں صلوٰۃ خمسہ کی جگہ صرف تین وقت کی نمازیں فرض کیں، ہر ایک وقت کی نماز میں صرف تین رکوع رکھے۔ سفر کی حالت میں یہ بھی ضروری نہیں بلکہ صرف سبحان اللہ کہدینا کافی ہے، اہم ترین عیدین صرف دو رکھیں اس میں بھی ایک پارسیوں کی نوروز کو لے لیا۔ روزے صرف انیس دن کے فرض رکھے کیونکہ پارسیوں کا مہینہ انیس دن کا ہوتا ہے۔ اسلامی قانونی وراثت کو بالکل بدلدیا طلب خیرات بزرگوں کی دست بوسی نفس کشی، رہبانیت، انسان کے خیالات کیوجہ سے اس کی نجاست کو حرام و ناجائز قرار دیا حج بیت کا ذکر تو کیا ہے لیکن ایرانی بابیوں کے خیالات کے مطابق اس سے باب کا مکان مقصود ہے، میلاد صرف ”باب“ اور ”بہار“ کا ہونا چاہئے اس کے علاوہ بیسیوں اور باتیں ہیں جن کے متعلق لوح اقدس میں احکام موجود ہیں۔

بہا نے اپنے مذہب کی تبلیغ و اشاعت کے خیال سے نپولین ثالث ملکہ وکٹوریا قیصر ولیم شاہ جرمنی پوپ وغیرہ کو خطوط لکھے اور ان سبھوں کو اپنے مذہب کیطرف دعوت دی۔

یہ تو بابی مذہب و عقائد کے تدریجی تکمیل و ترقی کی حکایت تھی لیکن اس کے اشاعت و تبلیغ کیونکر ہوئی۔ اور اسمیں بابیوں کو کیا کیا دقتیں پیش آئیں۔ انکو کن مصیبتوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اسکے لئے کتنی کیسی قربانیاں کرنی پڑیں، ان لوگوں نے اس کے لیے کیسے ایثار سے کام لیا، بابی ادبیات کے متعلق بہائی کی خدمات کا اندازہ کرنیکے لئے اس مذہب کے تبلیغ و اشاعت کی تاریخ کا علم بھی ایک حد تک ضروری ہے۔

جس زمانہ میں باب نے اپنے خیالات کا اعلان کیا قریب قریب اُسی زمانہ میں حاجی سید کاظم شیخیوں کے مقتدیٰ کا انتقال ہوا تھا۔ اور انکے جانشین کے انتخاب کا مسئلہ پیش تھا۔ باب کا نام بھی اس سلسلہ میں پیش ہوا اور شیخیوں کی اچھی خاصی تعداد باب کے حلقہ اثر میں آگئی۔ ان لوگوں نے غایت جوش و خروش کے ساتھ باب کے خیالات کی تبلیغ شروع کی نتیجہ یہ ہوا کہ دو سال کے اندر اس جماعت کی تعداد بہت کچھ ترقی کر گئی۔ ایکطرف بابیوں کی اس زبردست ترقی اور باب کے خیالات کے عروج اور روز افزوں دعاوے نے مستقل مزاج قدیم الخیال علماء کے دماغ میں ایسا ہیجان پیدا کیا کہ یہ لوگ کفر و الحاد کے فتووں اور مناظرہ و مجادلہ پر قناعت نہ کر سکے، بلکہ قدیم اسلامی احکام کے استحفاظ کے خیال سے حکومت کے اثر سے کام لینے لگے۔ اسلامی سلطنتوں میں حکومت پر علماء کا جو اثر ہے اُسے کون نہیں جانتا؟ ۱۸۴۵ء کے آخر سے ان لوگوں نے اپنے اثر سے کام لینا شروع کر دیا اور بابیوں کے خلاف زبان و قلم کے ساتھ توپ و تفنگ تک استعمال کئے جانے لگے۔ پہلے تو بابی خیالات کی تبلیغ کی، حکومت کی طرف سے ممانعت کی گئی اس فرقہ کے اہم اراکین کی زد و کوب کی گئی، اور بعض شہر بدر کر دئے گئے، لیکن جب یہ بھی بیکار ثابت ہوا تو ۱۸۴۷ء میں مرزا علی محمد قید کر لئے گئے یہ کچھ ہی دنوں قید میں رہے تھے کہ ایران میں طاعون کی وبا پھیل گئی اس وبا کی گڑبڑ میں یہ حضرت کسی طرح قید سے نکل بھاگے، اور منوچہر خاں عامل اصفہان کے زیر حکومت مقیم رہے۔ ۱۸۴۸ء میں منوچہر خاں کا انتقال ہو گیا۔ انکے جانشین نے حکومت پر اپنا اثر بڑھانے کے خیال سے مرزا علی محمد کو فوج کی حراست میں محمد شاہ کے پاس طہران بھیجدیا۔ بابیوں کی سرکشی، باب کے واسطے سرفروشی اور عام بغاوت کا حکومت کو اتنا خوف تھا کہ پایہ تخت میں مرزا علی محمد باب کا رہنا مناسب نہ سمجھا گیا اور یہ پایہ تخت سے باہر ماکو میں بھیجا رکھے گئے

۱۸۴۸ء میں محمد شاہ کے انتقال کے بعد ایرانی حکومت کی فضا میں جو عام ضعف و افسردگی چھائی، ملک میں بابیوں کے جوش و خروش اور قدیم الخیال علماء کے زہد و جمود میں ایسا تصادم ہوا کہ تمام ایران میں زلزلہ پڑ گیا۔ زنجان، مازندران، تبریز وغیرہ میں زبردست فسادات ہوئیں، اور انہیں باغیوں کو انکے فرو کرنے میں ہزاروں جانیں قربان کی گئیں، اگر ایک طرف حکومت کے توپ و تفنگ تھے تو دوسری

جانب بابیوں کا جوش و غضب شدت اور زیادہ بڑھ گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بابیوں نے بھی بزور
فوج بناکر ان پر حملے کئے اور مازندران کے چھ سو بابیوں کے مقابلہ میں ایرانی حکومت کی بارہ ہزار
فوج کے قدم اکھڑ گئے۔ بلا آخر یہ فسادات بدقت فرو ہوئیں اور ۱۸۵۰ء میں مرزا علی محمد باب قتل کر دیئے گئے
اس قتل سے بابیوں کا جوش بجائے فرو ہونے کے اور بھی بڑھ گیا۔ مختلف شہروں میں لڑائیاں ہوئیں جن میں ہزاروں
بابی سخت خوفناک ایذاؤں کے ساتھ قتل کر دئیے گئے۔ کسی کو منہ میں لکڑیوں سے کیچڑ ٹھونس ٹھونس
کر مار ڈالا گیا۔ کسی کو بدن میں زخم کرکے انمیں موم کی بتیاں جلا کر تمام شہر میں گشت کرایا گیا یہانتک کہ بتیوں کی
جگہ اسکے بدن کی چربی گھل گھل کر جلنے لگی اور آخر اس کی جان نکل گئی۔ کسی کو تلووں کی کھال اُدھیڑ کر
انہیں گھوڑوں کی نالیں جڑنے اور انپر کھولتا ہوا تیل ڈالنے کے بعد جلتے ہوئے شاہراہوں پر دوڑانے کا
حکم دیا گیا۔ بہتیروں کی جلتے ہوئے میخوں دہکتے ہوئے اینٹوں اور سرخ انگاروں سے داغ داغ کر جان لیگئی
بیسیوں کو عورتوں اور بچوں کے ساتھ گڑھوں میں ڈالکر آگ لگا دی گئی۔

اس ظلم و تشدد پر بھی بابیوں کے عزم و استقلال میں لغزش تک نہ آئی اور اُن کی تعداد و انکی قوت
تبلیغ چھپے چھپے بڑھتی ہی گئی بلکہ انمیں سے اگر کوئی شخص پکڑا جاتا تو خوش ہوتا اور ہنستا۔ جب حاجی سلیمان
خاں کے بدن میں موم بتیاں جلا کر شہر کا گشت کرایا جا رہا تھا تو وہ ہنستا تھا ناچتا تھا اور یہ شعر پڑھتا تھا

یک دست جام بادہ و یک دست زلف یار   رقصے چنیں میانۂ میدانم آرزوست

اس قسم کے بیسیوں چشم دید واقعات یورپین مصنفین نے بیان کئے ہیں۔ ان خوفناک مظالم کا اگر کوئی نمایاں
اثر ہوا تو صرف یہ کہ عام لوگوں کے دلوں میں بابیوں کے خلوص و رسوخ اعتقاد اور انکے جانبازی و دلیری
اور شوق شہادت کی وقعت و عظمت جم گئی۔ بعض بابیوں کے دماغ میں انتقام کا خیال بھی پیدا ہوا چنانچہ
ایک بابی نے ۱۸۵۲ء میں ناصر الدین شاہ قاچار کے قتل کے خیال سے انپر حملہ کیا۔ اس حملہ سے ناصر الدین شاہ
کی جان تو نہ گئی لیکن اس کی بدولت بیسیوں بابی مہیب مظالم کے ساتھ قتل کر دئیے گئے اور جو بچ
گئے تھے انکو ایران کی سرحد سے نکال دیا گیا۔ ان لوگوں میں سے اکثر نے اپنے امام مرزا یحییٰ صبح ازل
کے ساتھ بغداد میں ترکی حکومت کی قید میں بسر اختیار کیا۔

[illegible] پروفیسر براؤن باب کے قتل و غارت کے کئی برس بعد انگلستان میں پیدا ہوئے ایک
فرانسیسی مستشرق موسیو کونت گوبینو تھے جو اُس زمانہ میں حکومت فرانس کے نمائندے تھے طہران
نے اپنی مشہور آفاق کتاب "مذاہب و فلسفہ در ایشیائے وسطیٰ" Les Religions et
Philosophies dans l'Asie Centrale Paris کے تقریباً ۱۰۰ صفحات میں بابی مذہب اسکی
تعلیم و تبلیغ، تاریخ، حکومت ایران کے روح فرسا مظالم، بابیوں کے استقلال و عزیمت، جوش و
بے پناہ خلوص و رسوخ اعتقاد وغیرہ کو نہایت دلچسپ اور پُراثر پیرایہ میں بیان کیا ہے اور تمام واقعات
کی گویا زندہ تصویر کھینچ دی ہے۔ براؤن نے اپنے زمانہ طالب علمی ہی میں تصوف کے شوق کی وجہ سے
[illegible] کے قریب اس کتاب کو دیکھا اور بابیوں کے متعلق جو کچھ گوبینو نے لکھا تھا، اُسے پڑھکر بہت متاثر
ہوئے (۱) خیال ہوا کہ اس فرقہ کے متعلق کچھ اور معلومات حاصل کئے جائیں لیکن اسکی کوئی صورت
نہ تھی اُس وقت بابیوں کے متعلق کسی یورپین زبان میں کوئی ذخیرہ موجود نہ تھا جو کچھ تھا وہ خود گوبینو کی
مذکورہ بالا کتاب، فون کریمر کی ہرشندن ایدے (Herrchenden Lip. 1866)
کاظم بے کے رسالہ ژورنال ایشیاٹک پیرس (Journal Asiatique Paris 1867)
میں چند مضامین، ڈاکٹر ایتھر کے "مضامین و مطالعات" (Essays & Studies Berlin 1872)
میں محدود تھا۔ ان مضامین اور کتابوں کا براؤن کو غالباً پتہ نہ چلا اگر پتہ چل جاتا جب بھی براؤن کی پیاس
اس سے نہیں بجھ سکتی تھی کیونکہ کریمر کا ماخذ زیادہ تر گوبینو ہی کی کتاب ہے۔ کاظم بے نے بھی گوبینو پر کچھ
معتدبہ اضافہ نہیں کیا ہے کیونکہ انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ ناسخ التواریخ سے ماخوذ ہے، اور
ناسخ التواریخ پر گوبینو کی نظر پڑ چکی تھی۔ ایتھر کی کتاب ان تینوں کے بعد شائع ہوئی اس لئے
ممکن ہے کہ اس میں کچھ نئی باتیں مل سکیں، لیکن یہ کتاب کچھ ایسی نایاب ہوئی کہ اب اسکا صرف نام
ہی نام باقی رہ گیا ہے۔

[illegible] براؤن نے مجبور ہوکر اپنے شوق میں یہ ارادہ کر لیا کہ اگر کبھی زیارت ایران کا موقع ملا تو اس
فرقہ کے حالات و خیالات کے متعلق مزید تلاش و تفتیش کریں گے چنانچہ جب ایران گئے تو انہوں نے

---

(۱) مقدمہ نقطۃ الکاف صفحہ [illegible]

بابی فرقہ کے لوگوں سے ملنے کی پوری کوشش کی۔ ابتدا میں تو انکو بہت ناکامی ہوئی لیکن ایران میں
تقریباً دو سال قیام کرنیکے بعد اتفاقاً ایک بابی سے ملاقات ہوگئی اُس کے ذریعہ سے بہتیرے بابیوں سے
ملے اُن سے اُنکے متعلق بحث و مباحثے کئے، اُنکی تاریخ کے متعلق مزید معلومات حاصل کئے، اُنکی کتابیں
خریدیں، اُن کے جلسوں میں شریک ہوئے اور اُن لوگوں سے ایسے شیر و شکر ہوئے کہ بہتیرے اُنکو
بابی العقیدہ سمجھنے لگے۔

اکتوبر ۱۸۸۸ء تک جبکہ براؤن کیمبرج واپس آئے، یورپ کے اس خاص صنف ادبیات میں
اچھا خاصہ اضافہ ہوگیا تھا، دورن، کلیمان ہوار، ڈکٹر روزن اور تومانسکی اس فرقہ اور اسکے ادبیات
کے متعلق فاضلانہ مضامین شائع کر چکے تھے۔ انکے علاوہ پولک واٹسن اور لیڈی شائل وغیرہ چند
سیاحوں نے اپنے سفرناموں میں بھی اس فرقہ کے حالات لکھے تھے۔

مقدمہ

کچھ اپنی بے پروائی، کچھ پرانی تعلیم کی وجہ سے ہم لوگوں نے کبھی سیاسی معاملات اور علم سیاست کی طرف کوئی توجہ نہیں کی ہے۔ اس کا نتیجہ ہوا کہ جب مغلیہ سلطنت کا آفتاب ڈوب گیا تو ہم اپنی زندگی میں کسی قسم کی روشنی پیدا نہ کر سکے، اور انگریزوں نے جب ہمارے دیس پر قبضہ کر لیا تو سوائے ایک بیٹھے ہنگامہ کے ہمیں اور نہ سوجھا۔ ہم موقع پر خوشامد کرنا، خطرہ کے وقت دروازے بند کر لینا ضرور جانتے تھے۔ اپنی عزت آبرو کے لئے لڑنے والے بھی پرانے زمانہ میں بہت مل جاتے تھے مگر ہم کو اپنی تاریخ میں کوئی ایسا واقعہ نہیں ملتا جب ہماری قوم نے سیاسی معاملات یا حکومت میں حصہ لینے کی کوشش کی ہو یا مجموعی حیثیت سے اپنی عزت آبرو باقی رکھنے کا ثبوت دیا ہو۔ اپنے اور اپنے عزیزوں کے فائدہ کے علاوہ کسی کو کوئی فکر نہ تھی ہم میں کبھی قوم اور دیس کسی کے تصور میں نہ سمائے وہ زندگی کیا ہے جس میں ہم آفتوں سے بچنے کی دعائیں مانگا کریں وہ ملک کیا ہے جس میں ہم چوروں کی طرح رہیں، ڈرتے ہوئے اور سنبھل سنبھل کر اس طرح چلیں جیسے کوئی پرائے کھیت سے آنکھ بچا کر گزرتا ہے۔ مانا کہ جسے یوروپ کی قومیں سیاسی زندگی کہتی ہیں ہمارے یہاں ایک طرح کا جوا تھا جس کے کھیلنے کی جرأت صرف چند لوگوں کو ہو سکتی تھی، شیر کے منہ میں کوئی ہاتھ نہیں ڈالتا، نہ سمندر کا سفر کوئی تختے پر کرتا ہے۔ قوم کی خدمت بادشاہ کے ذریعہ ہی سے ہو سکتی تھی، اور اس تک پہونچنے کی جو لوگ کوشش کرتے تھے وہ عام طور سے دربار اور درباریوں کے پھندوں میں پھنس کر رہ جاتے۔ یا اگر خدمت شاہی میں پہنچ بھی گئے تو بادشاہ کا خوش رکھنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ جو چوکا اس کی عزت بھی گئی اور جان بھی پھر گیا تعجب ہے کہ سمجھدار لوگ سیاسی زندگی سے بھاگتے تھے، اور جوا کھیلنا صرف جواریوں پر چھوڑ دیا تھا۔ لیکن اگر ہماری سیاسی زندگی ایک مجبوری سی تھی تو اس کے ذمہ دار ہم ہی ہیں، بادشاہ اور ان کی تنگ مزاجی کچھ ازل سے ہماری قسمت میں نہیں لکھی تھی، اگر انہوں نے ہماری زندگی کو بے مزہ کر دیا تھا تو ہمارا فرض تھا کہ ہم ان کو دور کرتے

یورپ کی قوموں کا ہم پر جو اعتراض ہے وہ واقعی صحیح ہے۔ ہم میں تنقید اور انکار کا مادہ
بالکل نہیں۔ نہ ہماری طبیعت میں وہ خود مختاری ہے کہ زندگی کو اپنی آنکھوں دیکھیں اور اپنے تجربے
اور فکر سے سمجھیں۔ نہ وہ ہٹ اور ضد کہ جو دل میں ٹھان لیں اُس پر قائم رہیں چاہے رگوں میں ایک قطرہ
خون باقی نہ رہے۔ نہ وہ جرات کہ اپنی کمزوریوں کا اقرار کریں اور صداقت کے لئے لڑنے کا بیڑا اٹھائیں۔
جو کچھ ہوتا ہے سو ہوگا، جو کچھ ہوگیا سو ہوگیا، جو کچھ ہے اسے رہنے دو۔ یہی ہمارا فلسفہ ہے۔ اچھائی اور
برائی کا سوال ہمارے سامنے آتا بھی ہے تو ہم کترا کر کسی نہ کسی طرح نکل جاتے ہیں۔ بجائے اپنے راستے سے
پتھر ہٹانے کے ہم پتھر کو دیکھ کر اپنا راستہ بدل لیتے ہیں۔ ہم کو کبھی یہ نہ سوجھا کہ بادشاہت حکومت کرنے کا
ایک طریقہ ہے اور اگر اُس سے فائدہ کی بہ نسبت نقصان زیادہ ہے تو ہمت کرکے دوسرے طریقے
بھی آزمانے چاہئیں۔ ہم نے یہ طے کرلیا کہ اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ بعض نے بادشاہوں کے
سامنے گردن جھکا لی، چاہے اُس پر تلوار پڑے یا پھولوں کا ہار۔ بعض نے "عقلمندی" کی اور اس
جھگڑے سے الگ رہے۔ ہم ہر قسم کے لگان اور محصول دیتے چلے آئے ہیں، لیکن کبھی اس کی فکر نہ کی
کہ ہمارا روپیہ کیسے خرچ ہوتا ہے۔ اُس میں سے ہم کو کتنا واپس ملتا ہے اور کس صورت سے۔ ہم صرف
افسوس کرتے رہے اور دیتے رہے۔ زبان سے ہماری سوائے تعریف اور شکریہ کے کبھی کچھ نہ نکلا۔
کبھی ہم نے نہ اپنی رائے کسی بات پر ظاہر کی نہ کسی چیز پر اعتراض کیا۔ "اپنی" حکومت تھی تب یہ حال تھا
پرایا راج ہے تب بھی وہی کیفیت ہے۔

جس قوم کے لئے سیاسی آزادی حاصل کرنا ناممکن تھا اُس کے مختلف افراد سے یہ توقع کرنا کہ وہ
اپنی زندگی پر اپنی طبیعت اور خیالات کی مہر لگائیں گے یا شخصی آزادی کے لئے لڑیں گے بالکل بے کار
ہے۔ میدان جنگ میں شہید ہونا آسان ہے۔ وہاں ایک مرتبہ مرنا ہوتا ہے اور وہ بھی جلد ایک وقت
یا تھوڑے لوگوں کے پیچھے۔ (؟) عزیزوں دوستوں اور پوری سماج سے مقابلہ کرنا بہت دشوار
ہے۔ اس میں ہر گھڑی لڑائی جاری رہتی ہے۔ اور مرنا نہیں بلکہ ہر حالت میں زندہ رہنا ہے۔ مگر
آزادی انفرادی [illegible] کے لئے سیاسی آزادی سے بھی زیادہ ضروری ہے [illegible] زندگی

تک پہنچے جس کے بغیر سب کچھ بے مزہ ہو جاتا ہے اور ترقی کا ہونا یا نہ ہونا اسی پر مبنی ہے جیسے پودوں کا بڑھنا ان کے سینچنے پر۔ اس زمانہ میں سیاسی آزادی کی اہمیت کا اقرار عام طور سے لوگ کرتے ہیں مگر اس کے ساتھ ہی یہ غلط فہمی بھی ہو رہی ہے کہ سیاسی آزادی کافی ہے اور سوراج ملنے پر ہماری سب امیدیں پوری ہو جائیں گی۔ مل نے اپنی کتاب اسی غلط فہمی کے دور کرنے کیلئے لکھی تھی، اور اس زمانہ میں مل کے خیالات پر غور کرنا خاص طور سے ضروری ہے۔

مل نے سیاسی آزادی پر بحث نہیں کی ہے۔ وہ یہ نہیں دکھانا چاہتا کہ ہر قوم کو اپنی حکومت خود کرنا چاہئے۔ اس نے یہ فرض کر لیا ہے کہ قوم آزاد اور خود مختار ہے، جیسے کہ انگلستان کی حکومت اس زمانہ میں تھی۔ اور اس کتاب میں وہ یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ محض سیاسی آزادی کافی نہیں اور قومیں اسی وقت ترقی کر سکتی ہیں جب وہ آزادی فرد کا بھی پورا خیال کریں، اور اگر اس معاملہ میں انہوں نے کچھ کمی کی تو بادشاہت اور جمہوریت میں کوئی فرق نہیں، اور سیاسی آزادی ایک بالکل بے معنی شے ہے۔ تاریخ سے اگر ہم کوئی سبق سیکھ سکتے ہیں تو وہ یہی ہے کہ ترقی خود بخود نہیں ہوتی، بلکہ وہ چند باہمت شخصیتوں کی یادگار ہے، ایک تخم ہے جو انہوں نے اپنی قوم کی نذر کیا ہے، ایک پودا ہے جسے انہوں نے اپنے خون سے سینچ سینچ کر پروان چڑھایا ہے۔ چنانچہ مورخوں کا ایک خاص فرقہ ہے جو تاریخ کو صرف بڑی شخصیتوں کی سوانح عمری قرار دیتا ہے اور کچھ فلسفی بھی ایسے گذرے ہیں جو ساری زندگی کو انہیں شخصیتوں کی دین سمجھتے ہیں۔

ان مورخوں اور فلسفیوں نے اپنی پسندیدہ شخصیتوں کی عظمت دکھانے کے لئے واقعات کو بے شک بہت کچھ توڑا مروڑا ہے لیکن ان کے اصل دعوے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا میں جو کچھ ہوا ہے وہ معمولی لوگوں یا عام رائے کے ذریعہ سے نہیں بلکہ زیادہ تر معمولی لوگوں کے باوجود اور ان کی رائے کے خلاف ہوا ہے۔ اور جہاں کارلائل اپنے ہیرو کو پوری شان و شوکت کیساتھ تعریف اور تعجب کے لئے ہمارے سامنے پیش کرتا ہے اور نیٹشے زردشت کو عقل کل قرار دے کر ہم کو ہماری حماقتیں سمجھاتا ہے وہاں مل کی یہ کوشش ہو کہ ایسی شخصیتوں کے استقبال کے لئے ہم کو آمادہ کرے اور ان کی آمد کے لئے راہ صاف کرے۔ فرق ان دونوں میں صرف اتنا ہے کہ کارلائل بحیثیت مورخ کے جو شخصیتیں گذر چکیں

نگی اہمیت دکھاتا ہے نتیجے عام لوگوں کی بزدلی اور عیسائی مذہب کی جہالت سے عاجز آکر انسان کامل کا خواب دیکھتا ہے، اور مل بجائے ان دونوں کی طرح بلند پروازی کرنیکے سماج کو اسکا قائل کرانا چاہتا ہے کہ وہ ہر شخص کو آزادی دے جو اس کی ترقی کے لئے ضروری ہے۔

جو آزاد نہیں وہ انسان نہیں، جس کو ہم پوری آزادی دینے سے انکار کرتے ہیں اس کو ہم پورا انسان نہیں سمجھتے۔ یہی مل کے کتاب اور مل کے خیالات کا جوہر ہے۔ مل کے نزدیک آزادی انسان کی ان خاصیتوں میں سے ہے جن کے بغیر وہ انسان نہیں ہو سکتا، کیونکہ یہی اور تمام خاصیتوں کو حرکت میں لاتی ہے۔ انسان کو خدا نے سمجھ دی ہے، لیکن اگر وہ اپنی سمجھ سے کام نہ لے یا دوسرے اُسے کام نہ لینے دیں تو اُس میں اور دوسرے جانوروں میں کوئی خاص فرق نہیں رہتا۔ یہ ضرور صحیح ہے کہ اگر لوگ اپنی سمجھ پر چھوڑ دئے جائیں تو ہزار دل غلطیاں اور حماقتیں کرینگے لیکن ہمارا فرض ہے کہ ان لوگوں کو انکے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ زبردستی انکو راہ راست پر لانے کی کوشش نہ کریں۔ آدمی کو جانور بنا دینا دوسروں کے لئے ممکن ہے۔ انسان صرف اپنی ذاتی کوشش اور فطرت کی دی ہوئی قابلیت کے استعمال سے ہو سکتا ہے۔

جتنا اس مسئلہ پر ہم غور کرتے ہیں اُتنا ہی ہم کو اس کی سچائی اور اہمیت کا اقرار کرنا ہوتا ہے۔ مسلمان عام طور سے اس کی شکایت کرتے ہیں کہ آج کل لوگوں میں وہ مذہبی جوش نہیں رہا جو ایک زمانہ میں تھا، اور جو ہر مسلمان میں ہونا چاہئے۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ طالب علم اگر ایک روز ہاکی کھیلنے نہ جائے تو کسی کو خبر نہیں ہوتی، نماز میں غیر حاضر ہو تو اُستاد خفا ہوتا ہے۔ لیکن ہاکی اور دوسرے ورزش کے کھیلوں کی سب تعریف کرتے ہیں، اُن سے جو فائدہ ہے وہ اسے سمجھاتے ہیں، لیکن نماز کے بارے میں صرف یہ کہدینا کافی خیال کیا جاتا ہے کہ خدا کا حکم ہے اور قرآن مجید میں اسکا ثبوت موجود ہے۔ کھیل اور ورزش کی طرف رغبت دلائی جاتی ہے۔ لڑکے تجربہ سے معلوم کرتے ہیں کہ یہ ہر لحاظ سے انکے لئے فائدہ مند ہے۔ لیکن مذہب کے معاملہ میں ان کو اپنے تجربہ پر چھوڑنا انکے لئے خطرناک سمجھا جاتا ہے۔ دین اگر

انسان کے لئے کوئی اہمیت، ایمان اگر کوئی معنی رکھتا ہے تو اس میں کسی قسم کی زبردستی کرنا غلط ہے۔ مذہب کا منصب ہے جو کچھ ہو۔ بچارہ اُسی وقت سے جب انسان نے اپنے تجربہ سے اُسے ایسا ثابت کیا ہو۔ اس سے انکار کرنا گویا اپنے دین اور ایمان سے اپنی انسانیت سے انکار کرنا ہے۔

جہانتک کہ آزادیِ خیال اور بحث کا تعلق ہے مِل ایسے اصول اور ایسی دلیلیں پیش کرتا ہے، اور ایسے صدقِ دل اور خلوص سے کہ اُس کی مخالفت کرنا ناممکن ہے۔ ہمکو بجائے اُس کی منطق میں کمزوریاں اور غلطیاں ڈھونڈھنے کے اُس سے اپنی آزادی اور اپنی انسانیت کی وقعت کا سبق لینا چاہئے۔

تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے ہم کو یہ معلوم ہوجائیگا کہ ترقی انہیں کا حصہ ہے جن کو اپنے اوپر اور اپنی عقل اور سمجھ پر کافی اعتبار ہوتا ہے لیکن کسی نہ کسی وجہ سے آزادی لوگوں کو ہمیشہ ڈراؤنی شکلوں میں نظر آتی ہے۔ بچوں کو مذہب کے معاملہ میں آزادی دیدوگے تو اُنکے دلوں میں ذرہ برابر بھی دین و ایمان باقی نہ رہیگا۔ انکی اتنی سمجھ نہیں کہ راہ راست پر چل سکیں یا بُرے بھلے میں فرق کرسکیں۔ جو ایسی دلیلیں پیش کرتے ہیں اُن سے اول تو پوچھنا چاہئے کہ یہ ایمان کیا ہے جس میں اتنا اثر بھی نہیں اور وہ ماننے والے کیسے ہیں کہ نہ خود دوسروں کو عبرت دلا سکتے ہیں اور نہ اتنا اعتبار اپنے مذہب پر رکھتے ہیں کہ اُسے سچا ثابت ہونیکا موقع دیں۔ عورتوں کے آزاد ہونے سے بھی لوگ اسی طرح گھبراتے ہیں جو خامیاں اُنکے اخلاق اور ذاتی طبیعت میں ہیں وہ عورتوں پر تھوپ دیجاتی ہیں اور جہاں اُنکا اپنی اخلاقی صحت کا خیال کرنا چاہئے وہاں وہ دوسروں کے بیمار ہونے پر اصرار کرتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ عورتوں کی آزادی کے خلاف اس قسم کی دلیلیں پیش کرنا ہی بداخلاقی ہے۔ اور کسی توجہ کے قابل نہیں۔

اگر ہم نے آزادیِ خیال کی ضرورت کا اقرار کیا تو ایک حد تک آزادیِ اعمال سے بھی ہم انکار نہیں کیا کرسکتے۔ دوسروں کو نقصان نہ پہونچے تو ہمیشہ خطرہ رہے گی لیکن ایک خاص دائرے کے اندر ہر شخص کو پوری آزادی ملنی چاہئے۔

مِل نے اس مسئلہ پر بحث کرتے وقت صرف حکومت ہی کے عمل کو مدنظر نہیں رکھا بلکہ [illegible]

اور برادری جو ظلم اس معاملہ میں کرتی ہیں اُس پر بھی اس نے کافی زور دیا ہے۔ ڈرنے والے آزادی افعال ہی سے زیادہ ڈرتے ہیں اور یہیں پر آزادی پسند لوگوں کی زیادہ مخالفت ہوتی ہے۔ اگر محض گفتگو میں ایک مسلمان لڑکا عیسائی مذہب کی تعریف کرے تو باپ اُس سے اسقدر ناراض نہیں ہوگا لیکن اگر وہ عیسائی ہو جائے تو باپ بیٹے میں کسی قسم کا رشتہ قائم رہنا مشکل ہے۔ ایسے معاملہ میں ریاست یا حکومت عام طور سے دخل نہیں دیتی، یہاں پر جو لڑائی ہوتی ہے وہ سماج اور فرد کے درمیان ہوتی ہے اور یہیں پر آزادی فرد کی حفاظت کرنا سب سے زیادہ مشکل اور ضروری کام ہو جاتا ہے۔

آزادی افعال کی تائید میں نئی دلیلیں پیش کرنا بیکار ہے، اور جب فرد اور سماج میں مخالفت ہوتی ہے تو معاملہ بحث کے ذریعہ سے نہیں بلکہ باغی افراد کی جرأت کے مطابق طے ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے مل اسقدر جوش کے ساتھ سماج کو اطمینان دلاتا ہے کہ علاوہ تجربہ کے راہ راست تلاش کرنے کا اور کوئی طریقہ نہیں، اور لوگوں کو جستجو اور دریافت کی اجازت دینے سے کسی کا نقصان نہیں ہوتا۔

اگر مل خیالات اور افعال کی آزادی کی حمایت کرتا ہے تو اُسکا یہ مقصد نہیں ہے کہ لوگ اچھائی اور بُرائی میں فرق کرنا چھوڑ دیں، یا بد اخلاقی اختیار کر لیں اور نہ وہ یہ چاہتا ہے کہ سماج لوگوں کے ذاتی معاملات میں دلچسپی نہ لے یا انکے اخلاق پر رائے زنی نہ کرے۔ اُس نے زندگی کا خاص مقصد ہر قسم کی روحانی اور جسمانی، دینی اور دنیاوی ترقی کو مقرر کیا ہے، یہ ترقی اُسی وقت ہو سکتی ہے جب سماج اپنے ارکان کو اسقدر آزادی دے کہ وہ تجربہ اور تخیل کے ذریعہ سے ترقی کا راستہ تلاش کر سکیں۔ سماج کو چاہئے کہ نرالے پن، بھر دی، خود مختاری، بے قاعدگی کو بجائے اپنے قواعد و قوانین کے خلاف بغاوت خیال کرنیکے اپنی بھلائی کی کوشش سمجھے، اپنے ان ارکان کو جو یہ راستہ اختیار کریں، زندہ دلی اور جرأت کی داد دے۔ اُس کی التجا یہ ہے کہ اگر سماج کی عام رائے اور معمولی قواعد کے مطابق کوئی شخص نہیں چل رہا ہے تو سماج اپنے آپ کو سر و گیانی یا ہمہ داں قرار دے کر اس شخص پر کسی قسم کی زبردستی نہ کرے کیونکہ سماج کے ہر رکن کو اپنے آپ کو انسان سمجھنا اور دوسروں کے انسان ہونے کا اعتراف

بھی کرنا چاہئے۔ تاریخ ہم کو دکھاتی ہے کہ لوگوں کے خیالات بدلتے ہیں۔ اُنکے علم اور تجربہ کا دائرہ بڑھتا رہتا ہے، اور انسان کی فطرت کا تقاضا بھی یہی ہے۔ اس لئے ہم کو اپنی ریت رسم اور خیالات و افعال کو لوہے کا ڈھانچا نہ بنالینا چاہئے جس میں سے سماج کے تمام افراد ایک طرح سے ڈھلے ہوئے نکلیں بلکہ تجربہ اور عقل سے امتحان لیتے رہنا اور ضرورت کے مطابق انہیں بدلتے رہنا چاہئے۔

علم سیاست پر بہت سے فلسفیوں، مدبروں اور سائنس دانوں نے بحث کی ہے لیکن اصل اہمیت اس علم کو صرف چند شخصیتوں نے دی ہے جنہیں نہ فلسفی کہا جاسکتا ہے نہ مدبر و سائنس داں انکے پاس نہ ایک پردرد دل کے سوا کوئی سرمایہ تھا نہ ایک پرجوش محبت کے علاوہ انکا کوئی سفارشی۔ اگرچہ سیاسیات میں اس قسم کے مصنفوں کا بہترین نمونہ روسو ہے، اور اگرچہ مِل ایک زبردست عالم اور فلسفی بھی تھا، پھر بھی جس اثر میں یہ کتاب لکھی گئی تھی وہ دل کا ہے دماغ کا نہیں جس شخص کو اپنے ہمجنسوں سے محبت ہو، جس کو اپنی روحانی اور باطنی زندگی کی فکر ہے، جس کے دل میں اپنی قوم کی فلاح و بہبود کی سچی خواہش ہے وہ اس کتاب کی عزت کریگا اور اُس کی خامیوں کے باوجود بھی اس سے محبت کرتا رہیگا۔

ل ۲۰ مئی ۱۸۰۶ء کو لندن میں پیدا ہوا، اور ۸ مئی ۱۸۷۳ء میں جنوبی فرانس کے شہر آوی نیان میں اُس کا انتقال ہوا۔ اُس کی زندگی میں وہ سارا زمانہ آجاتا ہے جس کے علمی سیاسی اور ادبی کارنامے انیسویں صدی کو ایک خاص اہمیت دیتے ہیں، اور مِل کی شخصیت ایسی تھی اور اُسکی تعلیم اس طور پر ہوئی تھی کہ وہ ہر قسم کی تحریکوں میں پورا حصہ لے سکا۔

جس زمانہ میں بچے کھیل کود میں مشغول رہتے ہیں، مِل نے یونانی اور رومی زبان سیکھلی تھی اور بچپن میں اُس نے قدیم ادب سے پوری واقفیت حاصل کرلی، اور بیس برس کی عمر تک اُس کی معلومات جدید علوم میں بھی اس قدر ہوگئی تھی کہ وہ بخوبی ان مسائل میں بھی رائے دے سکتا تھا جو اُس زمانہ کے روشن خیال اور قوم پرست لوگوں میں زیربحث تھے اس کی تعلیم اس کے باپ جیمز مِل نے اپنے ذمہ لی تھی اور شروع سے اُن کو علمی، سیاسی، اور معاشی نظریوں اور اُن کو عمل میں لانے کے طریقوں سے صرف

بڑی دلچسپی ہی نہیں بلکہ انکو اپنی دریافت کے ذریعہ سے ترقی دینے کی قابلیت بھی اسمیں پیدا ہوگئی تھی۔ جیمز مل علاوہ عالم ہونیکے سیاسیات، اخلاقیات اور معاشیات میں اپنے ذاتی عقیدے بھی رکھتا تھا اور مل کی پرورش انہیں عقیدوں میں ہوئی باوجودیکہ جیمز مل کی یہ خواہش تھی کہ اُس کے خیالات کا پرچار اُسکے لڑکے کے ذریعہ سے ہو مگر وہ یہ کسی طرح سے نہیں چاہتا تھا کہ مل انہیں بغیر سوچے سمجھے یاد کرلے اُس کا ہر وقت اس پر اصرار رہتا تھا کہ مل اپنے عقیدوں کے نئے نئے ثبوت دریافت کرتا رہے، اور اپنی تعلیم کو تنگ نظری یا تعصب کی وجہ سے ناپسندیا بیکار نہ بنا دے۔

اسی وجہ سے کہ بچپن اور جوانی میں اسکا تعلق جیمز مل، رکارڈو اور بنتھم سے تھا، مل کو وہ حیثیت مل گئی جو بہت کم کو نصیب ہوتی ہے۔ وہ صرف اپنے زمانہ کے خیالات اور تحریکوں سے واقف ہی نہیں تھا بلکہ اپنے سے ایک قرن پہلے کے خیالات کا بھی خزانہ اپنے دماغ میں رکھتا تھا۔ ایڈم سمتھ اور رکارڈو کی معاشی تعلیم، بنتھم کی افادیت اٹھارہویں صدی کے آخری حصہ کی دینیات، فلسفہ، منطق سب مل کے ہاتھوں میں تکمیل پاتی ہیں، اور وہ صورت اختیار کرتی ہیں جو اُس زمانہ کے تخیل کے لئے مخصوص ہے بیں ان تمام لوگوں کا جیسے بڑھاپے میں نمائندہ تھا، ویسے ہی اب بھی ہے۔ اگر ہمیں اُس زمانہ کے تخیل کی کسی شاخ سے واقفیت پیدا کرنی ہو تو ہمیں مل کی کتابیں پڑھنا ضروری ہوں گی، کیونکہ مل ہی نے اُس تخیل کو ترتیب دیا، اور پچاس برس کے تجربہ کے بعد کاٹ چھانٹ ضروری تھی وہ بھی اسکا کے ذریعہ سے ہوئی۔

مل نے اپنی آنکھوں کے سامنے زندگی کی صورت بدلتی دیکھی نئی مشکلات سنئے سوالات پیش ہو رہے تھے، تجربہ ہر طرف سے سبق سکھا رہا تھا۔ جب مل نے اپنی تعلیم مکمل کر کے نئی دنیا میں قدم رکھا۔ اسوقت فرانسیسی انقلاب میدان جنگ میں شکست کھا کر یورپ کی سیاست پر رفتہ رفتہ اپنا اثر ڈالنے لگا تھا۔ یورپ کے تمام ملکوں میں آزادی پسند لوگوں کی تعداد بڑھ رہی تھی جمہوری حکومت کی خواہش ہر جگہ پیدا ہو رہی تھی جس زمانہ میں مل نے سیاسی معاملات پر اپنی کتاب "آزادی" لکھی اس وقت [illegible] دوسری حالت تھی انگلستان میں ۱۸۳۲ء کے "قانون اصلاحات" نے سیاسی مسائل کو بالکل بدل دیا

صورت پیدا کی تھی اور جہاں شروع میں لوگ پارلیمنٹ کو چند رئیسا اور زمینداروں کے قبضہ سے نکالنے کی فکر میں تھے، مل کو ۱۸۳۰ء میں یہ اندیشہ ہو رہا تھا کہ کہیں جمہوریت کے رواج میں شخصیت نہ تباہ ہو جائے۔ یورپ میں انقلابی جوش بہت پیدا ہو گیا تھا اور جہاں ۱۸۱۵ء کی ویانا کی کانگریس میں تمام ریاستوں نے انقلاب اور انقلابی اصولوں کی مخالفت کا بیڑا اٹھایا تھا وہاں ۱۸۴۸ء میں انقلاب کے طوفان نے قریب قریب ہر ریاست کی کشتی کو ڈبو دیا تھا۔

جس دنیا کی ضرورتوں کے لحاظ سے مل کو معاشیات کی تعلیم دی گئی تھی وہ بھی مل کے بڑھاپے میں بدل گئی تھی۔ صنعت و حرفت کے انقلاب کے شروع میں تجارت اور تاجروں کو آزادی کی ضرورت تھی۔ سرمایہ دار اور مزدور کے تعلقات، اگرچہ وہ اچھے کبھی نہیں تھے پھر بھی اس زمانہ میں وہ سماجی اور سیاسی اہمیت نہیں رکھتے تھے جو بعد کو انہیں حاصل ہوئی۔

اخلاقیات میں مل اپنی تعلیم کے لحاظ سے افادی تھا۔ بنتھم کے افادی اصول جب تک کہ انگلستان میں قانونی سدھار کی گنجائش رہی، اپنی سچائی اور فائدہ مندی کا ثبوت دیتے رہے۔ جب مل نے افادیت پر اپنی کتاب لکھی قانونی سدھار کی تکمیل ہو چکی تھی۔ پارلیمنٹ نے بھی اپنے دروازے کھول دئے تھے۔ افادیت کو اب یا تو آثار قدیمہ میں شامل کرنا، یا اُسے ایک مستقل اخلاقی اصول ثابت کرنا تھا۔

مل میں نہ عقیدہ کی کمزوری تھی کہ وہ ایسے اصولوں کو جنہیں اُس نے زندگی بھر صحیح اور سچا سمجھا تھا لوگوں کے اعتراض کی وجہ سے چھوڑ دے اور نہ اتنا تنگ نظر یا متعصب تھا کہ جو خامیاں اسے اپنے عقیدہ میں نظر آئیں اُنکا اقرار نہ کرے یا اُنکو دور نہ کرے۔ لیکن وہ خیالات اور عقیدے جن میں اُس نے پرورش پائی تھی، اُسے ناکافی معلوم ہوتے رہے اور اگر ہم اُسکی تصانیف کا ان مضامین سے مقابلہ کریں جو اُس نے جوانی میں لکھے تھے تو ہم پر ظاہر ہو جائے گا کہ اُس کے خیالات میں کیسی تبدیلیاں ہوتی رہیں لیکن مجموعی حیثیت سے مل اُسی زمانہ کا نمائندہ رہا جس میں اُس کی پرورش ہوئی تھی اور اس لحاظ سے بھی اُسکی خاص اہمیت ہے۔ اُسکا تخیل ایک کڑی ہے جو زمانوں کے خیالات کو جوڑتی ہے ایک بلندی ہے جس پر سے ہمیں نئی اور پرانی دنیا دونوں نظر آتی ہیں۔ مل نے ایک عمر کے خیالات جب

کرسکے دوسری پشت کو سمجھائے، اور جو تبدیلیاں زمانہ نے پیدا کردی تھیں اُنکی پوری داد دی۔

اوپر عرض کیا گیا ہے کہ بنتھم کی افادیت کے لئے جب "قانون کی سدھار کی تکمیل ہو چکی، اس وقت علمی دنیا میں کوئی خاص کام باقی نہیں رہ گیا، اور اُس پر ہر طرف سے اعتراض ہونے لگے کیونکہ اُسکے حامیوں نے اس کے ایک دائمی اخلاقی اور سیاسی اصول ہونے کا دعوےٰ کیا، افادیت کو جو خالص مادی رنگ بنتھم اور اُس کے ہمخیال لوگوں نے دیا تھا اُس کی وجہ سے وہ کسی طرح ایک اخلاقی اصول نہیں بن سکتا تھا[1]، اور ہم دیکھتے ہیں کہ اپنی "افادیت" میں، اور ایک دوجگہ "آزادی" میں بھی مل افادیت کو اس قدر مادی نہیں بناتا۔ "ایک غیر مطمئن سقراط ایک مطمئن بیوقوف سے اچھا ہے"! اس ایک جملہ لیا اس نے اُن تمام اعتراضات کو تسلیم کرلیا جو افادیت پر کئے گئے تھے، لیکن افادیت کا وہ پھر بھی قائل رہتا ہے جیسا کہ "آزادی" میں اُس نے لکھا ہے کہ "اخلاقیات کے تمام مسائل میں میں افادہ کو سب سے آخری معیار سمجھتا ہوں"، یعنی "اخلاقی تعلیم میں میں ہمیشہ اسکا خیال رکھوں گا کہ لوگوں کو اُس سے فائدہ بھی پہنچتا ہے یا نہیں، اور اگر ہے تو کتنوں کو"! افادیت آج کل ایک پرانی خیالی عمارتوں میں شمار کی جاتی ہے لیکن لوگ اُس کی تاریخی اہمیت اور اُسکی خدمات کا اقرار بھی کرتے ہیں اور اس کی بڑی وجہ مل کی شخصیت ہے۔

اگر ایک اور مثال کے طور پر ایڈم اسمتھ کے چند نظریے لیں تو مل کا اثر اور اُس کی حیثیت علوم کی تاریخ میں بہیں اور صاف نظر آنے لگیگی۔ ایڈم اسمتھ "آزاد تجارت" کا بڑا حامی تھا، اور اُس کے خیال میں ریاست کے لئے سب سے مناسب پالیسی یہ تھی کہ وہ معاشی معاملات میں دخل نہ دے، لیکن پارلیمنٹ نے ۱۸۱۵ء سے کوشش کی کہ قانون کے ذریعہ سے اناج کا بھاؤ اونچا رکھے، صرف اس وجہ سے کہ پارلیمنٹ پر زمینداروں کا بہت اثر تھا اور اس طرح سے ملک میں کئی سال تک ایک مصنوعی قحط

---

[1] افادیت کی ساری تعلیم بنتھم کے اس مشہور جملہ میں موجود ہے "زیادہ سے زیادہ لوگوں کی زیادہ سے زیادہ بھلائی"، لیکن ہر شخص اپنی بھلائی کی تعریف اپنے طور پر کرتا ہے اور جس سے ایک کو فائدہ ہوتا ہے دوسروں کو نقصان پہنچ سکتا ہے، مگر افادیت کے حامیوں کی رائے میں یہ معلوم کرنا ممکن تھا کہ کس چیز سے زیادہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ آسایش ہوتی ہے۔ انہوں نے اس سلسلہ میں ریاضیوں کی ایک فہرست [illegible]

اس حرکت نے "آزاد تجارت" کے حامیوں کو اپنے عقیدے میں اور مضبوط کر دیا، اور بجائے حکومت کی چند حرکتوں کی مخالفت کرنے کے روشن خیال لوگ عام طور سے حکومت کی مداخلت ہی کے دشمن ہو گئے اور جو تحریک چند معاشی قوانین کی مخالفت کے لئے شروع ہوئی تھی اُس نے ایک سیاسی نظریہ کی حیثیت اختیار کر لی جو [illegible] سے کوئی پندرہ برس کے عرصہ میں ایک عام عقیدہ بن گئی اور جواب بھی ایک حد تک قائم ہے۔ اس تحریک کی بنیاد دراصل حکومت کیطرف سے بدگمانی تھی۔ پارلیمنٹ پر چند با اثر لوگوں کا قبضہ تھا جو اپنی اغراض اور اپنے فائدے کے مطابق قانون پاس کراتے تھے۔ انہی "خود غرضانہ مفاد" کی مخالفت قوم کو بھی کرنی پڑی تھی یہی لوگ باوجود قوم کی کوششوں کے تجارت کی آزادی پر راضی نہیں ہوتے تھے، یہی لوگ مزدوروں کی خراب حالت دیکھ کر بھی انکو زبردستی اُسی مزدوری کے نرخ پر مجبور کرنا چاہتے تھے۔ اور انہی لوگوں نے ٹریڈ یونین وغیرہ کو خلاف قانون قرار دیا تھا تاکہ مزدوروں کے پاس مزدوری بڑھانیکا کوئی ذریعہ باقی نہ رہے۔ ان سب باتوں سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن رفتہ رفتہ پارلیمنٹ ان لوگوں کے اثر سے نکل رہی تھی، حکومت کی بنیاد قوم کی رضامندی قرار پائی اور اُسکا مقصد قوم کی فلاح و بہبود تھا۔ تجربہ نے یہ دکھا دیا تھا کہ بہت سے معاملات بغیر حکومت کی مداخلت کے نہیں طے ہو سکتے۔ سیاسی زندگی کے بہت سے فرائض تھے جو صرف حکومت پورے کر سکتی تھی اور اس لئے اُس کی طرف سے بدگمانی رکھنا اپنے آپ کو نقصان پہنچانا تھا۔

اس مسئلہ میں بھی مل گذشتہ موجودہ اور آئندہ کو پیوستہ رکھتا ہے اُس کے زمانہ کا عام رجحان اگر ہم ہربرٹ اسپنسر کے نظریوں کو انفرادیت کی انتہا قرار دیں، جیسا کہ واقعہ ہے، انفرادیت کی طرف تھا اُس سے پہلے یا تو سیاسی معاملات کی طرف سے بے توجہی تھی یا حکومت قوم کو بھلائی پہنچانے کا ایک اکیلا ذریعہ سمجھی جاتی تھی [illegible] کے بعد سے ہم دیکھتے ہیں کہ حکومت کے اثر کا دائرہ بڑھتا جاتا ہے۔ قوم اور حکومت میں کسی قسم کی بدگمانی باقی نہیں رہتی، اور بجائے حکومت کی مداخلت پر اعتراض کرنے کے قوم اُس کی اور مدد کرتی ہے۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مل خود انفرادیت کا قائل تھا، لیکن اُسکے ہمعصروں اور اُس کے زمانہ کے

سیاسی فلسفیوں میں بڑا فرق ہے۔ اسپنسر ریاست کو محض قوم یا سماج کے جان و مال کی حفاظت کا کام سپرد کرتا ہے
اس کی رائے میں بڑی خدمت جو وہ سماج کی کر سکتی ہے وہ یہ ہے کہ اُسے اپنے حال پر چھوڑ دے اور سماج
کو چاہیے کہ جہاں باہر کے چوروں اور ڈاکوؤں سے اپنی حفاظت کا انتظام کرتی ہے وہاں اس بات کا خیال
بھی نظر رکھے یعنی ریاست کو اپنے معاملات میں دخل دینے سے اور اپنی آزادی کے محدود کرنے سے روکے
یہ سب کچھ کہنے کی خاص وجہ یہ ہے کہ اسپنسر ریاست کو ضروری نہیں سمجھتا اور زندگی کا مرکز اور اس کی چلانے
والی طاقت اُس کے نزدیک مختلف افراد ہیں، انفرادیت اُس کا مذہب ہے، فرد کی عقل اور سمجھ کے علاوہ زندگی
میں اسے اور کوئی روشنی نظر آتی نہیں۔

انسان کی وقعت اور اہمیت پر زور دینا بہت قابل تعریف بات ہے۔ لیکن اسپنسر جس انسان کے
لئے میدان جنگ میں آتا ہے وہ انسانیت کا کوئی اچھا نمونہ نہیں، اسپنسر کا فرضی انسان جس کو وہ "سیدھا
آدمی" کہتا ہے، محض ایک تاجر ہے جس کا نقطۂ نظر خالص بیوپاریوں کا ہے، یعنی اُسے تمدن، تہذیب
اور اُن دلچسپیوں سے جن کو عام رائے نے اس زمانہ تک انسانیت کا خاص حصہ سمجھا ہے، کوئی مطلب نہیں
سماجی، سیاسی، ادبی زندگی کو وہ اگر حقارت نہیں تو بے قدری اور بے پروائی کی نظر سے ضرور دیکھتا ہے
ریاست اُس کے نزدیک ایک نظام ہے جو دشمنوں سے لڑنے اور چوروں اور ڈاکوؤں سے حفاظت
کے لئے بنایا گیا ہے۔ اگرچہ وہ ان خدمات کا شکریہ ادا کرنے پر تیار ہے، پھر بھی وہ یہ نہیں چاہتا کہ ریاست
اُس کے معاملات میں کسی قسم کا دخل دے، کیونکہ ریاست اُس کے معاملات کو اس سے بہتر نہ سمجھ سکتی
ہے نہ انجام دے سکتی ہے۔

مل ان تمام غلطیوں سے بچا ہوا ہے۔ یہ بے شک صحیح ہے کہ سماجی زندگی کو وہ اہمیت نہیں دیتا
جو در اصل دینا چاہیئے لیکن انسانیت کو وہ اس کے بدلے میں بہت اعلیٰ مرتبہ دیتا ہے۔ اسپنسر کے تخیل پر
سائنس نے ایسا قبضہ کر رکھا ہے اور اُس میں اتنی بھاپ بڑھ گئی ہے کہ وہ پٹریوں پر چلنے پر بھی راضی
نہیں۔ مل سائنس کو انسان کے بہترین مشاغل میں شمار کرتا ہے، لیکن اُس کی نظر سائنس کے دھوئیں میں
گم نہیں ہو جاتی۔ اسپنسر نے ریاست اور حکومت کا فرق بھول کر دونوں کو اپنے "سیدھے" آدمی کا دشمن

دکھانے کی کوشش کی ہے۔ مل اگر ریاست اور حکومت کی مداخلت کا قائل[1] نہیں پھر بھی اُس کی انفرادیت محض ایک اوسط بیوپاری کی خود غرضی کا بنایا ہوا اصول نہیں اور نہ اُس کے نزدیک اسپنسر کا "سیدھا، آدمی انسانیت کا بہترین نمونہ ہے، انسان کی آزادی کا خیال اُس کے دل میں ایک سچا جوش پیدا کرتا ہے اور آزادی کے اُس نے بہت وسیع معنی لئے ہیں۔

اپنے زمانہ میں اسپنسر کا اثر بے شک زیادہ تھا، کیونکہ اس نے اپنے نظریوں کو سائنس کے بھیس میں پیش کیا تھا، اور سائنس کا اُس وقت لوگوں کے دلوں پر بہت رعب چھایا ہوا تھا۔ آج کل سائنس کا جو سیاسیات میں دخل ہے اُسے لوگ بہتر سمجھتے ہیں، یا یہ کہئے کہ علاوہ نفسیات کے اور کسی سائنس کو سیاسیات میں دخل نہیں رہا، اور اسپنسر کے نظریوں کی کوئی وقعت نہیں رہی۔ مگر مل کی قدر اتنی ہی ہوتی رہی۔ ریاست کے معاملہ میں لوگوں کی رائے بدل گئی ہے، لیکن انسان اور انسانیت کی وقعت نہیں گھٹی اور زندگی کے آدرش یا نصب العین جو مل نے قرار دئے تھے، اگرچہ اُن میں خامیاں بھی ہیں، لیکن وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

---

[1] معاشی معاملات کے علاوہ ریاست کی مداخلت کے بارے میں مل کا جو خیال ہے وہ اس بحث سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے جو وہ ریاست اور تعلیم پر کرتا ہے۔ مفت اور جبری تعلیم کا وہ حامی ہے۔ اسپنسر کی طرح وہ اسے ضروری نہیں سمجھتا کہ ریاست کو اس معاملہ سے بھی دور رکھنا چاہئے۔ ریاست کیطرف سے تعلیم دلانیکے خلاف اگر کچھ کہا جاتا ہے تو اس کا یہ مقصد نہیں کہ ریاست سے تعلیم لازمی نہ کرائی جائے بلکہ یہ مطلب ہے کہ ریاست کو اپنے اغراض کے مطابق تعلیم دینے سے روکا جائے بالکل دوسری شے ہے۔ بڑے پیمانہ پر تعلیم کا انتظام صرف ریاست ہی کے لئے ممکن ہے لیکن مل نہیں چاہتا کہ تمام تعلیمی نظام اور اسکول وغیرہ ریاست کے قبضہ میں آجائیں، کیونکہ اسکا اثر برا ہوگا۔ عام ریاست کیطرف سے تعلیم صرف ہر شخص کو دوسرے جیسا بنانے کی ایک ترکیب ہے "، پرائیویٹ اسکولوں کے ساتھ ریاست کیطرف سے اسکولوں وغیرہ کا ہونا یا ریاست کیطرف سے پرائیویٹ اسکولوں کو مالی امداد دینا کوئی قابل اعتراض بات نہیں۔ تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ عام تعلیم افراد پر نہیں چھوڑی جاسکتی، اور اگر اس زمانہ میں ریاست اسقدر بے دخل نہیں ہے جتنا کہ مل چاہتا تھا لیکن پھر بھی اسپنسر سے اس کی رائے واقعات کے نقطۂ نظر سے زیادہ صحیح ثابت ہوئی۔

---

[2] اسپنسر کا خیال تھا کہ سیاسی مسائل کو ہمیں نیچرل سائنس، خاص طور سے حیاتیات (بائولوجی) (دیکھو صفحہ ۲۸)

حکومت کی خرابیوں اور اُس فرقہ[1] کے خیالات نے جس میں اسپنسر کی پرورش ہوئی تھی اُسے ریاست کا دشمن اور انفرادیت کا حامی بنا دیا تھا لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا ہے جب سے حکومت پر جمہور کا اثر پڑنے لگا حکومت کی طرف سے بدگمانی جاتی رہی اور اُس کے ساتھ اسپنسر کے نظریے بھی۔ اور اگرچہ اب بھی بہت سے ایسے اہلِ فکر موجود ہیں جو انفرادیت کو سیاسی اکسیر سمجھتے ہیں لیکن ریاست کی پالیسی، عام رائے اور وقت کا تقاضا بالکل دوسرا ہے۔ اسپنسر ایک زمانہ کے خیالات کو ظاہر کرتا ہے، اگر ہم اسکا مقابلہ اس سے پہلے کے خیالات سے کریں تو مل کی انفرادیت ایک کڑی ہے جو دونو کو جوڑتی ہے، اور اگر ۱۸۶۰ء کے بعد کی اجتماعیت سے کریں تب بھی مل کی حیثیت وہی رہتی ہے اُس نے اپنے سے پہلے کے خیالات جذب کر لئے تھے، اور اس کے زمانہ کے جو خیالات تھے وہ بھی، لیکن اُس نے اپنے تخیل کو ایسی وسعت دی تھی کہ آئندہ تحریکوں سے بھی اُس کا گہرا تعلق رہا، کیونکہ اگرچہ موجودہ زمانہ کی سخت گیر تنقید کے سامنے انفرادیت سیاسی پالیسی کی صورت میں نہیں ٹھہر سکتی تاہم مل نے آزادی کے جو معنی قرار دئے ہیں، اور اصلی آزادی سے اُس نے انفرادیت کا جو تعلق دکھایا ہے وہ کبھی کسی تنقید کے ذریعہ سے غلط ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) کے اصول اور قوانین کے مطابق حل کرنا چاہئے۔

[1] اسپنسر پیدائشی مذہب کے لحاظ سے اس فرقہ میں شامل تھا جو انگلستان کے ریاستی کلیسا کے عقائد کا قائل نہ تھا۔ یہ فرقہ کئی صدیوں سے ریاست اور کلیسا دونوں کی [illegible] کے باوجود ابھی تک قائم ہے، اگرچہ اسے بہت مصیبتیں بھی اٹھانی پڑیں۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ مخالف کلیسا کے لئے ریاست کا دوست ہونا ناممکن تھا۔

روحانی کلام اور روحانی عمل

الفاظ محض حرفوں کا مجموعہ نہیں۔ وہ اثر بھی رکھتے ہیں۔ ہماری کتب مقدسہ میں مذکور ہے کہ ایک زمانہ تھا جب الفاظ میں جادو، حد درجہ اثر آفریں جادو، ہوتا تھا۔ قدیم منتر فقط الفاظ تھے۔ مگر ان میں سحر تھا، وہ سحر جسے ہمارے فلسفہ میں پران کہتے ہیں۔ مشہور ہے کہ وہ نفوس جو یوگ اور ریاضت کے ذریعہ کامل ہو چکے تھے ان منتروں کو پڑھتے تو دنیا لرز اٹھتی اور ساکت رہ جاتی۔ اپنی زبان سے کچھ کہتے تو عناصر سر جھکاتے۔ سمندروں کا پانی ٹھہر جاتا، ہوا رک جاتی، گھنے جنگلوں کے درمیان چھپی ہوئی کٹیوں سے الفاظ، محض الفاظ نکلتے، آگ بھرے، روشنی لئے، انسانیت کو مصفا، زندگی کو پاک کرتے۔

آج ممکن ہے ہمیں یہ باتیں بالکل لغو معلوم ہوں۔ مگر آیئے ذرا سوچیں، اور سنجیدگی کے ساتھ اپنے سے سوال کریں: "کیا الفاظ میں اثر ہوتا ہے؟"

بارہا ہم نے یہ جملے سنے ہونگے: "مظلوم کی آہ عرش کا کنگرہ ہلا دیگی" کیا ہم انہیں بھی لغو ٹھہرا سکتے ہیں؟ مظلوم کے جلے دل سے نکلے ہوئے الفاظ! کیا سخت سے سخت آدمی بھی اُن سے لرز نہیں جاتا؟ ہندوستانی فلسفہ ایک بے پناہ طاقت کو تسلیم کرتا ہے۔ اور جب کبھی الفاظ پران سے بھرے نکلتے ہیں تو یقیناً وہ اثر رکھتے ہیں۔ آیئے مثال میں ایک اور منظر کو لیں، ایک اجتماع کو، جو کوئی اچھی تقریر سن رہا ہو۔ الفاظ کا جادو چل رہا ہوگا سامعین بالکل مسحور ہونگے اور مقرر کا اُن پر پورا اختیار ہوگا۔ گویا وہ واقعی ساحر ہے۔

ایسی حالت میں بھی کہ کسی گروہ پر یاس طاری ہو، زوردار الفاظ مردہ دلوں میں نئی روح پھونک سکتے اور بزدلوں کو مرد بنا سکتے ہیں۔ ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ طاقت الفاظ میں نہیں ان خیالات میں ہوتی ہے جن کے وہ حامل ہوتے ہیں ایسا نہیں ہے۔ خیالات میں ضرور طاقت ہوتی ہے، لیکن الفاظ میں بذاتِ خود ایسی طاقت موجود ہے جو اس سے بدرجہا بڑھ کر ہے۔ آپ کسی زید عمر بکر کو پلیٹ فارم پر کھڑا کر دیجئے۔ تقریر کے بعد آپ دیکھیں گے کہ سامعین جہاں کے تہاں رہے۔ لیکن جب کوئی خطیب زبان کھولتا ہے

تو اس کی آتش بیانی مردہ تنوں میں جان ڈال دیتی ہے۔ الفاظ اس حالت میں ایک ذریعہ محض نہیں رہ جاتے وہ بذات خود ایک مقصد بن جاتے ہیں۔

لیکن خطیبانہ الفاظ، ان کا انداز بیان، اکی ساحری، یہ سب بالکل عارضی چیزیں ہیں جہاں خطیب کی آواز بند ہوئی، انکا اثر بھی کم ہونے لگا۔ یہ صحیح ہے کہ اشتعال کے وقت بہت بڑے بڑے کاموں کا آغاز ہو سکتا ہے، جو ایک عرصہ تک جاری رہ سکتے ہیں، تاہم خطیبانہ الفاظ کے ساتھ بے ثباتی ان کا تخیل اگزیر طور پر وابستہ ہے۔

مگر کچھ ایسے الفاظ بھی ہیں جو اپنے مخصوص اوزان اور مخصوص انداز رکھتے ہیں اور جن میں اگرچہ عارضی اشتعال انگیزی کا عنصر نہیں ہوتا لیکن وہ زیادہ گہرا اور پائدار اثر رکھتے ہیں۔ یہ شاعرانہ الفاظ ہیں

شاعرانہ الفاظ عموماً ایک فانوس کی حیثیت رکھتے ہیں جس کے اندر تصور کے جلد جلد گزرنے والے لمحات میں جھلک جانیوالی حقیقت کی روشنی کو ہمیشہ کے لئے مقید کر دیا جاتا ہے لیکن جب شاعرانہ الفاظ سچے دل سے نکلے ہوں، جب وہ نتیجہ ہوں روح کے سچے شاعرانہ کیف کا تو ان کی حیثیت محض ایک فانوس کی نہیں رہجاتی جس میں حقیقت کی روشنی مقید ہو، بلکہ وہ بذات خود روشنی کا مخرج بنکر نورٌ علیٰ نور ہو جاتے ہیں۔

انہیں آپ ایک رنگین جام سے بھی تشبیہ دے سکتے ہیں، جو شفاف پانی سے لبریز ہو۔ اس کی رنگینی مستعار لیکر پانی خوشنما بن جاتا ہے، اور یہ خود پانی کے بغیر تہی ایہ ہوتا۔ شاعرانہ الفاظ تعلیقوں میں کل تناسب اور رنگینی پیدا کرتے ہیں جس کے بغیر وہ ایک بدہیئت چیز ہو، اور تصور الفاظ کے خالی پیکر میں جان ڈالدیتا ہے

ایک شاعر لکھتا ہے کہ "شعر میں روح کے اعلیٰ و صادق ترین جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ شعر ایک نقش ہے جو استعارہ کی لوح طلسمی پر بنایا جاتا ہے اسمیں رازہائے سربستہ منکشف اور زمین اور آسمان ہم آغوش ہو جاتے ہیں۔ یہ دعوے جو ایک عام کلیہ قائم کرتا ہے، اسمیں غالباً اعتراض کے پہلو بھی نکل سکیں گے لیکن آپ انکو نظر انداز کر دیں اور جو گہرے معنی اس کے اندر پوشیدہ ہیں ان پر غور کریں کہ شعر میں کیوں روح کے اعلیٰ و صادق ترین جذبات کا اظہار ہوتا ہے؟ اس لئے کہ شاعر در اصل ایک ساز

ہوتا ہے جس کے ذریعہ روح اپنے اعلیٰ ترین نغموں کو سناتی ہے۔

حقیقت تک پہونچنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان پر بیخودی طاری ہو شاعری انسان میں سب سے زیادہ بیخودی پیدا کرتی ہے کسی اخلاقی یا معاشرتی مصلح یا مدبر کے لئے اظہار خیال کے وقت بیخود ہونا ناممکن ہے۔ کیونکہ اس کے فرائض اور دلچسپیوں کی نوعیت اسے ناگزیر طور پر خارجی دنیا سے وابستہ رکھتی ہے۔ ایسے کم اخلاقی یا معاشرتی مصلح ہونگے جو اپنے کو خارجی دنیا کے علائق سے متاثر نہ ہونے دیں لیکن شاعر کے لئے خارجی دنیا محض ایک محرک کا کام دیتی ہے۔ اسے قید نہیں کرتی یعنی اس کے علائق شاعر کی ساری توجہ کو اپنی طرف کھینچ نہیں لیتے۔ اگر ایسا نہو اور یہ ایک معینہ حد سے زیادہ اثر اور اہمیت حاصل کرلے تو یہ اس بات کا یقینی ثبوت ہے کہ شاعری ختم ہو رہی ہے اور عملی قوتیں پیدا ہو رہی ہیں۔ شاعر ایک عملی انسان بن جاتا ہے۔

شاعری کا سچا کیف جو ماحول کے علائق سے شاعر کو متاثر نہیں ہونے دیتا، انسانی روح کی ارفع ترین حاجتوں کے سامنے اپنی نذر پیش کرتا ہے۔ اسی نذر کو میں "روحانی کلام" کہتا ہوں۔ روحانی کلام ان تصورات کو دوام بخشتا ہے جو شاعر کے دماغ میں گزرا کرتے ہیں۔

دوسروں کو بھی ایسے تصورات نظر آسکتے ہیں۔ لیکن وہ یا تو ان کو یونہی محو ہو جانے دیتے ہیں یا ان کا بہت کم اثر لیتے ہیں۔ اگر زیادہ اثر ہوتا بھی ہے تو اس قسم کا جو انہیں فوراً کچھ کرنے پر آمادہ کر دیتا ہے لیکن شاعر کے ساتھ یہ معاملہ نہیں ہوتا۔ اس کی خدا داد قوت کا ایک دوسری طرح عمل ہوتا ہے۔ وہ تصورات کو اپنے فن کے سنہری جال میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے پھنسا لیتا ہے۔ وہ انہیں غیر فانی بنا دیتا ہے تاکہ دوسرے بھی انہیں دیکھ سکیں اور حقیقت تک پہنچ سکیں۔ ذیل میں ایک شاعر کے چند سطور درج کئے جاتے ہیں جن سے روحانی کلام کی مثال واضح ہوگی۔

خیال کی ابتدائی تحریک خارجی دنیا کیطرف سے ہوتی ہے۔ غریبوں کی انتہائی مصیبت اور انکی دردناک بیکسی ناکام حسرت صبر و شکر، یہ باتیں شاعر کے حساس دماغ پر اثر ڈالکر حالت فکر طاری کرتی ہیں شاعر سوچ میں ڈوب جاتا ہے غریبوں کے مصائب کا خیال کرکے اس کا دل کڑھتا ہے اور وہ اپنے

دل سے یہ سوال کرتا ہے کہ آخر خدا کا انصاف کہاں ہے، خدا ان سے محبت کیوں نہیں کرتا، ان پر ترس کیوں نہیں کھاتا؟ پھر آہستہ آہستہ اس کے ذہن میں ایک خیال پیدا ہوتا ہے۔ خدا ہی خدا ہے، یہ اسکا کامل ایمان ہے۔ بذات خود دنیا کی ان فقیر ترین ہستیوں کے ساتھ رہتا ہے، انہیں کے لباس میں انکا دوست۔ انکا ساتھی، انکا رہنما بنکر۔ شاعر فرط انبساط سے اچھل پڑتا ہے اس کے دل سے اللہ اکبر کی صدا نکلتی ہے، اور وہ جذبہ پرستش سے بے اختیار ہو کر سربسجدہ ہو جاتا ہے۔ مگر محسوس کرتا ہے کہ اسکا سر جھک کر بھی اس پستی تک نہیں پہنچ سکتا جہاں خدا کے قدم "مفلسوں، فقیر دل، اور گم گشتگوں کے ساتھ رہتے ہیں!"۔

یہ ہے تصور جسکو شاعر نے روحانی کلام کی صورت میں لاکر غیر فانی بنا دیا ہے۔ ہم جو اس روحانی کلام سے واقف ہیں، جب بھی چاہیں انہیں پڑھ پڑھ کر شاعر کی طرح جھومیں اور جو کچھ اس نے دیکھا خود بھی دیکھیں۔

آئیے اب ایک ایسے آدمی کا خیال ذہن میں لائیں جو شاعری کی جگہ عمل کی خداداد قوت بدرجہ اتم رکھتا ہے۔ اسے بھی ایسا عمدہ تصور نظر آ سکتا ہے۔ وہ بھی ان غم زدوں کی حالت پر غمگین دل کیساتھ سوچ میں ڈوب سکتا ہے۔ اس غور و فکر کے وقت میں خارجی دنیا جو اسکا موضوع فکر ہوتی ہے، اس کے سامنے غیر معمولی اہمیت حاصل کر کے اسے براہ راست عمل کیطرف لیجاتی ہے اور وہ اپنے آپ کو مفلسوں، حقیر دل، اور گم گشتگوں سے جا ملاتا ہے۔

ایک شاعر اور عملی انسان میں یہی فرق ہے۔ وہ خارجی دنیا جو عملی انسان کے سامنے ہوتی ہے اس سے اپنی خدمت اور اصلاح کا مطالبہ کرتی ہے۔ عملی انسان اس مطالبہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتا ہے لیکن شاعر خارجی دنیا کے پنجے میں نہیں آتا۔ وہ اس کے مطالبہ کے جواب میں شعر کہہ دیتا ہے۔ شاعر کے جواب کو ہم اپنی اصطلاح میں "روحانی کلام" کہتا ہوں اور عملی انسان کے جواب کو "روحانی عمل"۔

دونوں روح ایک ہی کیفیت کی پیداوار ہیں۔ لیکن ایک ہی کیفیت کا دو طرح اظہار کیونکر ہو سکتا ہے؟ اس لئے کہ شاعر کی دماغی ساخت عملی انسان کی دماغی ساخت سے مختلف ہوتی ہے

مضراب ایک ہی ہوتا ہے۔ ساز دو ہوتے ہیں۔ ایک کا نغمہ روحانی کلام ہے دوسرے کا نغمہ روحانی عمل

لیکن میرا دعوٰے ہے کہ شاعر اور عملی انسان میں فرق یہ نہیں ہے کہ وہ بے عمل ہے اور یہ باعمل ایک شاعر، عارف، جو حقیقت کا ادراک و مشاہدہ کر سکتا ہے اور اپنے واردات قلب کو غیر فانی بنا کر ہر زمانے کے لوگوں کو اپنا ہم آہنگ بنا سکتا ہے، اس کا شعر کہنا بھی اسی طرح عمل ہے جس طرح کسی عملی انسان کی ٹھوس محنت فرق صرف یہ ہے کہ وہ عالم معقول میں ہوتا ہے اور یہ عالم محسوس میں۔

کچھ اور کہنے سے قبل میں مثلاً رابندر ناتھ ٹیگور کو ایک بڑے شاعر اور مہاتما گاندھی کو ایک بڑے عملی انسان کی حیثیت سے پیش کرتا ہوں جن میں سے ہر ایک ان اوصاف سے متصف ہے جن کا میں نے تذکرہ کیا ہے۔

اس سے میری یہ مراد نہیں کہ دونوں اپنے اپنے دائرہ عمل کے اسقدر پابند ہیں کہ دوسرے کے دائرہ عمل میں قدم نہیں رکھ سکتے۔ اس سے مراد صرف یہ ہے کہ فطرت نے دونوں کو جو غیر معمولی صلاحیتیں بخشی ہیں انہیں سے کسی ایک کا حقیقی مدعا دوسرے کے دائرۂ عمل میں کام کرنے سے نہیں پورا ہو سکتا۔ ٹیگور صرف شاعروں ہی کے سرتاج نہیں ہیں۔ وہ صرف بلندی تخیل اور ملکۂ شعر گوئی ہی نہیں رکھتے بلکہ ایک عملی انسان کے اوصاف بھی رکھتے۔ اور بہت سے مفید خیالات کو عملی جامہ بھی پہنا چکے ہیں۔ انہوں نے بھی خدمت خلق کا بیڑا اٹھایا ہے اور دنیا کے سرگرم خادموں میں شمار کئے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح مہاتما جی کی عظمت کا ثبوت صرف میدان عمل میں نہیں ملتا۔ فکر و تخیل کی سلطنت میں بھی ان کے لئے جگہ ہے۔ انہوں نے بھی چشم تخیل سے محبت اور حسن و ہمدردی کے دلفریب پیکروں کا نظارہ کیا ہے۔ انہوں نے بھی حسن اور عظمت کے ایسے تخیلات کو وجود بخشا ہے جن سے روح اہتزاز کرتی ہے اور جو ہمیں اپنے تنگ گھروں سے نکال کر امید اور محنت کی وسیع دنیا میں پہنچا دیتے ہیں۔ تاہم یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک کی ممتاز خصوصیت روحانی کلام اور دوسرے کی روحانی عمل ہے۔

جس وقت کلام کا بادشاہ عمل کی سلطنت میں قدم رکھتا ہے تو اسے کو لازمی طور پر گزرنا پڑتا ہے یہی حال عملی انسان کا ہے جب وہ کلام کی سلطنت میں گامزن ہوتا ہے۔ کیونکہ انہیں سے ہر ایک اپنے

کو ایک ایسے عالم میں پاتے ہیں جس کی بیشتر چیزیں آسے نئی عجیب اور بعض اوقات بے معنی نظر آتی ہیں جو قوت ٹیگور گاندھی کی دنیا میں آکر چرخوں اور دستکیوں کی سمع خراش آوازوں کو سنتے اور نفس کش مہاتما کارکنوں، ان کے موٹے کپڑوں، گرد آلود پیروں، اور عرق آلود چہروں پر نظر ڈالتے ہیں تو خواہ ان کا دماغ یہ سمجھ سکے کہ ان مشقتوں کی تہ میں غریبوں سے محبت و ہمدردی کا جذبہ کام کر رہا ہے لیکن وہ گھبرا کر ضرور کہہ اٹھتے ہیں کہ بھلا یہ دنیا اپنی بامنا لطکلیوں اور لامتناہی مشقتوں کے ساتھ میری منور، معطر اور پُر نغمہ دنیا کا کیا مقابلہ کر سکتی ہے، جہاں کا آسمان قدرت کے بوقلموں رنگوں سے رنگین و روشن ہے جہاں کے گل بوٹوں سے محبت کی خوشبو نکلتی ہے، اور جہاں کے پرندے نغموں کی آتش سیال کا جام پیش کرتے ہیں۔ اسی طرح مہاتما گاندھی جنہوں نے اپنے حواس و جذبات پر قابو حاصل کر کے انہیں عقل اور قوت ارادی کے تابع کر لیا ہے۔ ٹیگور کی دنیا میں داخل ہو کر یہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس عیش و نشاط کے کیا معنی جب دنیا کی وسیع بستی میں لوگ بھوکوں مر رہے ہیں، جب افلاس سے مفلسوں کی جھونپڑیاں تاریک اور روحیں تاریک تر رہتی ہیں اور جب ہر شخص کا پہلا فرض یہ ہونا چاہئے کہ وہ غریبوں اور ضرورتمندوں کی حاجت روائی کرے۔ یہ ٹیگور اور گاندھی کے اختلاف طبع کا ہی کا نتیجہ ہے کہ ایک چرخہ کے امکانات کو نہیں سمجھ سکتا اور دوسرا فنون لطیفہ کے پیام کو۔

شاعر کا دماغ عموماً باتوں کی تحلیل نہیں کر سکتا۔ وہ فطرتی طور پر ترکیب کی زیادہ صلاحیت رکھتا ہے دوسری طرف اخلاقی حیثیت، جس کا اثر مہاتما گاندھی پر غالب ہے، جمالی حیات کو ابھرنے نہیں دیتی۔

جو شخص اپنی فطرت کے ایک ہی حصہ کی تکمیل چاہتا ہے، ممکن ہے اس کوشش میں کامیاب ہو۔ مگر وہ اس پوری تکمیل سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے جو ہر دو حصص کی متناسب تکمیل سے ممکن ہے

برگساں نے اپنی کتاب مابعد الطبیعات میں لکھا ہے کہ کسی بات کا مفہوم سمجھنے کا بہترین طریقہ یہ نہیں ہے کہ آدمی اس کی کوشش میں عقل کو اس کے گرد چکر دیتا رہے بلکہ چاہئے کہ روحانی اتحاد کے ذریعہ جسے وہ وجدان کہتا ہے، اس چیز کی تہ تک پہنچ جائے، اور پھر آنکھ کھول کر دیکھے ؛؛

حقیقت تک پہونچنے کا بہترین ذریعہ یہی وجدانی ذریعہ ہے عقل کیلئے بیش بہا بخشش ممکن ہے

کہ وہ مسئلہ کے کسی ایک رخ کو کسی خاص نقطۂ نظر سے دیکھے لیکن وجدان سے مسئلہ کی پوری نوعیت کا انکشاف ہو جاتا ہے

یہ وجدان شاعر میں بھی ہوتا ہے اور عملی انسان میں بھی۔ لیکن اسی وقت تک جب تک کہ وہ اپنے اپنے دائرہ عمل میں ہوں۔ اس لئے کہ وجدان مجموعی شخصیت کی ایک صفت ہے۔ شاعر کی شخصیت کا رجحان عالم معقول میں تخلیق کی طرف ہوتا ہے۔ اور عملی انسان کی شخصیت کا رجحان عالم محسوس میں عمل کیطرف۔

ممکن ہے کبھی شاعر ہمدردی کے جذبہ سے متاثر ہو کر عالم معقول میں سرگرم عمل ہونا چاہے۔ مگر چونکہ یہاں کام کرنا اس کی شخصیت کے رجحان کے خلاف ہوگا۔ وجدان اس کی رہنمائی نہیں کرے گا اور اسے صرف اپنی عقل پر بھروسہ کرنا پڑے گا جو خام ہونیکی وجہ سے حقیقت کو نہیں سمجھ سکتی۔ پس اسکے کام کی حالت بالکل ابتر رہے گی۔ یہ اسی سبب کا نتیجہ ہے کہ ٹیگور جب چرخہ پر کچھ لکھتے ہیں تو تشبیہوں اور استعاروں کے میدان میں بھٹک کر نفس مضمون سے دور ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح ایک عملی انسان عالم معقول میں آکر وجدان کی رہنمائی سے محروم ہو جائیگا۔ اسکو بھی یہاں صرف عقل سے کام لینا پڑے گا جس سے حقیقت تک رسائی نہیں ہو سکے گی۔ پس وہ عالم معقول کی باتیں سمجھنے سے قاصر رہیگا۔ خود مہاتما گاندھی اس درماندگی کی زندہ مثال ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا چرخے پر ٹیگور کے اعتراضات کے جواب میں انکا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے صریحاً ٹیگور۔ یا اگر وہ نہیں تو فنون کے متعلق اشارہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ دنیا میں اس ساحر کو با آسانی عزت کی جگہ مل جاتی ہے جو نئی اور چیکا چوند پیدا کرنیوالی چیزیں پیش کرے۔ یہ بات اگرچہ مہاتما گاندھی کے قلم سے نکلی ہے مگر ہمیں اس کے ماننے میں قطعی تامل ہے۔ فنون کی دنیا میں جو نئی نئی تخلیقیں ہوتی رہتی ہیں ان میں صرف ظاہری چمک ہی نہیں ہوتی بلکہ قیمتی جوہر بھی ہو سکتا ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ہر بڑی تخلیق روح کے لئے ایک ضروری پیغام رکھتی ہے اور آپ ٹیگور ہی کے گیتوں کو پڑھ دیکھئے۔

طلوع فجر کے وقت، جبکہ ستاروں کی مدھم شمعیں ہنوز سلسلہ دار رخصت ہونے کے قریب ہوں جن جھلملاتی ہیں۔ چڑیاں کی چہچہاہٹ سکوت آشرم کی فضا کو نغموں سے معمور کرتی ہوئی گزرتا ہے، تو میرا

دل والے نغموں محض نغموں کو سنکر اسی طرح مسرور ہوتا ہے جس طرح مہاتما گاندھی کے کاموں میں کوئی نئی خوبی معلوم کرکے۔ یہ نغمے، یہ گلہائے چمن شاعری، زندگی کی عظمت مآب حقیقت کا اسی طرح جزو ہیں جس طرح ہمدردی کے کام، یا خدمت خلق، بلکہ یہ خود بھی کارہائے ہمدردی میں داخل ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہ لطیف تر ہیں۔

مہاتما جی کا یہ کہنا بھی خلاف واقعہ ہے کہ دنیا ارباب فن کو آسانی سے عزت کی جگہ دیدیتی ہے اکثر مثالیں اس بیان کی تغلیط کرتی ہیں۔ رولینڈ کو سالہا سال کتنی مشقت اور جانفشانی سے کام کرنا پڑا لوگوں کے اختلاف سے اس کو کیسی کیسی تکلیفیں اٹھانی پڑیں۔ کیٹس دل شکستگی کے صدمہ سے جانبر نہ ہوسکا خود رابندرناتھ ٹیگور باوجود خداداد لیاقت کچھ آسانی سے نامور نہ ہوسکے۔ انہیں کس کس طرح دل جلانا پڑا۔ تنگ نظر قدامت پسندوں کی کیا کیا نہ سننی پڑی۔ اور آج بھی جبکہ ساری دنیا میں انکی شہرت ہے، بنگال بلکہ سارے ہندوستان کے اندر کتنے لوگ ایسے موجود ہیں جو ان سے نفرت رکھتے ہیں۔

کسی بڑے آرٹسٹ کی جدت پسندی سے پرانی چیزوں کو کہیں نہ کہیں صدمہ ضرور پہونچتا ہے چونکہ انسان قدامت پسند واقع ہوا ہے۔ اسے گوارا نہیں کرتا۔ پس آرٹسٹ کو لوگوں کی مخالفت کرنی اور اس کی سزا بھگتنی پڑتی ہے۔ وہ بھی صلیب پر لٹکایا جاتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس کی صلیب لوہے اور کیلوں سے نہیں بلکہ ذہنی و روحانی کوفت سے بنتی ہے۔

پھر کہتا ہوں میرا یہ دعوے نہیں کہ مہاتما گاندھی کا دل جمالی حس نہیں رکھتا۔ کانٹ کی طرح انہیں بھی تاروں بھرے آسمان کو دیکھکر وجد آتے ہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ مہاتما گاندھی جیسا عملی انسان ایک شاعر کی طرح حسن کو خدا نہیں سمجھتا۔ وہ اسے ایک ثانوی چیز سمجھتے ہیں اور تقویٰ اور ضبط نفس پر زور دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ فنون کو صرف ظاہری طمطراق کی چیز خیال کرتے اور انکو لوازمات زندگی سے بے سروکار سمجھتے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "اڑیسہ کے فاقہ زدوں کا خیال مجھے خواب میں رہتا ہے اور بیداری میں بھی جو چیز انہیں بچائے وہی میری نگاہوں میں حسین ہے" یہ ہے انکی جمالیات

پس یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ٹیگور اور گاندھی جدا جدا سلطنتوں کے تاجدار ہیں۔ ایک کی سلطنت عالم

معقول میں ہے۔ دوسرے کی سلطنت عالم محسوس میں۔ ایک کا نشاحیات دنیا کو اپنے روحانی کلام سے مستفیض کرنا ہے۔ دوسرے کا روحانی عمل سے۔

مگر یہی کہہ دینے سے قصہ ختم نہیں ہوجاتا کہ ٹیگور ٹیگور ہیں اور گاندھی گاندھی ہیں یہ غور کرنا ہے کہ انسان کا نصب العین کیا ہونا چاہئے۔ میرے نزدیک تو کامل انسان وہی ہے جس میں دونوں کے خصائص جمع ہوں۔ زندگی بہت پیچیدہ ہے۔ اس کے اندر مختلف عناصر ہیں، جو کبھی تو متصادم ہوتے ہیں اور کبھی ہم آہنگ، ہمارا نصب العین انہیں عناصر کی کامل ہم آہنگی ہونا چاہئے جس سے ہم اس درجہ پر پہونچ جائیں جہاں کا انسان گیتا کے الفاظ میں۔

"بحر زخار کے مانند ہے، جو دنیا کے سیلابوں کو اپنی آغوش میں لیستا ہے مگر ابل نہیں پڑتا جس میں دریاؤں سے پانی آتا ہے مگر سیلاب نہیں پیدا کرتا۔ اس کی روح کے سمندر میں دنیا مادی . . . . کے چشمے آ آکر ملتے ہیں مگر وہ جس کا تس رہتا ہے، ان سے پانی کا خراج لیتا ہے مگر سمندر ہی رہتا ہے"

معلوم نہیں اس نصب العین تک کوئی پہنچ سکے گا یا نہیں۔ مگر ہمیں اس کے امکان یا عدم امکان سے کوئی بحث نہیں ہونی چاہئے۔ کیونکہ نصب العین اس بلند معیار کا نام ہے جو ہمارے خیال میں آسکتا ہے۔ خواہ وہ قابل عمل ہو یا نہ ہو۔

لیکن یہاں ایک نیا مسئلہ درپیش ہوجاتا ہے۔ اس کامل ہم آہنگی تک پہونچنے کے طریقے مختلف ہوسکتے ہیں۔ یہ مسلسل کوشش اور تدریجی ترقی سے بھی حاصل ہوسکتی ہے اور ذہن کی نوری وجدانی حرکتوں سے بھی۔

یہاں پھر ہم گاندھی اور ٹیگور کی مثالیں پیش کرسکتے ہیں۔ گاندھی مسلسل کوشش کے ساتھ چل رہے ہیں، ہر کوشش کا اثر ان کی شخصیت پر پڑکر کچھ نہ کچھ تبدیلی پیدا کرتا اور اسے تکمیل کی طرف لیجاتا ہے۔ لیکن ٹیگور کی شاعرانہ طبیعت اس سیدھے راستے پر نہیں بستی ہے۔ وہ کچھ دور چلتے پھر بہک کر غائب ہوجاتے ہیں ۔۔۔ معلوم ہوتا ہے کہ بالکل گم ہوگئے۔ مگر دوسری بار پھر جب ان پر شاعرانہ کیفیت طاری ہوتی ہے

تو وہ بجلی کی طرح اڑتے اور ایک لمحے میں حقیقت سے ہمکنار ہو جاتے ہیں۔

عامۃ الناس کو گاندھی کا آہستہ تدریجی ترقی کا راستہ زیادہ بھاتا ہے، کیونکہ یہ یقینی معلوم ہوتا ہے اگرچہ مشکل ہے لیکن شاعر کی پرواز بہت کم لوگوں کے لئے ممکن ہے۔ گاندھی کی ترقی میں ذہنی اور اخلاقی اثر غالب ہے۔ ٹیگور کی ترقی میں جمالی اور جذباتی۔

کوئی نہیں بتا سکتا کہ کون طریقہ بہتر ہے۔ ہم ان میں سے وہی اختیار کر لیتے ہیں جو ہماری طبیعت کے موافق ہو۔ اگر کوئی "دساتی" یا "بزاز" گاندھی کا طریقہ اختیار کرتا ہے، تو اس سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انکی طبیعت اس طریقہ کے موافق ہے۔ دوسری طرف اگر کوئی جمالی ذوق رکھتا ہے تو اس کے لئے صرف ٹیگور ہی کا طریقہ ممکن ہے۔ ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا غلطی ہے۔

عرب فرانسیسی ادبیات میں

رولان کا گیت

(۵)

مارسل کو جب ہوش آیا تو اسے اس کے خاص محراب دار کمرہ میں لے گئے، اس کمرہ میں رنگ برنگ کی تصویریں بنی ہوئی تھیں(۱)۔ بلکہ براسیموند اس کی حالت پر زار قطار رو رہی تھی اور اپنے بال نوچے ڈالتی تھی، کبھی زور زور سے چیخیں مار کر یوں کہتی تھی:۔

"افسوس اسار اگوس کے نام پر کیسا انمٹ دھبہ لگے گا اگر بادشاہ مارسل آج دنیا سے اٹھ گیا ہمارے سب خدا دھوکے باز نکلے، آج صبح انہوں نے ہمارے بادشاہ کو دشمن کے ہاتھوں شکست دلوائی۔ اگر امیر فرانسیسیوں سے لڑنے نہ آیا جنہیں اپنی جانوں کی بالکل پروا نہیں، تو بڑی بزدلی کا ثبوت دیگا۔ اگر وہ ان سے لڑنے آیا تو انکا بادشاہ جس کی داڑھی پھولوں کی سی ہے بھاگے گا۔ تھوڑی، وہ بڑا گھمنڈی اور بہادر ہے، افسوس! ہمارے آدمیوں میں کوئی نہیں جو اسے قتل کر ڈالے۔

بادشاہ شارل پورے سات سال اسپین میں رہا، کوئی گڑھی اور قلعہ نہیں جو اسنے فتح نہ کر لیا ہو، مارسیل نے مقابلہ کی پوری تیاریاں کیں، ہر ہر لگوا لگوا کر اپنی حکومت میں ہر جگہ حکمنامے بھجوائے اور بابل کے امیر بالیگان سے مدد کی درخواست کی، یہ امیر بڈھا اور زمانہ دیکھے ہوئے تھا، اُس کی عمر درحیل

---

(۱) اندلس کی مسلمانوں کی فنون لطیفہ کی ترقی مسلم ہے، اس گیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ازمنہ وسطی کی مسیحی دنیا میں مسلمانوں کی اس ترقی کا ہر جگہ چرچا تھا، یورپ کے موجودہ فنون لطیفہ خصوصاً موسیقی اور تصویر کشی مسلمانوں کے بڑی حد تک رہین منت ہیں، نشاۃ الثانیہ کے اطالوی مصوروں کی تصویریں صاف بول اٹھتی ہیں کہ کس حد تک وہ ایرانیت سے متاثر ہیں، عہد رفائل سے قبل کی تصویروں کو دیکھ کر نہ جاننے والا بڑی مشکل سے تمیز کر سکتا ہے کہ آیا انمیں کوئی چیز ہے جو مشرقی نہیں جس طرح فن تصویر کشی کی موجودہ تحقیقات اس ایرانی اثر کو تسلیم کرتی ہے اسی طرح موسیقی میں عربی اثر مسلم ہے۔

اور یہ ہو مرکی عمروں سے بھی زیادہ تھی، مارسیل نے اسے کہلا بھیجا کہ اگر وہ اس کی مدد کو آتا ہے تو آئے ورنہ وہ اس کے خداؤں سے انکار کر دے گا اور اس کے بتوں کو پوجنا چھوڑ دیگا اور مسیحی قانون ایمان قبول کر کے شارل سے صلح کرلے گا۔

امیر بالیگان بہت دور ہے، آتے آتے بھی اسے بہت دیر لگے گی، اس نے مارسیل کا پیغام سنکر اپنی چالیس ولایتوں سے آدمی طلب کئے، اپنی ساری کشتیاں، ڈونگے اور جہاز تیار کرلئے سکندریہ کے قریب اسکا بندرگاہ[1] ہے اس نے اپنا سب بیڑا وہاں اکھٹا کیا۔ مئی کے مہینے میں گرمیوں کے موسم کے شروع میں، وہ اپنے بیڑے کو لیکر سمندر میں روانہ ہوا، ان کافروں (بتپاں) کی فوجیں بہت تھیں، وہ بادبانوں کی مدد سے بڑے زور شور سے اپنی کشتیاں کھیتے ہوئے چلے آرہے ہیں، مستولوں کے سرے پر اور جہازوں کے عرشوں پر اور سب کشتیوں میں چراغ جل رہے تھے۔ ان چراغوں کی روشنی سے سارا سمندر جگمگا رہا تھا، جب وہ اسپین کی سرزمین کے قریب پہونچے تو کنارا روشنیوں سے جھلمل جھلمل ہونے لگا۔

ان کافروں کو آرام کرنیکی ذرا بھی پروا نہیں، سمندر چھوڑ کے فوراً وہ میٹھے پانی (یعنی دریا) میں داخل ہوگئے، مارابریز، ورمابروز سے گزرتے ہوئے دریائے ابرا میں انہوں نے اپنی کشتیاں ڈالدیں، رات بھر دریا کے کنارے روشنی سے جگمگاتے رہے اور سویرے ہی سویرے وہ سارا گوس پہونچ گئے۔

دن روشن تھا اور سورج خوب چمک رہا تھا، امیر اپنے آدمیوں کے ساتھ کشتیوں سے اترا

---

(۱) بادشاہ بابل کا سکندریہ کے قریب بندرگاہ بنانا یورپ کی ازمنہ وسطیٰ کی جغرافی معلومات کا بڑا پر لطف اظہار ہے اسلامی تاریخ میں اس قسم کا کوئی واقعہ درج نہیں کہ اندلس کے مسلمانوں کی مدد کے لئے کسی دوسرے ملک کے مسلمان آئے ہوں، ممکن ہے مراکش یا شمالی افریقیہ سے کبھی کچھ مدد آئی ہو جسے بھاٹوں نے شاہ بابل کی مدد سمجھا، یا یہ کہ بابل اور اسکندریہ کے نام عوام میں خاص اہمیت رکھتے ہونگے اور اپنے مخصوص اغراض کے لئے ان ناموں کا استعمال اس بات پر دال ہے کہ وہ مغنا نگوئی کے گروہ اور عوام کی نفسیات سے خوب واقف تھے اور بہت اچھے پیدا کرنے والے تھے۔

اس کے سیدھے ہاتھ پر اپانیلر تھا، سترہ باجگزار بادشاہ اس کے پیچھے پیچھے تھے، ان تولیوں اور باجگزاروں کا شمار نہیں جو ان بادشاہوں کی اردلی میں تھے، ایک پیڑ کے تلے ہکیت کے بیچوں بیچ ہری گھاس پر سفید ریشم کی چادر بچھا کے اس پر ہاتھی دانت کا تخت رکھا گیا اور اس پر کافر بالیگان بیٹھا، دوسرے سب کھڑے رہے۔ تھوڑی دیر بعد بالیگان نے یوں تقریر شروع کی :-

میرے بہادر دوستو! اگر میں حکم دوں کہ بادشاہ شارل پر کھانا پینا حرام کر دو تو ایسا ہی ہو۔ اس نے اسپین میں ہر طرف دنگا فساد مچا رکھا ہے، میں اسوقت تک چین سے نہ بیٹھوں گا جب تک کہ وہ ہار نہ مان لے یا قتل نہ ہو جائے" اس بات کی پوری تصدیق کرنے کے لئے اس نے اپنا سیدھا دستانہ گھٹنے پر مارا؛

بالیگان نے پوری طرح یہ بات اپنے دل میں ٹھان لی ہے کہ آسمان کے نیچے جتنا سونا ہے اس کے بدلے میں بھی ایکس جائے بغیر مانے گا نہیں، ایکس شارل کا دارالسلطنت ہے، وہ وہاں اپنی کچہری جماتا ہے، بالیگان کے سب مصاحبوں نے اس کی ان باتوں پر خوب تعریف کی، بالیگان نے اپنے دو مشہور سوار کلارفان اور کلیریان کو طلب کیا اور ان سے کہا :-

"تم دونوں بادشاہ مالیترین کے بیٹے ہو جو خوش خوش ہمارے پیغام ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچایا کرتا تھا، میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ تم دونوں ابھی ساراگوس جاؤ، میری طرف سے ہم سب کے پہنچنے کی خبر بادشاہ مارسیل کو پہونچاؤ اور اسے ہر طرح سے دم دلاسا دو کہ ہم لوگ فرانسیسیوں کے خلاف اس کی مدد کو آن پہونچے ہیں، پہلا موقع ملتے ہی ہم لڑائی شروع کر دینگے، ان باتوں کی ضمانت میں میرا سنہرا دستانہ تہہ کر کے اسے دو اور اسے سیدھے ہاتھ میں پہننے کو کہنا، یہ خالص سونے کی چھڑی بھی لے جاؤ، اسے اپنی باجگزاری کے اعتراف کے لئے بھی کہنا اور اسے یقین دلانا کہ شارل سے جنگ کرنے کو ہم فرانس تک میں جانے کو تیار ہیں، اگر شارل اس بات پر تیار نہیں کہ مجھ سے معافی مانگے، رحم کی درخواست کرے، میرے پاؤں پڑے اور عیسائی قانون سے انکار کرے تو میں اس کے تاج اور ملک سب پر قبضہ کر لوں گا" یہ سب مصاحب چلا اٹھے، واہ واہ، حضور نے کیا بات کہی ہے۔

بالیگان۔میرے سوار جاگیردارالو تم میں سے ایک دستانہ لیجائے اور دوسرا پگڑی مخدوم نے کہا کہ وہ اسکی مرضی کے مطابق سب کارروائی کرینگے۔انہوں نے گھوڑے سرپٹ چھوڑ دئے اور بہت جلد ساراگوس پہونچ گئے، دسوں پھاٹکوں سے گزر کر اور دریا کے چاروں پلوں کو پار کرکے وہ میدی شہر پر پہونچے، اسی سڑک پر کھاتے پیتے لوگ رہتے تھے، جب وہ خاص شہر کے قریب پہونچے تو انہیں محل کی طرف سے شور وغل سنائی دیا، جب وہ محل کے قریب پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ کافروں کی پوری نسل ماتم کر رہی ہے، جسے دیکھو رونے پیٹنے میں مشغول ہے، وہ اپنے خداؤں، ترا واگان، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اپولون پر تبرا بھیج رہے تھے، اور آپس میں یوں باتیں کر رہے تھے:

"بدنصیبی! ہماری اب کیا حالت ہوگی؟ ہم پر یہ بلائیں کہاں سے نازل ہو رہی ہیں؟ ہم اپنے بادشاہ مارسیل کو کھو بیٹھے، رولان کی تلوار نے کل اسکا ایک ہاتھ کاٹ ڈالا، سارا اسپین اب فرانسیسیوں کے رحم پر ہے۔"

یہ باتیں سنکر دونوں ایلچی اپنے گھوڑوں سے اتر پڑے اور انہیں ایک نزدیک زیتون کے پیڑ کے قریب چھوڑ دیا، دو عرب انکی لگام پکڑے کھڑے رہے، دونوں ایلچی مع اپنے لبادوں کے محل کی سب سے اونچی منزل پر چڑھ گئے، جب وہ محراب دار کمرے میں داخل ہونے لگے تو دوستانہ طریقہ پر انہوں نے یوں سلام کیا:۔

"کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ترا واگان اور اپولون ہمارے آقا بادشاہ مارسیل اور رانی کو ہمیشہ سلامت رکھیں۔"

براممیوند۔میں یہ آج کیسی حماقت کی باتیں سن رہی ہوں، یہ سارے خدا جن کے تم نے ابھی نام لئے سب نکمّے نکلے، سب نے ہمیں دھوکا دیا، رانسیوو میں انہوں نے جھوٹے معجزے دکھائے، انہوں نے ہمارے سواروں کو وہیں خاک وخون میں بڑا مرنے دیا اور میرے میاں کی لڑائی میں کوئی مدد نہیں کی، فرانسیسیوں کے مشہور کونت رولان نے اسکا سیدھا ہاتھ کاٹ ڈالا، اب سارا اسپین شارل کی نوابی میں چلا جائیگا، بتاؤ میں اب کیا کروں، میں غمزدہ ہوں، بیادہ ہوں، ہائے افسوس کیا کوئی نہیں

جو میرا بھی خاتمہ کر دے "

کلیر یان - ایسی اٹکل پچو باتیں نہ کرو، ہم لوگ بالیگان کے ایلچی ہیں، وہ مارسیل کی حمایت کا وعدہ کرتا ہے، اس نے ضمانت کے طور پر اپنا دستانہ اور اپنی چھڑی بھی دی ہے، دریائے ایبر کے کنارے ہمارے چار ہزار بہادر جہازوں، کشتیوں اور ڈونگوں میں پڑے ہیں، ہمارا بیڑا اتنا بڑا ہے کہ مجھے ٹھیک تعداد بھی یاد نہیں - امیر قوت والا زبردست ہے، شارل کے پیچھے وہ فرانس تک جائے بغیر ماننے والا نہیں، وہ یا تو اُسے قتل کریگا یا اپنے رحم سے اسے معاف کر دیگا "

برامیموند - بھلا فرانسیسیوں کا پیچھا کرنے کے لئے اتنی دوڑ دھوپ کی کونسی ضرورت ہے وہ یہاں سے بہت فاصلہ پر نہیں، آج سات برس سے بادشاہ شارل اس ملک میں ہے، وہ ایسا مضبوط اور زبردست ہے کہ کبھی لڑائی کے میدان سے منہ موڑنا نہیں جانتا، آسمان کے نیچے کوئی بادشاہ نہیں جس سے اسے ڈر ہو، شارل دنیا میں کسی کا ڈر نہیں مانتا "

بادشاہ مارسیل - اچھا، اب یہ قصہ چھوڑو (ایلچیوں سے مخاطب ہوکر) تمہیں مجھ سے بات چیت کرنا ہے تم دیکھتے ہو میں موت کے منہ میں ہوں، میرا کوئی وارث نہیں، ایک بیٹا تھا وہ قتل ہوا، اپنے آقا سے کہو کہ آخری وقت میں مجھے دیکھ جائیں، میں امیر بالیگان کو اسپین کی زمین کے سارے حقوق دیتا ہوں میں اسے سیاہ سفید کا اختیار دیتا ہوں، لیکن اسے فرانسیسیوں کے خلاف ملک کی مدافعت کرنی پڑیگی میری ایک آرزو ہے کہ ایک مہینے کے اندر اندر تم شارل کو قید کر لو - امیر بالیگان سے کہو کہ وہ بغیر کنجیوں کے سارا گوس فتح نہیں کر سکے گا، کنجیاں میرے پاس ہیں، انہیں لیجاؤ "

دونوں ایلچی - جی حضور آپ بالکل درست فرماتے ہیں،

مارسیل - شارل نے مجھے، میرے آدمیوں کو اور میرے سارے ملک کو تباہ کر ڈالا شہروں کو مجبور کر کے اس نے لوٹا، اس رات وہ دریائے ایبر کے کنارے خیمہ ڈالے پڑا ہے، مجھے معلوم ہے یہ جگہ یہاں سے سات کوس سے زیادہ نہیں ہوگی، امیر سے اس طرف اپنی فوجیں لیجانے کو کہو میرا پیغام ہے کہ شارل سے فوراً لڑائی شروع کر دو "

یہکر مارسیل نے سارا گوس کی کنجیاں ایلچیوں کے حوالے کیں، دونوں ایلچی کورنش بجالائے اور رخصت ہوئے۔

دونوں نے گھوڑے سرپٹ دوڑانا شروع کئے اور بہت جلد امیر بالیگان کے پاس پریشان پہونچے اور شہر سارا گوس کی کنجیاں اس کے حوالہ کیں، کنجیاں لیکر بالیگان نے کہا:-

"تم کیا کر آئے؟ مارسل کہاں ہے؟ تم نے میرا پیغام پہنچا دیا؟"

کلیریان۔ مارسیل کو بڑے مہلک زخم لگے ہیں، بادشاہ شارل بڑے پہاڑوں کے قریب سے گزر کے فرانس واپس جانا چاہتا تھا، اس نے اپنے عقب میں اپنے بھتیجے رولان اور اولیوے اور بارہ نوابوں کو مع بیس ہزار فرانسیسی فوج کے چھوڑ دیا تھا، بادشاہ مارسل نے اس عقب کی فوج سے لڑائی کی، رولان اور اسکا مقابلہ ہوا اور رولان نے اپنی درونڈال سے ایسا وار کیا کہ مارسل کا سیدھا ہاتھ دھڑ سے الگ ہوگیا۔ مارسیل کا بیٹا بھی جس سے اسے بہت محبت تھی، رولان کے ہاتھ سے قتل ہوا، سب بڑے بڑے نواب بھی مارے گئے، مارسیل جان بچا کر بھاگ آیا، شارل اسکا پیچھا کر رہا ہے، اب مارسیل کی ساری امیدیں آپ کی امداد پر ہیں، وہ اسپین کی ریاست پر آپ کے حقوق تسلیم کرتا ہے۔

بالیگان نے یہ سب باتیں سنیں اور کچھ سوچنے لگا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ غم سے پاگل ہو جائے گا۔

کلیریان۔ حضور والا! انسیو کے مقام پر کل بڑی گھمسان کی لڑائی ہوئی، رولان اور اولیوے اور بارہوں نواب قتل ہوئے، لیکن مارسل کا بھی کوئی سپاہی باقی نہیں رہا جو فرانسیسیوں کے ہاتھوں قتل نہوا ہو یا دریائے ایبر میں ڈوب کر نہ مرا ہو۔ فرانسیسی دریا کے کنارے خیمہ زن ہیں، وہ ہم سے بہت نزدیک ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو انہیں فرانس واپس جانا دشوار ہو جائے۔

کلیریان کی باتیں سنکر بالیگان کی نظروں سے خوشی، جوش اور غرور ٹپکنے لگا، اپنے تخت پر سیدھے کھڑے ہو کر اس نے یوں تقریر شروع کی:-

"میرے نوابو! اب کیا دیر ہے؟ اپنی کشتیوں اور رونگوں سے باہر نکلو اور گھوڑوں پر چڑھیں

کس طرح مارسل کے ہاتھ کٹنے کا بدلا لینا ہے، ہاتھ کے بدلے میں ہمیں چاہیئے شارل کا سر کاٹ لیں۔"

عرب کے کفار بالیگان کی یہ تقریر سن کر اپنی کشتیوں سے باہر نکل آئے اور اپنے گھوڑوں اور خچروں پر سوار ہو گئے، انہوں نے اپنے گھوڑے شارل کی فوج کی طرف بڑھائے، امیر بالیگان نے اپنے خواص میں سے گیما لگیفن کو طلب کیا اور اپنی فوج کی سرداری اس کے سپرد کی:

بالیگان اپنے کمید گھوڑے پر سوار تھا، اسکے ہمرکاب چار باجگزار نواب تھے، گھوڑے بڑھاتے ہوئے وہ سارا گوسہ پر آن دھمکے، بالیگان کے گھوڑے کی رکابیں چاروں نوابوں نے تھام لیں اور وہ سنگ مرمر کی سیڑھی پر پیر رکھ کر اپنے گھوڑے سے اترا، بادشاہ مارسیل کی بیوی برامیمونڈ اس سے ملنے کے لئے آئی اور یوں کہنے لگی:۔

"حضور والا! میں بیمار اور منحوس گھڑی کی پیدائش لینے آقا کو کھو بیٹھی وہ بھی کس ذلت کیساتھ"۔

یہ کہکر وہ غش سے گری جاتی تھی کہ امیر نے بڑھ کر پکڑ لیا اور لوگ اسے ایک کمرہ کی طرف لے گئے

بادشاہ مارسیل نے امیر بالیگان کو دیکھکر دو ہسپینی خدمتگاروں سے کہا "مجھے اپنے بازوؤں میں لیکر بٹھا دو" جب بالیگان اس کے قریب پہنچا تو اس نے اپنے الٹے ہاتھ سے دستانہ اٹھا کر یوں کہا:۔

حضور والا! میں اپنی ساری ریاست اور سارا گوس کا شہر تمہیں دیتا ہوں، میں تباہ ہو گیا اور میرے سب لوگ بھی تباہ ہو گئے!

بالیگان:۔ مجھے بڑا صدمہ ہے، اب اس وقت تفصیل سے گفتگو کرنے کا وقت نہیں، میں جانتا ہوں شارل میرا بالکل منتظر نہ ہوگا، اس لئے اس حالت میں فوراً اس پر حملہ کر دینا چاہیئے، میں آپ کے اس دستانہ کو لئے لیتا ہوں۔"

۔۔۔ نیچے محل کی سیڑھیوں سے اترا، گھوڑے پر سوار ہو، ہمیز لگا تا آن کی آن میں اپنی سپاہ میں واپس آگیا۔

۔۔۔ شارلمان کی آنکھ ۔۔۔ کھل گئی، وہ کیا دیکھتا ہے کہ حضرت جبرئیل ہاتھ سے اسے ۔۔۔ رہے تھے کہ

طرف اشارہ کر رہے ہیں وہ سمجھ گیا کہ حضرت جبرئیل فرانسیسی شہیدوں کی لاشوں کی طرف اشارہ کر رہے ہیں وہ معہ اپنی سپاہ کے تیار ہو رانسیو وروانہ ہوگیا، وہاں اپنے آدمیوں کی لاشیں دیکھکر اس سے ضبط نہ ہوسکا اور دہاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ اور اپنے آدمیوں سے یوں مخاطب ہوا:-

"ساتھیو! میں اپنے بھتیجے رولان کی لاش کو ڈھونڈنے تمہارے ساتھ چلتا ہوں، مجھے یاد ہے، جب ایک دفعہ ایکس میں میرے سب سردار اپنی اپنی مہموں کے قصے بڑے گھمنڈ سے بیان کر رہے تھے، میں نے رولان کو کہتے سنا ہے کہ جب کبھی وہ دشمنوں کے نرغے میں مرا تو اس کی لاش اپنے ساتھیوں میں دشمن کی طرف سب سے آگے پڑی ہی پائی جائیگی اور اسکا چہرہ دشمن کے ملک کی طرف ہوگا۔

آگے بڑھ کر ایک مٹی کے ڈھیر کے قریب اس نے دیکھا کہ جھاڑیوں کے سارے پھول فرانسیسی شہیدوں کے خون سے رنگین ہو رہے تھے انہیں جھاڑیوں میں اس نے رولان کی لاش پہچانی، کچھ تعجب نہیں اگر شارل یہ منظر دیکھکر رنج سے کپکپا اٹھا، وہ لاش کے قریب گیا اسے اٹھا کر اپنے دونوں ہاتھوں میں رکھ لیا اور صدمہ کی وجہ سے غش کھا کر گر پڑا۔

جب شارل کو ہوش آیا تو ڈیوک نائم اور کونٹ اسیلون، جافری دانجو اور اسکا بھائی ہنری اسے ایک چیڑ کے درخت کے نزدیک لے گئے، اس نے آنکھیں کھولیں اور رولان کی لاش کو خاک و خون میں لتھڑا ہوا دیکھا، رولان کی لاش سے حسن و مردانگی ٹپک رہی تھی، اسکی آنکھیں پلٹ گئی تھیں اور اس پر سیاہی آگئی تھی، شارل لاش کو دیکھکر یوں مخاطب ہوا،

"پیارے رولان! خدا تیری روح کو بہشت کے پھولوں میں جگہ دے، اب تیرے بعد کوئی نہیں جو دور دراز ممالک کی لڑائیاں جیتے، میری ساری عزت ذلت سے بدل گئی تو اسپین کیا آیا؟ کوئی ایسا دن نہ ہوگا کہ میں تیرے مرنے کا ماتم نہ کروں، میری ساری قوت اور جوش اب ختم ہوگیا آسمان کے تلے اب میرا ایک دوست نہیں ہے"

پیارے رولان! جب میں لاؤن پہونچوں گا تو دوسرے ملکوں سے میرے پاس گنوار ...

"میرا مال چھین لے گئے۔ کوئی دن ایسا نہ ہوگا کہ میں تیرے لئے روؤں نہ اور ماتم نہ کروں"

"ارے میرے سورما! میرے حسین جوان! میں اکیس ہوں جکہ جب اپنے باجگذاروں کو تیرے مرنیکی ناقابل یقین خبر سناؤنگا تو انہیں تعجب ہوگا۔ میں کہوں گا کہ میرا بھتیجا مرگیا، وہ جس نے میرے لئے ساری زمینیں فتح کیں، باغی سکسنوں، ہنگروا اور بلگاریوں کا سر کچلا، وہ مرگیا۔ وہ جس نے روما نو آکی والوں، پالرن والوں اور افریقہ والوں کو نیچا دکھایا وہ مرگیا۔ اب ان باغیوں کے خلاف کون لڑیگا۔ ہائے فرانس! تو کس ماتم میں مبتلا ہوگیا، میرا رنج ایسا ہے کہ میں اپنی زندگی کا خاتمہ کر دوں تو اچھا ہے"، شارل کی یہ حالت دیکھکر ایک لاکھ فرانسیسیوں کو غش آگیا۔

پیارے رولان! تیری روح کو خدا بہشت کے پھولوں میں جگہ دے، جس نے تجھے قتل کیا اس نے سارے فرانس کو ماتم اور مصیبت میں مبتلا کیا، ہائے میرے سوار جنہوں نے میرے لئے اپنی جانیں دیں، خدا اور مریم کا بیٹا میری حالت پر رحم کرے، پیشتر اسکے کہ میں سیزر کے بڑے پھاٹکوں تک پہنچوں، میری روح تن سے جدا ہو کر ان پاک روحوں میں ملجائے تو بہت اچھا ہو"

یہ حالت دیکھکر ڈیوک نائم بولا، "شارل کو بہت صدمہ ہے"

جافری والئی انجو۔ حضور والا! اس رنج سے اس قدر متاثر نہ ہوجئے، ہمیں چاہئے کہ یہاں کھیتوں میں ہمارے جتنے آدمی پڑے ہوئے ہیں انہیں ایک خندق میں پہلے دفن کرلیں۔

شارل۔ اچھا، سپاہیوں کو حکم دو کہ ایسا ہی کریں۔

جافری والئی انجو کے حکم سے سب سپاہی گھوڑوں سے اتر پڑے اور اپنے شہیدوں کی لاشوں کو اٹھا اٹھا کر ایک خندق میں رکھنے لگے۔ فوج میں جتنے پادری، راہب اور سر منڈے زاہد تھے وہ ان سب کی مغفرت کی دعائیں مانگنے اور خوشبوئیں لگا کر دفن کرنے میں مشغول ہوگئے۔

شارل نے کہا کہ رولان، اولیور اور پادری تربان کو ایک ہی کفن میں لپیٹ کر دفن کیا جائے۔ اس نے پھر ایک مرتبہ اپنے بھتیجے کی لاش کو دیکھا اور ریشم کے کفن میں رکھوا کر دفن کرایا، ان تینوں کی قبر پر سنگ مرمر کا مقبرہ تعمیر کیا گیا۔

اس کے بعد تینوں نوابوں کی لاشوں کو خوشبو لگا کر اور شراب[1] سے نہلا کر بادہ سنگے کی کھال میں رکھوایا اور حکم دیا کہ تیباآں، گیوآن اور کونٹ ملون ان تینوں جنازوں کو گاڑیوں پر رکھوا کر ریشم کی چادروں میں لپیٹ کر ساتھ لے چلیں[2]۔"

---

(۱) لاش کو شراب سے نہلانے کی رسم آج کل فرانس میں کہیں نہیں پائی جاتی، ممکن ہے دسویں گیارہویں صدی عیسوی کے جرمنوں میں جب وہ فرانس میں آکر آباد ہوئے ہوں اس قسم کی کوئی رسم فرانس کی انگوری شراب کی قدردانی اور بعد میں احترام کے لئے موجود ہو، یہ تو آج بھی ہے کہ فرانسیسی شراب کی قدردانی خود فرانسیسیوں سے زیادہ امریکن، جرمن اور انگریز کرتے ہیں، اسکا ثبوت یہ ہے کہ پیرس کی سڑکوں پر بدست آوردہ گردی کرنیوالوں کے اعداد و شمار میں معتدبہ حصہ فرانسیسیوں کا نہیں بلکہ غیر ملکیوں کا ہے جن میں انگریز، امریکن اور جرمن اکثریت کا فخر رکھتے ہیں۔

(۲) معلوم نہیں اسکی کیا وجہ ہے کہ شارل نے رولاں، اولیوے اور ترپاں کو دفن کیا اور باقی تین نوابوں [illegible] لے گیا۔

ٹیوٹن میطوی ارچ

مصنفہ انیطن چیخوف

مترجمہ ملک محمد اسلم خاں، بی۔اے کیمبرج، سابق متعلم جامعہ

شام کا وقت ہے، پانچ اور چھ بجے کے درمیان، اور ایک مشہور علامہ۔ جو اس کہانی میں محض علامہ ہی کہلائے گا۔ اپنے مطالعہ کے کمرے میں بیٹھا بے چین ہو ہو کر اپنے ناخن دانتوں سے کاٹ رہا ہے۔

اور اپنی گھڑی پر بار بار نظر کر کے کہتا ہے "سخت کمینہ حرکت ہے یہ! اور دوسرے شخص کے وقت اور کام کیطرف سے بے انتہا لا پروائی اس سے ظاہر ہوتی ہے۔ انگلستان میں ایسا شخص ایک دمڑی نہ کمائے، بھوکا مر جائے، تم آتو لو، میں سمجھ لوں گا تم سے"

اپنی بے صبری اور غصہ کی بنا پر وہ کسی نہ کسی پر بگھار پا رہا ہے، اور اپنی بیوی کے کمرے کے دروازہ پر دستک دے کر اُس کو بلاتا ہے، اور غیظ و غضب میں کہتا ہے۔

"کیٹیا، دیکھو، ڈان پیچ سے ملو تو اس سے کہدو کہ یہ دستور شریف لوگوں کا نہیں، یہ بے حد قابل نفرت ہے۔ وہ مجھ سے سفارش کرتا ہے کہ اس لڑکے کو اپنا منشی بنالوں، اور یہ دیکھتا تک نہیں کہ کیسے شخص کی سفارش کر رہا ہے، بلا ناغہ یہ لڑکا روزانہ تین گھنٹے دیر کر کے آتا ہے۔ ایسے شخص کو کیا تم منشی کہتی ہو؟ میرے لئے وہ دو تین گھنٹے اوروں کے دو تین سالوں کے برابر ہیں، آج آئے تو کتوں کی طرح اس سے بات کروں گا، ایک دمڑی اسے نہیں دوں گا، رخصت کر دوں گا اُسے"

بیوی۔ "تم روز یوں ہی کہتے ہو، اور وہ روز یہی وطیرہ کا دلیل آتا رہتا ہے"

علامہ۔ "کچھ ہو میں نے پورا پورا ارادہ کر لیا ہے، میں کافی نقصان اٹھا چکا ہوں اسکی بدولت میں [illegible] کے [illegible] گا آج"

گھنٹی بجتی ہے، علامہ کا چہرہ متانت کی تصویر بن جاتا ہے اور وہ اپنے آپ کو سمیٹ سامنے ڈیوڑھی
کی طرف جاتا ہے، وہاں اُسکا منشی آئیون میلوی اچ ایک اٹھارہ سالہ نوجوان، بیضاوی چہرہ
مونچھ داڑھی چٹ، ایک گدلا سا کوٹ پہنے کھڑا ہے، ہیٹ سٹینڈ ہک میں ٹنگ
چکا ہے، گولاش۱؎ اُس کے جوتوں پر نہیں ہیں، جلدی کی وجہ سے وہ بیدم ہو رہا ہے، اور بہت احتیاط
سے وہ ڈور میٹ پر اپنے بوٹ پونچھتا ہے، ساتھ ہی ساتھ اپنے بوٹ کے ایک
سوراخ کو جس میں ایک سفید جراب دکھلائی دے رہی ہے مامے چھپانے کی کوشش کرتا ہے
علامہ کو دیکھکر ایک دیر پا مگر احمقانہ سا تبسم اُس کے ہونٹوں پر آجاتا ہے، ایک ایسا تبسم جو کہ محض
بچوں یا بیحد خوش مزاج لوگوں کے چہروں ہی پر دکھلائی دیا کرتا ہے،

سلام کہتا ہوا، اور اپنا مینہ سے تر ہاتھ مصافحہ کے لئے بڑھاتا ہوا آئیون پوچھتا ہے،
"آپ کے گلے کی خرابی تو رفع ہو گئی؟"

غصہ سے کانپتا ہوا، اور ایک دو قدم پیچھے ہٹتا ہوا علامہ ہاتھ ہل ہل کے پکارتا ہے "آئیون
آئیون" پھر جلدی سے اُس کے شانے پکڑ کے اور آہستہ سے اُسے جھنجوڑ کے یاس بھری آواز
میں کہتا ہے،

"آئیون تم یہ کیا کرتے ہو بے سمجھ شخص، تم نے یہ کیا مذاق بنا رکھا ہے، کیا تم مجھ پر ہنس رہے
ہو؟ ہیں؟"

تبسم کے اُن آثار سے جو ابھی تک آئیون کے چہرہ میں باقی ہیں، یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُسکو
اور قسم کے استقبال کی توقع تھی، اور علامہ کے چہرہ کو دیکھ کر جو غم و غصہ کی اس وقت بولتی تصویر
ہے، آئیون معمول سے زیادہ بیضاوی چہرہ سے جواب دیتا ہے۔

"آپ ک، کیا فرماتے ہیں"

علامہ پھر ہاتھ ہل ہل کے جواب دیتا ہے "اچھا تم یہ بھی پوچھتے ہو؟ تم جانتے ہو کہ وقت [illegible]

۱؎ گولاش جوتوں کے اوپر پہنے جاتے ہیں، تاکہ جوتے کیچڑ وغیرہ سے آلودہ نہ ہوں۔

بے شک یہ قیمتی ہے اور تم اتنی دیر کر کے آئے ہو، تم دو گھنٹے لیٹ ہو . . . . . کیا تم خدا سے نہیں ڈرتے۔
آئیون اپنا گلوبند کھولتا ہوا دھیمی دھیمی آواز میں جواب دیتا ہے "جناب، میں سیدھا گھر سے نہیں آرہا، میری بچی کے رُوزِ تسمیہ کا جلسہ تھا، . . . . اور میری بچی کا گھر یہاں سے پانچ میل ہے البتہ اگر میں سیدھا گھر سے آتا تو دوسری بات تھی"

علامہ:- "آئیون، ذرا سوچو، تمہاری باتوں میں عقل کس حد تک ہے، تمہیں یہاں کام کرنا ہوتا ہے اور کام بھی وقت معینہ پر، اور تم ہو کہ تسمیہ کی تقریبوں اور بچیوں کیطرف بھاگتے پھرتے ہو، جلدی کرو اب اور اپنا گلوبند کھولو، میری قوت برداشت انتہا کو پہنچ رہی ہے۔"

علامہ بھاگ کے اس کی طرف جاتا ہے اور اُسے گلو بند کھولنے میں مدد دیتا ہے

علامہ:- "تم تو کسان عورتوں کی طرح لپٹے ہوئے ہو . . . . آداب . . . . جلدی کرو۔"

ایک گندے اور جیب میں بے ترتیبی سے رکھے جانیکے باعث بہت جگہ تہ ہوئے ہوئے رومال میں ناک صاف کر کے اور اپنا خاکی رنگ کا دوہرے سینے والا کوٹ نیچے کھینچتا اور ڈیوڑھی اور گول کمرے سے ہوتا ہوا، آئیون کمرۂ مطالعہ میں جاتا ہے، وہاں پر جگہ، کاغذ، اور سگرٹ اُس کے لئے پہلے ہی سے تیار ہیں۔

علامہ بے صبری میں ہاتھ ملتا ہوا، اُسے جلدی سے بیٹھ جانے کو کہتا ہے "تم ناقابل برداشت ہو، تم جانتے ہو کہ وقت معینہ پہ کام ختم کرنا ہے، اور پھر بھی تم دیر سے آتے ہو، مجبوری سے تم پر ناراض ہو پڑتا ہے، . . . . آداب لکھو . . . . ہم نے ختم کہاں کیا تھا؟"

آئیون اپنے چھوٹے چھوٹے بالوں کو جو کھڑے ہو رہے ہیں ہاتھ سے سنوارتا ہے، اور قلم اُٹھا لیتا ہے، علامہ کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہلتا ہے، توجہ سے سوچنے لگتا ہے، اور لکھوانا شروع کر دیتا ہے،

"حقیقت یہ ہے . . . . کاما . . . . کہ بنیادی . . . . صورتوں . . . . لکھ چکے ہو . . . . کا اکھٹا

ملے جس دن بچہ کا نام رکھا جائے، اس دن کی تقریب بھی روس میں سال بسال منائی جاتی ہے، اس کو روزِ تسمیہ کہتے ہیں۔

. . . ان اصولوں کی ہیئت پر ہوتا ہے . . . . کا ما . . . . جو کہ . . ان صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں . . اور عملی جامہ پہنتے ہیں . . . نئی سطر . . . یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اُن کی صورتوں کی قومیت کا اُن پر اثر ہوتا ہے . . . پچھلے الفاظ آتے کاموں میں . . . ہیں ؟ ہیں ؟ وہ ہائی سکول کی بابت تم کیا کہنا چاہتے تھے ؟ "

آئیون :" یہی کہ میرے وقت میں سکول کا مروجہ لباس اور تھا "

علامہ :" ہوں . . . تمہیں سکول چھوڑے کتنا عرصہ ہوا ہے ؟ "

آئیون :" یہ تو میں نے کل بھی آپ کو بتلایا تھا ، . . . مجھے سکول چھوڑے تین سال ہوئے ہیں ، میں اُس وقت ہائی اسکول کی چوتھی جماعت میں تھا "

علامہ آئیون کی تحریر کی طرف دیکھتا ہوا پوچھتا ہے " تم نے ہائی سکول کیوں چھوڑا ؟ "

آئیون :" خانگی معاملات کچھ ایسے ہو گئے تھے "

علامہ :" آئیون ، میں تمہیں کتنی مرتبہ کہوں ، تم کب سطروں کو اس قدر پھیلا دینے کی عادت سے باز آؤ گے کسی سطر میں بھی چالیس سے کم حروف نہیں ہونے چاہئیں "

آئیون - (غصہ میں) " کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں جان بوجھ کر ایسا کرتا ہوں ، دوسری بعض سطروں میں چالیس سے زیادہ حروف بھی ہیں ، گن کے دیکھ لیجئے . . . اور اگر آپ سمجھتے ہوں کہ میں سطروں میں کافی الفاظ نہیں لکھتا ، تو میری تنخواہ سے کچھ کاٹ لیجئے "

علامہ :" نہیں نہیں ، میرا یہ مطلب نہیں تھا . . . تم میں نفاست بالکل ہے نہیں . . . ذرا تمہیں موقع ملے اور تم روپیہ کا سوال کھینچ لاتے ہو ۔ ضروری چیز تو صحت ہے ، آئیون صحت ، تحریر کی صحت "

ماما چائے کا خوان لاتی ہے جس پر دو چائے کے گلاس دھرے ہیں ، اور ایک مٹھائی کی تھالی آئیون بہت بھدے انداز سے اپنا گلاس اپنے ہاتھوں میں اٹھا لیتا ہے اور فوراً اُسے پینا شروع کر دیتا ہے ، چائے سخت گرم ہے اپنے منہ کو جل جانے سے بچانے کے خیال سے آئیون چھوٹا سا گھونٹ لیتا ہے ، پھر مٹھائی کا ایک ٹکڑا کھاتا ہے ، پھر دوسرا ، پھر تیسرا ، پھر ذرا شرمندہ ہو کر ، علامہ کی طرف

دیکھتا ہوا جو تم کترے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھاتا ہے، ۔ ۔ ۔ نگلتے وقت جو آواز اس کے منہ سے نکلتی ہے جس لطف سے وہ اپنے ہونٹ چاٹتا ہے، اور بھوکا اور لالچی ہونے کے جو آثار اُس کے چہرے سے ظاہر ہیں علامہ کو سخت ناگوار معلوم ہوتے ہیں۔

علامہ:۔ جلدی جلدی ختم کرو، وقت بہت قیمتی ہے،

آئیون:۔ آپ لکھواتے جائیے، میں دونوں کام ساتھ ساتھ کر سکتا ہوں، ۔ ۔ ۔ مجھے ذرا بھوک زیادہ لگ رہی ہے

علامہ:۔ تمہارے اتنا پیدل چلنے کے بعد بھوک نہ لگتی تو اور کیا ہوتا"

آئیون:۔ جی ہاں، اور دیکھئے موسم بھی تو کتنا بُرا ہے، ۔ ۔ ۔ ہمارے صوبہ میں تو اب تک بہار بھی آچکی ہوگی اور برف پگھل پگھل کر چھوٹے چھوٹے نالے بنے ہوئے ہونگے"

علامہ:۔ تم جنوبی علاقہ کے رہنے والے ہو؟"

آئیون:۔ میں ڈان کے خطہ کا رہنے والا ہوں۔ ۔ ۔ ہمارے ہاں تو مارچ ہوتے تک پورا بہار کا موسم ہوتا ہے، یہاں یہ اس قدر کہر ہے، ہر وقت دھندلا آسمان رہتا ہے۔ ۔ ۔ وہاں تو اتنے تک گھاس اُگ آتی ہے۔ ۔ ۔ تقریباً تقریباً ہر جگہ خشک ہوتی ہے اور چاہئے تو کپڑنے کو مکڑیاں بھی ہوتی ہیں"

علامہ:۔ مکڑیاں تم کیوں پکڑتے ہو؟"

آئیون:۔ (آہ بھر کر) "یونہیں، ایک مشغلہ سمجھ کے ۔ ۔ ۔ اُنکے پکڑنے میں مزا آتا ہے، ایک تاگے کے ایک طرف لاسا لگا لیتے ہیں، اس سے مکڑی کی پشت پر آہستہ آہستہ مارتے ہیں، مکڑی غصہ میں آکر اپنے پنجوں سے اُسے پکڑ لیتی ہے، اور اُس سے چمٹ جاتی ہے، ۔ ۔ ۔ ہم تو ٹوکرا بھر مکڑیاں پکڑ کے اُن میں ایک بھونرا ڈال دیتے تھے"

علامہ:۔ بھونرا کیا چیز ہوتی ہے؟"

آئیون:۔ وہ ایک قسم کی مکڑی ہوتی ہے، جو عام مکڑیوں سے قدرے ملتی جلتی بھی ہے"

علامہ بیں سے کچھ کم سطریں لکھواتا ہے اور پھر خیال میں غرق کچھ دیر بیٹھا رہتا ہے جب تک
خیال میں متغرق ہے، آئیون اپنی گردن اونچی اٹھاتا ہے اور اپنی قمیص کا کالر ٹھیک کرنے کی کوشش
کرتا ہے، اُس کی نکٹائی ٹھیک طور سے بیٹھی نہیں، سٹڈ باہر نکل آیا ہے، اور کالر بار بار الجھنے لگتا ہے
علامہ:۔ ہوں تو آئیون، کیا تمہیں ابھی تک کوئی ملازمت نہیں ملی۔
آئیون:۔ نہیں صاحب ملے کیسے، میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ فوج میں والنٹیر ہو جاؤں، البتہ میرے
ابا کا یہ منشا ہے کہ میں کسی پنساری کے یہاں ملازم ہو جاؤں"
علامہ:۔ ہوں ... لیکن تمہارے لئے تو کالج میں داخل ہونا بہتر ہوگا، امتحان تو مشکل ہے لیکن
محنت اور استقلال سے کام کرو تو کامیاب ہو جاؤ، مطالعہ کیا کرو اور پڑھا کرو، ... تم کافی
کتب بینی کرتے ہو یا نہیں ؟"
آئیون۔ (سگرٹ جلاتے ہوئے) نہیں صاحب، یہ تو مجھے افسوس سے ماننا پڑتا ہے"
علامہ:۔ تم نے ٹورگنیف TURGENEV پڑھا ہے"
آئیون:۔ ن نہیں
علامہ:۔ اور گوگول GOGOL ؟"
آئیون:۔ گوگول، اں ... گوگول ... نہیں میں نے اُسے بھی نہیں پڑھا"
علامہ:۔ ہیں آئیون! تمہیں شرم نہیں آتی، تم ایسے اچھے آدمی ہو تم میں استعداد بھی ہے ...
اور تم نے گوگول نہیں پڑا، تمہیں گوگول ضرور پڑھنا چاہئے، اُس کی کتابیں تم مجھ سے لو، اسکا پڑھنا
نہایت ضروری ہے ... اگر تم نے نہ پڑھا تو ہماری تمہاری لڑائی ہوگی"
کچھ دیر تک خاموشی طاری رہتی ہے علامہ غور کرنے لگتا ہے۔ اور ایک نرم نرم سوفے پر آدھا
لیٹا آدھا بیٹھا ہوا ہے، آئیون لمحہ بھر کے لئے اپنے کالر سے توجہ ہٹا کے اُسے بالکل اپنے بوٹوں کی طرف
مبذول کر لیتا ہے، اُس نے ابھی تک نہیں دیکھا کہ برف نے جو اُس کے پاؤں کے تلووں سے گر رہی
رہی ہے قالین پر دو بڑے بڑے داغ بنا دئے ہیں۔ اُس کو شرم آنے لگتی ہے،

علامہ۔ (دھیمی دھیمی آواز میں) بھائی آئیون آج تو مجھ سے کام نہیں ہوسکا۔ کل صبح آجانا، لیکن پورے نو بجے۔ خدا تمہیں دیر سے آنے سے محفوظ رکھے۔

آئیون اپنا قلم رکھ دیتا ہے، میز کے پاس سے اٹھ جاتا ہے، اور ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ پانچ منٹ خاموشی میں گزرتے ہیں، اور آئیون کو یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ اُس کے جانے کا وقت آگیا لیکن علامہ کا کمرہ ایسا پر لطف اور گرم ہے، اور چائے اور مٹھائی کے مزے کی یاد اُسکے دل میں اسقدر تازہ کہ گھر کا خیال آنے سے بھی اُسکے دل میں ایک درد سا اٹھنے لگتا ہے۔ گھر میں افلاس بھوک، سردی، ایک دائمی ناراض باپ، اور اُس کی جھڑکیوں کے سوا کچھ بھی نہیں، یہاں وقت ایسے مزے میں گزرتا ہے اور اُس کے پرندوں اور اُس کی مکڑیوں تک میں بھی دلچسپی لیجاتی ہے!

علامہ اپنی گھڑی کی طرف دیکھتا ہے اور ایک کتاب اٹھا لیتا ہے۔

آئیون۔ (اُٹھتے ہوئے) تو پھر آپ مجھے گوگول دیں گے؟ ''

علامہ۔ ہاں ہاں آئیون لیکن عزیزی تم اتنی جلدی میں کیوں ہو، آؤ اور مجھے اور کچھ باتیں سناؤ

آئیون بیٹھ جاتا ہے، اس کے ہونٹوں پر ایک تبسم نمودار ہو جاتا ہے۔ تقریباً ہر شام وہ اس کمرۂ مطالعہ میں بیٹھتا ہے، اور اُسکو اس کمرہ کا سماں کچھ عجیب طور پر نرم معلوم ہوتا ہے جو اس کے لئے ایک خاص کشش سے بھرا ہے اور علامہ کی نگاہوں اور اُسکی آواز سے مشابہ ہے، بعض لمحے ایسے بھی آتے ہیں کہ اُس کو خیال ہونے لگتا ہے کہ علامہ اُس سے مانوس ہو رہا ہے اور اُسکا بہت مشتاق ہے، اور اسے اُس کے دیر سے آنے پر جو اُس پر ڈانٹ پڑتی ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ علامہ کرونیا [illegible] کی تعلیموں کی بابت اس کی سرگزشتوں کا منتظر ہوتا ہے۔

ٹالسٹائے کے عشقیہ خطوط

بنام ویلیریا آرسینیف

(۱۸۵۶ء - ۱۸۵۷ء)

مترجمہ ملک محمد اسلم خاں، بی۔ اے کیمبرج سابق متعلم جامعہ

خط نمبر ا

۲۲ر اگست ۱۸۵۶ء

خواتین سوڈاکوف

تمہارا نامہ شیریں مجھے ابھی ملا ہے، پہلے خط میں میں واضح کر چکا ہوں کہ میں کیوں تمہارے ساتھ خط و کتابت کرنے پر آمادہ ہوا اب میں لکھ تو رہا ہوں، لیکن اس سے بالکل مختلف دلی کیفیت میں جس میں میں نے پہلا خط لکھا تھا، اس وقت میں حد سے زیادہ یہ کوشش کر رہا تھا کہ اس محبت کو روکنے کی کوشش کروں جو رہ رہ کے میرے دل میں آتی تھی۔ اب میں اس نفرت کو روکنے کی کوشش کر رہا ہوں جو اس خط نے میرے دل میں پیدا کر دی ہے جو تم نے میری چچی کو لکھا، اور نفرت ہی نہیں بلکہ رنج اور مایوسی بھی، یہ قاعدہ ہے "نظری کو کھڑکی سے باہر پھینکو، وہ دروازہ سے موجود ہوگا" کیا سنج کشتی نمونوں کی خوبصورت پوشاکیں، اور ایڈی کانگ ہمیشہ کے لئے تمہارا منتہائے مسرت رہ سکتے ہیں یہ سخت ظلم اور بے انصافی ہے، تم نے کیوں یہ بات لکھی؟ تمہیں مجھ سے پوری پوری واقفیت تھی، یہ بھی علم تھا کہ مجھے یہ بات کس قدر ناگوار گذرے گی، کیا یہ میری چچی کو مرعوب کرنے کے لئے لکھا گیا ہے؟ یقین مانو کسی شخص کو یہ بتلانے کا کہ میں کیا ہوں سب سے برا طریقہ یہ ہے کہ اس سے یہ کہہ دیا جائے کہ "میں یہ ہوں" اول تو اگر تم ان چیزوں کا ذکر نہ کرو جو تمہارے دل میں فخر فنا پیدا کرتی ہیں، تو تم

اپنے دونوں میں اس سے زیادہ تمہاری عزت کرینگے جتنی تمہارے اپنی تعریف آپ کرنے سے، اور دلوں میں تمہارا خیال بھی زیادہ رکھیں گے، دوسرے اگر کوئی اور شخص انکا ذکر کرے تو لوگوں کی نظروں میں تم میں ایک نئی خوبی پیدا ہو جاتی ہے، یعنی جیسا انسان کا شاعر یا فلسفہ داں ہو، لوگوں کے دلوں میں اس کی اتنی وقعت نہیں پیدا کرتا جتنی کہ معاملات میں سوجھ بوجھ، تم کشمشی نمونے کی "بیحد خوبصورت" پوشاک میں حد سے زیادہ بری معلوم ہوتی ہوگی، اور یقین مانو کہ اپنے سفری لباس میں کروڑوں درجہ بہتر۔
یہ بات دیانت سے دور ہے کہ انسان اعلیٰ سوسائٹی سے محبت رکھے اور انسان سے نفرت رکھے اس میں خطرے بھی بہت ہیں۔ کیونکہ ناکارہ لوگ اعلےٰ سوسائٹی میں دوسری سوسائٹیوں کی نسبت زیادہ پائے جائیں گے اور تمہارے لئے اس میں کوئی فائدہ بھی نہیں کیونکہ تم خود اعلیٰ سوسائٹی کی نہیں ہو، اور تمہارے تعلقات جس کی بنا ایک خوبصورت چہرہ اور سرخ کشمشی نمونے کی ایک پوشاک ہوگی، نہ تو خوشگوار ہی ہو سکتے ہیں، اور نہ ان سے تم اپنی شان قائم رکھ سکتی ہو، رہا سوال ایڈی کانگوں کا۔ میرا خیال ہے کہ ان کی پوری پوری تعداد چالیس کے قریب ہے، اور میں اچھی طرح سے جانتا ہوں کہ ان میں سے صرف دو ایسے ہیں جو پرلے درجے کے بدمعاش نہیں، اس لئے اس بات سے بھی کوئی اتنی بڑی مسرت نہیں ہو سکتی مجھے کس قدر خوشی ہے کہ تمہارے کشمشی نمونے کے لباس میں پریڈ پر شکنیں پڑ گئیں، وہ گمنام نواب جس نے تمہیں بچایا کس قدر بیوقوف ہوگا، اگر میں اسکی بجائے ہوتا، تو میں بڑی خوشی سے ہجوم میں شامل ہو جاتا، اور کشمش کو سفید لباس کے اوپر کچلتا، میں یہ اس لئے کہتا ہوں کہ تم یقیناً کسی سخت خطرہ کی حالت میں نہیں تھیں، یہ بات محض بکواس ہی میں تھی جس کی کہانی تم نے نہیں پڑھی ہے کہ وہ ایک پریڈ پر تقریباً کچل ڈالا گیا، لیکن یہ کہ ایک نوجوان خاتون جو کہ تاجپوشی کے موقعہ پر موسیقی کا لطف اٹھانے آئی ہے پریڈ کی ایسی خوشگوار اور معصومانہ دل لگی میں کچلی جائے، میں نے اپنی تمام زندگی میں کبھی کوئی ایسا واقعہ نہیں سنا اور اس لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ یہ ہوا ہو۔ ہمارے علاقہ میں اب موسم بہت اچھا ہے، اور آج میں چھ بجے صبح سے آٹھ بجے شام تک شکار میں پھرتا رہا اور مجھے اس میں ایسی مسرت حاصل

ہوتی جیسی نہ کسی وزیر اعظم کو حاصل ہو سکتی ہے، نہ کسی نوجوان خاتون کو جو کہ گلکاری کی پوشاک پہنے ہو، اس لئے گو میں اسکو آنے کے لئے بیتاب ہوں کہ تمہاری طرف دیکھ دیکھ کر اپنی طبیعت کو خوشی کی وجہ سے بے قابو کروں، لیکن میں نہ آؤنگا۔ اور تمہیں ہر قسم کی بلند پرواز خوشیوں اور انکے عام تلخ نتیجوں کی دعا دیتا ہوا میں ہوں تمہارا سب سے ناچیز اور سب سے ناخوشگوار خادم

کاؤنٹ لیو ٹالسٹائے

" نیاز مندانہ جذبات کے ساتھ " مجھے افسوس ہے کہ میں یہ اعلیٰ درجہ کی اصطلاح جس میں اتنا قدر ندرت اور لطافت ہے لکھنا بھول گیا نہیں، مذاق پس پشت۔ اگر تم اس خط لکھنے کے باوجود درگزر کرو تو تم بہت اچھی ہو، مس ورجانی، میری سفارش کرو

غزل

از لسان القوم مولانا علی نقی صاحب صفی مدظلہ العالی

گرد غم بر دل نشست آواز پائے برنخاست — کاروان عمر ما رفت و صدائے برنخاست

از لب شوریدگان غم نوائے برنخاست — شیشۂ دلہا شکست اما صدائے برنخاست

عشق را زیر فلک دردآشنائے برنخاست — نالہا کردم و زیں گنبد صدائے برنخاست

عرصۂ میخانہ را نازم کہ پر شور و شر است — فتنہ نبود کہ در صحنش ز جائے برنخاست

کے تواں زد گام در راہ محبت بے خطر — کاندریں رہ از خضر آواز پائے برنخاست

اندرون سینہ صد پیکاں نشست و نالہ — از شہید ناز چشم سرمہ سائے برنخاست

چار باغ طبع را قصریست کز بام و درش — جز ہوائے معصیت ہیچ ہوائے برنخاست

طفل اشک آں نور چشم دل کہ یک افتاد و باز — ناتوانے خستہ بدیست و پائے برنخاست

نے سرے دارم بہ دوش و نے تنے در پیرہن — چوں من مسکین ز کوئش بے نوائے برنخاست

آں سیہ بختم کہ شمعے بر مزار من نسوخت — وز برائے مغفرت دست دعائے برنخاست

قلب محزوں در فراق ہمرہاں خوں شد صفی
کاروانے رفتہ و بانگ درائے برنخاست

از مصور جذبات جانشین میر و غالب مرزا ثاقب لکھنوی

کیوں کوئی آئے اس طرف سایہ نہیں ثمر نہیں
میرا نہال آرزو خشک ہے بار ور نہیں

درد تو میرے دل میں ہے نالوں میں ہاں اثر نہیں
بیخبری جو ہے اُدھر اس لئے کچھ خبر نہیں

مجرم عشق ہوں تو خیر قلب حزیں نہ چھوڑنا
آئے ہوا ب تو جاؤ کیوں دل ہے یہ رہگزر نہیں

طور کا سوز ختم ہے اب تو کوئی اثر نہیں
تو یونہی جل کہ شمع دل تیرے لئے سحر نہیں

صبح ازل سے جذب ہے حسن میں عشق سے سوا
میں تو اُدھر کا ہو گیا آپ ہیں جو ادھر نہیں

منکر ہمت ولی کاش کہیں سے دیکھ لے
راہ ہے اور مرے قدم ایک بھی ہم سفر نہیں

غنچہ گل کو دیکھکر ہاتھ بڑھا کے رہ گئے
خانہ غیر ہے یہ دہر کوئی ہمارا گھر نہیں

طول شب فراق بس میں تو وداع ہو چلا
نالوں نے اُٹھ کے دور دور دیکھ لیا سحر نہیں

تیرہ سرائے دہر میں خانہ زیست لٹ گیا
ایک طرف تو دل نہیں ایک طرف جگر نہیں

زردی رخ سے کیا غرض جینے پہ اعتراض ہے
قابل دید ہے جو شے اُسپہ کوئی نظر نہیں

وہ جو گلوں پہ ہر گھڑی رکھتے تھے سایہ دھوپ میں
اُڑ گئے یوں کہ باغ میں ایک بھی اب کا پر نہیں

بزم میں ہے مری طلب وہ بھی سرور عشق کی
ڈھونڈ رہے ہو تم جہاں حیف کہ میں ادھر نہیں

درد کا نام مٹ گیا دل جو مرا فنا ہوا
نالے کو موت آگئی اور کوئی تو حہ گر نہیں

زندگی جفا و ظلم تھی مری زندگی کے ساتھ　　مرنے کے بعد کیا ہوا پھر مجھے کچھ خبر نہیں

وہ نہیں خیر میں تو ہوں نذرِ مصائبِ فراق　زمانہ　دہر میں بے اثر نہیں

میں نہ سہی مگر سہی جانے دے پاسبان اسے　　بزم میں ہے زمانہ بھر ایک مری نظر نہیں

چھوٹ گئے ساکن لحد محنت و انبساط سے　　رو دئے کوئی اثر نہیں کوئی ہنسے خبر نہیں

خانۂ قبر میں ترا اوّل سے رہین لطف ہوں　　میرے لئے کھلا ہو جو ایسا تو کوئی در نہیں

اب کہاں وقت ناز حسن آؤ لحد سے اٹھ چلیں　　حشر اسی کا نام ہے میرا تمہارا گھر نہیں

ایک ہی کارواں ہے قافلہ سرشک غم　　دل کا سوائے عشقِ دوست کوئی بھی راہبر نہیں

بازوئے آسماں نورد قلب حزیں پہ بار ہیں　　قید میں ہوں تو کاٹ دو حاجتِ بال و پر نہیں

رعب جمال ہے فقط وجہ سکوت اہل دہر　　ورنہ جہاں میں کون ہے جسکو مری خبر نہیں

ثاقب اس انجمن میں تو ہرزہ سرا ہوا تو کیوں
جبکہ بجز کمال عیب تجھ میں کوئی ہنر نہیں

غزل

از تراوش کلک حافظ محمد علی صاحب قاری وکیل غازی پور

اے خوش آں شبہا کہ سر بر آستانے داشتم
کار با فریاد و با آہ و فغانے داشتم

اے خوش آں شبہا کہ در بر جان جانے داشتم
طالع فرخندہ و بخت جوانے داشتم

یاد آراں عہد کان بستی بمہر بندہ
من ہماں ہستم کہ چشم خوں فشانے داشتم

او ز ناز ار سر گرانیہا بمن میداشت من
در نیاز بے نہایت نیک شانے داشتم

بود از و قدغن کہ تا نایم بہ بزم خاص او
مصلحت داں دانش زاں خوش گمانی داشتم

مسکنم صحرائے سودا و جنوں آمد کنوں
پیش ازیں در کوئے دانش مکانے داشتم

در جفا و جور یار من اگر ممتاز بود
من بہ تسلیم و رضا صد گونہ آسانے داشتم

جان و دل دادم لبش را در بہائے بوسہ
بہ ازاں امید از شیریں دہانے داشتم

سرو تو اے فاختہ دیدی کہ گشتہ پا بگل
در چمن چوں با خود آں سرو جانے داشتم

چوں خدنگش در دل آمد جان ز دل گشتہ بدر
تیر او اندر دل خود ہمچو جانے داشتم

خاطرم گوید دو عالم چوں نگشتے ز آن من
تیر از مژگان و از ابرو کمانے داشتم

حرف حسرت از یاد من شد چوں رسیدم پیش او
ورنہ از ایام ہجراں داستانے داشتم

لال شد از رعب و داب شہریار ملک حسن
آنکہ من اندر دہان خود زبانے داشتم

بخت مدبر دل کشید انداخت در ویرانہ
در فضائے قدس ورنہ آشیانے داشتم

قاری از چشم ترم برخاست طوفان عظیم
غرق گردید آنکہ من با خود جہانے داشتم

ولہ

رخ سوئے کعبہ آمدہ زاہد پاکباز را ‏ ‏ در خم ابروئے کسے قبلۂ ما نماز را

کیست کہ پے برد کنہ راز نیاز و ناز را ‏ ‏ شد سپر سبکتگیں بندۂ ناز ایاز را

سوخت دلم ز شعلۂ شمع جمال رخ او ‏ ‏ جز دل سوختہ کہ یافت لذت ایں گداز را

دولت خویش از زکوۃ پاک کنند اغنیا ‏ ‏ بوسۂ لب زکوۃ ہست دولت حسن ناز را

ملک دلم با من بود رخ چو نمود شاہ حسن ‏ ‏ لشکر غم گرفتہ عشق آمدہ ترکتاز را

حوصلہ اے مگس مکن ورنہ کنند تار رسا ‏ ‏ دست چو شاہ خود بداد جا شدش شاہباز را

ہر دو جہاں نہادہ است سر بزمین عاجزی ‏ ‏ پایہ بلند آمدہ حسن کرشمہ ساز را

بربط و عود و چنگ و نے نیست مگر بہانہ ‏ ‏ مستی عارفاں کجا جست نوائے ساز را

قاری بے نوا ترا بار کجا بہ بزم ناز
ہاں چہ کنی دلیل راہ از پے خود نیاز را

اقتباسات

ہندوستان کی معاشی حالت: کچھ عرصہ ہوا جنوا میں تمام دنیا کی ایک معاشی کانفرنس ہوئی تھی جس میں
تقریباً ۲۰ ریاستوں کے نمائندہ اور ماہرین فن معاشیات دنیا کی موجودہ معاشی حالت پر غور کرنے اور
اصلاحی تجاویز سوچنے کے لئے مجتمع ہوئے تھے۔ اس میں ہندوستان کی طرف سے بھی ایک وفد
شریک ہوا تھا جس کے ارکین ڈاکٹر کریم حیدر لودی، کیمبل رووین اور ایک پارسی صاحب تھے، اس
وفد نے اپنے ملک کی نمائندگی کرتے ہوئے جو رپورٹ ہندوستان کی معاشی حالت پر کانفرنس کے سامنے
پیش کی اسکے چند اقتباسات ذیل سے ہندوستان کی تجارتی حالت اور تجارت کے متعلق حکومت
کا جو رویہ ہے اس کا کسی قدر اندازہ ہو سکتا ہے۔

ہندوستان کی معاشی حالت اور بیرونی دنیا کے ساتھ اس کے تعلقات بہت ہی اجمال کے
ساتھ بیان کئے جا سکتے ہیں، ہندوستان اس لحاظ سے ایک مقروض ملک ہے کہ برطانوی اور دیگر بیرونی
سرمایہ یہاں کی ریلوں، نہروں اور بعض صنعتوں میں اس سے زیادہ لگا ہے جتنا کہ ہندوستان کا
سرمایہ غیر ممالک میں لگا ہے، اس سرمایہ پر ہر سال بڑی بڑی رقوم بطور سود کے براہ راست یا سرکاری
طور پر مطالبات وطن کے نام سے ادا کیجاتی ہیں اسمیں پنشن اور دوسرے قسم کے وہ مطالبات شامل
ہیں جن کی ادائیگی انگریزی سکوں میں ہونا چاہئے، اس مد کی مجموعی رقم تقریباً ۲۵ کروڑ روپیہ سالانہ
ہوتی ہے۔ ان مطالبات کی ادائیگی کے لئے ضروری ہے کہ ہندوستان سے ہر سال کل برآمد اس کی
کل درآمد سے زیادہ قیمت کی ہو بالفاظ دیگر سامان تجارت کی درآمد و برآمد کے توازن ہندوستان کے
موافق قائم رکھا جائے، یہ اسی طرح ممکن ہے کہ ہندوستان کے اندر پیدائش دولت "صرف دولت"
سے زیادہ ہو۔ ہندوستان کا رقبہ روس کو نکالکر براعظم یورپ کے مساوی ہے کل بنی نوع انسان کا
پانچواں حصہ یہاں آباد ہے، باشندگان کی ضروریات بہت معمولی ہیں جو ملکی پیداوار سے پوری ہو جاتی

ہیں اور مقامی ضروریات کی تمام اشیاء قرب و جوار سے دستیاب ہو جاتی ہیں۔

اس وقت پیدائش دولت کے لئے ہندوستان کی تمام تر سعی و کوشش بیرونی منڈیوں سے زیادہ ملکی منڈیوں پر مرکوز ہے۔ ہندوستان کی زرعی برآمد اس کی کل برآمد کے دسویں حصہ کے برابر ہے حالانکہ یہ عشر کل زرعی پیداوار کا صرف گیارہواں حصہ ہوتا ہے۔ ہندوستان اپنی اس خصوصیت کی وجہ سے اور کثیر آبادی، وسیع رقبہ، اور بیش بہا قدرتی خزانہ اور وسائل کی وجہ سے نیز اس وجہ سے کہ ملک کے اندر مختلف صوبوں کے درمیان کسی قسم کی تجارتی دقتیں اور رکاوٹیں نہیں ہیں یورپ کی ریاستوں سے اتنی مناسبت نہیں رکھتا جتنی کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ سے۔

"جہانتک ملکی تجارت کا تعلق ہے حکومت کی طرف سے ایسا طرز عمل اختیار کیا گیا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ جنگ کے زمانہ میں جو مواقع ملکی تجارت کو فروغ دینے کے لئے تھے ان سے کما حقہٗ فائدہ اٹھایا جائے، وہ مصنوعات جو مقامی محنت اور مقامی سرمایہ سے اور مقامی مواد سے مقامی ضروریات کو فراہم کرنے کے لئے تیار ہونے لگی تھیں انکو اس بیرونی سامان کے مقابلہ میں نہ مرنے دیا جائے جو ارزاں قیمت پر ہندوستان کی منڈیوں میں فروخت کیا جاتا ہے جو فائدہ ارزانی قیمت کی وجہ سے ہندوستان کو ہوتا ہے وہ اس کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہیں رکھتا کہ ملکی مصنوعات کو زیادہ مستحکم بنیادوں پر قائم کیا جائے اور انکو ترقی دیجائے۔ ہندوستان کی تامینی پالیسی کا بھی یہی مقصد ہے کہ صرف ان مصنوعات کی حفاظت کیجائے جو ایک مدت تک کسی تامین اور امداد کے دنیا کی منڈیوں میں مقابلہ کر سکیں اسی وجہ سے سرکاری امداد خواہ درآمدی محصول کے ذریعہ سے خواہ دوسری صورت سے ہو صرف ایک مقررہ زمانہ کے لئے چند خاص خاص مصنوعات کے لئے دیجاتی ہے۔"

"کچھ تو جنگ اور کچھ بعد جنگ حالات کی وجہ سے ۱۹۱۷ء سے لیکر ۱۹۲۲ء تک ہر سال حکومت ہند کے خزانہ میں آمدنی و خرچ کی مقدار [illegible] برابر نہ ہو سکی اور برابر خسارہ ہوتا رہا [illegible] ملک کی [illegible] پڑتی ہے مختلف محصولات کے اضافہ اور مصارف میں تخفیف کر کے حکومت ہند کے بجٹ میں آمد و خرچ کا توازن اب دوبارہ قائم کیا گیا ہے [illegible]

۱۸ ارب ۷۹ کروڑ روپیہ اور ۲۳ کروڑ ۷۰ لاکھ پونڈ تھا۔ یہ قرضہ اب بڑھکر ۲۵ ارب ۳۱ کروڑ روپیہ اور ۴۴ کروڑ ۹۰ لاکھ پاؤنڈ ہوگیا ہے۔"

ہندوستان کو آزادی کب ملنا چاہئے؟ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۱۹ء کو نافذ ہوئے اب آٹھ سال سے زائد ہوگئے ہیں، حکومت خود اختیاری" کی ابتدائی منزل میں جو تجربات ہوئے ہیں اور جنکی بنا پر آئندہ آزادی کی دوسری قسط ملنا چاہئے یا نہ ملنا چاہئے اسکا فیصلہ کرنے کے لئے زیر دفعہ ۸۴ الف گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ" کم از کم دس سال کی مدت ختم ہونیکے بعد" ایک شاہی کمیشن تفتیش حالات کے لئے آنیوالا ہے۔ اس آنیوالے امتحان کے لئے تیاریاں ابھی سے شروع ہوگئی ہیں ایک گروہ ہے جو ہندوستانی ہے یا ہندوستان کا بہی خواہ ہے اور برطانوی مواعید پر پورا اعتماد رکھتا ہے، یہ گروہ تقریر تحریر اور ذاتی اثرات کو کام میں لاکر حکومت خود اختیاری کے لئے ہندوستان کی اہلیت کو ثابت کرنا چاہتا ہے ادھر گروہ دفتری حکومت کے ارکان کا ہے یہ جماعت اپنی حکومت اور اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے ہندوستانیوں کو ہر طرح حکومت خود اختیاری کے لئے نااہل ثابت کرنیکی ہر ممکن کوشش کررہی ہے۔

ڈاکٹر جے۔ ٹی سنڈرلینڈ امریکہ کے ایک فاضل مصنف ہیں اور چونکہ ہندوستان کی آزادی کے حامی ہیں اس لئے انکا شمار اول الذکر گروہ میں کیا جاسکتا ہے، آپ کی ایک تصنیف " ہندوستان، امریکہ اور عالمگیر اخوت" کے نام سے شائع ہوئی تھی جو بہت مقبول ہوئی، اب ایک تازہ تصنیف آزادی کے لئے ہندوستان کا مطالبہ عنقریب شائع ہونیوالی ہے، اس کتاب کے چند ابواب ماڈرن ریویو میں نکل رہی ہیں جس میں مصنف نے اس مسئلہ پر بحث کی ہے کہ " ہندوستان کو آزادی کب ملنا چاہئے" مصنف کی رائے ہے کہ حکومت خود اختیاری کی قابلیت اور اہلیت تعلیم اور تدریس سکھانے سے نہیں پیدا ہوتی ہے، اگر امریکہ کے قوم پرور دل سے ۱۷۷۶ء میں برطانوی جوے کو اپنے کاندھوں سے نہ اتار پھینکا ہوتا اور منتظر رہتے کہ برطانوی قوم انہیں حکومت خود اختیاری کے لئے تیار کردے تو قیامت تک امریکہ والے حکومت خود اختیاری کا انتظار کرتے

جاپان نے حکومت خود اختیاری کی تعلیم اجنبی قوم سے نہیں حاصل کی، نہ سیام نے، پھر بھی آج یہ دونوں قومیں ترقی کی جس منزل پر ہیں وہ اظہر من الشمس ہے، ترکی نے اجنبی اثر اور اقتدار سے آزادی حاصل کر لی اور اب وہ ترقی کی شاہراہ پر ہے یہی حال جنوبی امریکہ کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا ہے لیکن ان سب سے زیادہ قابل ذکر امریکہ کے حبشیوں کی وہ ترقی ہے جو انہوں نے ۱۸۶۵ء میں آزاد ہونے کے بعد سے کی ہے، اگر ہم لوگوں نے بھی ان سے وہی کہا ہوتا جو آج انگریز ہندوستانیوں سے کہتے ہیں کہ "جلدی نہ کرو، رفتہ رفتہ قدم اٹھانا چاہئے جب تم اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو جاؤ تو تم کو آزادی دینگے"، تو کیا حبشی آج آزاد ہوتے یا ہزار سال میں بھی وہ آزادی حاصل کر سکتے تھے۔

"دنیا کی ہر آزاد قوم نے محض اپنے تجربہ سے اپنے اوپر حکومت کرنا سیکھا ہے نہ کہ ایک اجنبی حکومت کے سامنے زانو تہ کر کے، سبھوں نے پیرنا سیکھا ہے، لیکن ہمیشہ پانی میں اتر کر آج ہندوستان بھی صرف پانی کے اندر اترنے کا مطالبہ کر رہا ہے، ایک سال تک اپنے اوپر واقعتاً حکومت کر کے غلطیاں کر کے اور انکی اصلاح کر کے ہندوستانی قوم سوراج کی وہ تعلیم حاصل کر سکتی ہے جو ہزار برس تک برطانوی آقا اور استاد اسکو نہ سکھلا سکیں گے، کیا آج کوئی شخص گلیڈ اسٹون کے اس قول کے خلاف کچھ کہنے کی جرات کر سکتا ہے کہ ہر سال اور ہر مہینہ جو کوئی محکوم قوم ایک استبدادی نظام حکومت کے ماتحت گزارتی ہے وہ اس قوم کو حکومت خود اختیاری کے لئے اور زیادہ ناقابل اور نا اہل بنا دیتا ہے"۔

"میں نے جو کچھ اب تک عرض کیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی قوم کو غلامی کی زنجیروں میں رکھ کر "اجنبیوں" اور آقاؤں کے ذریعے اسکو" آزادی کے لئے تیار کرنے کا خواب دیکھنا محض ایک دھوکا ہے، بنی نوع انسان کی پوری تاریخ اس کی شاہد ہے اور اس مضمون کا مطالبہ کرنے والے اور صاحب رائے لوگوں نے اس خیال کی تردید کی ہے جدید تعلیم اور جدید علم النفس نے اس کی غلطی ظاہر کر دی ہے۔

دنیا کی تاریخ میں کہیں بھی یہ تجربہ کامیاب کیا نہیں ہوا اور ایسا ہونا قدرتاً بھی ممکن نہیں ہے، "اقوام خود سے بنتی ہیں" لیکن لوگ انکو ترقی کرتوں کی طرح کھڑا نہیں کر سکتے۔ اگر برطانوی قوم ہندوستان کو سکھلا بھی سکے کہ انگلستان کی طرح ایک نظام حکومت تیار کرے اور جہاں تک ممکن ہو انگریزی نظام میں اس کو پہنچنے

تو اس سے کوئی فائدہ نہ ہوگا، اس لئے کہ وہ محض مصنوعی اور غیر فطری ہوگا۔ اور بہت ممکن ہے کہ پائیگا
برطانوی اور ہندوستانی طور طریقے ایک نہیں ہیں، نہ برطانوی ضروریات اور ہندوستانی
ضروریات یکساں ہیں، برطانیہ کی دست برداری کے بعد بھی ہندوستانیوں کو اپنے تمام نظام حکومت میں
ایسی تبدیلیاں کرنا پڑیں گی جو انکے نصب العین کے لحاظ سے موزوں اور مناسب ہوں اور ان کی
ضروریات کو پورا کر سکیں، برطانوی قوم آخر اس کو محسوس کیوں نہیں کرتی اور بلا مزید احمقانہ نقصان
وہ تاخیر کے وہ ملک اس کے جائز وارثوں کو کیوں نہیں واپس کر دیتی ہے کہ وہ ایک ایسا نظام
حکومت بنائیں جو انکے تمدن ان کی معاشرت اور انکی ضروریات کے مطابق ہو اور اسی وجہ سے زیادہ
مفید اور زیادہ پائدار ہو۔

ہندوستان کے لئے ایک پبلک اسکول کچھ عرصہ ہوا جب حکومت ہند کے مشیر قانونی مسٹر اس آر داس نے
ایک پبلک اسکول کے قیام کی تجویز پیش کی تھی جس کی تائید با اثر حلقوں سے کی گئی تھی اور اب کئی لاکھ
روپیہ کا اس کے لئے چندہ بھی جمع ہو گیا۔ عنقریب اس تجویز کو عمل میں لانے کے لئے انتظامات بھی شروع
ہونے والے ہیں۔ پبلک اسکول کی اس تجویز پر رسالہ جامعہ میں رائے زنی کی جا چکی ہے آج ہم ایک
مشہور ماہر تعلیم پروفیسر شیشادری کی رائے نقل کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ
" بڑے غلغلہ اور جوش وخروش کے ساتھ ہندوستان میں ایک "خاص" پبلک اسکول کے
قیام کی تجویز حال میں پیش کی گئی ہے، مجھے اعتراف ہے کہ اس تجویز نے کم از کم مجھے تو افسردہ کر دیا کہ
اس لئے کہ اولاً یہ مدرسہ اپنے کثیر مصارف کی وجہ سے ہندوستان ایسے غریب ملک کے لئے بالکل ناموزوں
ہے اور محض امراء کے بچوں کے لئے مخصوص ہو کر رہ جائے گا جن کے لئے یہ کسی طرح بھی مفید نہ ہوگا کہ ایک
ایسی علیحدگی کی فضا میں تربیت حاصل کریں۔ اسکی وجہ سے انہیں بیجا تکبر، خود بینی اور خود نمائی کی خرابیاں
پیدا ہو جائیں گی جس کو آج کل کی جمہوری نظام زندگی میں کوئی نہیں برداشت کر سکتا۔ جن لوگوں کو پبلک
اسکول نظام تعلیم پر پورا اعتماد ہے انہیں برٹرنڈ رسل کی جدید تصنیف تعلیم کا مطالعہ کرنا چاہیے جس میں

اس موضوع پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ بیشک ایک زمانہ تھا جب پبلک اسکول سے اس قسم کے لوگ پیدا ہوتے تھے جو سلطنت کی توسیع اور حکومت میں بہت حصہ لیتے تھے اور مفتوحوں پر حکومت کرنا چاہتے تھے لیکن اس جدید زمانہ میں اس قسم کی روح طلبہ میں پیدا کرنا مضر ہے علاوہ ازیں اس طرح کا امتیازی طریق تعلیم ہندوستان کی روایات کے بالکل خلاف ہی جہاں قدیم زمانہ میں شاہی خاندان کے شہزادے برہم چاریوں کے پہلو بہ پہلو سادھوؤں اور رشیوں کی جھونپڑی میں تعلیم حاصل کیا کرتے تھے سب سے زیادہ یادگار واقعہ سری کرشنا جی کا ہے جو باوجود اس کے کہ خود شاہی خاندان سے تھے لیکن انکا سب سے بڑا دوست اور مدرسہ کا رفیق سوداما تھا جو ایک غریب برہمن کا لڑکا تھا۔ اس دوستی اور مساوات کی تہہ میں جو بات ہے اس کو نظر انداز نہ کرنا چاہئے، سرسوتی دیوی نے اپنے مندر میں اعلیٰ اور ادنیٰ کے درمیان کوئی تفریق اور امتیاز نہیں قائم کیا پھر ایک درسگاہ جو صرف ان لوگوں کے لئے مخصوص ہو جو بڑی فیسیں ادا کر سکتے ہوں اور جہاں کی تعلیم یہ ہو کہ ہمیشہ یورپ والوں کے قدم چومنا فخر سمجھا جائے ایسی درسگاہ نہ تو ہندوستان کے موجودہ تعلیمی نظام میں کوئی مفید انقلاب پیدا کر سکتی ہے اور نہ ہندوستانیوں کو وسیع النظر بنا سکتی ہے۔ بہتر یہ ہے کہ ملک کا ایک ایک پیسہ جو مل سکتا ہو موجودہ ہائی اسکولوں کی اصلاح اور بہتری پر صرف کیا جائے اور ہر ہندوستانی چاہے وہ کسی قدر معزز اور اعلیٰ مرتبہ پر کیوں نہ ہو اس کو اپنی شان کے خلاف نہ سمجھے کہ اسکا لڑکا ہائی اسکولوں کے دیگر معمولی طلبہ کے ساتھ تعلیم حاصل کرے "

تاریخ الامت کا ایک ورق

آخری فاطمی خلیفہ عاضد لدین اللہ

۵۵۵ھ سے ۵۶۷ھ تک

جب سے جامعہ علیگڈھ سے دلی میں منتقل ہوئی اسوقت سے بعض وجوہات سے تاریخ الامت کا سلسلہ بند رہا۔ اس سال اسکی چھٹی جلد لکھی گئی ہے اور کاتب صاحب اسکی کتابت کر رہے ہیں انشاءاللہ رمضان شریف تک یہ حصہ چھپکر تیار ہو جائیگا۔ اسمیں طوفان نوح کے بعد سے ۹۲۳ھ تک کی جس میں خلافت مصر سے آل عثمان کے ہاتھ میں منتقل ہو گئی مصر کی ایک اجمالی تاریخ آگئی ہے جو اتبک اردو زبان میں نہ تھی۔ اسی حصہ کا ایک ٹکڑا ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

اسلم

خلیفہ فائز بنصر اللہ کی وفات کے بعد وزیر صالح نے فاطمی خاندان کے ایک سن رسیدہ شخص کو خلافت کے قابل سمجھکر بیعت لینے کا ارادہ کیا مگر کسی خیر خواہ نے اس کے کان میں کہا کہ پہلے وزراتم سے زیادہ عاقل تھے جو بچوں کو خلیفہ بناکر خود امور سلطنت کے متولی بن جاتے تھے۔ یہ سنکر اس نے حافظ لدین اللہ کے ایک نابالغ پوتے عبداللہ کو عاضد کا لقب دیکر خلیفہ بنا دیا اور مہات سلطنت پر بلا شرکت غیرے قابض ہو گیا۔ مزید تقرب کے لئے اپنی بیٹی بھی اس کے ساتھ بیاہ دی اور بیش قیمت جہیز رخصتی کے وقت اس کے ساتھ بھیجا۔

قتل صالح صالح کے استبداد سے لوگ تنگ آ گئے، خاصکر خلیفہ کی پھوپھی۔ اس لئے اس نے اپنے چند غلاموں کو بھیجا جو قصر کی دہلیز میں چھپ رہے۔ جب وہ نکلنے لگا تو خنجر سے اسکا شکم چاک کر دیا۔ لوگ اسکو اٹھا کر گھر لیگئے۔ اور وہ ۱۹ ر رمضان ۵۵۶ھ کو مرگیا۔ مگر موت سے پہلے خود خلیفہ کے حکم سے اس کی پھوپھی سے اپنا انتقام لے لیا۔

صالح پرشکوہ۔ فاضل، شجاع، سخی اور مدبر تھا فرائض شرع کا پابند لیکن شیعیت میں غلو رکھتا تھا حضرت علی کی خلافت بلافصل پر علماء و فقہاء سے مناظرے کئے۔ اور ایک کتاب بھی لکھی جس کا نام رکھا

"الاعتماد فی الرد علی اہل العناد" شعر بھی کہتا تھا۔

<u>مشہد حسینؓ</u>| اسی کے زمانہ میں مصر میں مشہد حسین تعمیر کیا گیا۔ صورت یہ ہوئی کہ امیر الجیوش جب زمانہ شام کی مہم پر تھا اس کو معلوم ہوا کہ عسقلان میں امام حسین کا سر دفون ہے۔ اس نے وہاں ایک قبہ تعمیر کرا دیا۔ صالح نے اپنے عہد میں چاہا کہ اسکو مصر میں لائے۔ اسی غرض کے لئے قاہرہ کی فصیل کے باہر ایک مدفن بنایا اور جامع تعمیر کرائی لیکن خلیفہ نے اس اثر شریف کو شہر کے باہر رکھنا گوارا نہ کیا اور اپنے قصر زمرد میں اس کے لئے ایک جگہ مخصوص کی۔ وہیں مشہد بنایا گیا جسمیں عسقلان سے خاک منتقل کی گئی۔

<u>شاور</u>| صالح کے بعد اسکا بیٹا محی الدین وزیر ہوا جس کو خلیفہ نے ملک عادل کا خطاب دیا۔ مگر وہ زیادہ عرصہ تک نہ رہ سکا اور اسکی جگہ شاور نے لے لی۔

صالح کے آوردوں اور پروردوں کی ایک جماعت تھی جسکا سرغنہ ضرغام تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو متفق کر کے چاہا کہ شاور کو نکالکر خود وزیر ہو جاؤں۔ رمضان ۵۵۸ھ میں اس کے محل پر حملہ کیا۔ شاور کا بڑا بیٹا مارا گیا مگر وہ خود بچکر نکل بھاگا اور شام کیطرف چلا گیا۔ ضرغام مسند وزارت پر متمکن ہو گیا۔

<u>ضرغام</u>| اسمیں عقل۔ شجاعت۔ کرم۔ شیریں زبانی اور حسن صورت جملہ صفتیں تھیں لیکن ایک عیب یہ تھا کہ جو شکایت کسی کی سنتا اسپر فوراً یقین کر لیتا۔ چنانچہ کچھ عرصہ کے بعد کسی ذریعہ سے اسکو اطلاع ملی کہ امرا پھر شاور کو بلانے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ اس بنیاد پر ان سب کو جن کی تعداد ۷۰ تھی دعوت کے بہانے سے بلا کر اپنے گھر میں قتل کرا دیا۔ ان رجال دولت کے خاتمہ سے ملک میں بین اضمحلال پیدا ہو گیا چنانچہ صلیبیوں نے مصر پر چڑھائی کر دی۔ ضرغام نے اپنے بھائی ہمام کو مقابلہ میں بھیجا مگر وہ شکست کھا کر بحال تباہ قاہرہ واپس آیا اور صلیبی بلبیس کے قلعہ میں داخل ہو گئے۔

<u>اسد الدین شیرکوہ</u>| شاور مصر سے بھاگ کر سلطان نور الدین کے پاس پہونچا جو اسوقت صلیبیوں کے مقابلہ میں سرگرم جہاد تھا اور تمام سلاطین و ملوک اسلام میں قوت و شوکت میں سر بلند۔ اور اس سے مدد کا طالب ہوا۔ اس نے مصر کو زیر بار احسان رکھنے کے لئے اس اہم موقع کو غنیمت سمجھا اور اپنے چند معتمدوں کو

نے ایک خاص معتمد اسد الدین شیرکوہ کو فوج دیکر شاور کے ساتھ روانہ کر دیا۔

شیرکوہ کرد کے قبیلہ رادیہ سے تھا جس کی سکونت مقام دربن تاحیۃ آذربیجان میں تھی۔ اس نے اور اس کے بھائی نجم الدین ایوب نے سلطان نور الدین کے ہمراہ صلیبیوں کے ساتھ جہاد میں ایسی شجاعت اور لیاقت کا اظہار کیا تھا جس سے سلطان کی نگاہ میں انکی خاص وقعت تھی

صلاح الدین | نجم الدین ایوب کا بیٹا یوسف صلاح الدین بھی اس سفر میں اپنے چچا کے ہمرکاب مصر کو چلا۔ اسکا باپ بوجہ اس کی کم سنی کے راضی نہ تھا لیکن تقدیر اسکو یوسف صدیق علیہ السلام کی طرح کھینچکر مصر لیگئی کہ وزیر بنا دے۔

یوسف صلاح الدین کی ولادت قلعہ تکریت میں ۵۳۲ھ میں ہوئی تھی۔ یہی وہ نوجوان ہے جو آگے چلکر سلطان صلاح الدین ایوبی فاتح جنگ صلیبی کے لقب سے مشہور ہوا۔ اور جس کے کارنامے اسلامی تاریخ کے اوراق کے زیب وزینت بنے۔

سلطان نور الدین صلیبیوں کے حملہ کے خوف سے خود اس فوج کو حدود مصر تک پہنچا کر واپس واپس گیا۔ ۲۹ جمادی الاول ۵۵۹ھ کو یہ لوگ مصر میں داخل ہوئے۔ ضرغام مقابلہ کے لئے آیا اور مارا گیا۔ شاور پھر وزیر ہوا۔ اور ایک ثلث مصر کا خراج سلطان مذکور کے پاس اس کے اس احسان کے معاوضہ میں بھیجنے لگا۔

لیکن سلطان کی غرض یہ نہ تھی۔ بلکہ وہ چاہتا تھا کہ فاطمی سلطنت پر جو انتہائی ضعف کو پہنچ چکی ہے خود قابض ہو جائے۔ اس بارہ میں شیرکوہ کو لکھا۔ اس نے شاور سے مشورہ کیا۔ دونوں مخفی طور پر باہم متفق ہوئے کہ سلطانی قبضہ کا اعلان کر دیں۔ مگر شاور کے دل میں شیطان نے یہ وسوسہ ڈالا کہ شیرکوہ اور اس کے مٹھی بھر ساتھیوں کو وہ مصر سے نکال سکتا ہے۔ اور نور الدین یہاں پہنچ نہیں سکتا [illegible] ملک اس کے حوالہ کیا جائے۔ یہ سوچ کر صلیبیوں کو لکھا کہ تم فوجیں لیکر آؤ اور شیرکوہ [illegible] میں میری امداد کرو۔ ورنہ اگر مصر نور الدین کے قبضہ میں چلا گیا تو تمہاری خیر نہیں [illegible] بہت کچھ مال ومتاع دینے کا بھی وعدہ کیا۔

صلیبیوں نے اپنی جمعیت لیکر دھاوا کیا۔ نورالدین کو جب اسکا علم ہوا تو وہ فوجیں لیکر انکی طرف بڑھا کہ نہ جانے پائیں لیکن وہ نہ رک سکے کیونکہ انکے لئے یہ خطرہ عظیم الشان تھا علاوہ بریں امید بھی رکھتے تھے کہ شاید اس نادر موقع پر مصر کو فتح کرلیں۔

شاور کو جب انکی آمد کا حال ملگیا تو اس نے شیرکوہ کو لکھا کہ مصر سے چلے جاؤ۔ وہ ایفائے عہد پر مصر رہا۔ اور اپنی فوج کو لئے ہوئے بلبیس میں جہاں سے صلیبی بھاگ چکے تھے جاکر قلعہ گیر ہوگیا۔ شاور نے صلیبیوں کو ساتھ لیکر محاصرہ کیا۔ باوجودیکہ اسکی فصیلیں بلند نہ تھیں اور روزانہ صبح و شام کو نکل کر وہ مقابلہ بھی کرتا تھا لیکن تین مہینے پورے گزر گئے اور یہ لوگ اسکا کچھ نہ کرسکے۔

اس درمیان میں نورالدین نے شام میں صلیبیوں کو جابجا شکستیں دیں۔ اور قلعہ حارم بھی قبضہ کرلیا جو انکا بہت بڑا مرکز تھا۔ جب یہ خبریں مصر میں پہونچیں تو صلیبیوں نے گھبراکر اپنے گھر کی حفاظت کے لئے مصر سے واپسی کا ارادہ کیا۔ شیرکوہ کو لکھا کہ اگر تم یہاں سے چلے جاؤ تو ہم محاصرہ اٹھالیں۔ وہ واقعات سے بے خبر اور قلت ذخیرہ سے تنگ تھا راضی ہوگیا۔ اور مصر چھوڑکر نورالدین کے پاس چلا گیا۔

وہاں ۵۶۲ھ تک رہا مگر مصر کا خیال اس کے دل کو چین نہ لینے دیتا تھا۔ آخرکار اس نے منتخب بہادروں کی فوج مرتب کی اور سلطان سے مصر کی اجازت چاہی۔ وہ راضی نہ تھا لیکن اس کے وفور شوق سے مجبور ہوکر اجازت دی اور اپنے چند امیروں کو بھی ساتھ کردیا۔ اس کل جماعت کی تعداد دو ہزار تھی۔

شاور کو جب اسکی اطلاع ملی تو اس نے پھر صلیبیوں کو بلایا۔ وہ یلغار کرتے ہوئے پہونچے۔ شیرکوہ دریائے نیل کو پار کرکے بالائی مصر میں پہنچ چکا تھا اسکے پیچھے مصری اور صلیبی لشکر دریا کیطرح موجیں مارتے ہوئے چلے۔

شیرکوہ نے دیکھا کہ میری فوج قلیل اور غریب الدیار ہے۔ ایسا نہ ہو کہ انکے دل چھوٹ جائیں اس لئے سب کو جمع کرکے مشورہ لیا بعضوں نے کہا کہ یہاں اگر ہم شکست کھاگئے اور گمان غالب یہی ہے تو ہمارے لئے کوئی [illegible] پھر [illegible] اس ملک کے سپاہی و لشکری اور بازاری [illegible] سب چن چن کر ہم کو قتل کر ڈالیں گے اور [illegible]

[illegible] نورالدین کے مالک میں ایک شخص شرف الدین برغش [illegible]

[illegible]

بلا جنگ یا غلبہ حاصل کئے ہوئے ہم گئے تو نور الدین ہماری تنخواہیں بند اور جاگیریں ضبط کر لیگا اور کہے گا کہ تم مسلمانوں کا مال کھاتے ہو اور اُنکے دشمنوں سے بھاگتے ہو مصر کو کیوں کفار کے سپرد کر آئے ہمارا ہمارے پاس کوئی جواب نہ ہوگا۔

صلاح الدین نے بھی اسی کی تائید کی۔ اور کہا کہ سوائے جنگ کے اور کوئی سبیل نہیں شیرکوہ نے کہا کہ یہی رائے صحیح ہے اور اسی پر میں عمل کرونگا۔ چنانچہ مقابلہ میں صف آرائی کی اور ایسی جنگی تدابیر اور بے جگری کے ساتھ لڑا کہ دونوں فوجوں کو شکست دی اور کشتوں کے پشتے لگا دئے۔

مورخین شیرکوہ کے اس عجیب و غریب کارنامہ پر انگشت بدنداں ہیں کہ صرف دو ہزار سواروں سے اس نے ساری مصری اور فرنگی طاقت کو چند گھنٹوں میں کیسے توڑ دیا۔

اس فتح سے وہ صعید سے اسکندریہ تک قابض ہوگیا۔ اور اسکندریہ میں اپنے بھتیجے صلاح الدین کو متعین کر کے خود سارے بالائی مصر کا خراج تحصیل کرنے میں مشغول ہوا۔

ہزیمت خوردہ جماعت نے پھر اپنا ساز و سامان درست کر کے اسکندریہ پر چڑھائی کی اور صلاح الدین کو محصور کر لیا۔ شدت محاصرہ سے اس پر سختی گزر گئی۔ جب شیرکوہ صعید کیطرف سے مقابلہ کے لئے پہونچا اس وقت فریقین میں مصالحت کی گفتگو شروع ہوئی۔

طے یہ پایا کہ اس نے جو کچھ وصول کر لیا ہے اس کے علاوہ پچاس ہزار دینار مصری حکومت اسکو اور دے۔ اور وہ اپنی فوج لیکر چلا جائے۔ شیرکوہ نے اس کو منظور کیا بشرطیکہ صلیبی بھی خالی ہاتھ شام کو واپس چلے جائیں اور مصر کے ایک گاؤں پر بھی قبضہ نہ کریں۔

شیرکوہ اسکندریہ مصریوں کے حوالے کر کے ذیقعدہ کے مہینے میں واپس چلا گیا۔ لیکن صلیبیوں نے قاہرہ میں اپنا ایک شحنہ اور سواروں کا دستہ چھوڑا کہ اگر نور الدین کوئی فوج بھیجے تو شہر کی حفاظت کریں۔ اس فوج نے مصریوں پر سخت ظلم و ستم ڈھائے اور دو سال کے بعد جب دیکھا کہ یہاں کوئی طاقت مزاحمت نہیں ہے شام میں اپنے بادشاہ اموری کو دعوت دی کہ آکر مصر پر قبضہ کرے۔

صلیبی امرا نے نہایت خوشی کا اظہار کیا۔ اموری اگرچہ خونریز تھا لیکن مدبر بھی تھا۔ اس نے

کہاکہ ہمارا مصر کی طرف چلنا مناسب نہیں۔ کیونکہ وہاں کے لوگ ملک کو ہمارے حوالہ نہ کرینگے اور جنگ کے لئے آمادہ ہوجائیں گے۔ بلکہ یقین ہے کہ نورالدین کو بلائیں گے۔ اس صورت میں اگر شیرکوہ کو اس نے مصر میں بھیجدیا اور خود شام پر چڑھائی کردی تو سوائے جلاوطنی کے اور کوئی صورت ہمارے لئے نہیں رہجائے گی۔ لیکن صلیبی امرا نے اس کی بات نہیں مانی اور کہاکہ جبتک نورالدین تیاری کریگا اسوقت تک ہم مصر پر قبضہ بھی کر چکیں گے۔

اسی اثنا میں مصر کے بعض اعیان و ارکان دولت کے بھی جو شاور کے مخالف تھے اس کے پاس خطوط پہونچے کہ ہم تمہاری مدد کریں گے۔ اسوجہ سے وہ قوی دل ہوکر روانہ ہوا۔ اور مصر پہنچکر صفر ۵۶۴ھ میں بلبیس کو قتل وغارت سے تباہ کرڈالا۔ پھر قاہرہ کی طرف بڑھا۔ دہاں کے لوگوں نے اس خوف سے کہ بلبیس کی طرح یہاں بھی یہ قتل عام کریگا دروازے بند کرلئے اور پوری قوت سے مدافعت کرنے لگے۔

خلیفہ عاضد نے سلطان نورالدین کے پاس خط بھیجا کہ اس مصیبت سے مصریوں کو نجات دلائے۔ اور خط کے اندر اپنے حرم کے بال بھی رکھدئے تاکہ اسکو ترس آئے۔ اس نے فوراً شیرکوہ کو چھ ہزار سواروں کے ساتھ روانہ کیا۔ اس کے پہونچتے ہی صلیبی خائب وخاسر شام کیطرف پلٹ گئے۔ لیکن اس جنگ میں فسطاط جیسا عظیم الشان شہر بالکل ویران ہوگیا جس میں مورخین کے بیان کے مطابق تین ہزار سے زائد مسجدیں تھیں۔

شیرکوہ کے آجانے سے مصریوں کو اطمینان ہوگیا۔ انہوں نے اس کی فوج کی ضیافتیں کیں خلیفہ نے بھی اس کو خلعت اور اس کے سپاہیوں کو انعامات دے۔ البتہ شاور دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا تھا اور کچھ کر نہیں سکتا تھا۔

ایکبار اس نے چاہا کہ دعوت کے بہانے بلاکر شیرکوہ کو قتل کردے۔ مگر اس کے بیٹے کامل نے مخالفت کی۔ اور کہاکہ اگر تم نے ایسا ارادہ کیا تو میں خود اسکو مطلع کردونگا۔ شاور نے کہاکہ اگر ہم اسکو نہ ماریں گے تو یقینی ہے کہ وہ ہم کو مارڈالے گا۔ بیٹے نے جواب دیا کہ بلا سے ہم قتل ہوجائیں

ملک تو مسلمانوں کے ہاتھوں میں رہے گا۔ یہ یاد رکھئے کہ جس دن شیرکوہ مارا گیا اسی دن صلیبی آکر مصر پر قبضہ کرلیں گے۔ اس وقت اگر خود عاضد بھی نورالدین کے پاس جائے گا تب بھی وہ ایک سپاہی مدد کو لئے نہ دیگا۔ چنانچہ وہ اپنے ارادے سے باز رہا۔

اسی اثنا میں صلاح الدین نے اطلاع پائی کہ شاور صلیبیوں کے ساتھ سازباز کررہا ہے۔ اس لئے اس کو گرفتار کرلیا۔ خلیفہ نے جب سنا تو اس نے بھی اس کے قتل کا حکم دیا۔ لوگوں نے اسکا گھر بھی لوٹ لیا۔ اسی میں اس کا بیٹا کامل مارا گیا۔ شیرکوہ کو اس کے مارے جانے کا بڑا افسوس ہوا۔ کہا کہ اگر وہ زندہ رہتا تو میں اس کو اس کے اس احسان کا کہ اپنے باپ کو میرے قتل سے روکا تھا اچھا بدلہ دیتا۔

اس کے بعد خلیفہ نے شیرکوہ کو بلاکر شاور کی جگہ پر وزارت کا خلعت اور فرمان عطا فرمایا لیکن صرف دو مہینے پانچ دن وہ اس منصب پر رہنے پایا تھا کہ ۲۲ جمادی الثانی ۵۶۴ھ کو انتقال کرگیا عاضد نے صلاح الدین کو اس منصب پر مامور فرمایا۔

موتمن الخلافہ

صلاح الدین کے صفات اور اخلاق حسنہ کی وجہ سے اہل مصر اس کے گرویدہ ہوگئے۔ یہ دیکھکر اس کے حاسدوں کو رشک آیا جس میں سب سے مقدم موتمن الخلافہ تھا۔ یہ خصی غلام قصر خلافت کے جملہ امور کا منصرم اور خدم وحشم کا سردار تھا۔ اس نے چند مصری امرا کے ساتھ اتفاق کرکے صلیبیوں کے پاس خط لکھا کہ صلاح الدین کو مصر سے نکالنے میں ہماری مدد کرو۔ یہ خط جوتے کے تلے میں سلوا کر ایک غلام کو دیا گیا وہ مخفی طور پر پہنچائے۔ وہ راستہ میں جوتہ ہاتھ میں لئے ہوئے چلا جاتا تھا صلاح الدین کے کسی آدمی کو شبہ ہوا اس نے پکڑ لیا۔ خط برآمد ہوا۔ اور تحقیقات سے ساری کیفیت معلوم ہوگئی۔ موتمن الخلافہ نے خوف کی وجہ سے قصر سے باہر نکلنا چھوڑ دیا۔ صلاح الدین خاموش رہا۔ یہاں تک کہ جب وہ مطمئن ہوگیا اور باہر آنے جانے لگا تو اسکو قتل کرادیا۔ شیدیوں نے غضبناک ہوکر شورش کی۔ اور تقریباً پچاس ہزار کی جمعیت فراہم کرکے صلاح الدین پر حملہ آور ہوئے۔ خلیفہ بھی ایک جھروکہ پر بیٹھکر انکی حمایت کررہا تھا۔

وصول کیا جائے گا۔ دسمبر کی تعطیل میں ایک وفد جس میں ڈاکٹر سید عابد حسین ناظم اکادمی اور عبدالعلیم اسراری صاحب رفیق اکادمی شامل ہیں صوبہ متحدہ کے بعض شہروں کا دورہ کریگا تاکہ علم دوست حضرات کو اکادمی کا ممبر بنائے۔

رسالہ جامعہ اب اکادمی کا آرگن قرار دیا جائے گا۔ اور اسمیں اُس کے کام کی تفصیل چھپتی رہا کرے گی ہمیں قارئین کرام سے امید ہے کہ وہ خود اکادمی کے ممبر بنیں گے اور اپنے دوستوں کو بنائیں گے تاکہ اُنکے پاس دو مفید رسالے اور چھ اعلیٰ درجہ کی کتابیں ہر سال پہونچتی رہیں۔

فرمانروائے افغانستان شاہ امان اللہ خاں ادام اللہ ملکہٗ واقبالہٗ کی ہندوستان میں تشریف آوری بھی موجودہ عہد کا ایک یادگار واقعہ ہے۔ جس وقت سے کہ حضور ممدوح نے ہماری سرحد میں قدم رکھا یہ معلوم ہونے لگا کہ ہندوستان کے کل باشندوں کے جسم میں خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان ایک برقی لہر سی دوڑ گئی خصوصاً کراچی اور بمبئی کے لوگوں نے تو اپنے معزز مہمان کے استقبال میں ایسے جوش کا اظہار کیا کہ یقیناً آج تک کبھی نہیں کیا تھا۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ ہندوستان غلام ہے لیکن دل میں آزادی کی تمنا رکھتا ہے۔ منتشر ہے لیکن اتحاد کا آرزومند ہے، سیاست میں طفل مکتب ہو لیکن دوست دشمن میں تمیز کر سکتا ہے۔ اس لئے جب اُسے ایک ایسے اولوالعزم بادشاہ کی مہمانداری کا فخر حاصل ہوا جس نے اپنے ملک کو بزور شمشیر آزاد کیا ہے جس نے اپنی رعایا کے مختلف فرقوں کو بلطف وکرم متحد کر لیا ہے اور جس نے ہمیشہ ہندوستان کے باشندوں کے ساتھ محبت واخلاص کا ثبوت دیا ہو تو اُس کے مردہ جسموں میں جان پڑ گئی اور اُس نے آپس کے مناقشوں کو پس پشت ڈالکر متحدہ آواز سے وہ نعرہ ہائے مسرت بلند کئے جو حاسدوں کے دل میں تیر بن کر پیوست ہو گئے۔ خدا کرے یہ جوش محض عارضی چیز نہ ثابت ہو بلکہ ہمارے دلوں میں اسکا اثر ہمیشہ باقی رہے

حضور ممدوح نے جامعہ ملیہ کے سپاسنامے کے جواب میں جو قابل قدر الفاظ فرمائے ہیں وہ

ہمارے لئے نازش وافتخار کا سرمایہ ہیں۔ خدا ہمیں یہ توفیق دے کہ ہم اس تعریف کے مستحق ثابت ہوں اور ملت اسلامیہ کو یہ توفیق دے کہ وہ ہماری درسگاہ کی بنیادوں کو اپنی عقیدت مندی سے مضبوط اور مستحکم بنادے۔ آمین۔

ہمارے ملک میں ایک اور مہمان بھی آیا ہوا ہے جو تاج و تخت کا مالک تو نہیں لیکن ملک علم و دانش کا فرمانروا ضرور ہے۔ پروفیسر ہائنرش لوڈرس جو معہ اپنی زوجہ محترمہ کے کلکتہ یونیورسٹی کی دعوت پر ہندوستان تشریف لا رہے ہیں۔ جرمنی کے فضلا میں نہایت ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ پروفیسر صاحب سنسکرت اور ہند قدیم کے آداب کے متبحر عالم ہیں اور برلن کی یونیورسٹی میں انڈالوجی (ہندیات) کے استاد خصوصی ہیں۔ آپ ۱۸۹۹ء میں گوٹنگن یونیورسٹی میں سنسکرت کے لکچرار مقرر ہوئے تھے۔ ۱۹۰۳ء میں راشاک میں اسی زبان کے پروفیسر ہوئے اور ۱۹۰۸ء میں وہاں سے کیل یونیورسٹی چلے گئے۔ ۱۹۰۹ء سے آپ برلن کی یونیورسٹی میں ہیں۔ اسی سال پروشیا کی اکادمی نے آپ کو اپنا رکن مقرر کیا اور ۱۹۲۰ء میں سکریٹری منتخب کیا۔ یہ وہ رتبہ ہے جو جرمنی میں نہایت قدر و منزلت سے دیکھا جاتا ہے۔

پروفیسر لوڈرس پہلے کلکتہ یونیورسٹی میں ذیل کے موضوع پر چھ لکچر دیں گے۔
"وسط ایشیا میں آثار قدیمہ کا انکشاف اور اسکا تعلق ہندوستان کے آداب و تمدن کی تاریخ سے"
کلکتہ سے روانہ ہوکر پروفیسر صاحب تمام ہندوستان کا دورہ کریں گے۔ ہمیں امید ہے کہ ہر شہر میں جہاں آپ تشریف لیجائیں گے ارباب علم آپ کا تہ دل سے خیر مقدم کریں گے اور ثابت کردینگے کہ ہندوستان سچے عالموں کی سچی قدر کرتا ہے۔

رسالہ پورا لکھا جاچکا تھا کہ ۲۹ دسمبر کو اس سانحۂ عظیم کی خبر ملی کہ مسیح الملک حکیم محمد اجمل خانصاحب نے رات کو رامپور میں اچانک انتقال فرمایا۔ نعش دہلی میں لاکر دفن کی گئی۔ حکیم صاحب کے انتقال سے ملک اور قوم کا ایک عاقل اور مخلص رہنما اٹھ گیا اور جامعہ ملیہ تو بالکل یتیم ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ انکی روح کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور پس ماندگان کو صبر جمیل۔

شذرات

سال ختم ہو رہا ہے اور اس موقع پر ہمیں اپنے سال بھر کے کام کا تبصرہ کرنا ہے۔ رسالہ عموماً وقت پر نکلتا رہا۔ البتہ اکتوبر کے پرچے میں اتنی دیر ہوئی کہ اُسے نومبر کے پرچے کیساتھ نکالنا پڑا۔ اسکا سبب جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے۔ ٹائپ میں چھاپنے کا تجربہ تھا جو چند وجوہ سے ناکامیاب ہوا۔ اب انشاءاللہ رسالہ ہمیشہ وقت پر نکلے گا۔ مضامین اس سال مجموعی حیثیت سے سال گذشتہ سے بہتر تھے۔ کوشش کیجارہی ہے کہ آئندہ سال اس سے زیادہ دلچسپ اور بلند مضامین پیش کئے جائیں۔ ظاہری خوبیوں کے اعتبار سے بھی ترقی ہوئی اور انشاءاللہ اور ہوگی۔ ہمیں امید ہے کہ قارئین کرام آئندہ سال بھی اسی قدر دلچسپی کا اظہار کرتے رہیں گے۔ جتنی انھوں نے اس سال ظاہر فرمائی ہے۔ اُن سے یہ بھی التجا ہے کہ اس رسالے کے پہونچتے ہی اپنا سالانہ چندہ یا بذریعہ منی آرڈر روانہ فرمائیں یا دی پی بھیجنے کی اجازت دیں۔ جو حضرات جنوری کے بعد خریدار ہوئے ہیں، انھیں ابھی چندہ بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

ہم کسی گذشتہ اشاعت میں عرض کر چکے ہیں کہ جامعہ کے شعبہ تصنیف و تالیف کا از سر نو انتظام کیا گیا ہے اور اسکا نام اُردو اکادمی رکھا گیا ہے۔ اس اکادمی کی نگرانی میں امسال تین کتابیں چھپیں اور چھ سات کتابیں چھپنے کے لئے تیار ہیں۔ تجربے سے یہ معلوم ہوا ہے کہ باوجود انتہائی کوشش کے ایک سال میں چھ سے زیادہ کتابوں کا چھپنا دشوار ہے۔ مالی اعتبار سے اکادمی کے کام میں آسانی پیدا کرنیکے لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اکادمی علم دوست حضرات کو اپنا ممبر بنائے جو اُس کی تمام مطبوعات کے خریدار بن کر اُس کی عملی مدد فرمائیں۔ اس لئے تجویز کیا گیا ہے کہ جو حضرات اکادمی کو کم سے کم دو روپیہ ماہوار چندہ دیں وہ اُس کے ممبر قرار دئے جائیں اور انہیں رسالہ جامعہ، پیام تعلیم اور اکادمی مطبوعات جن کی تعداد سال میں چھ ہو چھپنے کے بعد فوراً بھیجی جائیں۔ چندہ سہ ماہی یا ششماہی پیشگی

صلاح الدین نے نفط اندازوں کو حکم دیا کہ اس بھر دکہ کو جلا دیں۔ جب خلیفہ وہاں سے بھاگا اس وقت شیدیوں کی ہمتیں پست ہو گئیں۔ صلاح الدین کے بھائی شمس الدولہ نے ان سب کو شکست دیکر تعذیب و تحریق سے فنا کر دیا۔ اس وقت سے انکا نام و نشان مٹ گیا اور عاضد بھی بے کس و مخمول ہو گیا۔ انکا ذکر بھی لوگوں نے چھوڑ دیا۔

عجیب بات یہ ہے کہ مصر کو فاطمیوں کے لئے جس غلام نے فتح کیا تھا اسکا نام بھی جوہر تھا اور جس کی بدولت انکا قبضہ جا تا رہا یعنی موتمن الخلافہ اسکا نام بھی جوہر تھا۔

صلاح الدین نے اب اطمینان کے ساتھ ملکی انتظامات شروع کئے۔ اور سلطان نورالدین کے حکم سے محرم ۵۶۷ھ کے پہلے جمعہ میں مصر میں عباسی خلیفہ مستضی باللہ کا خطبہ رائج کیا۔ اس وقت سے فاطمی خطبہ منقطع ہو گیا۔ عاضد مرض الموت میں تھا۔ صلاح الدین نے مناسب نہ سمجھا کہ ایسی حالت میں اسکو اس خبر کی اطلاع دے۔ جو اس کے لئے رنج کا موجب ہو گی۔ چنانچہ وہ بلا اس علم کے عاشورا کے دن گزر گیا۔ اسکی موت سے فاطمی خلافت کا خاتمہ ہو گیا۔ عاضد کے معنی بھی لغت میں قاطع کے ہیں۔

عاضد نہایت غالی شیعہ تھا اور سنیوں کے خون کو حلال سمجھتا تھا۔

انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ

جس کا مقصد یہ ہے کہ سائنس کے مسائل اور خیالات کو اردو دانوں میں مقبول کیا جائے۔ دنیا میں سائنس کے متعلق جو نئی بحثیں یا ایجادیں اور اختراعیں ہو رہی ہیں یا جو جدید انکشافات وقتاً فوقتاً ہونگے ان کو کسی قدر تفصیل سے بیان کیا جائے۔ ان تمام مسائل کو حتی الامکان صاف اور سلیس زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اس سے اردو زبان کی ترقی اور اہل وطن کے خیالات میں روشنی اور وسعت پیدا کرنا مقصود ہے۔

یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ ہندوستان کے سائنس دانوں کے علاوہ یورپ کے فضلا نے بھی اس رسالے میں مضمون لکھنا منظور فرمایا ہے۔ چنانچہ پروفیسر انڈر ریڈ ڈی۔ ایس سی، پی، ایچ ڈی، پروفیسر فرانیدلش پروفیسر برلن یونیورسٹی اور پروفیسر سر آرتھر کیتھ کے مضامین وصول ہو چکے ہیں جن کے ترجمے اس رسالے میں شائع ہوں گے۔ متعدد بلاک بھی ہوں گے۔

رسالہ ماہ جنوری ۱۹۲۸ء میں شائع ہوگا۔ تقطیع بڑی رسالہ اردو کی ہوگی۔ [illegible] سالانہ چندہ آٹھ روپے سکہ انگریزی۔

امید ہے کہ اردو زبان کے بہی خواہ اور علم کے شائق اس کی سرپرستی فرمائیں گے

انجمن ترقی اردو - اورنگ آباد دکن